کرن
فروری 2016
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
چہرے بولتے ہیں
READING Section

چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز
MEMBER APNS CPNE
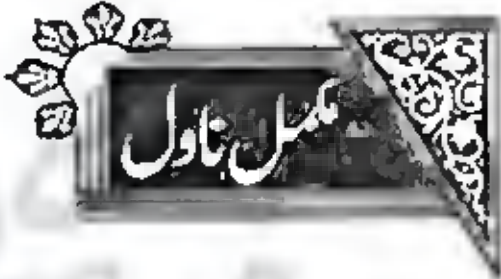
زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

مستقل سلسلے

فروری 2016
جلد 38 شمارہ 11
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

کہتے ہیں زندگی سہاروں کی محتاج ہوتی ہے۔ہمیں قدم قدم پر دوسروں کی ضرورت ہوتی ہے۔انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ضرورتوں کے یہ بندھن اگر امداد باہمی کے اصولوں پر استوار ہوں تو درست ہے لیکن اگر محتاجی کے درجے میں آئیں تو انسان سر اٹھا کر نہیں جی سکتا۔

اسی طرح وہ قومیں جو اپنے وسائل پر انحصار نہیں کرتیں۔دوسروں کی امداد کی محتاج ہوتی ہیں، قرضوں پر گزارا کرتی ہیں، وہ سر اٹھا کر نہیں جی پاتیں۔انہیں دوسروں کے طے کردہ راستوں پر چلنا پڑتا ہے نہ کہ اپنی آواز ہوتی ہے نہ تشخص۔ان کے فیصلے دوسرے کرتے ہیں لیکن ان فیصلوں کے غلط نتائج کا خمیازہ انہیں خود بھگتنا پڑتا ہے۔قوموں کا ایک غلط فیصلہ تاریخ کا دھارا بدل دیتا ہے۔پوری قوم کی قسمت بدل دیتا ہے۔

ماضی کے کچھ فیصلوں کی سزا پوری قوم بھگت رہی ہے اور آج ہم اس حال تک آپہنچے ہیں کہ نہ ہمیں جان و مال کا تحفظ حاصل ہے نہ ہمارے گھر محفوظ ہیں نہ درس گاہیں۔

خود مختاری کی پہلی شرط خود انحصاری کے لیے اور کسی قوم کی ترقی اور خوشحالی کے لیے امن و امان بنیادی مسئلہ ہے۔ہمیں سب سے پہلے متحد ہو کر اس دہشت گردی سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔تب ہی ہم ترقی کی شاہراہ پر قدم رکھ سکتے ہیں۔

مارچ کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔قارئین و مصنفین اسی مناسبت سے اپنی تحریریں جلد از جلد روانہ کریں تاکہ شامل اشاعت ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- اداکارہ "امین خان" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "سجل علی" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- "آواز کی دنیا سے" "اس ماہ مہمان ہیں" نعیم خان"
- اس ماہ "سیدہ لوبا سجاد" کے "مقابل ہے آئینہ"
- "من موہ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا کا نیا سلسلے وار ناول،
- "داپنزل" تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول،
- "رولتے وفا" فرحین اظفر کے سلسلے وار ناول کی آخری قسط،
- "دل ٹوٹ کے ہارا تھا" نایاب جیلانی کا مکمل ناول،
- "وہی درد میری حیات ہے" قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول،
- "شاید" فائزہ افتخار کا دلکش ناولٹ،
- "جان جہاں" سویرا فلک کا ناولٹ،
- "برسات محبت کی" شبنم گل کا ناولٹ،
- شبانہ شوکت، شہزادی کائنات، ماہم علی اور بنت سحر کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت:

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب "چہرے بولتے ہیں" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

پاک ہے تو خالق ہر دو جہاں
تیری صفت، یہ زمیں، وہ آسماں

چاند سورج اور زمین و آسماں
تیری یکتا کے شاہد بے گماں

یہ صفت تیرے لیے مخصوص ہے
ہر جگہ موجود، پھر بھی لامکاں

تو مری شہ رگ سے بھی نزدیک ہے
تو ہی بتلا اب تجھے پاؤں کہاں

واحد مطلق ہے تو معبود!
میرے سجدے تیری عظمت کے نشاں

یہ عنایت بندۂ ناچیز پر
حمد تیری اور مائل کی زبان

محمد حنیف مائل

شوقِ بے حد غمِ دل، دیدۂ تر مل
مجھ کو طیبہ کے لیے رخت سفر مل جائے

نامِ احمدؐ کا اثر دیکھ جب آئے لب پر
چشمِ بے مایہ کو آنسو کا گہر مل جائے

چشمِ خیرہ نگراں ہے رُخِ آقا کی طرف
جیسے خورشید سے ذرے کی نظر مل جائے

یادِ طیبہ کی گھنی چھاؤں ہے سر پر میرے
جیسے تپتی ہوئی راہوں میں شجر مل جائے

نخلِ صحرا کی طرح خشک ہوں وہ ابرِ کرم
مجھ پہ برسے تو مجھے برگ و ثمر مل جائے

سلیم احمد

ایمن خان سے ملاقات

شاہین رشید

دو بہنوں والے سیریلز تو آپ نے دیکھے ہی ہوں گے۔ مگر اب اس فیلڈ میں سچ مچ دو بہنیں کام کر رہی ہیں۔ جیسے سارہ خان اور نور خان اور ایمن خان اور منال خان۔ سارہ خان اور نور خان کی عمروں میں تو ایک دو سال کا فرق ہے مگر ایمن خان اور منال خان تو جڑواں ہیں۔۔۔ دونوں کو پہچاننا بہت مشکل ہے۔ دونوں ہی کام کرتی ہیں۔ اس فیلڈ میں۔۔۔ تو آئیں ان دونوں میں سے ایک ایمن خان سے آپ کی ملاقات کروائیں

ایمن خان کو آج کل آپ "بے قصور" میں دیکھ رہے ہیں۔

☆ "کیسی ہیں ایمن۔۔۔ اور کیا مصروفیات ہیں؟"

☼ "جی الحمد للہ میں ٹھیک ہوں اور ماشاء اللہ مصروفیات تو کافی ہیں۔ کچھ سیریلز آن ایئر ہیں اور کچھ انڈر پروڈکشن ہیں تو مصروفیات تو اتنی ہیں کہ گھر والوں کے لیے بھی ٹائم نہیں ملتا۔"

☆ "رات دیر سے آتی ہیں یا جلدی؟"

☼ "میں صرف رات 10 بجے تک شوٹ پہ ہوتی ہوں بلکہ رات 10 بجے میں اپنے گھر میں ہوتی ہوں۔"

☆ "گڈ۔۔۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

☼ "جی میرا نام ایمن خان ہے اور میرا فیملی نیم "ام ہانی" ہے اور سب گھر والے مجھے "ہانی" کے نام سے بلاتے ہیں اور میں 20 نومبر 1998ء میں کراچی میں پیدا ہوئی اور کراچی سے ہی میرا تعلق ہے اور بنیادی طور پر ہم پٹھان ہیں مگر مجھے پشتو نہیں آتی کیونکہ ہم کافی عرصے سے کراچی میں ہیں۔ میرے بابا پولیس میں ہیں اور امی ہاؤس وائف ہیں۔۔۔ میرا ستارہ 20 نومبر کے حساب سے "اسکارپیو" ہے اور ہم 5 بہن بھائی ہیں۔ ہم دو بہنیں جڑواں ہیں۔ پھر میرا ایک بھائی ہے اور پھر دو بھائی جڑواں ہیں۔"

☆ "آپ دونوں کی شکلیں ایک جیسی ہیں اور دونوں ہی اس فیلڈ سے وابستہ ہیں تو کوئی مشکل تو نہیں ہوتی؟"

☼ "جی ہم دونوں ہی کام کرتے ہیں اور کوئی مسئلہ

نہیں ہوتا' کیونکہ سب ہمیں جاننے پہچاننے لگ گئے ہیں۔"

★ "کبھی ایسا ہوا کہ تم اس کی شوٹ پر چلی گئیں اور وہ تمہاری؟"

✲ ہنستے ہوئے... "نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ لیکن ایک آدھ بار کمرشل کے لیے ایسا ہوا ہے۔"

★ "بہت کم عمری میں اس فیلڈ میں آگئیں تو پڑھائی تو متاثر ہوتی ہوگی؟"

✲ "الحمدللہ میں نے پڑھائی کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہوں اور میں اگر اس فیلڈ میں آئی ہوں تو مجھے اس فیلڈ میں آگے جانا ہے اور پڑھائی کے بغیر ایسا ممکن نہیں ہے۔ تو ان شاءاللہ میں نے میڈیا سائنس میں ڈگری لینی ہے اور پروڈکشن سائڈ پر آنا ہے مجھے۔"

★ "اس فیلڈ میں آمد کیسے ہوئی؟"

✲ "اپنے شوق سے ہی آئی۔ ہوا یہ کہ میری پھوپھو کی شادی میں پروفیشنل فوٹوگرافر آئے تھے۔ انہوں نے ہم سے بات کی' ہمارا آڈیشن لیا۔ ہماری تصاویر انہوں نے ہماری اجازت سے فیلڈ سے منسلک لوگوں کو بھیجی انہیں ہماری تصاویر پسند آئیں۔ انہوں نے بلایا اور پھر ایک سیریل میں مجھے کاسٹ کیا اس طرح میرا پہلا سیریل "میری بیٹی" تھا جو کہ "اے آر وائی" سے آن ایئر آیا تھا۔ اور دوسرا "ڈائجسٹ رائٹر" تھا اور دونوں ہی ماشاءاللہ بہت ہٹ گئے اور درمیان میں ایک دو اور بھی کیے مگر اس سیریلز نے بہت شہرت دی... اور اب تو میں لیڈ میں آگئی ہوں تو لیڈ کردار ہی کروں گی۔"

★ "ابھی تو شکل میں بھی معصومیت ہے اور کم عمر بھی ہو تو لیڈ رول کرنے میں مشکل نہیں ہوگی کیونکہ اس چہرے کے ساتھ نہ رومینس اچھا لگے گا نہ ہی نگیٹو رول؟"

✲ "نہیں کوئی مشکل ہوگی۔ کیونکہ میں نے تو اداکاری کرنی ہے اور پھر جیسا کردار ہو چہرے پہ ویسے تاثرات آہی جاتے ہیں۔"

★ گھر والے خوش ہوئے اس فیلڈ میں آنے سے

✲ "ہاں جی' بہت خوش ہوئے' کیونکہ میرے والدین کو تو کوئی اعتراض نہیں تھا میرے اس فیلڈ میں آنے پر... اور فیملی میں بھی کسی کو کوئی پرابلم نہیں ہے۔"

★ "لوگ پہچان لیتے ہیں؟ اتنی کم عمری کی شہرت سے نخروں میں اضافہ بھی ہوا ہوگا؟"

✲ "نہیں نہیں کوئی نخرے نہیں ہیں۔ لوگ پہچان لیتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے... شہرت بھلا کسے بری لگتی ہے۔"

★ "کمرشلز کی تعداد زیادہ ہے یا ڈراموں کی؟"

✲ "ڈراموں کی تعداد تو بہت کم ہے کمرشلز کے مقابلے میں... لیکن اب ڈراموں کی تعداد بھی آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی ہے۔"

★ "فیلڈ اچھی ہے...؟"

✲ "جی اچھی ہے یہ فیلڈ' جب تک آپ خود اچھی ہیں اور آپ خود جیسی ہوتی ہیں' لوگ بھی آپ کو ویسا ہی ٹریٹ کرتے ہیں اور اگر آپ سامنے والے کو کچھ غلط سائن دیں گی تو پھر وہ بھی آپ کے ساتھ برا ہی کریں گے اور جب میں اس فیلڈ میں آئی تو میری امی میرے ساتھ آیا کرتی تھیں لیکن اب چونکہ میں خود بھی سمجھ دار ہوگئی ہوں اور امی نے بھی فیلڈ کا سارا

ماحول دیکھ لیا ہے۔ اس لیے اب کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

★ "اگرچہ ابھی زیادہ کام نہیں کیا'لیکن پھر بھی آپ کی پرفارمنس پہ کوئی اپنی رائے دیتا ہے؟"

※ "ماشاء اللہ سے سب تعریف کرتے ہیں۔ مگر میری امی مجھ پر بہت تنقید کرتی ہیں کہ یہاں یہ صحیح نہیں کیا۔ یہ سین اچھا نہیں کیا۔ لیکن خیر میں تو پوری توجہ کے ساتھ کام کرتی ہوں۔"

★ "اپنی کمائی کو خرچ کرنا آسان ہوتا ہے یا والد صاحب کی کمائی کو؟"

※ "میرے خیال سے دونوں کو.... اور آپ یقین کریں کہ جب میں پیسہ خرچ کرنے لگتی ہوں تو مجھے فوراً" احساس ہوتا ہے کہ یہ سب کتنی مشکل سے کمایا ہے میں نے اور میرے بابا نے.... مگر پھر بھی کبھی کبھی فضول خرچی کر ہی لیتی ہوں۔"

★ "اس فیلڈ کا کوئی ایسا فنکار جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہو.... اور انڈین موویز دیکھتی ہیں یا پاکستانی؟"

※ "مجھے فواد خان بہت پسند ہیں اور انہی کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہوں اور جہاں تک فلموں کی بات ہے تو میں انڈین پاکستانی دونوں دیکھتی ہوں اور اگر کبھی پاکستانی فلم کے لیے آفر آئی تو ضرور کام کروں گی۔ کیونکہ میں پاکستانی ہوں اور پاکستانی فلموں میں ہی کام کرنا پسند کروں گی۔"

★ "شوبز میں نئے لوگوں کی بہت خواہش ہوتی ہے کہ یہ کردار بھی کرلوں فلاں بھی کرلوں.... آپ کی کوئی ایسی خواہش؟"

※ "نہیں 'میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں اس فیلڈ میں آئی ہوں تو ہر طرح کے رول کروں۔ خواہ وہ نگیٹو ہو یا پوزیٹو مجھے ہر طرح کے رول کرنے ہیں۔"

★ "دل چاہتا ہے کہ جیسی میری شخصیت ہے جیسی میری پرسنالٹی ہے ویسے ہی کردار ملیں؟"

※ "نہیں ایسا تو کبھی نہیں سوچا۔ بس یہ سوچ لیتی ہوں کہ جو بھی کردار ہو میں اسے بہ خوبی کرلوں اور بہت اچھا کروں تاکہ لوگ یاد رکھیں۔"

★ "ڈائریکٹر اور پروڈیوسر پہ اعتبار کرکے کردار لیتی ہو؛

❊ ”نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں تو اسکرپٹ بھی پڑھتی ہوں اور اپنا کردار بھی اور مجھے میرا کردار پسند آتا ہے تو میں لیتی ہوں ورنہ نہیں۔“

★ ”کبھی کوئی کردار کرنے سے منع کیا آپ نے؟“

❊ ”جی مجھے بولڈ کردار کرنے کی آفر آتی تھی مگر میں نے منع کر دیا‘ میں بولڈ کردار کر کے اپنا امیج خراب نہیں کرنا چاہتی۔“

★ ”اتنی مصروف رہتی ہیں‘ گھر والوں کو کچھ شکوے تو ہوں گے؟“

❊ ”جی... میری امی کو بہت شکوے ہیں کہ تم گھر والوں کو ٹائم نہیں دیتی اس لیے میں فیلڈ میں کتنی ہی مصروف کیوں نہ ہوں اپنی اماں کو فون کرتی رہتی ہوں... کیونکہ وہ پریشان ہو جاتی ہیں۔“

★ ”اماں کو تو یہ بھی شکایت ہو گی کہ گھر میں کسی کام کو ٹائم نہیں دیتی؟“

❊ ہنستے ہوئے... ”آپ کو کیسے اندازہ ہوا... باقی کام میں تو مجھے کوئی ایشو نہیں ہے لیکن کچن میں جانا مجھے اچھا نہیں لگتا‘ پکانے وکانے سے مجھے کوئی شوق نہیں ہے... کوکنگ کرنا بالکل بھی پسند نہیں ہے۔“

★ ”کبھی بھی کچھ نہیں پکایا کیا؟“

❊ ”نہیں‘ بس دال چاول بنا لیے ہوں گے۔ اس کے علاوہ تو کچھ نہیں پکایا۔“

★ ”پرائے گھر جاؤ گی تو کیا ہو گا؟“

❊ ہنستے ہوئے... ”اماں بھی یہی کہتی ہیں۔ لیکن جب سر پر پڑے گی تو کام آ ہی جائیں گے... ابھی تو میرے کھانے کے دن ہیں پکانے کے نہیں۔“

★ ”منال خان (بہن) اور آپ میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟“

❊ ”پہلے فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب کافی فرق محسوس ہوتا ہے پہلے تو ہم کپڑے بھی ایک جیسے پہنتی تھیں... مگر اب ایسا نہیں ہے۔“

★ ”کوکنگ سے لگاؤ نہیں اور کوکنگ چینل سے؟“

❊ ”او... یس... کوکنگ چینلز بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ مگر سیکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے مجھے۔ بس

مجھے دوسروں کو کھانا پکاتے ہوئے دیکھ کر اچھا لگتا ہے۔"

★ "لباس میں کیا پسند ہے اور کون سے رنگ کے لباس زیادہ پہنتی ہیں؟"

☼ "مجھے ڈارک رنگ کے لباس پسند ہیں اور میں زیادہ تر شلوار قمیص پہنتی ہوں۔"

★ "زندگی کیسی لگتی ہے اچھی یا مشکل؟"

☼ "زندگی میں مشکلات نہ آئیں تو پھر وہ زندگی کیسی ۔۔۔ تو زندگی بہت اچھی لگتی ہے اور اللہ نے دی ہے تو کیوں نہیں اچھی طرح گزاریں اور میں تو سمجھتی ہوں کہ ہماری زندگی کافی لوگوں سے بہت بہتر ہے۔"

★ "پیسہ قسمت سے ملتا ہے یا محنت سے؟"

☼ "میرے خیال میں قسمت میں لکھا ہو تو پھر انسان محنت بھی کرتا ہے تب ہی پیسہ ہاتھ آتا ہے۔"

★ "کوئی بات جس کو سوچ کر آپ پریشان ہو جاتی ہوں؟"

☼ "ہاں بس اکثر سوچتی ہوں کہ کہیں میں کبھی اکیلی نہ ہو جاؤں۔ پتا نہیں کیوں تنہائی میں ایسا کچھ سوچتی ہوں۔"

★ "دنیا کا کوئی مسئلہ جو آپ حل کرنا چاہتی ہیں؟"

☼ "دنیا کے بہت سے مسائل ہیں جو میں حل کرنا چاہتی ہوں۔ مگر ان کو حل کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔۔۔ کیونکہ میں کسی بڑے اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں ہوں۔"

★ "آئینہ دیکھ کر کیا سوچتی ہیں۔ چینج ہونے کو دل چاہتا ہے یا شکر کرتی ہیں؟"

☼ "آئینہ دیکھ کر بہت شکر کرتی ہوں اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے بہت سے بہت اچھا بنایا ہے۔ بڑا کرم ہے اس کا اور میں تو یہی تبدیلی لاسکتی ہوں کہ موٹی ہوں تو دبلی ہو جاؤں اور دبلی ہوں تو موٹی ہو جاؤں اس سے زیادہ کیا بھلا تبدیلی لاسکتی ہوں۔ کیونکہ جیسا اللہ نے بنا دیا ہے میں نے تو ویسے ہی رہنا ہے۔"

★ "وقت کی قدر کرتی ہیں؟"

☼ "میں تو بہت زیادہ قدر کرتی ہوں۔ کوشش بھی کرتی ہوں کہ ویسے وقت پر پہنچ جاؤں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ لوگ دوسروں پر تنقید کرنے میں اور دوسروں کو جج کرنے میں اپنا بہت سا وقت ضائع کر دیتے ہیں۔"

★ "لوگ ملتے ہیں تو پہلی بات کیا کرتے ہیں؟"

☼ "آپ بہت اچھی ہیں' پلیز ایک تصویر بنوالیں ہمارے ساتھ اور لڑکیوں کے ساتھ اور خواتین ہوں تو پھر ضرور بنوالیتی ہوں۔۔۔ ورنہ نہیں۔"

★ "راہ چلتے فقیر تنگ کرتے ہیں؟"

☼ "ہاں بہت تنگ کرتے ہیں' مگر انہیں کچھ کہتی نہیں ہیں بلکہ کچھ نہ کچھ دے ہی دیتی ہوں کہ پتا نہیں کس مجبوری سے مانگ رہے ہوں گے۔"

★ "خوش خوراک ہو؟"

☼ "ہاں اچھا کھاتی ہوں۔ پیٹو نہیں ہوں اپنی فٹنس کا بہت خیال رکھتی ہوں اور دہی کے بغیر میرا ہر کھانا نا مکمل ہوتا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ایمن سے اجازت لی۔

☼ ☼

میری بھی سنیے

سجل علی

شاہین رشید

1 "نام؟"
"سجل علی۔"

2 "پیار کا نام؟"
"جو سجایا... باقی جس کا جو دل چاہتا ہے۔ پیار کے بہت سے نام ہوتے ہیں اور میرے بھی بہت سے نام ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش؟"
"17 جنوری 1994ء لاہور۔"

4 "اسٹار؟"
"اسٹار تو میں خود ہوں۔" (ہنستے ہوئے) "میرا ستارہ کیپری کورن ہے اور ستاروں پہ مجھے زیادہ یقین بھی نہیں ہے۔"

5 "میری فیملی؟"
"ایک بھائی ہم دو بہنیں۔ میں گھر میں بڑی ہوں' بھائی چھوٹا ہے اور پڑھ رہا ہے... مجھ سے چھوٹی بہن ایک دو ڈراموں میں آئی۔ مگر اسے مزا نہیں آیا تو اس نے چھوڑ دیا۔ باقی ممبرز میں امی ابو۔"

6 "تعلیم؟"
"گریجویشن۔"

7 "شوبز میں کس نے آگے بڑھایا؟"
"کسی نے نہیں جی... اپنے ٹیلنٹ سے آئی ہوں۔ لاہور میں رہتے تھے کراچی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سب کو پتا تھا کہ مجھے اداکاری کا شوق ہے۔ کسی نے بتایا کہ "سکس سگما" والے آڈیشن کر رہے ہیں میں

گئی ادھر ادھر کی باتیں کیں اور بس سلیکٹ ہو گئی۔ آڈیشن بھی نہیں ہوا۔"
8 "پہلا ڈرامہ؟"
"سیریل نہیں تھا' سوپ تھا" محمود آباد کی ملکائیں" ایک شوخ چنچل لڑکی کا کردار تھا۔ اس میں میری بہن بھی تھی ...... اس نے مجھے شہرت دی اور پھر ایک کے بعد ایک آفر آتی گئی۔"
9 "آج کل آن ایئر سیریل؟"
"گل رعنا۔"
10 "فیڈ بیک؟"

"بہت زیادہ پسند کیا جارہا ہے۔"
11 "میری خواہش ہے کہ؟"
"میں پیرس (فرانس) میں اپنا گھر لوں۔"
12 "میرا یادگار دن؟"
"17 جنوری' میری پیدائش کا دن اور اس دن محمود آباد کی ملکائیں کے لیے میں نے پہلا کنٹریکٹ سائن کیا تھا۔ اس لیے 17 جنوری کو دو سالگرائیں مناتی ہوں ایک اپنی پیدائش کی اور دوسری اس فیلڈ میں پہلا کنٹریکٹ سائن کرنے کی۔"

13 "میرا خواب ہے کہ؟"
"کہ میں فیوچر میں ایک اچھی اور بہت ہی کامیاب ڈائریکٹر بنوں۔"
14 "کیا زندگی اپنی مرضی سے گزارنی چاہیے؟"
"گزارنی تو چاہیے' لیکن اگر آپ کے سر پر آپ کے والدین کا سایہ سلامت ہے تو پھر ان کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی کو گزاریں۔ کامیابیاں آپ کا مقدر ہوں گی۔"
15 "اگر میک اپ نہ ہوتا تو؟"
"تو کوئی بات نہیں ...... مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔"
16 "میک اپ سے کیا چھپایا جاسکتا ہے؟"
"اگر کوئی کہے کہ اصلی چہرے تو ایسا نہیں ہے۔ میک اپ سے نین نقش تو نہیں بدلے جاسکتے۔ اور ویسے بھی اصلی چہرے تو آپ کے ایٹی ٹیوڈ سے ہی سامنے آجاتے ہیں۔"
17 "گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟"
"سچ بتاؤں ..... باتھ روم میں ..... کچھ پلاننگ کرو۔ کچھ سوچو..... کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں ہوتا۔"
18 "کب بھوک نہیں لگتی؟"
"جب ٹینشن میں ہوتی ہوں اور جب غصے میں ہوتی ہوں۔ بس پھر بھوک ہوا ہو جاتی ہے۔"
19 "پسندیدہ ناشتا؟"
"نہیں بھئی ..... کوئی ناشتا واشتا نہیں کرتی ..... بس ایک گلاس "ملک شیک" پیتی ہوں۔"
20 "میں جذباتی ہو جاتی ہوں؟"
"چھوٹی چھوٹی باتوں پر جذباتی ہو جاتی ہوں اور ہر ایک کی بات کو بہت محسوس کرتی ہوں۔"
21 "میرا انڈر پروڈکشن کام؟"
"یوں تو کافی کام ہے۔ جو خاص ہیں وہ بتا دیتی ہوں۔ فہد مصطفیٰ کے سیریل "بینڈ تو اب بجے گا" میں کام کر رہی ہوں۔ فیروز خان میرے ساتھ مرکزی رول میں ہیں۔ ویسے کام بہت ہے مگر میں سلیکٹو کام کروں

کی۔"

22 "فلم؟"

"انجم شہزاد کی ایک فلم سائن کی ہے اور اس میں بھی میں اور فیروز خان ہوں گے۔ ان شاء اللہ یہ اس سال یعنی 2016ء میں ریلیز ہو گی۔ اس فلم کا نام "زندگی کتنی حسین ہے" مزید اچھی آفرز آئیں تو وہ بھی کروں گی۔"

23 "بالی ووڈ کے لیے میری سوچ؟"

"کہ مجھے وہاں کام نہیں کرنا۔ کیونکہ مجھے میرے ملک نے عزت دی ہے۔ اس کے لیے کام کروں گی اور ویسے بھی میں ایسے لباس نہیں پہن سکتی جو میری فیملی کے لیے باعث شرم ہوں۔"

24 "میں انکار کروں گی؟"

"اگر پاکستانی فلم میں بھی مجھے آئیٹم سونگ کرنے کو کہا گیا۔ کیونکہ یہ میرا مزاج نہیں ہے۔"

25 "بہت کوفت ہوتی ہے؟"

"جب میں کبھی ٹریفک میں پھنس جاتی ہوں۔ تو بہت کوفت ہوتی ہے۔"

26 "شوبز کے بارے میں رائے؟"

"میری تو اچھی ہی ہے کیونکہ مجھے اس میں کوئی خاص برائی نظر نہیں آتی۔ ہاں لوگ کیا سوچتے ہیں مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

27 "اپنے بارے میں چند جملے؟"

"میں عام لوگوں سے بہت مختلف ہوں اور ہر لحاظ سے مختلف ہوں۔ جذباتی ہوں۔ رونا جلدی آتا ہے۔ بہت زیادہ مذہبی ہوں۔"

28 "بری عادت؟"

"غصہ بہت آتا ہے اور اظہار بھی کر دیتی ہوں۔"

29 "اچھی عادت؟"

"دوسروں کی باتوں کو غور سے سنتی ہوں۔ کوئی مسئلہ ہو تو حل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

30 "اگنور کرتی ہوں؟"

"کوئی لڑکا گھورے یا کوئی جملہ پاس کرے تو۔"

31 "برداشت نہیں کرتی؟"

"کوئی بدتمیزی کرے کوئی غلط ایٹی ٹیوڈ دکھائے۔

دل چاہتا ہے کہ پکڑ کر خوب ماروں۔"
32 "پسندیدہ ملک؟"
"فرانس.... اس لیے تو پیرس میں گھر بنانا چاہتی ہوں اپنا۔"
33 "کیا پاکستان ایک آزاد ملک ہے؟"
"جی بالکل آزاد ملک ہے اور یہاں تو ماشاء اللہ سے ہر چیز.... جی ہر چیز کی آزادی ہے۔" (مسکراہٹ)
34 "کیا موڈ ہمیشہ اچھا رہتا ہے؟"
"توبہ کریں.... موڈ تو کبھی کبھی بلاوجہ ہی خراب ہو جاتا ہے۔ اور میں اپنے موڈ پر خود بھی حیران ہوتی ہوں کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔"
35 "گھر آتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"ہائے کہ نرم گرم بستر ہو اور میں مزے کی نیند سو جاؤں کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔"
36 "میں شرما جاتی ہوں؟"
"جب لوگ میری بہت زیادہ تعریف کرتے ہیں اور بے ساختہ کہتے ہیں کہ تم بہت کیوٹ ہو' ماشاء اللہ .... اللہ بری نظر سے بچائے۔"
37 "پسندیدہ سواری؟"
"مجھے تانگے کی سواری بہت پسند ہے۔ بشرطیکہ لمبی سڑک ہو اور کوئی دوسری ٹریفک نہ ہو.... تو کیا ہی کہنے اس سواری کے۔"
38 "فریش ہوتی ہوں؟"
"سب کام ٹھیک طرح سے ہو رہا ہو تو تھکن میں بھی اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتی ہوں۔"
39 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"نہیں بڑے بزرگوں کی نصیحت بری نہیں لگتی۔ مگر کوئی ہم عمر یا کوئی غیر نصیحت کرے تو برا لگتا ہے۔ مگر کہتی کچھ نہیں۔"
40 "شہرت پریشان کرتی ہے؟"
"نہیں نہیں بالکل نہیں۔ مجھے تو بہت مزا آ رہا ہے اور میں بہت انجوائے کرتی ہوں۔"
41 "پسندیدہ چینل؟"
"ہم" ٹی وی۔"
42 "فضول خرچ؟"
"بہت زیادہ اور زیادہ تر چیزیں گھر کی سجاوٹ کے لیے لیتی ہوں اور اپنے گھر والوں کے لیے خرچ کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"
43 "ہم کلام ہوتی ہوں؟"
"تنہائی میں اپنے خدا سے اور دل کی ساری باتیں کرتی ہوں۔"
44 "گھر سے نکلتے وقت؟"
"ماں کی دعائیں اپنا بیگ اور بیگ میں ڈھیر ساری چیزیں رکھ کر نکلتی ہوں۔"
45 "غلطی کا اعتراف؟"
"آسانی سے نہیں کرتی۔"
46 "محبت ایک بار ہوتی ہے؟"
"نہیں بار بار ہوتی ہے۔ میرے خیال میں عشق ایک بار ہوتا ہے۔"
47 "کھانے کے لیے بہترین جگہ؟"
"اگر گھر میں ہوں اور سب گھر پر ہوں تو پھر چٹائی بچھا کر' دسترخوان سجا کر چٹائی پہ بیٹھ کر کھانے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔"
48 "اپنے سرہانے رکھتی ہوں؟"
"اپنا بیگ' گلاسز' موبائل فون اور دیگر ضروری چیزیں رکھتی ہوں۔"
49 "چوٹ لگ جائے تو؟"
"بہت اپ سیٹ ہو جاتی ہوں اور جس وقت گرتی ہوں اور چوٹ لگتی ہے تو میری تو سانس ہی بند ہو جاتی ہے۔ آواز ہی غائب ہو جاتی ہے۔"
50 "اب تک کی کمائی میں اپنے لیے کیا خریدا؟"
"ایک اچھا سا "لیپ ٹاپ" باقی تو سب کچھ تھا اور ہے بس لیپ ٹاپ نہیں تھا۔"
51 "برے لگتے ہیں وہ لڑکے؟"
"جو لڑکیوں کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔"
52 "پہلی بار ملتی ہوں تو؟"

"تو اس کی آنکھیں دیکھتی ہوں جس سے پہلی بار مل رہی ہوتی ہوں اور ایسا بے ساختہ ہوتا ہے۔"

53 "خدا کی حسین تخلیق؟"

بے ساختہ... میں خود۔"

54 "دل چاہتا ہے کہ؟"

"ان لوگوں کا منہ توڑ دوں جو مسلسل بولتے ہیں اور چپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ بندہ مروت میں ہی لگا رہتا ہے۔"

55 "آنکھیں کب چغلی کھاتی ہیں؟"

"جب میں جھوٹ بولنے کی کوشش کرتی ہوں۔ تو آنکھیں چغلی کھاتی ہیں۔"

56 "زندگی بری لگتی ہے؟"

"جب کوئی ناراض ہو یا کسی سے لڑائی ہو۔"

57 "بھوک مرجاتی ہے؟"

"جب بھوک میں فوری طور پر کچھ کھانے کو نہ ملے تو میری بھوک مرجاتی ہے۔"

58 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے؟"
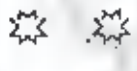
"نہیں بالکل نہیں۔ کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔ بس کچھ نہ کچھ سوچتی رہتی ہوں، پھر خود ہی نیند آجاتی ہے۔"

59 "چھٹی کا دن؟"

"زیادہ تر سو کر گزارتی ہوں۔ مگر اتنا بھی نہیں۔ گیارہ بجے تک اٹھ ہی جاتی ہوں۔"

60 "میں بھول نہیں سکتی؟"

"کہ جب آڈیشن دیے بغیر سلیکٹ ہو گئی اور ایک بڑا سوپ مل گیا۔"

61 "موبائل فون رحمت یا زحمت؟"

"دونوں... آج کل تو خیر اس کے بغیر گزارہ نہیں لیکن آخر پہلے بھی تو لوگ اس کے بغیر رہتے ہی تھے نا... اس لیے ایجاد نہ ہوتا تو میرے خیال میں کوئی فرق نہ پڑتا۔"

☼ ☼

آواز کی دنیا سے

نعیم خان

شاہین رشید

ریڈیو پہ وہی لوگ جاتے ہیں جنہیں آواز کے ذریعے اپنے خیالات اور دنیا جہاں کی معلومات دوسروں تک پہنچانی ہوتی ہے۔ جنہیں کیمرے کے پیچھے رہ کر اپنے آپ کو منوانے کا شوق ہوتا ہے۔ ویسے میں آواز کی دنیا سے تعلق رکھنے والوں کو آل راؤنڈر بھی کہتی ہوں کیونکہ وہ ہر شعبے میں اپنے آپ کو منوانے میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ ایف ایم سننے والوں کے لیے "نعیم خان" کا نام نیا نہیں ہے کیونکہ یہ 2004ء سے اس فیلڈ سے وابستہ ہیں۔ ایف ایم 105 ان کی خاص پہچان ہے۔ کیونکہ اس ایف ایم کو انہوں نے
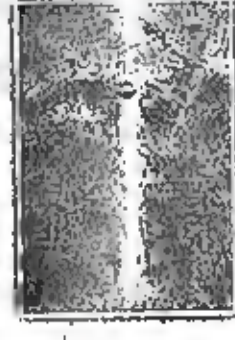
سب سے زیادہ ٹائم دیا۔ آج کل اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے اس 105 سے چھٹیاں لی ہوئی ہیں۔ اس لیے سامعین کی ایک بڑی تعداد ان کی کمی محسوس کر رہی ہے۔

★ "کیسے ہیں نعیم خان صاحب؟"

☼ "الحمدللہ میرے مزاج بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

★ "اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

☼ "آواز کی دنیا کے بندے کی مصروفیات کیا بھی ہو سکتی ہیں۔ ایف ایم میں پروگرام کرنا۔ ڈراموں کے لیے ڈبنگ کرنا اور وہ بھی ترکش ڈراموں کے لیے۔ پرائیویٹ پروڈکشن کے لیے جو کچھ تیار ہوتا ہے جیسے کمرشلز ہیں، دستاویزی فلمیں ہیں ان کے بیک گراؤنڈز میں اکثر میری آواز ہوتی ہے۔ اس طرح ترکش ڈرامے جو جیو' ہم ستارے اور اردو ون کے لیے ہوتے ہیں ان کی ڈبنگ وغیرہ۔ تو بس یہی کام ہے ہمارا۔"

★ "ترکش ڈراموں میں کیا کیا کردار ہیں آپ کے؟"

☼ "ہم ستارے سے ایک سیریل چل رہا ہے۔۔۔ اس میں ایک نیگٹو کردار ہے جو کہ ظاہری طور پر تو مسلمان ہے مگر در حقیقت نصرانی ہے اس کردار کا نام ناصر ہے جو کہ میں کر رہا ہوں۔۔۔ اردو ون سے 3 سال پہلے ایک سیریل "اک دھند سی چھائی ہے" سے چلا تھا اس میں عمر کے کردار میں میری آواز تھی اس چینل پہ "آشیانہ میری محبت کا" کے ایک کردار میں میری آواز تھی۔"

★ ”آپ آج کل ایف ایم 105 سے غائب ہیں‘ کیوں؟؟“

⁂ ”اس لیے کہ اب معیار بدل گیا ہے۔ جہاں آپ کے کام کی قدر نہ ہو‘ جہاں آپ کو کوئی کچھ سمجھتا نہ ہو وہاں رہنے کا فائدہ۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ پاکستان کی تاریخ میں کسی نے اپنے شوز کے لیے اتنی محنت نہیں کی ہوگی جتنی میں نے کی ہے۔ میرے شوز ہفتے میں پانچ دن ہوا کرتے تھے۔ پیر کے دن جو پروگرام ہوتا تھا اس کا پروڈیوسر میں خود تھا ساری سلیکشن میری ہوتی تھی اور خالصتاً ”پاکستانی میوزک ہوتا تھا اس میں‘ اس میں غزلیں لگاتے تھے ہم .... منگل کے دن مکس میوزک ہوتا تھا.... یعنی انڈین پاکستانی جس میں بہت ہی معیاری قسم کے انڈین اور پاکستانی سونگ ہوتے تھے‘ غزلیں جو آج کل کوئی نہیں سنواتا مگر بہت خوب صورت تھیں جو بھی ایف ایم 100 میں سنوائی جاتی تھیں۔ منگل کو ہی میں ساتھ ساتھ فرمائش بھی لیتا تھا اور پھر بدھ کے دن وہ فرمائش پوری کیا کرتا تھا اور جمعرات کے دن سوشل ایشوز پہ بات ہوتی تھی اور اہم موضوعات پر اور مسائل پہ بات ہوتی تھی .... اور یہ پروگرام بہت زیادہ پسند کیا جاتا تھا اور لوگ حیران ہوتے تھے کہ اتنے موضوعات آپ کے دماغ میں آتے کہاں سے ہیں.... تو ایک معیار کی ہوتا تھا پروگرام۔“

★ ”اتنے سارے ایف ایم آنے سے معیار پر اثر تو پڑا ہوگا کہ بس پیٹ بھرنا ہے جو بھی اچھی آواز مل جائے اسے آر جے بنا دو.... ایسا ہے؟؟“

⁂ ”ہاں .... ایسا ہے۔ سستا مل جائے‘ کچھ مل جائے۔ آپ کو معیاری لوگ لانے چاہیں جو واقعی اس قابل ہوں کہ اچھے پروگرام پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہوں۔“

★ ”آپ میں ماشاءاللہ اتنا ٹیلنٹ ہے تو ٹی وی کی طرف کیوں نہیں آئے؟؟“

⁂ ”ستمبر 2004ء میں میں نے اپنے کیریئر کا آغاز ریڈیو سے کیا۔ ٹی وی پہ نیوز کاسٹنگ کی تقریباً“ ایک سال تک لیکن میں نے محسوس کیا کہ ریڈیو پہ مجھے زیادہ پذیرائی مل رہی ہے تو پھر میں اسی طرف آ گیا۔ ٹی وی پہ نیوز کاسٹرز ماڈل زیادہ لگتے ہیں اب نیوز کاسٹنگ کا وہ معیار نہیں رہا اب تو ریڈیو پہ بھی آوازوں کو تربیت دینے والے لوگ یا تو خود چلے گئے یا نکال دیے گئے۔

الیف ایم 105 میں جتنی بھی اچھی آوازیں تھیں ان سب کو فارغ کر دیا گیا ہے۔"

★ "آواز ہی آپ کا پروفیشن ہے یا کوئی جاب وغیرہ بھی ہے؟"

☼ "میرے والد صاحب کا بزنس بھی ہے.... جبکہ میرا بزنس مائنڈ نہیں ہے اس لیے آواز کی دنیا ہی میرا پروفیشن ہے مجھے اس کام میں سکون ملتا ہے اچھا کام کر کے 'اچھا سوچ کے اور اچھا لکھ کے.... میں جو پروگرام کرتا تھا وہ ہوتا تو دو گھنٹے کا تھا مگر اس کی تیاری میں مجھے چھ گھنٹے لگ جاتے تھے اور اتنی محبت کوئی نہیں کرتا ہو گا جتنی میں کرتا تھا۔"

★ "ریڈیو کی طرف آپ کا رجحان کیسے ہوا جبکہ آپ کا دور تو ٹی وی میڈیا کا ہے؟"

☼ "ریڈیو کی طرف رجحان بچپن سے ہی تھا اور جس زمانے میں بچے ٹی وی پہ کارٹون دیکھتے تھے 'میں خبریں دیکھتا تھا .... اور میں نیوز کاسٹرز کی اپرینس Appearance کو نہیں دیکھتا تھا بلکہ یہ سوچتا تھا کہ یہ کام ہوتا کیسے ہے۔ پھر جب کمرشلز میں اور ڈاکومینٹریز پہ بیک گراؤنڈ میں آواز سنتا تھا تو سوچتا تھا کہ اتنی اچھی آوازیں ہوتی کس کی ہیں....

2004ء میں میرے ایک دوست نے کہا کہ الیف ایم 92 کے لیے آڈیشن ہو رہے ہیں تم بھی دے دو.... میں نے کہا کہ یہ کون سا ریڈیو اسٹیشن ہے تو کہا کہ یہ یہاں کا ریڈیو اسٹیشن نہیں ہے بلکہ نوری آبادی کراچی سے تقریباً" 50 کلومیٹر دور کا ایک ریڈیو اسٹیشن ہے وہاں تم جاؤ' کیونکہ یہاں بڑے ایم ایف میں جو مگرمچھ بیٹھے ہوئے ہیں وہ تمہیں آگے نہیں بڑھنے دیں گے وہ اتنے ہائی پروفائل لوگ ہیں مگر تم جیسے بچے سے ڈر جائیں گے۔ اچھے لوگ بھی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ خیر' میں وہاں آگیا۔ آڈیشن دیا آواز پسند آئی مگر کہا گیا کہ آپ پر محنت کرنی پڑے گی' اور ہم تو محنت کریں گے ہی آپ کو خود بھی محنت کرنی ہے.... تین چار دن کے بعد کال آئی کہ ایک ریکارڈڈ شو

ہفتے میں ایک بار کیا گیا۔ مجھے تو ایسا لگا کہ جیسے مجھے قارون کا خزانہ مل گیا ہو.... اور آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ مجھے ایک پروگرام کا 150 روپے ملتے تھے.... میرے پروگرامز کو بہت سراہا جاتا تھا۔ معاوضہ دیکھتا تو شاید پروگرام نہ کرتا مگر شوق نے سب کچھ کروایا اور پذیرائی نے سب کچھ کروایا۔"

★ "پھر ترقی کیسے ہوئی' الیف ایم 92 سے آگے کیسے بڑھے؟"

☼ "ترقی یوں ہوئی کہ ساتھ ساتھ ٹی وی پہ بھی کام کیا اور ریڈیو پہ بھی پھر پتا چلا کہ ایم ایف 103 میں آڈیشن ہو رہے ہیں۔ وہاں سے ایک صاحب آئے ہوئے تھے انہوں نے مجھ سے فون پر بات کی اور کہا کہ آپ پروگرام کریں۔ تو پھر میں نے اپنی ہی اردو پوئٹری کے ساتھ ایک پروگرام تیار کر کے پیش کیا تو پسند کیا گیا اور پھر مجھے ہفتے میں 3 پروگرام ملنے لگے اور یوں تقریباً" ایک سال میں نے پروگرام کیے جو کہ لوگوں نے بہت زیادہ پسند کیے .... پھر مجھے صبح کے گیارہ بجے والے سلوٹ میں ڈال دیا گیا اور میں گیارہ سے لے کر ایک بجے تک پروگرام کرتا تھا یہ وہ وقت تھا جب ریڈیو سننے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ مگر اللہ کا کرم ہوا کہ میرا پروگرام سنا جاتا تھا لوگ میرے پروگراموں سے متاثر ہوئے کیونکہ میں مکس میوزک سنوایا کرتا تھا اور پروگرام کا نام تھا آؤ چلو آس کدہ تھیم یہ تھی کہ جو لوگ نشے کی وجہ سے 'وہ لوگ جو محبت میں ناکامی کی وجہ سے یا کسی بھی وجہ سے خودکشی پر آمادہ ہیں یا جینا نہیں چاہتے ان میں جینے کی امنگ ڈالتا تھا۔ اس تھیم کے ساتھ میں نے الیف ایم 105 پہ بھی پروگرام کیے جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اس کا معاوضہ تو خیر مجھے کیا ملنا تھا مگر جو خوشی مجھے ملتی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ جب مایوس لوگوں کا فون آتا تھا کہ آپ کی وجہ سے میں نے جینا سیکھا ہے اگرچہ میں پروگرام کرنا چھوڑ چکا ہوں لیکن ٹوئٹر پہ اور فیس بک پر میری پذیرائی کا سلسلہ جاری ہے۔ اور اب لوگ ای میل کے ذریعے مجھ

سے اپنے مسائل کا حل مانگتے ہیں۔"

★ "ایف ایم 103 کے بعد آپ ایف ایم 105 میں آئے اور... پھر مزید کیا کیا... کیا؟"

✲ "FM 103 میں ایک سال کام کیا اور پھر گیپ دیا... پھر 2006ء میں بہ حیثیت نیوز ایڈیٹر کے میں نے FM 105 جوائن کیا اور سیدہ تحسین فاطمہ سے مزید اس کام کو سیکھا اور نیوز کی پوری شفٹ میں نے اکیلے سنبھالی۔ رپورٹنگ کا شعبہ دیکھا اور آؤٹ ڈور ورک کیا میں نے اس میں ریلوے کی اپ ڈیٹس کے لیے ریلوے اسٹیشن جاتا تھا سبزیوں کے ریٹ آج اور کل کے حساب سے کیے۔ یعنی ہر طرح کا آؤٹ ڈور ورک میں نے کیا اور یہ تقریباً" ساڑھے تین سال میں نے ایف ایم 105 کو بھرپور انداز میں دیے۔ پھر مجھے آئی ڈی ایس سے آفر آئی۔ یہ وہ سروس ہے جس میں آپ سنتی ہوں گی کہ اردو کے لیے ایک ملائیے۔ انگریزی کے لیے 2 ملائیے۔ اس کمپنی کے لیے میں نے تقریباً" ڈھائی سال کام کیا فری لانسر کے طور پر۔ اس میں صرف آوازیں ریکارڈ کروائی ہوتی تھیں۔ میں نے اپنی آواز بھی ریکارڈ کروائی اور جب اس کمپنی میں نیوز کا شعبہ کھلا تو اس کے لیے بھی کام کیا۔ تو ان سارے کاموں کی وجہ میں ان کو اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے تقریباً" مکمل اختیار اس شعبے کا مجھے دے دیا۔ ساتھ ساتھ وارید ٹیلی کام کا ایک ریڈیو اسٹیشن شروع ہوا 666 کے نام سے اس میں بہ حیثیت آر جے کے مجھے فرائض سونپ دیے۔ پھر "یوفون" نے اپنا ایک ریڈیو چینل کھولا "اسلامک ریڈیو" کے نام سے جس میں اسکالر آئیں گے اور لوگوں کے سوالات کے جوابات دیں گے اس میں بہ حیثیت ہوسٹ کے کام کیا اور ان سارے کاموں کا سلسلہ تقریباً" 5'6 سال چلا۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- ماہ وش
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی ---------- موسیٰ رضا

اور ساتھ ساتھ ایف ایم 105 کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اس کے بعد مجھے بول چینل سے آفر آگئی تو سب کو چھوڑ کر میں "بول" میں چلا گیا' کیونکہ آفر بہت اچھی تھی۔ مگر مجھے مزا نہیں آیا اور میں نے چھوڑ دیا اور میرے چھوڑنے کے بعد "بول" کا پول کھلا اور الحمدللہ میں نے بول کو خود چھوڑا۔"

★ "بول میں آپ کے کیا فرائض تھے؟"

✲ "میں بول میں ہائر ہوا بہ حیثیت نیوز اینکر ایسوسی ایٹ پروڈیوسر اور وائس اوور آرٹسٹ کے اور تقریباً" سترہ دن میں نے وہاں یہ کام کیا۔ لیکن مجھے احساس ہوا کہ یہاں میرے کام کی کوئی قدر نہیں ہو رہی تو پھر میں نے اس ادارے کو چھوڑ دیا جبکہ میں تمام کشتیاں جلا کر گیا تھا اور جب میں نے چھوڑنے کا ارادہ کیا تو گھر والوں نے کہا کہ چھوڑ کر کرو گے کیا تو میں نے کہا کہ رزق دینے کا وعدہ اللہ نے کیا ہے وہ ہی دے گا۔ میں انسان کو اس قابل نہیں سمجھتا اور نہ ہی وہ اس قابل ہے کہ کسی کو رزق دے سکے۔ کیونکہ انسان کے اختیار میں ہوتا تو سب کا رزق بند ہو چکا ہوتا۔"

★ "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"

✲ "جی بالکل حتی الوسع کوشش ہوتی ہے کہ وقت کی پابندی کروں اور یہ کوالٹی مجھ میں بچپن سے ہی ہے دو تین منٹ یا پانچ منٹ آگے پیچھے ہو سکتے ہیں مگر اس سے زیادہ نہیں۔ وعدے کا بھی پابند ہوں جس سے ایک بار کمٹمنٹ کر لیا اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

★ "باتیں تو کافی ہو گئیں اب ذرا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے؟"

✲ "میں کراچی میں 11 جولائی 1989ء کو پیدا ہوا۔ مادری زبان اردو ہے۔ کراچی کا رہنے والا ہوں والد بزنس مین ہیں اور والدہ ہاؤس وائف ہیں... ایک بھائی ہے اور ایک ہی بہن ہے... میں نے گریجویشن کیا ہے۔ خواب بہت تھے کہ یہ کرنا ہے وہ کرنا ہے۔ مگر جہاں کمانے کی دھن لگ جاتی ہے تو وہاں پھر کچھ چیزیں آپ چھوڑ دیتے ہیں۔"

★ "انسان کے لیے تعلیم ضروری ہے یا تجربہ؟"

❋ ”میں نے فیس بک پہ بھی ایک جملہ لکھا کہ انسان اپنے آپ کو گولی مار لے مگر وہ بے وقوف نہ ہو۔ بے وقوف ہونے سے بہتر ہے کہ وہ پاگل ہو جائے۔ خود کشی کر لے نا تجربہ کاری ہے کوئی مسئلہ نہیں' کام نہیں آتا کوئی مسئلہ نہیں وہ بھی آجائے گا' تعلیم کم ہے کوئی مسئلہ نہیں مگر احمقانہ اور بے وقوفانہ بات نہ کرے۔“

★ ”بہ حیثیت آر جے آپ کا کیا خیال ہے کہ سامعین کے ساتھ گھل مل جانا چاہیے یا ذرا فاصلہ رکھنا چاہیے؟“

❋ ”ہماری عوام کا یا سامعین کا پرابلم یہ ہے کہ ذرا سا بھی کوئی اپنائیت کا اظہار کرے لوگ فری ہو کر پرسنل لائف میں گھسنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مجھے پڑوسی چینل کے کئی لوگوں نے سمجھایا کہ لوگ سے زیادہ فرینک مت ہوا کرو' میں نے ان کی بات نہیں مانی جس کا خمیازہ مجھے یہ بھگتنا پڑا کہ لوگوں نے میری پرسنل لائف میں جھانکنا شروع کر دیا۔ اب جس سے بات نہ کرو وہ برا منا جاتے ہیں۔ تو اب میں صرف کام کی بات کا جواب دیتا۔“

★ ”آپ گھر کے بڑے ہیں؟ میں بھی تھوڑی پرسنل ہو جاؤں؟“

❋ ”مجھ سے بڑے ایک بھائی ہیں اور بہن بھی مجھ سے بڑی ہیں' ماشاء اللہ سے دونوں شادی شدہ ہیں اور اب میری باری ہے اور کوئی ایسی حسینہ ٹکرا جائے جس سے مل کر نعیم کو محبت ہو جائے اور بس....“ قہقہہ....

★ ”مزاج کے کیسے ہیں؟“

❋ ”میں مکس موڈ کا مالک ہوں۔ میرے دوست کہتے ہیں تم ایک پاگل پرسنلٹی کے مالک ہو پل میں کیا ہوتے ہو اور دوسرے پل میں کیا ہوتے ہو۔ ویسے میں بہت زیادہ پیار کرنے والا انسان ہوں۔ بچے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور وہ لوگ جن سے مل کر مجھے اچھا لگتا ہے خواہ وہ کسی بھی عمر کے ہوں مجھے اچھے لگتے ہیں کم عمر انسان اگر عقل مندی کی بات کر رہے ہوتے ہیں تو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور ان میں سے میں نے بہت کچھ سیکھا' اپنے حاسدین سے بھی سیکھا' میرے حاسدین مجھے بہت خوش کرتے ہیں کہ واقعی مجھ میں کوئی کوالٹی ہے جو انہیں ”ان سیکور“ کرتی ہے۔“

★ ”فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں اور کیا کیا شوق ہیں آپ کے؟“

❋ ”کھانے پینے کا بہت شوقین ہوں میں.... چائنیز بہت پسند ہیں۔ دیسی میں چرغہ وغیرہ پسند ہیں اور فارغ اوقات اگر میسر آجائیں تو بہت اچھی بات ہے اور دسمبر میرا پسندیدہ مہینہ ہے اس کی شامیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں باقی میرا لیپ ٹاپ میرا دوست میرا ساتھی ہے۔ شعروشاعری سے بہت لگاؤ ہے۔ شام کو کبھی وقت مل جائے تو اپنی شاعری کو تھوڑا سا ٹائم دے دیتا ہوں۔“

چلیں جی بہت شکریہ ٹائم دینے کا۔

✡ ✡

سیدہ لوبا سجاد

شاہین رشید

س "پورا نام' گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"

ج "سیدہ لوبا سجاد نام ہے۔ گھر والے لوبا ہی بلاتے ہیں۔ میرے نام کا مطلب "جنت کی حور" ہے۔"

س "کبھی آئینے نے آپ سے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟"

ج "کہا نہیں بس سوچا ہے کہ۔

سب کا ساتھ نبھانے والے
خود کیوں تنہا رہ جاتے ہیں؟

س "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

ج "میرا کردار' میری فیملی' میرے دوست اور سب سے بڑھ کر میرے رب کا ساتھ۔"

س "اپنی زندگی کے دشوار لمحے بیان کریں؟"

ج' بڑی مختصر داستاں ہے ہماری
کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں؟

"بہت سے لمحے دشوار تھے مگر اللہ کا شکر ہے اچھا وقت نہیں رہتا تو برا بھی نہیں رہا۔"

س "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

ج "محبت اگر خدا سے یا فیملی سے ہو تو صبح کا وہ پہلا ہوا کا جھونکا ہے جو روح تک تازگی بخش دے اور کسی سے مجھے تجربہ نہیں۔ میرا تو خیال ہے وقت کی بربادی ہے۔"

س "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا ہے؟"

ج "میں قبل از وقت منصوبہ نہیں بناتی۔"

س "پچھلے سال کی کامیابی؟"

ج "میں نے ایم۔ اے اردو کے کمبائنڈ پیپرز دیے اور فرسٹ چانس میں کلیئر ہو گئی یہ بہت خوشی اور مطمئن کرنے والی کامیابی تھی۔"

س "آپ اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

ج "اترا تھا لمحہ بھر کوئی دکھ شعور میں
روئے' چلے نہ بولے پر اعصاب تھک گئے"

س "آپ اپنے آپ کو بیان کریں؟"

ج

اچھی ہوں یا بری خود اپنے لیے ہوں
میں خود کو نہیں دیکھتی اوروں کی نظر سے

س "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑھے ہوئے ہیں؟"

ج "صرف خوف خدا۔۔۔"

س "آپ کی کمزوری' آپ کی طاقت؟"

ج "کمزوری' کمزور لوگ بناتے ہیں اور میری طاقت میرا خدا پر یقین ہے۔"

س "آپ کے نزدیک دولت؟"

ج "حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو جیسے جینے کے لیے کھانا ویسے رہنے کے لیے دولت کیونکہ مشہور کہاوت ہے "جب غربت دروازے سے اندر آتی ہے تو پیار کھڑکی سے نکل جاتا ہے۔"

س "آپ خوش گوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

ج "خاموشی سے' کیونکہ گنے چنے لمحات ہیں۔ ویسے کوئی خاص نہیں گزارتی بس عام سے طریقے سے۔"

س "گھر آپ کی نظر میں؟"

ج "جائے پناہ۔۔۔"

س "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

ج "معاف کر دیتی ہوں فوراً" مگر بھولتی نہیں۔ بدلہ

اس لیے نہیں لیتی کہ معافی سب سے بڑا انتقام ہے اور اللہ برا کرنے والوں کو اس کا بدلہ بھی دیتا ہے اس لیے میں آسانی سے معاف کر دیتی ہوں۔"

س "کامیابی کیا ہے آپ کی نظر میں؟"

ج "اللہ کا امتحان۔ کیونکہ انسان کامیابی کے بعد خدا سے لاپروا ہو تا جاتا ہے۔"

س "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا یا واقعی یہ ترقی ہے؟"

ج: ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

س "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

ج "خواہش تو عام سی ہے کہ جب میں مروں تو جنت البقیع میں دفن ہوں۔ہاں خواب عجیب ہے وہ یہ کہ میں دیدار حضرت یوسف کروں اور میری پہچان صرف میرے اپنے نام سے ہو کسی اور کے نہیں۔"

س "برکھا رت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

ج "دور سے دیکھ کر' چائے اور پکوڑے سے لطف اٹھا کر۔ بارش میں نہانا اچھا نہیں لگتا یوں لگتا ہے کوئی پتھر برسا رہا ہو مجھ پر۔"

س "آپ جو ہیں نہ ہوتی تو کیا ہوتیں؟"

ج "اللہ کا شکر ہے کہ جیسی ہوں ویسی ٹھیک ہوں خدا بہتر بنانے والا ہے۔"

س "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب.....؟"

ج "اپنی نانی امی سے گپ شپ لگا کر۔"

س "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

ج "یہ سچویشن پر منحصر ہے۔"

س "متاثر کن کتاب' مصنف اور مووی؟"

ج "کتاب فضائل آل محمد' مصنف بہت سے ہیں ہر اچھا لکھنے والا پسند ہے اور موویز میں نہیں دیکھتی تو کوئی پسند نہیں۔"

س "آپ کا غرور؟"

ج "غرور و تکبر سے دور ہوں' شکر اللہ کا۔"

س "کیا آپ نے [illegible] پالیا؟"

ج "میں نے کھویا بہت ہے پایا کم (یا شاید مجھ سے چھینا گیا بہت کچھ) اس لیے کچھ خاص پانے کی آرزو نہیں ہے۔"

س "اپنی ایک خوبی اور ایک خامی بتائیں؟"

ج "خوبی یہ ہے کہ بہت مخلص ہوں اور خامی یہ ہے کہ جو لوگ دھوکا دیتے ہیں ان پر دوبارہ بھی اعتبار کر لیتی ہوں۔"

س "مطالعہ آپ کی نظر میں؟"

ج "تنہائی کا بہترین ساتھی۔ معلومات میں اضافے کا سبب۔"

س "کوئی شخصیت یا کسی کی کامیابی جس نے حسد میں مبتلا کیا ہو؟"

ج "حسد نہیں کرتی کیونکہ کسی میں خوبی ہو تو وہ ظاہر ہے کامیابی بھی حاصل کرے گا۔"

س "پسندیدہ شخصیت؟"

ج "کسی نبی یا امام کا نہیں کہوں گی کیونکہ وہ یقیناً سب کی ہیں۔ مجھے میرے نانا ابو کی شخصیت پسند ہے۔ کیونکہ عام انسان تو عام انسان کو کاپی کر سکتے ہیں۔"

س "ہمارا پورا پاکستان خوب صورت ہے۔ آپ کو کون سا خاص مقام پسند ہے؟"

ج "سکون اپنے شہر میں آتا ہے ویسے اسلام آباد خوب صورت ہے خاص کر راستے میں آنے والے کلر کہار کے پہاڑ بہت حسین ہیں۔"

س "مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟"

ج "مقابلے بازی پسند نہیں ہے کسی کے لیے اتنا ہی کافی ہو جاتا ہے کہ وہ مقابلہ کرنے کی کوشش کرے تو میں توجہ ہی نہیں دیتی۔"

س "آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے؟"

ج "امتحان گاہ ہے زندگی' آگ کا دریا ہے' نہ حل ہونے والی پہیلی ہے یا روہی لگتا ہے۔ جو ڈوبتا نہیں' جو تھکتا نہیں اور ہار نہیں مانتا۔"

☼ ☼

شادی مبارک ہو

عائشہ مغل ہمراہ ظہیر اعظم

روبینہ حیات مغل

جب میں شادیوں کے احوال پڑھتی تھی تو میری بھی یہ خواہش ہوتی تھی کہ میں بھی اپنے کسی کی شادی کا احوال لکھوں اور یہ خواہش جب پوری ہوئی جب میری پیاری بہن کی شادی کی تاریخ طے ہوئی۔ میری بہن عائشہ ماشاءاللہ حافظ قرآن بھی ہے اور ہم سات بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے ہماری لاڈلی بھی ہے۔ امی جان کے انتقال کے وقت وہ محض آٹھ سال کی معصوم سی بچی تھی جسے یوں تو ہم بہن بھائیوں نے بہت لاڈوں سے پالا مگر یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ ماں کی کمی کوئی نہیں پوری کر سکتا۔ شادی سے ڈیڑھ ماہ پہلے تاریخ کیا طے پائی ہم بہنوں کو وقت بے وقت رونے کا گویا لائسنس ہی مل گیا۔ یہ ڈیڑھ ماہ رونے دھونے اور بازاروں میں اپنا رنگ روپ جلاتے کیسے گزرا کچھ پتا نہ چلا اور 2 اپریل 2012 کا مبارک دن آپہنچا جب ہم سب کی لاڈلی نے مایوں بیٹھنا تھا۔ ہم تینوں بہنوں نے مل کر اپنے ابو کے آنگن کو سجایا میرے میاں جانی اور میں نے مل کر ساری چھت پر لائٹنگ بھی کی۔ مایوں مہندی کی رسم چونکہ ایک دن ہی تھی اس کے لیے ہم نے اپنے بابل کے گھر کے سامنے ڈیکوریشن کروائی۔

ہری اور پیلی ڈیکوریشن نے مہندی کی تقریب میں چار چاند لگادیے اور جو کمی رہ گئی تھی اس حسن میں وہ ہم چاروں بہنوں کی آمد نے پوری کردی۔ مہندی کی مناسبت سے میں نے ڈارک گرین کلر کا لہنگا اپنایا اور

پھولوں کے زیور کے ساتھ جب میں پارلر سے الڑمیار بن کر آئی تو سب نے ہی بے حد تعریف کی۔ مہندی کی تقریب میں دلہا والوں نے بھی بھرپور شرکت کی۔ سیما آنٹی عائشہ کی ساس نے بری کی ایک ایک چیز انتہائی محبت سے بنائی تھی۔ شان دار سی بری کی ہر ایک نے تعریف کی اور میں بس دل سے دعا کرتی رہی کہ میری بہن کو یہ سب برتنا نصیب ہو۔ عائشہ کی سہیلیوں نے خوب سر بکھیرے اور ہم اپنی بے وقت بیٹھی آواز کا رونا روتے رہے۔ ایک خوشگوار یادیں دے کر یہ بن اختتام پذیر ہوا۔

بارات چونکہ 10 اپریل کی تھی تو بیچ کے دنوں میں دلہا کے گھر جہیز پہنچایا گیا جس دن فرنیچر لے کر گئے ہم لوگ 3 گھنٹے ٹریفک جام میں پھنسے رہے اور یہ لمحات بھی یادگار بن گئے مگر غصہ دلانے والی یادیں۔

بارات والے دن جب عائشہ پارلر جانے کے لیے نکلی تو ہم نے قرآن کے سائے میں گھر سے رخصت کیا اور خوب رونا دھونا بھی ہوا۔ ہم تینوں بہنیں بھی وہیں سے تیار ہوئیں جہاں سے عائشہ تیار ہوئی۔ شادی کے سرخ جوڑے میں میری بہن حسین شہزادی لگ رہی تھی اور مجھے اس کے بچپن کی ایک ایک یاد آ رہی تھی مگر میں نے خود کو رونے سے باز رکھا۔ بڑی بہن ہونے اور امی جان کے نہ ہونے کی وجہ سے میری چاروں بہنیں مجھے ہی فالو کرتی ہیں سو دل بوجھل ہونے کے باوجود میں نے خود پر کنٹرول رکھا۔

بارات کی آمد شاندار طریقے سے ہوئی دلہا کے بھائیوں کے رقص نے سب کو خوب محظوظ کیا۔ میں نے اور عائشہ کی دوست صابرہ نے دلہا کو گاڑی میں ہی گھیر لیا اور بھتہ گروپ کی طرح پورے 5 ہزار لے کر جان چھوڑی۔ دولہا میاں بھی سفید اور سرخ شیروانی میں بے حد ہینڈسم لگ رہے تھے۔ میرے بہنوئی ظہیر اعظم پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہیں۔ نکاح چونکہ پہلے ہو چکا تھا لہٰذا دولہا میاں کو بنا انتظار کرائے دلہن کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ سب نے ہی اس پیاری جوڑی کی خوب تعریف کی۔

دولہا صاحب نے کبھی نہیں سوچا ہو گا کہ انہیں 5 ہزار کا دودھ کا گلاس پینا پڑے گا جی ہاں میری بہن

افشاں نے دودھ پلائی کی رسم کی۔ رسم ادا کی۔ یہ رسم بہت دلچسپ تھی ہم نے ایک فیڈر اور ایک گلاس رکھا تھا۔ دونوں چیزوں پر قیمت کے ٹیگ تھے۔ گلاس 5 ہزار اور فیڈر 3 ہزار کا اور ہماری سوچ کے عین مطابق دلہا میاں نے گلاس کو ہی ترجیح دی کیوں کہ اب جو دلہن لینے آئے تھے وہ فیڈر تو پینے سے رہے۔ مزے دار سے کھانے کے بعد وہ مرحلہ آیا جو عائشہ کی پیدائش کے ساتھ ہی ہمارے دل کو دکھی کر دیتا تھا۔ ہم سب نے رونے کے ریکارڈ توڑ دیے ابو جی بھی بہت روئے ان کی دکھ سکھ کی ساتھی جو جا رہی تھی۔ امی کے انتقال کے بعد عائشہ ہی ابو کے ساتھ زیادہ رہی تھی پھر کشمیریوں کے دستور کے مطابق ہم ڈولی چھوڑنے بھی گئے اگرچہ ڈولی کی جگہ گاڑی تھی مگر ہم نے اپنی رسم نبھائی۔

ولیمہ کا انتظام بہترین شادی ہال میں کیا گیا تھا۔ ہال کی ڈیکوریشن زبردست تھی اور ان سب سے بھی زیادہ حسین تھی میری بہن اور بہنوئی کی جوڑی جس کی آج بھی خوب تعریف ہو رہی تھی۔ میری شہزادی کا مسرت چہرہ اس کی دل کی خوشی ظاہر کر رہا تھا۔ آج بھی کھانا بہت مزے دار تھا خاص طور پر تکہ کڑاہی۔ ہم سب نے اس شادی کو خوب انجوائے کیا مگر ایک کمی جو پوری شادی میں رہی وہ میری بہن غزالہ جو کہ دبئی میں مقیم ہے اور میرے بھائی شکیل کی جو کہ لندن میں مقیم ہے اور اپنی مجبوریوں کے باعث شریک نہ ہو سکے۔ آخر میں میری دعا ہے کہ میری بہن اپنے دلہا میاں کے سنگ صدا ہنستی بستی رہے۔

☼ ☼
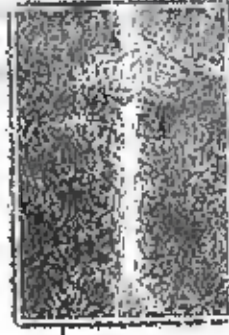
آسیہ مرزا

عباد گیلانی بلڈ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی بیوی مومنہ کو چھوڑ کر اپنے بیٹے حازم کو اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسری شادی عاظمہ سے کرلیتا ہے۔ حازم اپنی سوتیلی ماں عاظمہ اور بھائی بابر کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہا ہوتا ہے مگر اپنے باپ عباد گیلانی کی بیماری کی وجہ سے فکر مند رہتا ہے جبکہ عاظمہ اور بابر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔

حوریہ مومنہ کی بھتیجی اپنی پھوپھو اور اپنی دوست فضا سے بہت محبت کرتی ہے۔ فضا کی ایک امیر زادے سے دوستی ہے اور وہ گھر والوں سے چھپ کر ملتی رہتی ہے۔ حوریہ کو اس بات سے اختلاف ہے' وہ فضا کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ اس راستے پر نہ چلے۔

عباد گیلانی جب موت کو اپنے قریب دیکھتا ہے تو مومنہ کے باپ یاور علی کو بلاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے۔ حازم کو خاص طور سے اس کے نانا یاور علی سے ملواتا ہے مگر حازم اپنے نانا سے مل کر اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کرتا۔

(اب آگے پڑھیے)

دوسری قسط

ایک خوش فہمی سی تھی کہ خون' خون کو دیکھ کر جوش مارے گا' مگر چند لمحے' بے مہری خاموشی اور اس کی جانب سے بے اعتنائی کے ساتھ گزر گئے تو انہیں اپنے اس خیال پر ہنسی آ گئی۔ یقیناً" صحرا ہی سراب میں مبتلا نہیں کرتا آدمی کو.... بلکہ خیال کا ایک سراب بھی ہوتا ہے جو کسی لمحے بھی کسی بھی وقت آدمی کو جکڑ لیتا ہے۔ اور وہ بھی اس کی اٹھنے والی نگاہوں سے اس سراب میں مبتلا ہو گئے تھے جسے خوش فہمی بھی کہا جا سکتا ہے۔

یقیناً" وہ خالی سیپ سے گہر محبت کی طلب کر رہے تھے جبکہ وہ اپنائیت اور محبت اس کے دل میں ڈالی ہی نہ گئی تھی' اس کا ذائقہ اس کے دل کے لبوں پر اتارا ہی نہ گیا تھا۔

اس نے بڑی بے فیض نگاہوں سے یاور علی کو دیکھا تھا جبکہ یاور علی کی خاموشی منتظر نگاہیں' اس کے اندر ایک بار پھر اپنی محبت کی کسی کونپل کی مہک کو ڈھونڈنے لگیں۔

"میرا خیال ہے آپ لوگ اپنی باتیں کریں میں پھر آؤں گا۔"

وہ یک دم نظریں باپ کے چہرے پر جماتے ہوئے بظاہر نرم سے لہجے میں بولا' مگر اس میں بلا کی سرد مہری رچی ہوئی تھی۔

یقیناً" اس کے ذہن کے گوشے میں کہیں بھی نانا سے ملاقات کا تصور نہیں تھا بلکہ "نانا" کا ہی تصور نہ تھا۔

"حازم۔" عباد گیلانی نے مضطرب ہو کر اسے پکارا' مگر وہ دروازہ کھول کر ان کی اس پکار کو سنی ان سنی کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

محبوب سے ملاقات کا نشہ ابھی تک اس کی آنکھوں میں چڑھا ہوا تھا بلکہ اس ملاقات سے زیادہ اس شاپنگ کا' جو آج اس نے اس کے ہمراہ کی تھی۔ انسان کی فطرت بھی عجیب ہی ہے وہ صرف محبت سے نہیں بہلنا چاہتا۔ اس کے پیش نظر اس کی مادی خواہشات کا ایک نہ ختم ہونے والا آسمان ہوتا ہے جس میں اڑے بغیر اسے چین نہیں آتا۔ خصوصاً" اسی وقت جب خواہشات کو پر مل جائیں اور پھر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے' کبھی واپسی کا ہی راستہ بھول جاتا ہے۔

وہ اپنے تئیں اس چھوٹے سے تین کمروں کے گھر میں اپنی یہ شاپنگز چھپائے ہوئے تھی' مگر یہ محض اس کی کم فہمی تھی۔ جہاں آرا بھی قیامت کی نظر رکھتی تھیں۔ وہ کم فہم تھی تو کیا ہوا جہاں آرا تو جہاں دیدہ تھیں۔

"کہاں سے آ رہی ہو مہک ہی مہک اٹھ رہی ہے۔" وہ کالج بیگ احتیاط سے ایک طرف رکھ رہی تھی کہ جہاں آرا خاتون یعنی اس کی سوتیلی ماں اس کے پیچھے داخل ہوئیں۔

وہ ان کی اس غیر متوقع آمد پر سٹپٹا گئی۔

"ک.... کالج سے۔"

"اس وقت۔"

"روز ہی اسی وقت آتی ہوں۔ اب کچھ نیا ہو گیا کیا۔"

دوسرے پل وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ چادر اتار کر مسہری پر ڈالی۔ لمبی سی چوٹی کو سہلاتے ہوئے پیچھے کیا اور مسہری پر بیٹھ کر پیر سے چپلیں یوں کھینچنے لگی جیسے یہ چپلیں نہ ہوں جہاں آرا ہو جو اس کے وجود سے چمٹ کر رہ گئی تھیں۔

"تمہارے ابا تمہیں یاد فرما رہے ہیں' کپڑے بدل کر باہر آ جاؤ' ان کے لیے کھانا لگا رہی ہوں تم بھی ساتھ ہی کھا لو۔"

یہ احسان کرتی ہوئیں وہ اس پر ایک گہری جانچتی نظر ڈال کر اس کے اسٹور نما کمرے سے نکل گئیں۔ وہ گھڑی بھر وم سادھے رہ گئی۔

"ابا۔ اور اس وقت، مگر وہ تو شام میں آتے ہیں دکان سے، دوپہر کو تو کبھی نہیں آئے۔ خدایا رحم کر۔" اس کے اندر کا چور اس کے دل میں دھکڑ پھکڑ مچانے لگا۔

جہاں آرا خاتون کے تیور بھی کچھ جتانے والے لگ رہے تھے۔ اس نے تو کپڑے بھی نہ بدلے گئے بس منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر باہر آگئی۔ وہ اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حسب عادت اسے دیکھ کر ابا کی پیشانی سلوٹ زدہ ہوگئی۔ چہرے پر بلا کی کرختگی اتر آئی۔

"سلام ابا۔" وہ دسترخوان پر بیٹھنے کے بجائے کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔

"والسلام۔" جواب کھینچ کر آیا۔

"ندیم نظر نہیں آرہا۔" وہ سوتیلے بھائی کا پوچھنے لگی۔

"دکان پر اسے ہی بٹھا کر آیا ہوں۔ سر میں درد تھا سو اس وقت آگیا۔ کبھی آتا ہوں اس وقت.....؟" وہ کھنچے کھنچے انداز میں جواب دے رہے تھے۔

"کھانا نہیں کھاؤ گی کیا۔" جہاں آرا نے باورچی خانے کی جالی سے اسے ٹوکا۔

"آکر بیٹھ جاؤ انسانوں کی طرح۔ اب دسترلگا ہوا ہے تو ساتھ بیٹھ کر دو نوالے ہی کھالو۔ روز تو اکیلے، کمرا بند کیے کھانا پینا ہوتا ہے ہم میں بیٹھنے کی فرصت نہیں ملتی تمہیں۔ نت نئی سہیلیاں بنا رکھی ہیں اُن کے دیے تحفوں میں بس گم رہتی ہو۔ اب آج باپ آیا ہے تو دو گھڑی باپ کے پاس ٹک کر بیٹھ جاؤ۔ میرے ساتھ تو بیٹھا نہیں جاتا تم سے۔"

جہاں آرا جو شروع ہوئیں تو بس اس کا دل چاہا دستر پر رکھا اسٹیل کا گلاس اٹھا کر یہیں سے اس عورت پر کھینچ مارے۔ ابا کے سامنے اسے نیچا دکھانے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتی تھی۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں، ایسی کون سی سہیلیاں مل گئی ہیں تمہیں جو اتنے مہنگے مہنگے تحائف دیتی رہتی ہیں۔" ابا پانی کا گلاس منہ سے ہٹا کر اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے بولے۔

"ارے نہیں ابا۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے یہ اماں بھی نا بس۔ انہیں ہر سستی چیز بھی بہت مہنگی لگتی ہے۔" وہ یک دم نبرد آزمائی کی قوت کھینچ لائی اور کرسی اتر کر دستر پر بیٹھ گئی۔

"دوستوں میں چلتا رہتا ہے گفٹس وفٹس۔ دینا لینا تو ابا۔" وہ ہنس دی۔

"یہاں تو صرف لینا لینا ہی دکھ رہا ہے۔ کل تم نے جو جوتی پہنی تھی خیر سے ہزار روپے سے اوپر ہی کی ہوگی۔"

جہاں آرا نے روٹی کے تھال اٹھائے باورچی خانے سے باہر آگئیں۔ بیوی کی بات پر ابا کھوجتی نظروں سے بیٹی کو دیکھا نوالہ ذرا سا حلق میں اٹکا تھا دوسرے پل منہ زور زور سے چلانے لگے۔

"بڑی بڑی شیشوں والی دکانوں میں ایسی جوتیاں دیکھی ہیں میں نے۔"

"اب تو ہر مہنگے اور برانڈز چیز کا جعلی مارکیٹ میں آگیا ہے، آپ کو دیکھنے میں مہنگے لگتے ہیں، مگر ہوتے سستے ہیں یہ بھی نمبر دو جوتی تھی۔"

اس نے کمال خوب صورتی سے بات سنبھال لی۔ جہاں آرا اسے بس دیکھتی رہ گئیں کم تو سوتیلی یہ بیٹی بھی نہ تھی۔

"چار سو بیس کہیں کی۔" دل میں وہ بھی برا بھلا کہہ کر رہ گئیں۔

"دیکھ رہا ہوں تم کالج سے آکر سارا دن کمرے میں بند پڑی رہتی ہو جہاں آرا اکیلے سارے گھر کے کام کرتی

رہتی ہے' ہاتھ پیر چلالیا کرو تم بھی۔ ورنہ یہ پڑھائی ختم کرادوں گا۔"
ابا دستر سے اٹھتے ہوئے اسے جھاڑ گئے۔ اس نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ جہاں آرا جس طرح اسے آج گھیرنے کے موڈ میں تھیں وہ اچھی طرح جانتی تھی۔
"کھانا تو کھالو۔ کہاں چلی۔" ابا کے جاتے ہی اسے بھی دستر سے اٹھتے دیکھ کر انہوں نے گرم گرم چپاتیوں کو ململ کے کپڑے میں لپیٹتے ہوئے اسے پکارا۔
"آپ کھالیں۔ میں نے کالج میں برگر کھالیا تھا۔" وہ اپنے اسٹور نما کمرے میں جاکر بند ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

عباد گیلانی نے ایک خفیف سی شرمندگی کے ساتھ تکیے سے سر ٹکاتے ہوئے یاور علی کی طرف دیکھا۔ ماحول پر بے عنوان سا اضمحلال چھا گیا تھا۔
"دراصل وہ شروع ہی سے ایسا ہے اجنبی لوگوں سے ملتے ہوئے گھبراتا ہے۔" ان کے لہجے میں وضاحت بھی تھی اور دفاع بھی۔
"میں اجنبی تو نہیں تھا۔" یاور علی نڈھال سے کرسی پر بیٹھ گئے۔
"خونی رشتوں میں ہزار فاصلے ہوں' مگر اجنبیت نہیں ہوتی۔ ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ یہ فاصلوں سے ٹوٹ تو نہیں جاتے' ٹوٹتے اس وقت ہیں' غیر اہم اس وقت ہو جاتے ہیں جب انہیں اہمیت نہ دی جائے' ان کو غیر اہم سمجھا گیا ہو' بصورت دیگر سمجھایا گیا ہو۔ ان کی اہمیت کو ذہن نشین نہ کرایا گیا ہو۔" یاور علی کے لبوں پر بے اختیار شکوہ آگیا تھا۔ دل بری طرح ٹوٹا تھا دھواں تو نکلنا تھا۔
"مگر تم ان باتوں کو کیا سمجھو گے عباد۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہ کر آدمی کی سوچ بہت چھوٹی ہو جاتی ہے اس کے قد کی طرح۔ اتنا پست قد دکھائی دے تو رشتوں کا وجود کہاں رہ جاتا ہے۔" پھر خود کلامی سے انداز میں بولے۔
"مسئلہ یہ ہے کہ رشتہ غیر مادی حقیقت ہے اس کا مادیت سے کوئی تعلق نہیں۔"
عباد گیلانی نے ایک پل آنکھیں میچ لیں۔ اس کے ذہن کی رو ایک بار پھر حازم کی طرف بہنے لگی۔ جس طرح حازم اس پر ایک سرد سی نظر ڈال کر گیا تھا اس کے دل میں یخ بستگی سی پھیل رہی تھی' ہر سانس سینے میں اٹکتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے یوں تو اس کی طرف سے ایسی ہی حیرانگی کی امید تھی' مگر اس نے محسوس کیا تھا کہ اس نظر میں فقط حیرت نہیں تھی ایک یخ بستگی تھی اور اس یخ بستگی اور سکوت میں سلگتا الاؤ دہک رہا تھا۔
اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے اس ساری حقیقت کو بے نقاب کرنا ہوگا جسے وہ بے نقاب کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ سارے سچ کھولنے پڑیں گے جو اس کے دل کی قبر میں دفن تھے۔
آہ... قبر کو کھودنا آسان تو نہیں ہوتا' اب دفناتے ہوئے سچ کا چہرہ دیکھنا اور دکھانا تھا اسے.....

☼ ☼ ☼

حازم اسپتال سے سیدھا گیلانی ہاؤس چلا آیا۔ اس کا ذہن بری طرح منتشر تھا۔ وہ گلاس ڈور دھکیل کر سیدھا اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ اس کا بیڈ روم کا سیاہ نقشی والا دروازہ بے آواز کھل کر پھر اسی انداز میں اپنی فریم میں فٹ ہو گیا۔ عباد گیلانی اور اس کوٹھی کا پرانا ملازم امیر علی اس کے تیور دیکھ کر گھبرا کر تیزی سے حازم کی طرف بڑھا۔ اس کا دل عباد گیلانی کی طرف ہی گیا تھا اور انجانے اندیشوں سے لرز گیا۔
اس نے گولڈن رنگ کے خوب صورت لاک کو گھمایا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔
"حازم صاحب!" اس نے دروازہ ہلکے سے بجایا۔

"کیا بات ہے امیر علی۔" بابر پرفیوم سے مہکتا ادھر سے گزرا اور امیر علی کو حازم کا دروازے کے باہر حیران پریشان کھڑے دیکھ کر رک گیا۔

"کیا مسئلہ ہے؟؟"

"وہ جی۔ حازم صاحب آتے ہی کمرے میں بند ہو گئے ہیں دروازہ لاک کر دیا ہے۔"

"لاک کر دیا ہے۔ کیوں؟" وہ حازم کے دروازے کے ہینڈل کو گھمانے لگا پھر کچھ سوچ کر جیب سے اپنا موبائل نکال کر حازم کے نمبر پش کرنے لگا۔ دو چار بیپ کے بعد اس کے موبائل پر حازم کی آواز ابھری۔ بابر جلدی سے بولا۔

"کیا بات ہے حازم۔ پاپا تو ٹھیک ہیں آئی مین (میرا مطلب ہے) تم نے اس طرح دروازہ لاک کیوں کیا ہوا ہے۔"

"میں تھک گیا ہوں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ ہاں پاپا ٹھیک ہیں۔" اس نے مختصر جواب دے کر لائن کاٹ دی۔

بابر نے موبائل کو گھورا پھر امیر علی کی طرف نظر ڈال کے کندھے اچکائے اور سٹی بجاتا داخلی دروازے کی جانب چل دیا۔

امیر علی اس ماں بیٹے کی اس بے مروتی پر اکثر دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اسے اپنے صاحب عباد گیلانی سے جنت محبت تھی اور حازم سے وہ بے انتہا پیار کرتا تھا وہ اس کی نظروں کے سامنے بڑا ہوا تھا۔ رات دیر تک باغیچے کی ٹھنڈی گھاس پر چہل قدمی کرتے ہوئے وہ خود کو کسی حد تک سنبھال چکا تھا۔ امیر علی اسے بلیک کافی دیتے ہوئے عباد گیلانی کی خیریت پوچھنے لگا۔

"ہوں۔ بس تم دعا کیا کرو امیر علی۔" حازم نے ایک افسردہ سانس کھینچتے ہوئے جواب دیا۔

"دعا تو ہر لمحہ ہر آن لبوں سے نکلتی ہے ان کے لیے 'یہی تو واحد سہارا ہے اور دعا ہی تو ہر مومن کا ہتھیار ہے جی۔" امیر علی کی آواز بھرا گئی۔ اس نے کافی کے سپ لیتے ہوئے ابرو کو ہلکی سی جنبش سے اٹھاتے ہوئے امیر علی کو دیکھا۔

"تم پاپا کے لیے کیا دعا مانگتے ہو' میرا مطلب ہے کس طریقے سے مانگتے ہو۔"

"بس جی۔ اسی انداز سے جو بچپن سے مانگتے آئے ہیں۔ دعا تو بس دعا ہوتی ہے۔" امیر علی سوال پر تھوڑا الجھا تھا اسے یہ سوال کچھ عجیب سا لگا۔

"میرا مطلب ہے تم عربی میں پڑھتے ہو یا اپنی ہی زبان میں مانگتے ہو۔" وہ مگ رکھ کر سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"اپنی ہی زبان میں مانگ لیتا ہوں جی۔ سننا تو اسی ایک ذات نے ہے' کسی بھی زبان میں مانگ لو' اس کے لیے سمجھنا کون سا مشکل ہے' وہ تو اپنے بندے کے دل کا حال' اس کی نیت دیکھتا ہے جی' زبان سے اسے کیا لینا دینا۔" امیر علی کسی فلسفی کی طرح بولا۔

"ہوں۔" حازم لائٹر سے سگریٹ کی ٹوپ پر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے ایک ہلکی سی سانس بھر کر رہ گیا۔ امیر علی کافی کا خالی مگ اور پانی کا گلاس ٹرے میں رکھ کر اندر بڑھنے لگا' مگر یک دم کچھ یاد آنے پر پھر رک گیا۔

"وہ صاحب۔۔۔ کسی یاور علی کا فون آیا تھا پر میں نے آپ کا دروازہ نہیں بجایا۔"

"کیا۔" اس کی ساری حسیات یک دم بے دار ہو گئیں۔ پھر یک دم لب بھینچ کر عجیب بھنچے بھنچے لہجے میں پوچھا۔

"کیا کہہ رہے تھے۔"

"کچھ نہیں۔ بس آپ کی خیریت پوچھ رہے تھے' میں نے کہا وہ سو رہے ہیں تو کہنے لگے سونے دو۔ پھر بہت سی

دعائیں دے کر فون رکھ دیا جی۔" امیر علی یہ کہہ کر اندر کی جانب چل دیا۔ حازم کے تصور میں وہ باریش نورانی چہرہ آگیا۔

"یہ تمہارے نانا ہیں۔" اسے اپنے باپ کے منہ سے نکلا ہوا یہ جملہ بڑا عجیب سا لگا تھا۔ اس رشتے کا تو تصور بھی نہ تھا'اس رشتے میں کیسی مٹھاس ہوتی ہے' کیسی رغبت ہوتی ہے وہ ناآشنا تھا۔ ہاں اس رشتے کے حوالے سے کڑواہٹ' تلخی اور زہر کی لہریں اس کی نس نس میں اترتی جارہی تھیں۔

ایک تلخ کہانی جو اس کی ماں سے منسوب تھی بس وہی اسے یاد تھی۔ اور اس کے ذائقے کی کڑواہٹ اس کے خون میں پھیلی ہوئی تھی' اس کہانی کا سب سے بدہیت اور مکروہ کردار ہی یاور علی تھا۔ اس کے باپ کی زندگی میں زہر گھولنے والوں کو وہ کیسے معاف کر سکتا تھا۔

وہ نفرت سے سر جھٹک کر سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگانے لگا۔

☆ ☆ ☆

کبھی خاموشی طویل ہو جائے تو وحشت ہونے لگتی ہے اور خاص کر ایسی خاموشی جو محض فرار کے لیے اوڑھی گئی ہو۔ مومنہ کو یقین تھا اباجی۔ (یاور علی) کی ایسی خاموشی کے پیچھے فرار تھا۔

"شکستگی کا عذاب موت سے زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے ایک بار مرنا آسان ہے اباجی۔ بار بار بکھرنے اور ٹوٹنے کا عمل ناقابل برداشت ہوتا ہے۔" وہ بالآخر کئی لمحوں کی جامد خاموشی کا سینہ چیرتے ہوئے بولی۔

"آپ کے گھر میں اٹھنے والے قدموں سے میں نے جان لیا تھا کہ آپ اپنے قدموں پر واپس نہیں آئے ہیں۔" وہ یاس بھرے انداز میں ہنس دی۔ دراصل لاشعوری طور پر تو وہ خود بھی ایک ایسی ہی امید کے سہارے لیے گن رہی تھی۔ دھچکا تو اسے بھی لگا تھا۔ یاور علی نے متورم آنکھیں بامشکل اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر کھڑکی کی طرف چہرہ موڑتے ہوئے بولا۔

"اسی تکلیف اور اذیت کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ میری طرح کون بکھر بکھر کر جڑا ہوگا اور جڑ جڑ کر بکھرا ہوگا۔"

مومنہ ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ کچھ کہنے کی خواہش مچل کر اندر ہی دم توڑ گئی جیسے کوئی بپھری ہوئی موج سطح سمندر پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ جائے۔ وہ فقط متاسفانہ سی سانس بھر کر رہ گئی۔ یاور علی یک دم اپنے بکھرے خیالات کو سمیٹتے ہوئے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا سنہری چہرہ دھندلا رہا تھا۔

"نہیں مومنہ۔ جو تم سوچ سمجھ رہی ہو ویسا کچھ نہیں ہے میں دراصل عباد کو دیکھ کر بہت زیادہ دکھی ہو گیا ہوں۔ حازم سے تو میری ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔ وہ ڈاکٹرز سے کچھ میٹنگز میں مصروف تھا۔" وہ جلد سے بولے۔ مومنہ بہت غور سے باپ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ عباد گیلانی کے نام پر ایک مانوس سی اذیت دل کو چھو گئی۔

"ملاقات ہو بھی جاتی تو اسے کون سا آپ کے ساتھ آجانا تھا۔" وہ چائے کے خالی برتن سمیٹنے لگی۔ اس کا انداز خود کلامی سا تھا۔

"تم پوچھو گی نہیں کہ عباد نے مجھے کیوں بلایا تھا۔" یاور علی بولے۔ وہ ٹرے اٹھاتے اٹھاتے پھر بیٹھ گئی اور مبہم سے انداز میں مسکرا دی۔

"نہیں۔ اس لیے کہ میں جانتی ہوں موت کی آہٹیں سننے والے انسان کی کیا تمنا ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے اسے اپنے کردہ ناکردہ خطاؤں کی آپ سے معافی مانگنی ہو اور شاید اس طرح وہ آخرت بھی کمالینا چاہتا ہوگا۔"

"تو کیا مجھے اسے معاف نہیں کرنا چاہیے۔" یاور علی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ تو ہر انسان کا اپنا ظرف ہے' میں آپ کی کسی نیکی کے درمیان کیسے آسکتی ہوں۔" وہ بے تاثر لہجے میں کہہ کر اٹھ گئی۔

"ہاں۔ وہ مجھ سے معافی کا طلب گار تھا۔" مومنہ طنز سے ہنسی۔

"اور آپ نے اسے معاف کردیا ہوگا۔"

"ہاں صورت حال ہی کچھ ایسی تھی۔" یاور علی ایک گہری سانس کھینچ کر اسے کمرے سے جاتا دیکھتے رہے وہ نئے سرے سے اسی تکلیف اور درد سے گزر رہی تھی وہ اچھی طرح جانتے تھے' مگر عباد کے پاس جانا ان کی مجبوری تھی۔

☼ ☼ ☼

حوریہ کالج جانے سے پہلے یاور علی کے پورشن میں آکر مومنہ کے کمرے تک آئی' مگر کمرہ بند ملا۔ اندر سے انہوں نے لاک لگایا ہوا تھا۔ رات بھی وہ دوبار چکر لگا چکی تھی' مگر کمرہ بند تھا اس نے یاور علی سے پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"ہوسکتا ہے طبیعت سست ہو۔ سو رہی ہو۔" حوریہ مایوس سی ہو کر لوٹ گئی' مگر صبح بھی کمرہ بند ملا تو اس کی تشویش بڑھ گئی۔

"ایسا تو کبھی نہیں ہوا امی کہ پھپھو یوں رات سے کمرہ بند کیے پڑی ہوں۔" وہ کالج بیگ میں جرنل ڈالتے ہوئے تشویش سے بولی۔

"طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی۔"

"تو دروازہ تو کھولیں' کیا اندر اس طرح اکیلے پڑے پڑے ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"اچھا میں پوچھتی ہوں تمہیں کالج دیر ہو رہی ہے تم جاؤ۔" امی نے اسے پچکارا۔

"میرا تو اس طرح کالج جانے کا دل نہیں کر رہا ہے۔"

"اوہ۔ ہوں۔ کالج نہیں جاؤ گی تو مومنہ خفا ہوگی' تم جاؤ۔ فکر مت کرو۔ کبھی کبھی وہ ایسا کرلیتی ہے اسے اس طرح تنہائی میں سکون ملتا ہے۔ ارے میں نے کہا نا میں جاتی ہوں اس کے پاس۔ تم کالج جاؤ۔" امی نے اسے تھپکا۔ وہ جانتی تھیں وہ مومنہ سے بے حد محبت کرتی تھی۔ اس کے ساتھ لگی رہتی تھی اور جتنی مومنہ میں اس کی جان تھی اتنی ہی مومنہ کی وہ بھی جان تھی۔

وہ بے دلی سے کالج چلی آئی' مگر یہاں فضا کو جدید تراش کے کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر اس کی جان ہی جل گئی گویا آج بھی وہ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے جانے والی تھی۔ خوب صورت لباس کے ساتھ ہلکی پھلکی میچنگ کی جیولری بھی پہنی تھی۔ اپنی کلائی میں پہنا ہوا بے حد قیمتی بریسلیٹ اس کے آگے لہرایا۔ صاف ستھری گداز گندمی کلائی میں بریسلیٹ جگمگ کر اپنی قیمت خود ہی بتا رہا تھا۔

"اچھا ہے اور مہنگا بھی' مگر بدلے میں اس نے تم سے کیا وصول کیا؟"

حوریہ کے لہجے میں توصیف نہیں تھی بلکہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ وہ دونوں باغیچے کے احاطے میں سیمنٹ کی بنی کیاری پر بیٹھ گئیں۔ اس کا دل پڑھائی لینے سے اچاٹ ہو گیا تھا اور فضا تنویر کا تو دل یوں بھی کالج آکر بھی پھر سے اپنے محبوب کے سنگ اڑ جانے کو مچلتا رہتا تھا۔

"زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے مجھ سے وہ کیا وصول کرے گا بھلا۔ اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے بھلا۔" وہ نظریں چرا کر گھاس کے تنکے سے کھیلنے لگی۔ حوریہ کو اس کی اس بناوٹی معصومیت پر چڑ کر غصہ آیا۔

"اتنی نا سمجھ تو تم بھی نہیں ہو۔" وہ اس کے سراپے کا از سر نو جائزہ لینے لگی۔
نیلے اور سفید کنٹراس کی قمیص حد سے زیادہ چست تھی۔ اس کے گداز بدن کا ایک ایک انگ نمایاں ہو رہا تھا جو کسی بھی ہوش مند کے ہوش اڑانے کو کافی تھا اور مقابل اگر فقط تن کا ہی خواہش مند ہو تو... اسے جانے کیوں جھرجھری سی آگئی اس نے نظریں سامنے درخت پر مرکوز کر دیں۔

"عورت پرفیوم کی بوتل کی طرح ہوتی ہے ڈھکن مضبوطی سے بند رہے تو مہکتی رہتی ہے جیسے ہی ڈھکن کھلا رہ گیا خوشبو اڑ جاتی ہے اور بوتل خالی ہو کر اپنی قیمت کھو دیتی ہے۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے فضا' بہت زیادہ ڈر۔" وہ کہنا چاہتی تھی' مگر فقط سوچ کر رہ گئی کہ فضا نے کون سی اس کی بات سن کر سمجھ لینی تھی۔ وہ تو اس اجنبی آشنا کی محبت میں تند لہروں میں کھلکھلاتی بہہ رہی تھی۔ سامنے منہ پھاڑے سمندر کی گہرائی سے بے نیاز کہ کبھی بھی کوئی تند لہر اسے ڈبو سکتی تھی۔

"مسئلہ یہ تھا کہ ابھی تمہارے ارد گرد اتنی روشنیاں رنگینیاں سجا دی گئی ہیں کہ تمہیں آگے پھیلا رسوائی کا اندھیرا دکھائی نہیں دے رہا' مگر خدا نہ کرے کہ تمہارے لیے یہ اندھیرا ہو' مگر....."

"تم اس سے ملی نہیں ہو نا۔ ایک بار مل لو۔ تمہاری رائے بدل جائے گی۔ آئی سویر۔ تمہیں بھی محبت ہو جائے گی پتا چل جائے گا اس آگ میں کیسا نشہ ہے۔"

"نشہ بہرحال کوئی اچھی چیز نہیں ہوتی۔" حوریہ اسے خواب ناک ماحول سے کھینچ لائی۔ فضا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"قسم سے تم بھی نا... خوش بھی نہیں ہونے دیتی ہو۔" فضا نے اسے شکوہ کناں نظروں سے گھورا۔

"یہ خوشی نہیں ہے بدمستی ہے اور بدمست انسان اپنے نفع نقصان کے احساس سے بے نیاز ہو جاتا ہے جو اچھی بات نہیں ہے۔"

"حوریہ آخر تم ایسا کیوں بولتی ہو۔ کیا مجھے محبت کرنے کا' محبت میں بدمست ہونے کا حق نہیں ہے۔" اس کا لہجہ سلگا سلگا سا تھا۔ وہ حقیقتاً "چڑ" گئی تھی۔

"یہ محبت نہیں ہے فضا۔ محبت کبھی چھپے ہوئے تنگ و تاریک راستوں پر سفر نہیں کرتی' ایسی ایسی تنگ و تاریک بند گلیوں جیسے راستوں پر فقط فریب ملتے ہیں دیدہ زیب دلکش فریب جو نفس کی نگا میں چھوڑ دینے والی اندھی لڑکیوں کو دکھائی نہیں دیتے۔ محض جسم کی خواہش میں لپٹی محبت سراسر رسوائی اور خوف ناک انجام ہے اسے کہو کہ اگر وہ محبت کا مطلب سمجھتا ہے تو تمہیں یوں سڑکوں' پارکوں میں لے کر نہ پھرے بلکہ محبت کا ثبوت دیتے ہوئے تمہارے ماں باپ سے بات کرے۔ تمہیں عزت سے بیاہ کر لے جائے۔" وہ رسان سے اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ جواباً" فضا نے اسے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

"تم مجھے یہ باور کیوں کراتی رہتی ہو کہ وہ محض فلرٹ کر رہا ہے' کس بنیاد پر تم یہ بات سوچتی اور کرتی ہو۔"

حوریہ نے ایک تاسف آمیز سانس بھری۔

"میں تمہاری خیر خواہ ہوں' بس میرا مقصد تمہیں تمہاری نسوانیت اور وقار کی اہمیت کا احساس دلانا تھا' تم اتنی ارزاں نہیں ہو فضا۔ چند مادی خواہشوں کے منہ زور لہروں کے آگے تنکے کی طرح نہ بہہ جانا۔ محبت کے نام وہ نہ کھو دینا جسے کھو کر پھر پا نہیں سکتے۔" فضا نے اس کی بات پر بھنچی بھنچی سانس کھینچی اور تلخی سے سر جھٹک کر بولی۔

"خوشیوں اور آسودگی پا لینے کا یہ راستہ اگر غلط ہے تو غلط ہی سہی۔ عزت نفس' پاکیزگی' وقار اونہہ۔" وہ تحقیر سے ہنسی۔

"میں اپنے ماحول سے حد درجہ بے زار اور تنگ آگئی ہوں حوریہ... غربت' افلاس' دکھ انہی مسائل دیکھ دیکھ کر

گھونٹ گھونٹ پی پی کر میں تھک چکی ہوں۔ ان محرومیوں نے میرے سوچنے کا طریقہ بدل ڈالا ہے۔"
"تم نہیں سمجھ سکتی حوریہ۔ چونکہ تم نے غربت' افلاس' تنگ دستی اور محرومی دیکھی نہیں ہے۔ ان کانٹوں کی اذیت محسوس نہیں کی۔ شرافت یا پاکیزگی کے اونچے مینارے پر کھڑے ہو کر وہ واہ ملتی نہیں ہے' محرومیاں ختم نہیں ہوتیں۔ ہم لوئر مڈل کلاس ہی رہیں گے۔ کچھ نہیں ملے گا اس شرافت کی اوڑھنی اوڑھے رکھنے سے بھی۔"
"تو کیا پستی میں اتر کر سب محرومیاں دور ہو جائیں گی۔ سارے مسائل ختم ہو جائیں گے۔"
"ہو سکتا ہے۔" وہ نظریں دور دیوار پر مرکوز کرتے ہوئے دھیمے بجھے لہجے میں بولی۔ پھر گھاس کے تنکے نوچ کر فضا میں اچھالتے ہوئے بولی۔
"میں تمہارے ان فلسفوں پر کان نہیں دھر سکتی بس اب اپنے لیے جینا چاہتی ہوں' میں بھی ایک عمدہ اور پر تعیش زندگی گزارنا چاہتی ہوں' گاڑی' بنگلہ اور خوب صورت شریک سفر۔ ان سب کی خواہش میرے اندر بھی ہے۔" حوریہ نے دیکھا اس کی آنکھوں کے کناروں پر ہلکی سرخی تیر رہی تھی اس سرخی کے عقب میں سلگتی خواہشوں کا دھواں تھا۔
"میرے لیے یہ صحرا پہ منڈلانے والا سیاہ گھنگھور بادل کی طرح ہے' میں اس سے منہ نہیں موڑ سکتی۔" اس کا لہجہ قطعی تھا۔ وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔
حوریہ نے اسے نہیں روکا۔ خود اس کا دل بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔ جیسے دل کے اندر بہت کچھ ٹوٹ سا گیا ہو۔ وہ اپنا بیگ اٹھا کر کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

فیصلوں کی ندامت سے
تکلیف وہ دکھ نہیں ہوتا
وقت کے دشت بے برگ میں
واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا

عباد گیلانی کی نظریں چھت پر مرکوز تھیں۔ وہ حازم کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز کر رہے تھے' وہ بہت چپ چپ سا تھا۔ ڈاکٹر زمان سے ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر ڈاکٹر کے جانے کے بعد کرسی دیوار سے لگا کر بیٹھ گیا۔
"ناراض ہو مجھ سے۔" دہکتی خاموشی کے یہ لمحے عذاب محسوس ہو رہے تھے۔ اس ہی اذیت سے گھبرا کر عباد گیلانی نے بیٹے کی طرف رخ موڑا اور پست آواز میں بولے۔
"یہ خیال کیونکر آیا آپ کو۔"
"تمہارے رویے سے۔"
"میرا رویہ۔ میرے رویے کو کیا ہوا ہے۔" وہ بے مقصد مسکرانے لگا' مگر اس کی آنکھیں اس کا چہرہ سرد سرد سی کیفیت میں رہا۔
"آنکھیں ہماری قلبی کیفیات سے مشروط ہوتی ہیں۔ تمہاری آنکھوں میں میرے لیے بہت خفگی ہے بے حد ناراضی ہے' ضروری نہیں تم مجھ سے بچوں کی طرح لڑ جھگڑ کر ہی یہ ناراضی ظاہر کرو۔" وہ افسردگی سے ہنس پڑے۔ حازم ان کی طرف دیکھنے لگا پھر ایک ہلکی سانس بھر کر اٹھ کر ان کے سرہانے آکر بیٹھ گیا۔
"آپ ڈاکٹر زمان کی بات مان کیوں نہیں لیتے UK میں آپ کا علاج بہت بہتر ہو گا کم از کم یہاں سے بہتر۔ یہاں تو کوئی پروگریس نہیں ہو رہی ہے۔"

"بات کو مت ٹالو حازم۔ یہ بتاؤ تمہیں میری کون سی بات بری لگی ہے۔" انہوں نے ذرا سا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ اپنے نحیف ہاتھ میں جکڑ لیا۔

"شاید تمہارے نانا کا تعارف تمہیں پسند نہیں آیا' مگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نظریں چرانے سے خواب نہیں ہو جاتیں۔"

"مگر وہ میرے لیے خواب ہی ہیں ڈراؤنا خواب۔ جسے میں دیکھنا نہیں چاہتا۔" وہ رکھائی سے بولا۔ عباد گیلانی نے تڑپ سے گئے۔ کچھ کہنے کی خواہش میں لب فقط کانپ کر رہ گئے۔

وہ ایک ناقابل برداشت اذیت سے خود کو گزرتا محسوس کرنے لگا۔ حازم کا کوئی قصور نہیں تھا اس کے لہجے سے ٹپکتا نفرت اور تنفر کا زہر خود ان کا اپنا انڈیلا ہوا تھا۔

مگر آج بستر مرگ پر پڑے پڑے اس کے منہ سے ابلتا یہ زہر اسے اپنے وجود پر آتشیں سیال کی طرح گرتا محسوس ہونے لگا۔ اسے پہلی بار پتا چلا کہ اعتراف جرم کرنا کس قدر مشکل ہے۔

وہ گردن جو کبھی خدا پاک کی ہزار نافرمانیاں کرنے کے باوجود اس حقیقی مالک کے آگے اعتراف گناہ سے نہ جھکی تھی ایک بندہ بشر کے آگے کیسے جھک جاتی... مگر اب اسے دل پر رکھا یہ بوجھ ناقابل برداشت حد تک اذیت آمیز لگ رہا تھا۔

"اگر میں تم سے ایک بات کہوں تو کیا تم مانو گے میری بات۔" وہ لمحے توقف کے بعد اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولے۔ حازم نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"تم اپنے نانا سے تعلق جوڑ لو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم..." ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ حازم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پاپا... میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان حالات میں آپ کو رشتوں ناطوں کی کیا پڑی ہے' یہ مردہ گھڑے اکھاڑنے کی کیا ضرورت ہے' آپ پہلے ری کور ہو جائیں ہم اس ٹاپک پر پھر کبھی بات کرلیں گے' یہ کوئی اتنا امپورٹنٹ میٹر نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں اتنی تلخی تھی کہ عباد گیلانی کو لگا زہر سے بھرا جام الٹ گیا ہو۔

"یہ اتنا ہی امپورٹنٹ میٹر ہے حازم۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔" اب کے اس کے لہجے میں دبی دبی خفگی تھی۔

"امیزنگ..." وہ طنز سے ہنسا۔

"وہ لوگ جن کا میں نے بچپن سے اچھے لفظوں میں کبھی ذکر نہیں سنا' یہ آج اتنے اہم کیونکر ہو رہے ہیں آپ کی نظر میں۔" اس کی استہزائیہ آمیز مسکراہٹ تیز ہو گئی۔

"آپ شاید بھول رہے ہیں کہ ان رشتوں کو آپ میری زندگی کی ڈکشنری سے نکال چکے ہیں یہ سب میری لیے مر چکے ہیں اور کیا مرے ہوئے زندہ ہو سکتے ہیں۔"

"تم طنز کرنے میں حق بجانب ہو۔" عباد گیلانی نے خفیف سی ندامت سے نظریں چرا کر سامنے دیوار پر مرکوز کرلیں۔

"میں طنز نہیں کر رہا ہوں' میں تو بس بتا رہا ہوں کہ یہ سارے..."

"بس چپ ہو جاؤ حازم۔" وہ جیسے کراہائے تھے' اسی پل یاور علی اپنی اسٹک کے سہارے دھیمے قدموں سے اندر آرہے تھے' ان کے چہرے کے زاویوں میں بے نام سا کھنچاؤ تھا' عجیب سی یاسیت دل کو گھیر رہی تھی۔ حازم ان کو دیکھ کر لب بھینچ کر نظروں کا زاویہ بدل گیا۔ جبکہ عباد گیلانی انہیں دیکھ کر تکیہ کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"رشتوں کو غیر اہم سمجھ لینے سے یہ غیر اہم نہیں ہو جاتے۔ ان کا تعلق روح کی جڑوں سے جڑا ہوتا ہے' ہماری عارضی کج روی' بے گانگی اور لاتعلقی ان کو بے شک نمو نہیں بخشتی' پھلنے پھولنے نہیں دیتی' مگر انہیں اکھاڑ بھی

نہیں سکتی۔ تعلق، رشتے ابدی ہوتے ہیں پیدائشی، ہر بچہ اس زنجیر سے بندھا ہوا پیدا ہوتا ہے ان سے تعلق ظاہر رکھو یا نہ رکھو، انہیں توجہ کا پانی دو نہ دو، یہ نہ مرجھائیں گے نہ سوکھتے ہیں۔"

"اوہنہ بھول جو ہوئے۔" حازم تلخی سے ہنس دیا۔ یاور علی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر تناؤ کی آمیزش بڑھ گئی تھی۔ عباد گیلانی ایک خفیف سے احساس شکست کے ساتھ تکیے پہ سر ڈال گئے۔ کمرے میں یکلخت اس کے لہجے سے اڈنے والی تلخی کا جیسے کڑوا کڑوا سکوت پھیل گیا۔ یاور علی اس حد تک سخت رویے کی توقع شاید نہیں کر رہے تھے۔ وہ اپنے کشیدہ اعصاب کو سنبھالتے ہوئے ایک ہلکی سی سانس بھر کر عباد گیلانی کے نزدیک خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"اوکے بابا۔ میں چلتا ہوں۔" حازم جیب سے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے یاور علی کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے عباد گیلانی سے بولا۔

"بیٹھو حازم مجھ کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔"

"پاپا اس وقت آفس کے ایک دو بہت ضروری کام ہیں وہ نمٹا کر میں آؤں گا۔" اب کے وہ قدرے نرم روی سے بولا۔

"ٹھیک ہے تم اتنے فرمانبردار نہیں تھے کبھی، مگر اتنے نافرمان بھی نہیں تھے حازم۔" عباد کسی کم سن بچے کی طرح اس سے ناراض نظر آنے لگے۔

"میں نے کہا نا، میں رات کو چکر لگاتا ہوں۔" وہ عباد گیلانی کے نزدیک آیا۔

یاور علی نے محسوس کیا وہ ذاتی طور پر ایک نرم خو لڑکا تھا اس کے اطوار میں بڑی ملائمت تھی، وہ اس طرح کا رد عمل کرنے پہ دلی طور پر مجبور تھا۔ وہ عباد گیلانی کو تھپک کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد عباد گیلانی نے بڑی شکستہ نظروں سے یاور علی کو دیکھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے کس طرح قائل کروں۔ اس سے کیا کہوں؟"

"وہی جو سچ ہے، سچ کہنے میں تردد کیسا، سوچ بچار کیسی۔" یاور علی کا لہجہ نیم استہزائیہ تھا۔

"میں نے اپنی زندگی میں اس نوبت کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔" وہ خود آزردگی کی کیفیت میں تھا۔

"جس طرح گناہ سے آلودہ زندگی گزارنے کے بعد توبہ کی کیا امید۔" اس نے آنکھیں بند کرلیں، جیسے اتنا ہی اس کے بس میں تھا۔ ایک آنسو لڑھک کر اس کی کنپٹی کے بالوں میں جذب ہو گیا۔

"ناامیدی کفر ہے بڑے سے بڑا گناہ بھی حقیقی توبہ سے دھل جاتا ہے، یہ دروازہ ہر انسان کے لیے رب العزت نے کھول رکھا ہے، یہ خیال فاسد اور سراسر شیطان کی طرف سے آتا ہے۔ وہ مایوسی پیدا کر کے کفر کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔" یاور علی کرسی کھینچ کر ان کے نزدیک ہو گئے، ان کا لہجہ خود بخود نرم اور لچک دار ہو گیا۔ جیسے کوئی خشک زمین پر یکلخت پانی گرا ہو۔ شاید عباد گیلانی کی آنکھ سے نکلا آنسو ان کے دل کی خشک زمین پر گرا تھا۔

"بزرگ فرماتے ہیں "ناامیدی کی طرف نہ جاؤ کیونکہ امید کے بے شمار راستے ہیں، تاریکی کی طرف مت دیکھو، کیونکہ بے شمار سورج موجود ہیں، بس توبہ کرلو تو سارے گناہ ختم ہو جاتے ہیں۔" عباد گیلانی کا دل عجیب سی اتھاہ میں ڈوبا اس نے تھکی ہوئی آنکھیں کھول کر یاور علی کا نورانی چہرہ تھا۔

"کیا میری خطائیں قابل معافی ہیں، میں لائق معافی ہوں۔" اس کی آواز اندرونی کرب سے بکھرنے لگی۔ دوسرے پل وہ خود آزاری کی کیفیت میں ہنس پڑا۔

"نہیں یاور صاحب۔ ایسی طفل تسلیاں نہ دیں، موت سامنے دکھائی دے رہی ہے تو مجھے خطاؤں کا خیال آرہا ہے۔"

"خطا کار اور گناہ گار ہی تو توبہ کرتے ہیں۔" یاور علی کا لہجہ تھپکتا ہوا تھا۔
"توبہ کے آنسو ماضی کی تمام برائیوں کو بھلائیوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ آنسو خدا کو بہت پسند ہیں یہ اس کی بارگاہ میں ضائع نہیں ہوتے بلکہ شہیدوں کے خون کے قطروں کی طرح بے حد پیار سے چن لیے جاتے ہیں۔"
"کیا میرے جیسے شخص کے لیے بھی یہ دروازہ کھلا ہے۔ جس نے بھی ایک سجدہ نہ کیا ہو۔ ساری عمر حقوق غصب کیے ہوں۔ حقوق اللہ کی پروا نہ کی ہو۔ نافرمانی ہی نافرمانی کی ہو۔ ایس۔۔ اس جیسے شخص کے لیے بھی یاور صاحب؟"
وہ ورطہ حیرت میں تھا۔ مگر ایک موہوم سی آس سر اٹھا رہی تھی۔ جیسے بجھتے دیے میں دھیرے دھیرے تیل پڑ رہا ہو۔ کوئی شعلہ سا امڈنا چاہ رہا ہو۔
"ہاں ہر ایک کے لیے۔" یاور علی نے اس کا کمزور سفید ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر تھپتھپایا۔
"یہ سب شیطان کا بہکاوا ہے۔ یہ آدمی کو مرتے دم تک ذلیل اور رسوا کرنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو راندہ درگاہ کیا تو اس وقت اس نے اس کی مخلوق کو راہ سے بے راہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ رب العزت نے بھی اپنی عزت کی قسم کھائی کہ۔
"میری عزت کی قسم میں اس ابن آدم کے لیے توبہ کا دروازہ بھی اس وقت تک بند نہ کروں گا جب تک اس کے جسم میں روح باقی ہے۔ تو میری عزت کی قسم کھاتا ہے کہ میں نہیں نکلوں گا۔ (ابن آدم کے دل سے جب تک اس کی روح جسم میں باقی ہے) تو میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ میں اس کے لیے توبہ کا دروازہ بند نہیں کروں گا تو اگر زہر ہے تو میں ہر ابن آدم کو اس زہر کا تریاق بھی دے رہا ہے کہ اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔"
"اس رحیم نے اپنی رحمت کے سو حصے میں سے فقط ایک حصہ دنیا میں اتارا ہے۔ باقی ننانوے حصے رحمت کے اس نے اپنے پاس محفوظ رکھے ہیں۔ تم اس ذات کریم کی کریمی دیکھو اپنے گناہ نہ دیکھو۔ اپنا منہ مت دیکھو اپنے رب کی ذات کریمی کی قدرت کاملہ کو دیکھو۔"
تم نالائق ہو مگر وہ تو لائق ہے نا۔ اور ہمیشہ نالائق لائق کے پاس جائے گا۔ خالی ہاتھ ہمیشہ دینے والے کے سامنے ہی پھیلا ہے سوچو۔ انسان اپنے شقی القلب بے رحم ہونے کا باوجود یقیناً "مانگنے والے فقیر کو بھی کچھ نہ کچھ دے ہی دیتا ہو گا۔
سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتا ہو گا تو پھر اس کریم کے بارے میں اتنے تنگ ذہن کیوں ہو رہے ہو۔
اس در سے کیوں مایوس ہو رہے ہو اس کی رحمت تو اس کے اپنے غضب پر حاوی ہے۔
ہر خاص و عام کے لیے ہے توبہ فقط ایک توبہ۔ اس بارگاہ گناہوں کے غبار کو مٹا ڈالتی ہے۔"
"عباد گیلانی کو لگا اس کے بجھے سینے میں کوئی نیا دل بے دار ہو رہا ہو۔ اس کھنڈر میں کوئی روشنی پھوٹ رہی ہو۔" مایوسی کے گھپ اندھیرے میں ننھے ننھے دیے جھلملا گئے ہوں۔
(ایک سچ تھوڑی سی اذیت دے گا مگر باقی ماندہ اذیتوں کو چوس لے گا۔)
وہ سوچنے لگا۔ اس نے یاور علی کو آواز دینے میں دیر کیوں لگا دی۔
ہاں جب یاور علی ایک انسان ہونے کے باوجود اس کی خطاؤں کو معاف کر سکتا ہے تو اس ذات کریمی کی بارگاہ میں جھکنے سے بھلا کیسے وہ مایوس ہو سکتا ہے۔ وہ حازم سے کتنی محبت کرتے ہیں جبکہ یہ محبت اور رحمت کا فقط ایک حصہ ہے جو دنیا میں اتارا گیا ہے۔ تو پھر ننانوے حصے جس کی ذات میں ہیں اس کی محبت رحمت کیسی ہو گی۔
ہاں ایسی ہی ہو گی جیسی یاور علی کہہ رہے ہیں۔ وہ خدا یقیناً "ایسا ہی ہو گا جیسا یاور علی بتا رہے ہیں۔
محبت کا بحر بیکراں جس کی رحمت کی کوئی حد نہیں کوئی منتہا نہیں۔
اس کے سینے سے گھٹی گھٹی سسکیاں نکلنے لگیں۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے دل پگھل کر آنسوؤں کی صورت بہنا جانا چاہ رہا ہو۔

☼ ☼ ☼

رات کے کھانے کی میز پر حازم نے عاظمہ (سوتیلی ماں) سے پوچھا۔
"آپ پاپا کی طرف گئی تھیں کیا۔" وہ آپ کا پوچھ رہے تھے۔"
اس نے عاظمہ کے میک اپ زدہ چہرے پر ایک نظر ڈالی اور جوس کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔
"ہاں' رات تو گئی تھی مگر جلد آگئی۔ وہ دواؤں کے زیر اثر تھا۔" بابر اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی کانچ کی تپائی پر پھینکنے کے انداز میں ڈال کر ڈائننگ میز تک آگیا۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ دونوں مل کر پاپا کو کنوینس کیوں نہیں کرسکتے۔ وہ U.K جائیں۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔
"کیا پاپا کو اپنی لائف سے محبت نہیں ہے امیزنگ۔"
"میں تو کہہ کہہ کر تھک چکی ہوں۔ بہت کرلی گرما گرمی۔ تم کیا سمجھتے ہو مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔"
عاظمہ کو بابر کی بات چبھی تھی۔
"آخر آپ وائف ہیں ان کی۔" "آپ کے پاس کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہونا چاہیے۔" حازم بے ساختہ بابر کی اس بات پر عاظمہ کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔
"بکواس نہیں کرو تم۔ تمہارا باپ اس عمر میں تو اتنا ہی ضدی ہے جتنا جوانی میں تھا۔" عاظمہ نے اسے گھور کر دیکھا اور بالوں کے لچھے شانوں سے پیچھے جھٹکتے ہوئے بولیں۔
"کیوں حازم میں نے کیا کوشش نہیں کی۔ خود ڈاکٹر زمان سے بھی اس سلسلے میں بات کی۔"
"میرا مطلب ہے آپ دونوں زبردستی پکڑ کر انہیں کیوں نہیں لے جاتے۔" بابر کے انداز میں ہنوز سکون تھا۔
"وہ کوئی بچہ نہیں ہے کہ ہم پکڑ کر لے جائیں۔"
"بوڑھے اور بچے میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا مما۔" وہ ماں کی نظروں سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔
حازم جوس کی چسکیاں بے دلی سے بھرنے لگا۔ عموما" بابر کچھ اس طرح عاظمہ کو چڑایا کرتا تھا۔
"دماغی طور پر بچہ ہونا الگ بات ہے جسمانی طور پر تو وہ بچہ نہیں ہے کہ میں گود میں بھر کر جہاز میں چڑھ جاؤں' عجیب احمقانہ باتیں کرتے ہو۔"
وہ سخت خار کھاتے ہوئے بولیں اور چائے کا مگ تھام کر رخ حازم کی طرف کرلیا۔
"تمہیں تو پتا ہے عباد اب کیسی عجیب بہکی بہکی باتیں کرتا ہے کہ موت ہوئی تو یہاں بھی آجائے گی' وہاں بھی آجائے گی۔ پتا نہیں اس کے دماغ میں کیسے فضول خیالات آنے لگے ہیں۔ احساس جرم وغیرہ وغیرہ۔" وہ جھنجلا کر سر جھٹک کر چائے کے گھونٹ بھرنے لگیں۔
حازم غیر محسوس طور پر چونک سا گیا۔
"احساس جرم۔۔۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پر رکھ دیا اور عاظمہ کو دیکھا۔
"کیسا احساس جرم۔"
"پتا نہیں۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے حازم کہ اسے اس کی کنڈیشن کے متعلق صحیح صحیح بتادو کہ یہاں کوئی ری کوری نہیں ہورہی ہے۔"
"کوئی فائدہ نہیں ہے انہیں سب خبر ہے۔ بہت اچھی طرح وہ اپنی کنڈیشن سے آگاہ ہیں۔" وہ میز سے اٹھ گیا۔

"ارے کھانا تو کھالو۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں حازم۔"
عاظمہ اسے اٹھتے دیکھ کر جلدی سے بولیں۔
"کھانا نہیں کھاؤں گا۔ بس ریسٹ کروں گا۔" اس نے کلائی میں بندھی گھڑی پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔
اس کی آنکھوں کے کناروں پر تھکن کی سرخی ہلکورے لے رہی تھی۔ عاظمہ کچھ بے چین نظر آنے لگیں۔ وہ حازم سے لائبہ کے حوالے سے بات کرنا چاہتی تھیں۔
"اپنی ہیلتھ کی طرف بھی دھیان دو حازم۔ تھوڑا بہت ہی کھا لیتے' یہ ڑا کفل ہی کھا لیتے۔"
"نو تھینکس مما۔" وہ ذہنی طور پر اس قدر منتشر تھا کہ عاظمہ کی غیر معمولی لگاوٹ کو وہ محسوس ہی نہ کرسکا۔
جبکہ بابر ماں کے رویوں کا پس منظر جان کر استہزائیہ آمیز مسکراہٹ سے دیکھنے لگا۔
"آپ کی محنت فضول ہوگی' آپ کی بے سروپا بھانجی۔ کم از کم حازم کو کسی طور سے بھی ہضم نہیں ہوسکتی۔ حازم کی آنکھیں ضرور خراب ہوسکتی ہیں ٹیسٹ نہیں۔"
حازم کا جاتے ہی بابر کی زبان رک نہ سکی ساتھ ہی اس نے محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا۔
"حازم کا ٹیسٹ آئی مین کہ پسند جو بھی ہوئی کم از کم لائبہ ہرگز نہیں ہوسکتی۔ اف مجھے تو وہ فلرٹ کے لیے بھی موزوں نہیں لگتی۔" جواباً عاظمہ نے اسے ٹیبل سے اٹھا کر چمچ کھینچ مارا۔
"دن میں دس دس لڑکیوں سے فلرٹ کرتے ہوئے شرم تو آتی نہیں ہے لائبہ تمہیں اچھی طرح سمجھ چکی ہے۔ وہ خود تمہیں منہ نہیں لگاتی۔"
"آہ ہا۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔"
"بابر۔ تمہیں سوائے میرا دل جلانے کے آتا ہے کچھ۔" عاظمہ نشانہ خطا ہوتا دیکھ کر اور جل گئیں اور وہاں سے جانے میں ہی عافیت جانی۔

٭ ٭ ٭

کہتے ہیں عورت کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ "محبت" سے متعلق ہے۔
مرد اور عورت کی بنیادی محبتوں میں بڑا فرق ہے مرد جب چاہے محبت کرے۔ کروا لے نہ کرے۔ محبت کرنے کا ملاپ وصال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ فقط محبت نہ کرے بلکہ اس سے محبت کی جائے وہ چاہی جائے۔ مگر یہ فعل اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس کا انحصار مرد پر ہوتا ہے۔ وہ چاہے یا نہ چاہے۔ محبت کرے یا نہ کرے۔ التفات کی نظر ڈالے نہ ڈالے۔
فضا تنویر۔ محبت کرکے بھی تڑپ رہی تھی اسے لگ رہا تھا یہ محبت نہیں سزا ہے' محبوب سے ملنے کے لیے اسے سو جتن کرنے پڑے تھے۔ ملاقات کے لیے سو سو جھوٹ باندھ کر گھر سے نکلنا پڑ رہا تھا۔ ملاقات کرکے آئی تو بنی خوشی اپنی سرشاری اور بدمستی کو چھپانے کا جتن کرنے پڑے تھے۔ اس کا خیال تھا وہ محبت کرنے میں بھی آزاد نہیں ہے۔
وہ اپنے اسٹور نما کمرے میں تیار ہو کر اب جلے پاؤں کی بلی کی طرح ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ اس کے محبوب نے کہا تھا کہ وہ اس کی گلی کے کنارے پہنچ کر اسے مس کال دے گا۔
اب اسے انتظار تھا کہ اس کی ماں جو صبح سے اپنے میکے جانے کا کہہ رہی تھیں' تیار ہو کر بیٹھی تھیں مگر چادر کی بکل مار کر گھر سے نکل جانے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔
وہ جلی بھنی ادھر ادھر پھرتے ہوئے اپنے شاہی دماغ محبوب کا سوچ رہی تھی کہ جوں ہی اس نے کال دے دی۔

پھر ایک منٹ کا انتظار نہ کرے گا۔
"فضا میں نکل رہی ہوں۔ باہر آکر دروازہ بند کردو۔"
جہاں آرا کی آواز اسے کسی خوش نما گھنٹی کی طرح لگی۔ اس کی بے قراری کو قرار آگیا۔
"جی۔ اچھا۔ آپ جائیں۔" اس نے اندر سے ہی چیخ کر جواب دیا۔ پھر کھڑکی سے جھری بنا کر جھانکا۔
جہاں آرا گھر سے نکل گئی تھیں۔ اس نے اس بوجھ کے اترتے ہی۔ نئے سرے سے خود کو سنوارنا شروع کیا۔
اور آئینے میں اپنے سراپے پر نظر ڈال کر مطمئن ہو کر گھر کو تالا لگا کر گلی میں آگئی۔
وہ اپنی وہائٹ کرولا کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شوخ سی دھن پر سیٹی بھی بجا رہا تھا۔ گلی میں کھیلتے بچے۔ بڑے شوق اور تجسس سے اس خوبرو ہیرو جیسے لڑکے کو دیکھ رہے تھے مرد حضرات بھی گزرتے ہوئے اس پر نظر ضرور ڈال رہے تھے۔
فضا بڑے بڑے قدموں سے چلتی جلدی سے فرنٹ سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔
"ذرا جلدی آجایا کرو' مجھے تو لگتا ہے جیسے میں یہاں ہر نظر کا مجرم ہوں۔"
"بس یہ محلہ ایسا ہی ہے اب جلدی سے گاڑی چلادو۔ میں چادر اتار دوں۔ بڑی گھٹن ہو رہی ہے۔"
"گھٹن تو ہوگی نا۔ اتنا بند بندھا کے آئی ہو جیسے چوری کرتے ہوئے نکل رہی ہو۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کے سراپے پر خاصی کڑی اور تنقیدی نگاہ ڈالی۔
"میں جس طبقے سے تعلق رکھتی ہوں وہاں یوں نکلنا چوری سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔" وہ کشادہ سڑک پر آتے ہی چادر کو اس طرح اتارنے لگی جیسے واقعی کوئی بوجھ ہو جسے وہ عرصے سے اٹھاتی پھر رہی ہو۔
چادر کا گولا بنا کر پچھلی سیٹ پر پھینک دیا۔
چادر اترتے ہی اس کا سجا سنورا سراپا آب و تاب سے جگمگانے لگا اور ہوس زدہ نظروں کو اور بھڑکانے لگا۔
"ہوں۔ گڈ۔" اس خوبرو نوجوان نے بھرپور نگاہ ڈالی اور بڑی نرمی سے اس کے بالوں کی لچک دار لٹ کو کھینچا۔
"اب بولو یہ جرم کہاں جاکر کریں۔" اس کا انداز ذو معنی تھا۔
"کیا مطلب۔" فضا نے نا سمجھ آنے والے انداز میں اسے دیکھا مگر اس کی مقناطیسی نظروں کی تاب نہ لاکر نظریں شرما کر جھکا دیں۔
"کیسی لگ رہی ہوں۔" وہ نگاہوں نگاہوں میں سیراب ہو رہا تھا وہ لوہا گرم دیکھ کر بات آگے بڑھانا چاہ رہی تھی۔
"ہوں۔ کہیں تنہائی میں بیٹھ کر بتاتا ہوں کیسی لگ رہی ہو۔" وہ ہنوز بہکا ہوا تھا۔
"اوہو۔ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے جناب۔" وہ کھلکھلائی اور دوپٹے کا سرکتا ہوا کونا بے ترتیب انداز میں شانے پر ڈالنے لگی۔
"مجھے تو بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے آلو پالک کھا کھا کر دل اوب گیا ہے کسی چائنیز ریسٹورنٹ میں لے چلو۔" وہ ادا سے بولی۔
"ہوں۔ بھوک ہی تو لگ رہی ہے۔"
"میں تمہیں کہہ رہی ہوں۔"
"ہوں۔ سن رہا ہوں۔ مگر ابھی چائنیز وائنیز کھانے میں مزا نہیں ہے' میں تمہیں فی الوقت اپنے ایک بے حد اچھے فرینڈ سے ملوانا چاہ رہا ہوں۔ ہم ڈیفنس جارہے ہیں نا۔ راستے میں برگر کھلا دیتا ہوں۔"
"کون سا فرینڈ۔ تم نے پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا اس کا۔"
وہ ذرا سا چونکی۔ پھر جانچتی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر کسی خیال سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"ارے ملوانا تو میں بھی چاہ رہی تھی اپنی ایک فرینڈ سے۔ قسم سے وہ تم سے بہت بدظن ہے۔ اور مجھ سے نالاں ہے۔ کہ میں تم سے کیوں ملتی ہوں۔" وہ حوریہ کے بارے میں اسے بتانے لگی۔

"آ۔ چھا۔ تمہاری ایسی کون سی فرینڈ ہے جو ظالم سماج بن رہی ہے چلیں اس سے بھی مل لیتے ہیں۔"

"چلو۔ اس سے ملنے جاتے ہیں۔"

"خاطر جمع رکھیے۔ وہ ملے گی نہیں بقول اس کے۔ آپ ایک فلرٹی ہیں۔" وہ یک دم چونکا پھر ابرو اچکا کر سے باقاعدہ گھورا۔

"تم نے میرا ایسا تعارف کرا رکھا ہے اس کے ذہن میں میرا اتنا برا امیج ہے۔"

"ارے نہیں۔ وہ دراصل شادی سے پہلے کی محبت کو برا' فلرٹ اور جھوٹ وغیرہ سمجھتی ہے اس کے خیال میں جو لڑکا شادی سے پہلے ہی لڑکی کو اتنی شاپنگز کراتا ہو' سڑکوں' پارکوں میں لے جا کر گھوماتا ہو۔ وہ فیئر نہیں ہو سکتا فلرٹی۔ ایک بدکردار ہو سکتا ہے ضرور۔"

وہ بڑی سادگی سے حوریہ کے خیالات اس کے گوش گزار کر رہی تھی۔

"امیزنگ۔" اب تو مجھے تمہاری اس فرینڈ سے ملنا ہی پڑے گا۔

"کیا وہ... سچ کہتی ہے جو کہتی ہے۔" فضا نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"بکواس۔ ایک دم بکواس۔ دراصل وہ تم سے جیلس ہے' بسا اوقات۔ محبت سے محروم لوگوں کے خیالات محبت کرنے والوں کے بارے میں عموماً" ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"مگر وہ محبت سے محروم تو نہیں ہے۔ نہ نظرانداز کیے جانے جیسی لڑکی ہے۔ مجھ سے تو ہر لحاظ سے بہتر ہے۔"

"ہوں۔" وہ سر ہلانے لگا۔

"دراصل اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم مجھ سے اس طرح ملنے کے بجائے شادی کر لو۔ اور سیدھے پردپر راستے سے آؤ۔ غلط تو نہیں کہتی نا۔"

"دیکھو نا۔ آخر میرا باپ بھی تو مجھے چٹ پٹ بیاہنے کے چکر میں ہے۔ آخر کب تک گھر میں آئے کسی بھی پیام کو رد کر سکوں گی۔"

"ہوں ڈیئر!" اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ "میں بھی اب اس کہانی کا اختتام کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کا لہجہ دھیما تھا لگا جیسے وہ خود سے ہمکلام ہو۔

گاڑی ایک خوب صورت سے بنگلے کے سامنے رک چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح صبح حازم کے نام ایک رجسٹری آئی تھی اور اس کے ایک گھنٹے کے بعد ڈرائیور نے آکر اسے ایک لفافہ دیا جو عباد گیلانی نے اسے بھجوایا تھا۔

وہ آج شام کو عباد گیلانی کو اسپتال سے گھر منتقل کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ اسپتال سے ہو کر ہی آیا تھا۔ پھر گھنٹہ بھر کی نیند لے کر اٹھا تھا۔ اور تب سے لے کر اب تک وہ گہرے اضمحلال کا شکار رہا۔

اسے لگا یہ طویل قسم کا خط اسے اندر باہر سے ہلا کر رکھ گیا ہے۔ کوئی چھوٹا سا آٹومیٹک بم تھا جو اس کے دل کے اندر رکھا ہوا تھا اور اب بلاسٹ ہو گیا ہو۔ یہ خط اسے اس کے نانا یاور علی نے بھیجا تھا اور ایسا ہی میٹر تقریباً" اس کے باپ عباد گیلانی نے بھجوایا تھا۔

وہ خطوط کیا تھے۔ ایک کہانی تھی جو برآمد ہوئی تھی' اس کے لیے محض انوکھی نہیں تھی بلکہ ایک اعصاب شکن

ثابت ہوئی تھی وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا باپ اس کے ساتھ اتنا بڑا فریب بھی کر سکتا ہے اتنا بڑا دھوکا بھی دے سکتا ہے۔

شیکسپیئر کے بقول دنیا ایک اسٹیج ہے ٹھیک ہی ہے ہر شخص اداکار ہے اور اس کا باپ بھی ایک بڑا اداکار تھا اور شاید اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔ ایک اذیت آمیزی سے اس نے زور سے آنکھیں میچ کر بیڈ کراؤن سے سر ٹکا لیا۔

اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اس کی ماں کے لیے اچھے خیالات نہیں تھے' اس کی نگاہ میں وہ ایک بے وفا' بد کردار اور بے حس عورت تھی اس نے اپنی زندگی میں ہزار ہا عورتوں کو دیکھا تھا۔

ہر مزاج' ہر عادت' خوب صورت' بدصورت' باکردار' بدکردار مگر اپنی ماں کے تصور کا ساتھ اس کے اندر ایک عجیب زہریلی ناگن کا تصور ابھرا تھا جس کے ڈسے کا تریاق نہ ہو پائے۔ اور اس کے خیال میں اس کا باپ بستر مرگ پر اسی ناگن کے ڈسنے کی وجہ سے تھا آج۔

اس نے آنکھیں کھول کر بیڈ پر بکھرے کر کاغذوں کو دیکھا۔

کاش۔ اس کا باپ یہ سب کچھ اسے نہ بھیجتا۔ اس کے ذہن میں اچھا خاصا انتشار برپا تھا۔ وہ یوں ہی ساکت بیٹھے ان پرچوں کو دیکھتا رہا پھر بستر چھوڑ کر اپنی خواب گاہ سے باہر آگیا۔ وہ ٹیرس میں چلا آیا۔ عاظمہ کے کمرے کا دروزہ بند تھا۔ ملازم اپنے اپنے کاموں میں منہمک تھے۔

ٹیرس کے ایک کونے کی ریلنگ سے لگ کر وہ سگریٹ سلگانے لگا۔

یہ ٹیرس فرنچ طرز کا تھا اس کی دو دیواریں پر بنڈ گلاس کی تھیں اور ایک طرف لکڑی کا خوش نما جنگلا تھا۔ جو کشادہ دریچے کی طرح تھا یہاں سے باغیچے کا خوش نما حصہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ اسی جنگلے سے لگ کر سلگائی ہوئی سگریٹ کے دو تین گہرے گہرے کش لے کر اپنے منتشر اعصاب سنبھالنے لگا۔ مگر لگ رہا تھا کسی منہ زور ہوا کو راستہ مل گیا ہو۔ وہ کچھ دیر خالی نظروں سے فضا کو تکتا رہا۔

"چائے پیجیے گا صاحب۔" عقب سے امیر علی کی آواز آئی۔

وہ پلٹا۔ امیر علی باادب کھڑا تھا یہ اس کے باپ کا بہت پرانا اور وفادار ملازم تھا۔

"چائے یا کوئی جوس وغیرہ لاؤں۔"

"نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم ادھر آؤ۔"

وہ قریبی رکھی چیئر پر بیٹھ گیا۔ امیر علی اس کے نزدیک آکر باادب کھڑا ہو گیا۔

"امیر علی۔ تم نے کبھی میری ماں کو دیکھا ہے میرا مطلب ہے تم یہاں آئے تو وہ تھیں۔" اس نے کرسی کی پشت سے لگ کر ہلکے ہلکے جھولتے ہوئے امیر علی کو مخاطب کیا۔ مگر اس کی نظریں امیر علی کے چہرے کی بجائے بھاگتے دوڑتے بادلوں پر جمی تھیں۔ "وہ کیسی تھیں۔ ایسی ہی جیسا پاپا بتاتے آئے ہیں۔"

"میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ میں جب آیا تو وہ یہاں نہیں ہوتی تھیں۔" امیر علی کا لہجہ دھیما تھا۔ پھر اس کی اٹھنے والی نگاہوں سے نظریں چرا کر فرش کو گھورتے ہوئے بولا۔

"آپ ہی ہوا کرتے تھے۔ بہت چھوٹے ہوا کرتے تھے جی۔"

"ہوں۔ کبھی کوئی تصویر دیکھی۔"

"نہیں۔" امیر علی کی نظریں اب بھی فرش پر جمی تھیں۔

پھر یک دم خیال آنے بولا۔

"ارے حازم صاحب آپ کے نام رجسٹری آئی ہے۔ میں دینا ہی بھول گیا آپ کو۔ ابھی لایا۔" اور یہ دوسری رجسٹری اس کے نانا نے بھجوائی تھی۔

پے در پے انکشافات۔ اب کوئی نئی کہانی۔ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے بھینچے ہوئے لبوں سے پھسل کر منجمد ہو گئی۔

اس نے کمرے میں آکر بے دلی سے لفافہ چاک کیا ایک چکنی چمکتی تصویر پھسل کر۔ اس کی گود میں آگری۔

اس نے خفیف سی حیرت کے ساتھ تصویر اٹھائی تو ایک بے حد پرکشش عورت کی تصویر تھی۔

جدید تراش کے فرانسیسی لیس کے نیلے اور سیاہ امتزاج کے شلوار سوٹ پر ایک طرف دوپٹا پھیلائے عورت دکھائی دے رہی تھی۔ تصویر میں اس کی ستواں ناک میں پڑی لونگ۔ بہت نمایاں اور روشن دکھائی دے رہی تھی آنکھوں میں مدھم مسکراہٹ تھی۔ اور ہونٹوں کے اوپری خوش نما تل تھا۔ جیسے وہ بھی مسکراتا دکھائی دے رہا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے ہمراہ پوری کائنات مسکرا رہی ہو۔

وہ جس باغ میں کھڑی تھی اس باغیچے کا کوئی حصہ معلوم ہو رہی تھی۔

وہ یقیناً "ایک بھرپور عورت تھی۔ اس نے حیرت کے ساتھ تصویر کو بہ نظر غور دیکھا پھر تصویر پلٹا تو پیچھے سفید گتے پر سیاہ روشنائی سے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"مومنہ یاور۔"

حازم کو ایک پل اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے۔ یہ نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا اسے لگا اس کے اعصاب شیشے کی طرح اکڑنے لگے ہوں اور ایک چیخ کے ساتھ اچانک بکھر جائیں گے۔ وہ سیاہ روشنائی کو گھورتا رہا پھر آہستگی سے تصویر پلٹی۔

وہ پرکشش عورت اب کچھ اور پرکشش دکھائی دینے لگی تھی۔

تو یہ تھی اس کی ماں۔ ایک زندہ بھرپور کردار۔

اس کے اکڑے ہوئے اعصاب چند لمحوں کے بعد ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے عجیب احساس محرومی سے اپنے دل کو کٹتا ہوا محسوس کیا۔

ایک نامانوس سی آگ اپنے پہلو سے اٹھتی محسوس کی۔

تصویر پر اس کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

اس نے تصویر اسی لفافے میں ڈال دی۔ اس لفافے میں ایک خط بھی تھا چند فل اسکیپ صفحات پر مبنی تھا۔

(باقی آئندہ ملاحظہ فرمائیں)

بنت سحر

یہ یونیورسٹی کے تین بڑے کمروں کے بائیں طرف بنے ہال کا منظر ہے... دیواروں پر سرخ اور سنہری رنگ کے پردے لٹکائے گئے ہیں جن کے سروں پر چھوٹی ٹوکریوں میں گلاب کے پھول بھرے ہوئے ہیں... ہال کی اونچی چھت پر لگے فانوس میں ست رنگی روشنیوں کی جھلک واضح ہے... سارے تماشائی دم بخود یہ منظر دیکھ رہے ہیں... دفعتا" ساری لائٹس بجھتی ہیں اور پردہ آہستہ آہستہ اٹھتا ہے... پردے کی اوٹ سے وہ لڑکی بانکپن سے چلتی ہوئی اسٹیج پر آن رکتی ہے... اس لڑکی نے چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا... فراک کے کناروں کو اس نے چٹکیوں سے پکڑ رکھا تھا... ایک دودھیا روشنی کا دھبا اس کے وجود کو گھیر لیتا ہے... اس کا لباس بہت شاندار تھا... سرخ کم خواب کا گھیر دار فراک، جو سونے کے بٹنوں سے سجا لگتا تھا اور سنہری جھالر کی قطاروں سے چمک رہا تھا جو اس کے چاروں طرف لپٹی نظر آتی تھی... اس کے نازک پیروں کا کھسہ چمک رہا تھا... وہ لڑکی آہستہ سے کچھ بولتی ہے۔

"تم کہاں ہو سلیم...؟" روشنی کا دھبا ایک لڑکے کے چہرے پر پڑتا ہے جو ایک مصنوعی چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے... اس کا لباس شاہانہ ہے... رنگت سنہری ہے جیسے کوہ قاف کے جگنوؤں کی ہو...

"میں تمہارے دل میں ہوں... انار کلی..."

انار کلی نے آواز کی سمت کا تعین کیا اور چپکے سے اپنے مخملی ہاتھوں کو سلیم کی آنکھوں پر رکھ دیا... سلیم کی یونانی دیوتا کی سی ہنسی سنائی دیتی ہے۔

"سارے گلوں کی خوشبوؤں کے آگے تمہارے ہاتھوں کی خوشبو جدا ہے' سارے رنگوں کے ہجوم میں تمہارے وجود کا رنگ اعلا ہے..." انار کلی اس کے قریب آن بیٹھتی ہے... اس کے لمبے بال فرش پر کالی چادر کی طرح بچھے ہوئے ہیں۔

"سلیم... میری زندگی میری سانسوں سے نہیں تم سے ہے... جذبات کے اعلا درجوں میں سے پہلے درجے عشق پر کھڑی ہوں... احساس قربت سوار ہے..." سنہری آنکھوں میں سنہرا پانی مدوجزر اٹھانے لگا تھا... سلیم نے اسے کندھے سے لگایا تھا۔

"عشق کے آسمان پر ہم عشق زادوں کا وجود ثبت کیا جا چکا... رب کے سوا کسی کو اختیار نہیں کہ توڑے دو دل' جو جڑ چکے ہیں..." انار کلی آنکھوں میں آس لیے بیٹھتی ہے... پردہ گرتا ہے۔

تماشائی دم بخود چہروں کے ساتھ حیرت کی بکل اوڑھے بیٹھے ہیں... ایسا لگتا ہے جسم حرارت سے خالی ہو اور دل دھڑکنوں سے خالی ہو... سناٹے کا سحر طاری ہے۔

پردے کی ڈوریاں اٹھتی چلی جاتی ہیں... ویرانیوں کے مناظر میں سے سب سے ویران منظر ہے... ہر طرف خزاں کے خشک پتے بکھرے ہوئے ہیں... ہوا میں بین کر رہی ہیں... زنجیروں میں جکڑی انار کلی کے آگے دیوار اٹھائی جا رہی ہے... زنجیروں میں بندھا وجود لہولہان ہو چکا ہے... پہلی اینٹ کے بعد دوسری... دم گھٹ رہا ہے... وہ روتی ہوئی کہتی ہے۔

"وقت کے حکمران کو اختیار نہیں کہ دلوں کے ملن میں خار بچھائے... انار کلی اور سلیم کا رشتہ حیات سے سانس' راگ سے ساز' گل سے خوشبو' پردوں سے

اڑان تک کا ہے... ہمارے عشق کی حقیقت پر فرشتے حیراں ہیں۔ موسموں کی خوب صورتی عشق سے ہے۔ اگر عشق نہیں تو ہر بہار خزاں ہے جہاں صرف خشک پتوں کا شور ہے۔" دیوار کے پار انارکلی کا وجود غائب ہو جاتا ہے۔ سسکتی آواز باقی ہے۔

پردہ گرتا ہے... ہال کی روشنیوں میں بیٹھے تماشائی ورطہ حیرت میں ہیں۔ ہال کی دیواروں پر لگے دوپٹوں میں چھید ہونے لگتے ہیں۔ اور مردہ پھول فرش پر ساکت نظر آتے ہیں۔ پردہ اٹھتا چلا جاتا ہے... دیوار کے ساتھ اکڑوں بیٹھا سلیم آنکھوں میں نمی کا سمندر لیے بیٹھا ہے... وہ دیوار پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ شدت اور تڑپ سے۔ اور وہ روتے ہوئے مخصوص لفظوں کی تکرار کیے جاتا ہے۔

"تم جانتی ہوناں انارکلی۔ وجود خاک ہیں اور روح امر ہے... سب کو لگتا ہے وجود مٹا دینے سے عشق مٹ جاتا ہے۔ سب نادان ہیں۔ دلوں میں جلتی عشق کی مشعلوں پر کبھی زوال نہیں آتا... تم سن رہی ہوناں انارکلی...؟" سلیم کا سوال ہواؤں کے شور میں دبنے لگتا ہے۔ دیوار کے پار زنجیر ہلنے کی آواز آتی ہے اور آخری دم توڑتی سسکی قطبین میں بکھر جاتی ہے۔

"سلیم۔ حاکم وقت کو کہنا انارکلی اور سلیم کے عشق کی پختہ عمارت پر دیواریں اٹھا دینے سے حاصل کچھ نہیں ہو گا۔ بہاروں کے موسموں نے خزاؤں کے آنے تک لفظ عشق دہرایا جائے گا... عشق کا کلمہ

گونج رکھتا ہے۔ جو باز گشت ہے بار بار پلٹے گی...."

ادھر سلیم دیوار پر ہاتھ رکھتا ہے اور دوسری طرف انار کلی کے لہو آلود ہاتھ اٹھتے ہیں.... عشق روح کی کھیتی کا سنہری بیج ہے.... جو عشق زادے پیدا کرتا ہے.... اور یہ کام برسوں سے جاری ہے.... جاری رہے گا.... فنا سے بقا تک.... ابتدا سے انتہا تک۔ پردہ گرتا ہے۔

ہال میں سناٹا ہے.... منجمد تماشائی کھڑے ہیں.... ان کے ہاتھ سے ہاتھ ملتا ہے اور یونیورسٹی کے دیواریں لرز جاتی ہیں.... آدھا گھنٹہ اور جانے کتنے لمحوں تک تالیاں بجتی رہیں.... اسٹیج پر مس نیلم مائیک تھامے اپنی ہیل کی ٹک ٹک پر جز بز ہوتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

"ڈیئر.... اسٹوڈنٹس ہر سال کے آخر پر تقریب میں ڈرامہ پیش کیا جاتا رہا ہے مگر آپ لوگوں کی پذیرائی دیکھ کر لگتا ہے کہ اس ڈرامہ "انار کلی اک لازوال عشق" نے پچھلے سارے ریکارڈ توڑے ہیں.... میں اپنی پیاری اسٹوڈنٹ "عقیدت" کو مبارک دیتی ہوں کہ جنہوں نے میرے بے تحاشا اصرار پر انار کلی کا رول کیا.... اس کے علاوہ اپنے شہزادہ سلیم مسٹر شہریار بھی ڈھیروں مبارک باد کے مستحق ہیں...."

مس نیلم کی بات پر سارے اسٹوڈنٹس نے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا.... ڈیسک زور سے بجائے گئے تھے اور سیٹیوں کی آوازوں سے پوری یونیورسٹی گونج رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ہال خالی ہوجاتا ہے.... فرش پر گری کچلی ہوئی پتیاں ادھر ادھر اڑنے لگتی ہیں۔

میرا دوست ، میرا حبیب دم آخر پہ ہے
میں کیا کروں اے خدا ، میں ڈرا ہوا ہوں!
اسے اب جانا ہے وہ نہیں ٹھہر سکتا
اور ہوائیں بھاگی بھاگی کہتی پھرتی ہیں
انار کلی کہتی ہے رنگ عشق جاوداں ہے....

☆ ☆ ☆

ڈریسنگ روم میں چیزیں ادھر ادھر پھینکے جانے کا ہلکا سا شور تھا.... گلاس ونڈو کے پار سہ پہر شام کے سانچے میں ڈھلنے کو تیار کھڑی تھی.... وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں کھڑی تھی جیسے.... حقیقی عکس لگتا تھا.... کلائی پر الٹی ہوئی واچ کو سیدھا کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی.... حرا اس کے پیچھے کھڑی اس کے لمبے بالوں میں سے احتیاط سے پنیں نکال رہی تھی.... ساتھ ساتھ اس کی باتیں بھی جاری تھیں۔

"عقیدت رئیلی یور لکنگ ویری بیوٹی فل۔" (عقیدت! واقعی تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو)

عقیدت نے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس پر نظریں جمائی تھیں....

"باتیں کم کرو حرا.... وہ باہر کھڑا غصہ ہورہا ہوگا.... میں اسے کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہتی...." حرا بائیں طرف کی پنیں نکال رہی تھی۔

"غصہ کیوں ہورہا ہوگا....؟" عقیدت نے ٹھنڈی سانس لی تھی.... چہرے پر تفکر کی چھاپ تھی۔

"جانے شہریار نے کیسے مس نیلم کے کہنے پر ڈرامہ میں ایکٹ کرنے پر ہامی بھرلی.... اسے آخری لمحے تک پتا نہیں تھا کہ میں اس کے مقابل ہوں گی.... آج میری خیر نہیں ہے.... کاش میں مس نیلم کی بات نہ ہی مانتی...." حرا اب آخری پن نکال رہی تھی....

"ڈونٹ وری عقیدت.... وہ چھوٹا بچہ نہیں ہے.... زندگی میں ایسے موقع بار بار نہیں آتے...." وہ اسے تسلی دے رہی تھی.... عقیدت نے مسکرا کر پلکوں کو بار بار جھپکا تھا.... ایسا لگ رہا تھا کسی نے چھوٹے پتھر رکھ دیے ہوں.... دروازہ ناک کرکے وہ اندر آیا تھا.... اور مخاطب حرا سے ہی ہوا تھا ورنہ اس پر تو ایک خشمگیں نظر ہی ڈالی تھی۔

"کتنا وقت لگے گا.... شام ہونے والی ہے...." حرا نے بوکھلاتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ صوفہ پر بیٹھ جائیں.... بس دس منٹ لگیں گے...." شہزادہ سلیم چپ چاپ صوفہ پر بیٹھ کر ٹیبل پر

بڑا میگزین اٹھا کر پڑھنے لگا تھا... اک پل کو نظر اٹھی تھی... لانبی پلکیں میک اپ سے سنہری چمکتا چہرہ...

عقیدت نے اسفنج گیلا کر کے حرا کی طرف بڑھایا تھا... حرا اب اس کے چہرے پر گیلا اسفنج پھیر رہی تھی...

یونیورسٹی کے احاطے میں جلتے ست رنگی بلب جل اٹھے تھے... دھماکے سے دروازہ کھلا تھا اور مس نیلم ہانپتی کانپتی اپنے بے ڈول وجود کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں۔

"اوہ مائی گاڈ... آج کا ڈرامہ بہت شاندار رہا... تم دونوں کی ایکٹنگ تو کمال کی تھی... ہال آدھا گھنٹہ تالیوں سے گونجتا رہا تھا..." وہ اب ریوالونگ چیئر پر گھوم رہی تھیں اور ساتھ ساتھ عقیدت کو دیکھ رہی تھیں۔ شہریار نے میگزین ٹیبل پر رکھ دیا اور مس نیلم کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"آپ نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ میرے ساتھ عقیدت ایکٹ کرے گی...؟" لہجے میں احترام کے ساتھ ساتھ ناراضی کی جھلک واضح تھی... مس نیلم نے بغور عقیدت کو دیکھا تھا۔

"قسم سے شیری مجھے علم نہیں تھا کہ رودابہ فتنی مجھے دھوکا دے گی اور عین وقت پر رفوچکر ہو جائے گی... اسے سلیکٹ کرنے سے پہلے میں نے عقیدت کو کہا تھا مگر اس نے انکار کر دیا تھا... مگر اب مجھے کچھ تو کرنا تھا مجبوری تھی... میڈیا، مہمان سب کے سامنے کتنی سبکی ہوتی... اسی وجہ سے میرے بہت اصرار کرنے پر عقیدت راضی ہوئی تھی... اب پلیز... تم اسے کچھ نہ کہنا۔"

عقیدت نے ان کی بات ختم ہونے پر چور نظروں سے اسے دیکھا تھا... پیشانی پر پڑی شکنیں آہستہ آہستہ کم ہونے لگی تھیں... طالبات اڑن طشتریوں کی طرح دوپٹے اوڑھے خارجی دروازے سے باہر جا رہی تھیں... کچھ کے ہاتھوں میں کوک تھیں جبکہ کچھ کارن فلیکس پکڑے ہوئے تھیں... وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے! جلدی آؤ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں" وہ اب ڈائریکٹ دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا مگر اس بار اس کا مخاطب عقیدت تھی... آئینے میں عکس باقی تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں مس نیلم کے کمرے میں بیٹھی تھیں... پورے کمرے میں حرارت پھیلی ہوئی تھی۔

"شہریار نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں تھا...؟" مس نیلم کے سوال پر حرا نے بھی اسے دیکھا تھا۔

"کہا تو کچھ نہیں تھا... بس میرے ہاتھ کی کافی صبح ٹیبل پر پڑی ہوئی ملی... بریانی کی پلیٹ ڈھکی ہوئی ہی ملی... پہلے کچن میں ہاتھ بٹاتا تھا... اس دن سارے کام مجھے خود کرنے پڑے تھے... پہلے اپنے موزے خود دھوتا تھا مجھے نہیں دھونے دیتا تھا... اس دن ہفتے بھر کی میلی شرٹس اور موزے مجھ معصوم سے دھلوائے گئے۔"

ریک میں کتاب ڈھونڈتی مس نیلم ہنسی تھیں...

"واؤ سو رومانٹک۔" حرا نے بھی مسکراہٹ مشکل سے دبائی تھی... وہ تینوں کافی پیتی رہیں اور ہنستی رہی تھیں... حرا کو کافی پینے اچھو لگا تھا۔

انارکلی ڈرامہ کے آڈیشن میں ایسے نادر نمونے دریافت ہوئے کہ پوچھو مت... اوم شانتی اوم کے آڈیشنز کو بھی مات دے دی گئی... نورین نے تو ڈانس کے وہ اسٹیپ کیے تھے کہ آنکھیں زمین پر جا پڑیں... رضیہ پنجابن کو جب پتا تھا کہ مقابل شیری ہے تو اس نے سریلی چیخ مار کر کہا تھا۔

"ہائے میں لٹی گئی آں..." پھینی ناک والی آمنہ نے چست چولی دامن پہنا اور جب لہک لہک کر ریہرسل کرنے آئی تو کمر پر ایک شگاف پڑ چکا تھا... تھل تھل کرتا وجود کہاں نازک چولی دامن میں سمٹ کر آنے والا تھا...؟ پروین عرف پینو جو بقول اس کے مس ورلڈ تھی مٹکتی ہوئی آئی اور نزاکت سے چھوٹی آنکھوں میں شرمیلا پن طاری کیا اور کہا۔

"اگر انارکلی ڈسکو چلی آئٹم سانگ پر پرفارمنس کرنی ہو تو مجھ سے ضرور رابطہ کیا جائے..."

مس نیلم نے تو سر پکڑ لیا تھا... سارے ڈڈو،

مینڈک، چھپکلیاں اسی یونیورسٹی میں جمع تھے... آخر ہزار منتوں کے بعد رودابہ نخریلی نے ہامی بھری تھی مگر عین وقت پر وہ بھی دھوکا دے گئی تھی... تبھی مجبوراً" عقیدت کو میدان میں آنا پڑا تھا... اور ہر کوئی گواہ تھا کہ پردے گرنے سے اٹھنے تک اس نے کمال کی پرفارمنس دی تھی... اور ایک بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ سارے مکالمے عقیدت نے ہی لکھے تھے کیونکہ وہ اخبارات میں بھی اکثر مضامین، افسانے لکھا کرتی تھی۔

اور جب سب کے سامنے مہمان خصوصی کی موجودگی کے درمیان مس نیلم نے کہا تھا۔

"ویسے تو میں بھی انارکلی کا رول کر سکتی تھی آخر میں اتنی اسمارٹ اور سلم سی جو ہوں... مگر پھر سوچا چلو میں اس ڈرامے کی ڈائریکٹر ہی بن جاؤں... آخر میں آل راؤنڈر ہوں..." ان کی اس بات پر مہمان خصوصی زیر لب مسکرائے تھے مگر باقی سب نے تالیاں پیٹی تھیں... اور مس نیلم خنداں پیشانی سے یہ تعریفی سند وصول کرتی رہی تھیں۔

مس نیلم آرٹ ٹیچر تھیں اور پوری یونیورسٹی کی جان تھیں... ان کی طبیعت میں ظرافت پائی جاتی تھی ان کی کوئی اولاد نہیں تھی ان کے میاں فوت ہو چکے تھے... اور وہ اکیلی رہتی تھیں۔

جب ساون رتوں میں بارشیں کھڑکیوں کے شیشوں پر تڑتڑ جیسی آوازیں پیدا کرتی تھیں تو وہ ڈر جاتی تھیں... چوری چھپے روتی تھیں... ہر وقت کی ہنسی میں چھپے دکھ کو کوئی بھی نہ سمجھ سکا تھا... ہنستے ہنستے پلکیں بھیگ جاتی تھیں... مگر عقیدت نے وہ راز کھوج ہی لیا تھا۔

شدت غم کو تبسم میں چھپانے والے
دل کا ہر راز نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے

☆ ☆ ☆

بھیگتی ہوئی رات کا سحر طاری تھا... ہلکی ہوا چلتی تھی تو اس میں چنبیلی کی بھینی بھینی مہک ہوتی تھی... ٹیرس کا بلب جل رہا تھا... وہ ٹیرس کے جھولے پر بیٹھی تھی... گود میں تکیہ رکھے اور اس کے اوپر ڈائری رکھ کر وہ کچھ لکھ رہی تھی... آہٹ پر اس نے سر اٹھایا تھا... وہ تھکے تھکے انداز میں بیگ ٹیبل پر رکھتا مقابل کرسی پر بیٹھ چکا تھا... بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور ساحر آنکھوں سے تھکن جھانک رہی تھی... سفیدے کی چوٹیوں سے جھلکتے چاند کی روشنی اس پر پڑ رہی تھی...

"آج کھانے میں کیا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا... اس کا مطلب تھا کہ وہ سخت بھوکا تھا...

"بریانی بھی ہے اور فش بھی فرائی کی تھی۔ لے آؤں؟" عقیدت نے پوچھا تھا... شہریار نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ڈائری کا ورق موڑتی سیڑھیوں سے نیچے چلی گئی تھی... ہوا سے سفیدے کے پتوں میں سرسراہٹ پھیل رہی تھی... اس نے ڈائری کا مڑا ہوا ورق وہیں سے کھولا تھا... زرد روشنی الفاظ پر بکھرنے لگی تھی۔

"آج میں بالکل تنہا سی ہوں... جیسے شام ہوتی ہے جس کا وجود تاریکی سے عبارت ہے... میرے پاس پھولوں، خوشبوؤں، بہاروں، خزاؤں کی داستانیں ہیں اور آج کل کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں ایسی داستانوں میں کون دلچسپی رکھتا ہے؟ کبھی کبھی لگتا ہے کہ جیسے میں کسی بوسیدہ کتاب کا خستہ سا ورق ہوں... جو بالکل کورا ہے اور اس کا وجود کسی بھی عبارت سے خالی ہے۔"

شہریار نے گہری سانس لے کر ڈائری مقررہ جگہ پر رکھ دی تھی... اگلے پانچ منٹ میں وہ کھانا لے آئی تھی... وہ چپ سا چھوٹے چھوٹے نوالے لیتا رغبت سے کھانا کھا رہا تھا... عقیدت نے خوش ہو کر اس کے پرسکون چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گرل کی پاس جا کھڑی ہوئی تھی... چاند سفیدے کے چھدروں پتوں کی راج دھانی سے سرک کر اب آسمان کے وسط میں آن ٹھہرا تھا۔

وہ چاند کی طرف ہی نظریں ٹکائے کھڑی تھی۔

"کل چاول، سبزیاں اور فروٹ جلدی دے جائیے گا پھر آپ بعد میں اکیڈمی پڑھانے چلے جائیے گا..." وہ

چونکا تھا۔
"خیر تو ہے۔۔۔؟" ہوا چنبیلی کی مہک سے بھری گھوم رہی تھی۔۔۔ وہ اب پانی پی رہا تھا۔۔۔ عقیدت بولی تھی۔
"کل جمعرات ہے نا۔۔۔ چاچا' چچی اور امی ابو کے ایصال ثواب کے لیے محلے کے بچوں کے لیے کھانا پکاؤں گی۔۔۔" شہریار نے سر ہلا دیا تھا۔۔۔ یہ وہ معمول تھا جو وہ جانے کب سے دہرا رہی تھی۔
"تمہارے لیے کچھ نہیں لانا کیا؟" وہ اپنے فرض میں کبھی بھی کوتاہی نہیں کرتا تھا اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔۔۔
"نہیں میرے پاس سب کچھ ہے۔۔۔" وہ اطمینان سے کہتی ہوئی واپس مڑی تھی اور برتن اٹھاتی سیڑھیاں اتر گئی تھی۔۔۔ انگوروں کی بیل پر جگنو قطار در قطار لٹکے ہوئے تھے۔۔۔ وہ چند ثانیے انہیں دیکھتا رہا تھا۔ کوٹ کے سائیڈ والی پاکٹ سے پین نکالا اور ڈائری اٹھالی تھی۔۔۔ اب وہ عقیدت کی لکھی عبارت کے سامنے چھوڑی گئی جگہ پر کر رہا تھا۔۔۔ موتیوں کی سی خوب صورت لکھائی ڈائری کے اوراق پر جیسے سج گئی تھی۔
"زندگی میں بہت بار ہم یہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ ہمارے پاس کوئی نہ کوئی سہارا ضرور ہوتا ہے۔۔۔ تمہیں لگتا ہے کہ تم تنہا ہو۔۔۔ اور تمہاری گلوں' موسموں' بہاروں کی داستانیں سننے والا کوئی نہیں۔۔۔ تم غلط ہو عقیدت۔۔۔ اپنے وجود کے گرد چڑھے خول کو توڑو اور پھر دیکھو۔۔۔ تمہارے پاس "وہ" ہے جو کسی کے پاس نہیں۔۔۔ تمہارے پاس' تمہاری دسترس میں انار کلی جیسا رنگ عشق ہے۔۔۔ وہ رنگ جو مٹتا نہیں۔۔۔ جاوداں ہے۔" رات کی سلوٹ پر دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔۔۔ فجر رات کے چوکھٹے پر سر نیہوڑائے کھڑی ہے۔

☆ ☆ ☆

"اپنے بھائی اور بھابھی کی ناگہانی موت کے بعد اکرام علی اپنی بھتیجی کو اپنے گھر لے آئے تھے۔۔۔ تقریباً" دو سال بعد ان کی اہلیہ بھی وفات پا گئی تھیں۔۔۔ پھر اپنے بیٹے شہریار اور عقیدت کو انہوں نے ہی پالا تھا۔۔۔ جانے کیوں ہمیشہ شہریار اور عقیدت میں فاصلہ ہی رہا تھا۔۔۔ جیسے جیسے عقیدت بڑی ہوتی گئی۔۔۔ سمجھ دار ہوتی گئی۔۔۔ گھر داری اس نے پڑوسن خالہ سے سیکھ لی تھی پھر وقت گزرتا گیا اور وہ ہر کام بخوبی سرانجام دیتی رہی۔۔۔ پڑھائی سے لے کر گھر داری تک وہ ماہر تھی۔۔۔ اس کی اور شہریار کی عمر میں سات برس کا فاصلہ تھا۔۔۔ شاید یہ اتنی عمر نہیں تھی کہ فاصلہ رکھا جاتا مگر جانے کیوں وہ دونوں کبھی ایک دوسرے کو سمجھ ہی نہ سکے۔ کبھی کبھی بس برائے نام ہی بات ہوتی تھی۔۔۔ سنجیدگی کے بھاری خول نے انہیں دور کر دیا تھا۔
پھر جب چچا جان پر فالج اٹیک ہوا تھا تو وہ دونوں بہت پریشان رہے تھے۔۔۔ وہ دونوں چپکے' چپکے روتے کبھی بھی ایک دوسرے کو حرف تسلی نہ دے سکے۔۔۔ اور پھر گھر۔۔۔ چچا جان کے وجود سے خالی ہو گیا تو جیسے مشکلات کا انبار ٹوٹ پڑا تھا۔
ساری جمع پونجی لگ چکی تھی اور ان کے تعلیمی اخراجات بھی بہت بھاری تھے۔۔۔ وہ رات گئے ٹیوشنز پڑھا کر آتا تھا۔۔۔ وہ سہمی' سہمی ادھر ادھر گھومتی رہتی۔۔۔ چچا جان نے چچی جان جب حیات تھیں ان سے مشورہ کیا تھا اور پھر تقریباً" پندرہ سال بعد ان کا نکاح کر دیا تھا۔۔۔ اور وہ سمجھوتے کی چادر اوڑھے چپ رہے۔۔۔ یہی زندگی تھی۔۔۔ وہ گھر کا مرد تھا اور سارا سارا دن دھکے کھاتا تھا اور عقیدت اس کے شانہ بشانہ کھڑی تھی۔۔۔ وہ خود بھوک برداشت کر لیتی تھی مگر اسے کبھی بھی بھوکا نہیں رکھتی تھی۔۔۔ رات ڈھلنے سے صبح اترنے تک وہ اسے آرام دیتی تھی۔۔۔ کپڑے استری کر کے ہینگ کر دیتی۔۔۔ شوز پالش کر کے رکھتی تھی۔۔۔ اس کے آنے پر ہی کھانا گرم کر کے دیتی تھی۔۔۔ وقت نے آہستہ آہستہ ان کی چپ توڑی تھی اور وہ دونوں دوستی کے دائرے میں مقید ہو گئے۔
وقت گواہ تھا کہ عقیدت نے شہریار اکرام کے لیے دن رات کا آرام تیاگ دیا تھا۔۔۔ وہ روز راتوں کے

آخری پہر اکیلے کمرے میں دیواروں پر اترتے سائے دیکھ کر ڈر جاتی تھی.... وہ خود سے باتیں کرنے لگی تھی ... مگر کب تک ... پھر دل کے احساسات ڈائری کے کورے اوراق پر جگہ بنانے لگے تھے ... شہریار اکرام نے پہلی بار جب اس کی ڈائری کا ایک ورق پڑھا تھا تو اسے لگا تھا عقیدت اس کی زندگی کا اہم ستون ہے.... اور پھر آہستہ آہستہ وہ سارے خول توڑ تا گیا... اور ان کے مابین دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا اگرچہ جو زیادہ مضبوط نہیں تھا مگر پھر بھی غنیمت تھا.... شہریار کو وہ الفاظ آج تک یاد تھے اور وہ بھی اپنے پورے معنی اور مطالب کے ساتھ....

"یہ رات کے اندھیرے میں سائے مجھے کیوں ڈراتے ہیں.... بیڈ کے نیچے چھپتی ہوں تو یہ وہاں بھی آجاتے ہیں.... مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے.... کہتے ہیں کوئی مر جائے تو اس کی روح سایہ بن کر گھومتی رہتی ہے.... کیا یہ وہی روحیں ہیں....؟ کاش.... یہ چاند روز آسمان پر ابھرا کرے.... جب چاند ہوتا ہے تو ڈراونے سائے نہیں ہوتے.... میرا کوئی بھی دوست نہیں ہے پیاری ڈائری.... تم میری باتیں سنتی رہتی ہو مگر بولتی نہیں ہو.... تم بولا کرو ناں.... مجھے خاموشیاں اچھی نہیں لگتی ہیں.... مجھے ان سے خوف آتا ہے.... تم بولا کرو گی ناں....؟"

آخری سوال پر نمکین پانی کے قطرے سیاہی میں مدغم ہوتے صاف دیکھے جاسکتے تھے.... وہ ہمیشہ شہریار کو دن کے پہر پر سکون نظر آتی تھی مگر رات کے تاریک پہر کے قصوں سے وہ اب آگاہ ہوا تھا۔

رات جو ساحر ہے۔ جو وجود پر کبھی کبھی چابک کی طرح لگتی ہے اور یہ چابک عقیدت کے حصے میں روز آتا تھا....

☆ ☆ ☆

لڑکیوں اور لڑکوں کی ٹولیاں نوٹس بورڈ کے گرد جمع تھیں.... رضیہ پنجابن کو سکتہ ہو گیا تھا اور گم صم سی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی.... فائزہ چیمہ اس کی مارکس شیٹ اس کے سامنے لہرا لہرا کر کہہ رہی تھی۔

"رضیہ.... توں تاں لٹی گئی ایں...." رضیہ کے سامنے مارکس اماں کے بنائے گئے گول لڈوؤں کی طرح گھومنے لگے تھے....

پروین عرف پینو بھنگڑا ڈال رہی تھی.... خوش قسمتی سے وہ پاس ہو گئی تھی.... رودابہ درانی نے ایک پیپر میں فیل ہونے کا غم نزاکت سے ٹشو پیپر میں جذب کر دیا تھا.... عقیدت کو حرا نے جالیا تھا....

"اتنی دیر کر دی آنے میں.... میں تو فاتحہ پڑھنے لگی تھی...." حرا نے ہاتھ میں پکڑی فائل اسے رسید کر دی تھی....

"میں تو جلد ہی آ رہی تھی.... بس وہ راستے میں بائیک خراب ہو گئی تھی...."

"اور شہزادہ سلیم کہاں ہیں....؟" حرا نے پوچھا تھا۔

"وہ بائیک کو ورکشاپ میں لے گیا ہے...."

"اوہ.... چلو پھر کینٹین.... اور ٹریٹ دو.... پوری کلاس تمہاری منتظر ہے...." وہ الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"میں ٹریٹ دوں.... مگر کیوں؟" حرا نے اس کی الجھن کو بغور دیکھا اور زور سے گلے لگالیا....

"پاگل.... تمہاری فرسٹ پوزیشن آئی ہے...." عقیدت نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھا تھا.... بے یقینی سی بے یقینی تھی.... آنکھوں میں جگنو چمک اٹھے تھے.... راتوں کی ریاضت رنگ لے آئی تھی۔ وہ ساری ساری رات چہل قدمی کرتی ہوئی پڑھتی رہتی تھی جبکہ شہریار بیچ پر بیٹھا اپنا کام کرتا رہتا تھا.... وہ بغور اسے دیکھتا ہنستا تھا۔

"رٹے لگانے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے...." وہ بھڑک جاتی....

"شہریار اکرام میں تو محنت کرتی ہوں...." وہ لیپ ٹاپ گود میں رکھے بیٹھا ہوتا تھا۔

"چلو جب رزلٹ آئے تو پہلے مجھے بتانا...." وہ بلب کے نزدیک کھڑی ہوتی تھی تو اس کے قریب آجاتی تھی....

"کامیاب ہوئی تو کیا دو گے؟" یونانی دیوتا کی سنہری

آنکھیں جگمگ کرنے لگتی تھیں۔۔۔

"جو تم مانگو گی وہی دوں گا۔۔۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی تو وہاں سنجیدگی کی چھاپ نظر آتی تھی۔۔۔

☆ ☆ ☆

روڈ کے کنارے لگے نیون سائن چمک رہے تھے۔۔۔ ٹریفک کی آمد و رفت نہایت کم تھی۔۔۔ پیدل چلنے والوں کی تعداد کثرت میں تھی جو روزانہ ہوا خوری کے لیے گھروں سے نکلتے تھے۔۔۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔۔۔ دونوں کے ہاتھوں میں پاپ کارن تھے۔۔۔ شہریار نے اسے بغور دیکھا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تمہیں کونسا گفٹ چاہیے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔۔۔ عقیدت نے اردگرد پھیلی روشنیوں کو دیکھا تھا۔

"انسان کی سب سے قیمتی چیز کیا ہوتی ہے۔۔۔؟" عقیدت نے پلٹ کر سوال کے اوپر سوال داغ دیا تھا۔۔۔ ایک پاپ کارن شہریار کے ہاتھوں سے چھوٹ کر ہواؤں میں اڑ گیا تھا۔

"میرے خیال میں انسان کا دل اس کی سب سے قیمتی چیز ہوتی ہے۔۔۔" عقیدت نے روڈ کنارے بنے بنچ کی طرف اشارہ کیا تو وہ دونوں وہیں بیٹھ گئے تھے۔۔۔ صندلی خوشبو میں رچی ہوئی ہوا آوارہ گھوم رہی تھی۔۔۔ اردگرد کی روشنیوں کو عقیدت نے جیسے کم ہوتا محسوس کیا تھا۔

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔۔۔ پلیز آپ میری بات اطمینان سے سنیے گا۔" آواز لرزنے لگی تھی شہریار اکرام نے بغور اسے دیکھا تھا۔

"ہاں کہو۔۔۔ میں سن رہا ہوں۔" روشنیاں مدھم ہو رہی تھیں۔۔۔ پاپ کارن کا پیکٹ اس نے گود میں رکھ لیا تھا۔۔۔ اب وہ گم ہو جانے والے الفاظ اکٹھے کر رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں کہ گزرے ہوئے سالوں میں کبھی بھی ہم دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو سکی شاید اس کی وجہ ہمارے مزاج مختلف ہونا تھے یا پھر جو بھی تھا۔۔۔ مگر چچا جان کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہماری مجبوری تھی۔۔۔ اب ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم کوئی بہتر فیصلہ کر لیں۔۔۔" شہریار نے جیسے اپنے وجود سے جان نکلتی ہوئے محسوس کی تھی۔

"تمہارے خیال میں بہتر فیصلہ کیا ہو سکتا ہے۔۔۔؟" رنگوں نے بے رنگی اختیار کر لی تھی۔

"میں خود کو فی الحال اس بات کا اہل نہیں پاتی کہ درست فیصلہ کر سکوں مگر میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کو سمجھوتے کی زندگی گزارنی پڑے۔۔۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف اٹھانی پڑے۔۔۔ آپ خود مختار ہیں جو بھی فیصلہ کریں گے۔۔۔ مجھے منظور ہوگا۔۔۔" لفظ بازگشت کی طرح اڑ اڑ کر سماعتوں میں انڈیلے جا رہے تھے۔۔۔ اذیت در اذیت۔۔۔ اداسی سی چار سو پھیلنے لگی تھی۔

"عقیدت۔۔۔ اور تم۔۔۔ تمہارا فیصلہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیا؟"

"میری ذات میں بہت خلا ہیں اور خلاؤں سے پر وجودوں کی خوشی کوئی بھی معنی نہیں رکھتی۔۔۔ بس میں اتنا چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے کسی کو بھی سمجھوتا نہ کرنا پڑے۔۔۔"

"مگر عقیدت۔۔۔ اتنا وقت گزر گیا اور یہ بات تم اس وقت کیوں سوچ رہی ہو۔۔۔ کیا میرے کسی بھی فعل سے تمہیں ایسا محسوس ہوا کہ تم میرے لیے بوجھ ہو۔" وہ پوچھ رہا تھا۔۔۔ تصدیق چاہ رہا تھا۔۔۔ عقیدت کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔۔۔ ہلکی سی خوشبوؤں میں لپٹی ہوا چلی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں شہریار۔۔۔" آنسو جو روکے بیٹھی تھی وہ شہریار کے اٹھ کر اسے جھنجوڑنے پر آنکھوں سے پھسل پڑے تھے۔

"تمہیں کیا لگتا ہے صرف تمہارے ہی جذبات احساسات ہیں۔۔۔ میں کچھ نہیں ہوں۔۔۔ تم ہی فرار کی راہیں تلاش کر رہی ہو۔۔۔ میں ایسی لڑکی کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں جو میری راحت کے لیے اپنا آرام تک تج دیتی ہے۔۔۔ جس نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب میں

کچھ نہ تھا... مجھے اس قدر خود غرض مت بناؤ کہ مجھے اپنی ہی ذات سے شرمندہ ہونا پڑے..." وہ شدید غصے میں تھا... عقیدت کی گود میں رکھے پاپ کارن نٹ پاتھ کے کنارے گر کے اڑنے لگے تھے...

وہ اب اپنا ہاتھ تھام کر فرسٹریشن میں چلا رہی تھی۔

"جب اتنی پروا کرتے ہو تو بتاتے کیوں نہیں... بہت انا والے ہو تم شہریار اکرام... دو قدم تم نہیں اٹھا سکتے تو ایک قدم میں بھی نہیں بڑھاؤں گی۔" وہ اب واپس مڑ رہی تھی... وہ اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

نیون سائن جھماکے سے جلنے بجھنے لگے تھے... اور وہ دونوں لڑتے جھگڑتے تیز چلتے جا رہے تھے... یہ سب رنگوں میں سب سے بھاری رنگ عشق ہے جس کے آنگن میں موسم، گل، مہک اور مشکبار ہوائیں نثار ہوتی ہیں... عشق ست رنگی لالی کے جیسا ہوتا ہے جب عشق زادوں کے وجود پر گرتا ہے تو سرور کے ساتھ ساتھ ایک اور ساز بھی ابھرتا ہے۔

"بہ نوک خاری رقصم... بہ نوک خاری رقصم..."

بیچ خالی ہے مگر بازگشت باقی ہے... یہ عشق زادے بھی ناں "وجود" لے جاتے ہیں "آوازیں" چھوڑ جاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں مکمل خاموشی کا راج تھا... مس نیلم گم صم سی صوفہ پر بیٹھی تھیں... ان کی نظروں میں خالی پن سا تھا... عقیدت نے ان کے ہاتھ تھامے تھے اور پیار سے ان کا چہرہ دیکھا تھا۔

"آپ نے اپنے وجود پر یہ جو "بہادری" کا خول چڑھایا ہوا ہے ناں... اور آپ ہر کسی کی باتوں پر ہنستی ہیں اور قہقہے لگاتی ہیں... اب اس بہادری کے خول میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئی ہیں... راتوں کو تو کھل کر آپ روتی ہوں گی مگر دن کے اجالوں میں ہنسی کے پیچھے چھپا دکھ کبھی کبھی منظر عام پر آ ہی جاتا ہے... شہریار، پروفیسر رضی کی وہیل چیئر لا رہا ہے... آپ ان کی بات مان لیں... زندگی میں ایسے موقع بار بار نہیں آتے۔" وہ انہیں گلے سے لگاتی باہر آ گئی تھی...

شہریار بھی پروفیسر رضی کو کمرے میں پہنچا کر کمرے کو اک نظر دیکھتا باہر آ گیا تھا۔ پروفیسر رضی کی نظریں مس نیلم کے کپکپاتے ہاتھوں پر تھیں۔ وہ اب کچھ سوچ رہے تھے... پھر انہوں نے ہی ابتدا کی تھی۔

"میں خود کو آپ کے قابل تو نہیں سمجھتا مگر پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے پرپوزل پر نظر ثانی کریں... میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کروں گا..." مس نیلم نے اک نظر اس کشادہ پیشانی والے شخص کو دیکھا تھا... خاموشی سے ادھر ادھر ٹہلتی رہیں... آخر وہ بولی تھیں۔

"مگر رضی... لوگ کیا کہیں گے...؟" وسوسے بلند ہونے لگے وجود سے بھی...

"نیلی... کیا تمہیں اپنی تنہائی، ویرانی نظر نہیں آتی جو تم ابھی تک لوگوں کو سوچتی ہو... جب ہم دونوں کی رضا ہے... ہمارا دین اجازت دیتا ہے تو ہم کیوں کر لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی خوشیاں خود پر حرام کر لیں..."

"مگر پھر بھی..." مس نیلم تذبذب کا شکار تھیں۔

"نیلی... اگر تم مجھے میری معذوری کی وجہ سے..." نیلم نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

"نہیں رضی... ایسی بات نہیں ہے۔ ہم ماضی میں اچھے دوست رہے ہیں... میں نے کبھی بھی آپ کو کم تر نہیں سمجھا..."

"مگر جب زندگی میں شامل کرنے کی بات ہو تو اکثر معیار بدل جاتے ہیں۔" پروفیسر رضی کی آواز میں کچھ درد سا تھا۔

"نہیں رضی... اگر خوشیوں کا سوال ہے ناں... تو میں راضی ہوں... مگر میں ہمیشہ یہ چاہوں گی کہ اگر کہیں زندگی میں لوگوں کو وضاحت دینے کی بات آئے تو ہم دونوں مل کر متحد ہو جائیں گے... میں اپنی باقی ماندہ زندگی اندھیروں کے خوف اور تنہائی کے ڈر سے نہیں گزار سکتی رضی..." وہ رو رہی تھیں... اور پروفیسر رضی ان کو چپ کرانے کی کوششوں میں تھے۔

کھڑکی کے شیشے سے ناک لگائے تانکا جھانکی کرتی رضیہ پنجابن نے چیخ ماری تھی۔

"ہائے... میں لٹی گئی آں..." شدت جذبات میں اس کا ہاتھ چشمش فریحہ کی عینک پر جا پڑا تھا... فریحہ کی عینک کے ٹوٹے عدسے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اور فریحہ کہہ رہی تھی...

"اللہ کرے... اگلی بار بھی فیل ہو جاؤ..." رضیہ پنجابن نے آنکھیں غصے سے میچ لیں...

"در فٹے منہ... رب کرے تیریاں لتاں ٹٹ جاون... تے اتھری گھوڑی وانگوں کلا نچاں یار دی پھریں۔" کوریڈور میں ہنسی دور تک گونج رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

پورا ہال بقعہ نور بنا ہوا تھا... عقیدت انار کلی فراک کے ساتھ گز بھر کا دوپٹا اوڑھے ادھر ادھر گھوم رہی تھی شہر یار اکرام دل کے ہاتھوں ان گنت نظریں اس پر ڈال چکا تھا مگر مجال ہے جو عقیدت نے اس کو لفٹ کروائی ہو... اسٹیج پر بیٹھی مس نیلم کی آنکھوں میں سچی خوشی کی چھاپ تھی جبکہ پروفیسر رضی بھی پرسکون نظر آ رہے تھے... رضیہ پنجابن نے پراندہ لہرایا اور گانے کی کوشش کی...

"لٹھے دی چادر اتے سلیٹی رنگ ماہیا۔
آؤ... سامنے آؤ سامنے تے رس کے ناں کولوں لنگھ ماہیا۔"

دبی دبی ہنسی کورس میں گونجی تھی... پروین عرف پینو اب کمر کس کے میدان میں آئی تھی...

"چھوڑ چھاڑ کے اپنے سلیم کی گلی...
اوہ... ہو انار کلی ڈسکو چلی..."

پینو بے چاری کی آواز کو بھی بمشکل برداشت کیا گیا تھا... سب کی دیکھا دیکھی ساڑھی میں ملبوس نخریلی روداب نے انگریزنی بننے کی بھرپور کوشش کی تھی

"Give me some sunshine..."
"Give me some Love..."

آخر میں رضیہ پنجابن اور چشمش فریحہ نے کپل ڈانس کیا... اور رضیہ کی ہیل فریحہ کے پیر کا قیمہ بنا گئی تھی... فریحہ اسے جی بھر کر کوس رہی تھی... رضیہ نے جواباً "در فٹے منہ" کہہ کر پراندہ لہرا دیا تھا۔ مدھم روشنیوں میں کھڑی عقیدت نے اپنے سامنے شہر یار کو پایا تھا...

"اے سنہری آنکھوں والی... نک چڑھی دوشیزہ... بندہ ناچیز آپ کی گلوں، بہاروں، موسموں کی باتیں ساری عمر برداشت کرنے کو تیار ہے... کیا آپ کو یہ ساتھ قبول ہے...؟" وہ ہاتھ میں منہ بند سرخ کلی لیے کھڑا تھا... سنہری آنکھوں والی لڑکی نے اس لڑکے کو دیکھا... ان آنکھوں میں عشق کا رنگ جھلک رہا تھا... ہاتھ بڑھا کر کلی تھام لی...

"شہر یار اکرام... زندگی میں کچھ چیزیں انسان کی سانس سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں... جن کی حفاظت پورے دل و جان سے کی جاتی ہے... اور تم میرے لیے وہی ہو... میں اپنے اللہ کی شکر گزار ہوں کہ اس نے میرا جوڑ تمہارے ساتھ بنایا..." سنہری پانی میں نہائی لڑکی کے چہرے پر شام کے چھینٹے پڑ گئے تھے وہ لڑکا اس لڑکی کو... روشنیوں کے دائرے میں کھینچ لیتا ہے... ہال میں تالیاں بجتی چلی جاتی ہیں۔

"دنیا میں میرے لیے سب سے قیمتی چیز عقیدت ہے... میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میرا جوڑ سنہری آنکھوں والی لڑکی کو بنایا..." ہر طرف ہنسی ڈھول پر پڑتی تھاپ کی طرح امنڈ پڑی تھی۔

دل و دیوار پر رنگ و نور کے چھینٹوں نے سلامی دے دی ہے... اور جو جوڑ اللہ بناتا ہے وہ کسی اور کے اختیار میں نہیں... جوڑے سے جوڑ جوڑنے کا حق اللہ کو ہے جو کہ ایک اچھا منصف اور عادل ہے۔

شبینہ گل

وہ اس کے لیے محبت تھی۔ سراپا محبت۔ سرما کی نرم گرم دھوپ جیسی' جو تن من کو نرم سی تپش سے پگھلا دے۔ جیسے مخمل سی گھاس' جس پر پاؤں دھرے سکون کا احساس اندر تک تراوٹ بخش دے۔ ایسی تھی اس کی محبت جیسے سخت گرمی میں لو کے تھپیڑوں کو دھکیل کر پھیل جانے والی ہلکی خنک ہوا جو اپنے سنگ بادلوں سے قطرے کھینچ لائے اور تپتی زمین پر پھوار کی صورت برسا دے۔ بس اسی پھوار جیسی ٹھنڈی' خوش گوار اور بھیگی بھیگی سی محبت اور اس کا تصور۔ جیسے کوئی چودھویں رات میں 'کھلے آسمان تلے شبنم میں رچی گھاس پہ ننگے پاؤں چلتا چاند کو تکتا من ہی من میں اس سے ہم کلام ہو۔ ایسے میں اس کے چہرے پہ پھیلی آسودگی اور طمانیت جیسا تھا اس کی محبت کا خیال' اس کا تصور۔ جیسے بہار میں چار سو کھلے رنگ برنگ پھول اور فضا میں گھلی ان کی ملی جلی مہک میں سے ہر پھول کی خوشبو الگ کرنا محال ہو' ایسے ہی اس کے لیے محال تھا یہ فیصلہ کرنا کہ وہ اس سے کیوں محبت کرتا تھا۔ وہ اس کے لیے گلاب کی ادھ کھلی کلی تھی۔ مگر... کسی اور کے کوٹ میں سجی ہوئی...

☆ ☆ ☆

بے حد متناسب' سانچے میں ڈھلا موم کی صورت سا سراپا' مناسب قد' دودھ اور میدے میں گلاب گھلی رنگت' پتلے پتلے دلکش نقوش' بے حد گھنے' ملائم' ریشمی' چمکدار شہد رنگی بال' شاعر کی تخلیق جیسے نازک ہاتھ پاؤں۔ چہرے پہ قوس قزح کی مانند بکھری معصومیت' تروتازگی اور شادابی۔ یہ اساور نجم جس کی خوب صورتی اور دلکشی پر اس کے اپنے ماں باپ بھی انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ ایک بار نہیں' بار بار' ہر بار جب وہ ان کے سامنے آتی تھی۔ ہر بار جب وہ مسکراتی تھی۔ انہیں لگتا تھا وہ آج اسے پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ اس پر مستزاد اس کی خوش اخلاقی۔ وہ بے حد خوش مزاج' خوش اطوار اور خوش گلو تھی۔ ایک ایسی نایاب لڑکی جس سے شاذ ہی کسی کو کوئی شکایت ہوتی تھی۔ وہ ہر دلعزیز تھی۔ اساور کے بعد دانش۔ اس سے دو برس چھوٹا تھا اور پھر پریہ۔ اساور سے پورے دس برس چھوٹی۔ نقوش میں اساور کی ہو بہو کاپی' مگر رنگت قدرے دبتی ہوئی تھی۔ مزاجاً" شوخ و چنچل اور اپنی بجو کی دیوانی تھی۔ کون تھا جو اساور کا دیوانہ نا تھا۔ جہاں وہ ہوتی وہاں کسی کو کوئی اور دکھائی نہ دیتا تھا۔ کوئی تو بات تھی اس میں کہ چاہ کر بھی کوئی اس سے حسد نہ کر پاتا تھا۔ اپنی ان خوبیوں پر وہ خود نازاں تھی یا مغرور' یہ اندازہ بھی کبھی کسی کو نہ ہو پاتا تھا۔

وہ بہت اعلا اخلاق کی حامل تھی' یہ بات بچہ بچہ جانتا تھا۔ اسکول' کالج' یونیورسٹی ہر جگہ وہ مشہور رہی تھی' لیکن اس کی شہرت ہمیشہ مثبت رہی' نیک نام رہی۔ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ہر فنکشن میں بھرپور طریقے سے حصہ لینا اساور اپنا فرض سمجھتی تھی' ہر مقابلے میں انعام حاصل کرتی تھی' خواہ وہ پہلا ہو یا دوسرا' تیسرا۔ جوش و جذبہ اس کی فطرت میں بھرا تھا۔ لمحہ لمحہ زندگی سے خوشیاں کشید کرنا اس کا اضافی ہنر۔ وہ اچھی اسٹوڈنٹ رہی ہمیشہ۔ ٹاپ پوزیشن کے لیے کبھی ہلکان نہیں ہوئی اور چوتھی پوزیشن سے کبھی نیچے نہیں

گئی۔ وہ لٹریچر کی دیوانی تھی' انگلش ہو یا اردو۔ ہر کتاب چاٹ جاتی۔ سو اس نے ماسٹرز کرنے کے لیے انگلش لٹریچر کو چنا۔ اس کے بعد اس کا ارادہ اردو لٹریچر میں ماسٹرز کا تھا۔ اگر قسمت ساتھ دیتی تو اور قسمت نے اس کے لیے کیا لکھ رکھا تھا' اگر وہ جان جاتی تو...

انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کے بعد اسے اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر شپ آفر ہوئی تھی جو اس کے لیے اعزاز کی بات تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کے لیے یوں تھی گویا فلک کا سب سے درخشاں ستارہ اور اس کے گرد باقی سب جیسے سیارے' جو اس کے وجود سے روشنی مستعار لیتے تھے تو جیتے تھے۔ سیاروں کا غرور کرنا بنتا نہیں اور ستارے کو غرور تھا نہیں۔ اس ستارے کو معلوم تھا کہ وہ خواہ کتنا بھی روشن ہو جائے' ایک نہ ایک دن اسے بحکم الٰہی ٹوٹ کر مٹی میں مل جانا ہے۔ تو جب انت مٹی ہے تو غرور کیسا؟۔

تخلیق وہ رب کائنات کی تھی تو غرور بھی اسی پہ بجتا ہے، نہ کہ بندوں پہ۔ خدا کے علاوہ اگر کوئی غرور و تکبر کو اپنی صفت بنانے کی کوشش کرے تو وہ ملعون ٹھہرایا جاتا ہے۔ انسان یہ حقیقت جان کر بھی انجان بن جاتا ہے اور یہیں سے خرابی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں سے دنیا کا بھی تو آغاز ہوا تھا۔ یعنی ابلیس کے غرور سے۔ آدم کے لیے اس کی نخوت سے۔ تو ازل سے کیا ہوا اپنا عہد ابلیس تا ابد نبھائے گا۔ نشانہ آدم و حوا ہی ہیں۔ مختلف روپ میں مختلف ادوار میں اور یہاں جو روپ تھا جو ٹارگٹ تھا وہ تھے نجم ظہیر اور آسیہ نجم۔ جی ہاں۔ اساور نجم کے والدین۔

بیٹی ہو الیسزا و قلوپطرہ، تو ماں باپ بھلا کس موقع پر اپنا غرور ظاہر کرتے ہیں؟ جی بالکل... جب بات آتی ہے مناسب رشتے کی۔ نجم صاحب کو کوئی بھی رشتہ اپنی شہزادی کے شایان شان نہ لگتا تھا۔ رشتے تو اس کے تب ہی آنا شروع ہو گئے تھے جب وہ محض میٹرک کی طالبہ تھی۔ بڑی نخوت و حقارت سے وہ جاننے والوں کو وہ رشتے بتا دیا کرتے تھے یہ کہہ کر کہ

"ہمارے لیول کے مطابق تو نہیں ہیں وہ لوگ، آپ کہیں تو میں آپ کی بیٹی کے لیے کہہ دیتا ہوں۔ آپ کو سوٹ کرے گا وہ رشتہ۔" اور جو قناعت پسند ہوتے وہ قبول کر لیتے ورنہ منہ بنا کر ٹال جاتے۔ یوں کئی رشتے دوسری فیملیز میں ٹرانسفر ہوتے رہے اور نجم صاحب بیگم کے ساتھ مل کر مضحکہ اڑاتے رہے۔

"بھلا ہماری شہزادیوں جیسی بیٹی کے قابل تھا وہ لڑکا۔ ہماری اساور کے لیے تو ایسا لڑکا آئے گا کہ لوگ دنگ رہ جائیں گے۔" جس رشتے کا وہ مضحکہ اڑا رہے تھے وہ نجم صاحب کے دوست کے توسط سے آیا تھا۔ لڑکا اٹامک انرجی میں بہت اچھی پوسٹ پہ فائز تھا۔ اعلا تعلیم یافتہ اور خوب صورت تھا۔ مالی لحاظ سے بھی نجم صاحب کے ہم پلہ تھے۔ لیکن... اور یہ "لیکن" ہی تمام مسئلوں کی ابتدا ثابت ہوتا ہے۔ اب پتا نہیں یہ "لیکن" بذات خود مسئلہ ہے یا انسان ہی ہر سیدھی چیز کو مسئلہ بنانے کا شوقین ہے۔ بہرحال... نجم صاحب کے اعتراض کی وجہ ان کا کنبہ تھا۔ وہ لوگ چار بھائی چار بہنیں تھے۔ لڑکا سب سے بڑا تھا اور باقی بہن بھائی غیر شادی شدہ اور زیر تعلیم تھے۔ نجم صاحب کی بات سے متفق ہونے کے باوجود آسیہ بیگم کو لگا کسی نے ان کے دل پر چٹکی کاٹی ہے۔ وہ خود ایک مختصر خاندان سے تھیں۔ دو بھائیوں رؤف اور منور کی اکلوتی لاڈلی نازوں پلی بہن۔ جبکہ نجم صاحب کا خاندان کافی بڑا تھا۔ نجم صاحب سب سے بڑے تھے اور ان کے بعد بالترتیب دو بھائی ضیغم اور ارقم اور پھر چار بہنیں سعیدہ، شاہدہ، سعدیہ اور نبیلہ۔ نجم صاحب نے بھی بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں ساری عمر نبھائی تھیں، لیکن بیوی تو پرائی بیٹی ہوتی ہے۔ اس کے لیے اصول و قواعد الگ ہوتے ہیں، لیکن بس سنے جا رہی تھیں۔ ایک بار پھر شوہر کے اعتراض سے متفق ہونے کے باوجود ان کا دل لہولہو ہوا تھا۔ آسیہ بیگم درد کو صبر کی مانند نگل گئیں۔ اپنے جیسی زندگی وہ بھی بیٹی کو نہیں دینا چاہتی تھیں۔

پھر اساور کی ایک یونیورسٹی فیلو نے اپنے بھائی کا رشتہ دیا۔ ان کا خاندان مختصر تھا۔ رہائش گاؤں کی تھی سو دونوں بہنیں تعلیم کی غرض سے شہر میں بھائی کے ساتھ رہتی تھیں۔ والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ اس نے یقین دہانی کروائی کہ بھائی نے شادی کر کے بیوی کو بھی ساتھ ہی رکھنا ہے۔ گاؤں نہیں بھیجنا۔

"اس کا بیک گراؤنڈ دیہاتی ہے۔ بے شک وہ اساور کو شہر میں رکھے، لیکن ہر غمی خوشی میں گاؤں کا ہی رخ کرنا پڑے گا۔ اساور کو ہم نے نازوں میں پالا ہے۔" نجم صاحب یہ اعتراض نکالتے ہوئے ایک بار پھر اپنی بیوی کو فراموش کر گئے تھے ——— بس تو پھر... کوئی کالا اور موٹا تھا، کوئی صاحب جائیداد نہ تھا، کوئی کم پڑھا لکھا تھا، کسی کے سر پہ ذمہ داریوں کا انبار تھا، کوئی بہو کمانے والی مانگتا تھا اور کوئی... دین دار تھا۔

یوں نخرے دکھاتے دکھاتے کیڑے نکالتے نکالتے سالوں پہ سال گزرتے رہے۔ ان کے شاندار لاؤنج میں لگے کیلنڈر چینج ہوتے رہے نئے کیلنڈر لگ کر پرانے ردی میں جاتے رہے۔ اساور تعلیم مکمل کر کے

لیکچرر شپ میں مصروف تھی' ساتھ ساتھ ایم اے اردو کی بھی تیاری کرتی رہی۔ جاب کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ماسٹرز کرلیا۔ گریڈ بڑھ گیا پروموشن ہوئی۔ آئیڈیل رشتے کے انتظار میں ترقی کی منازل عبور کرتے کرتے وہ اٹھائیس برس کی ہوگئی۔ تب اس کے کیک پر لگی 28 کے ہندسے والی موم بتی پر جلتا ننھا سا شعلہ نجم صاحب اور آسیہ بیگم کو دل پر بھڑکتے الاؤ جیسا محسوس ہوا اور وہ خواب غفلت سے جاگے۔

دانش 26 اور بریرہ 18 برس کی ہوچکی تھی۔ بریرہ کی دہکتی رنگت نوجوانی کے جوبن پر چمکتے دمکتے نگاہوں کو خیرہ کرتے سونے جیسی ہوچلی تھی۔ اس سے پہلے کہ اساور کی رنگت میں کھلے گلاب مرجھا کر سیاہ پڑجاتے اور لوگ گلابوں کے زیور پر سونے کے زیور کو ترجیح دینے لگ جاتے' انہیں حتمی فیصلہ کرنا تھا اور اب ایسا ہونے بھی لگا تھا۔ اب محفل کی روح رواں بریرہ بنتی جارہی تھی۔ جہاں پہلے اساور کے آگے کسی کو کوئی نظر نہیں آتا تھا وہاں اب بریرہ نظر آنے لگی تھی۔ بیٹوں کی ماؤں کی مرکز نگاہ بھی اب اساور نہیں' بریرہ ہوتی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ اس کے لیے سائبان تھا۔ وہ سائبان جس میں جا بہ جا بڑے بڑے چھید ہوں۔ ایسے چھید جو نہ دھوپ کی تمازت سے بچاسکیں اور نہ ہی طوفان کے تھپیڑوں کے آگے ڈھال بن سکیں۔ وہ ایسا ساتھی تھا' جو ساتھ ہی نہ تھا اور الگ بھی نہ تھا۔ وہ اس کی پوری زندگی تھا' لیکن ایسی زندگی جو تپتی دوپہروں میں لو کے تھپیڑوں کی مانند سلوک کرے۔ سرما کی شدید خنکی سے خشک ہوکر پھٹ جانے والی بدنما ہوتی جلد کے جیسی زندگی تھا وہ شخص۔ جو صرف تکلیف پہنچائے۔ شدید گرمی میں حبس میں تڑپتے جسم کی مانند۔ ایسا تھا اس کا تعلق اس بے مہر شخص سے۔ لق ودق صحرا میں اڑتی دھول کے بگولوں جیسا' جو نہ جیتے اور نہ ہی تھمے' بس آنکھوں میں ریت بھر کے اشکبار کیے رکھے۔ ایسا ہی تھا ان دونوں کا ربط۔ خزاں رسیدہ پتے جیسا ایک قدم غلط پڑا اور کڑچ۔ چرمرا کر ختم' پھونک پھونک کر رکھے جانے والے قدموں جیسا تعلق۔ تاریک ہولناک اندھیری رات جیسا۔ وہ اس کا ہم سفر تھا... مگر اس سے ہم نوائی نہ تھی۔

✡ ✡ ✡

"لوگ دین سے ایسے دور بھاگتے ہیں جیسے کوئی خونخوار جانور دیکھ کر بھاگتا ہے۔ استغفراللہ۔ ہم کون سا بہت زیادہ دین دار ہیں۔ اللہ معاف کرے بس لنگڑے لولے سے قدم اٹھاتے ہیں من مرضی کے چند احکامات پر عمل کرلیتے ہیں' ذرا پردہ کرلیتے ہیں اور بس' اس پاک ذات نے اسی پر ایسا رتبہ بنادیا کہ لوگ ہمیں اللہ والے سمجھنے لگے۔ ہمارے ماحول کو گھٹن زدہ اور ہماری اقدار کو انتہا پسندی شمار کرنے لگے۔ ایسے میں بھلا وہ ہمیں بیٹی کیوں دینے لگے ثمرہ۔ حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے۔" سعیدہ بیگم اپنی بڑی بیٹی ثمرہ کو سمجھا رہی تھیں۔

"لیکن امی... مجھے نہیں لگتا کہ اساور بجو کی سوچ ایسی ہوسکتی ہے۔ وہ بہت مختلف نیچر کی ہیں۔ آسیہ مامی خود ایسی سوچ رکھتی ہیں۔ اگر بجو سے الگ سے پوچھا جائے تو..." سعیدہ بیگم نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

"نہیں ثمرہ ایسا کرنے کا سوچنا بھی مت۔ رشتے ٹوٹے کانچ کی مانند ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں شفاف' بے داغ اور خوب صورت' لیکن انہیں برتنے میں احتیاط لازم ہے۔ ورنہ کرچیاں جڑتی نہیں ہیں زخم خوردہ کردیتی ہیں۔ عمر کا جہاں جوڑ اللہ پاک نے بنایا ہے' میری دعا ہے وہی اسے سامنے لانے کا سبب آسانی کے ساتھ پیدا کرے۔" وہ قطعیت سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں اور وضو کے لیے واش بیسن کی طرف بڑھ گئیں' جو لاؤنج کے ایک کونے میں نصب تھا۔ ثمرہ غائب دماغی سے انہیں دیکھتی رہی۔

عمر شہزاد احمد' ان کا پیارا راج دلارا اکلوتا بیٹا تھا جو...

ایک مشہور ٹیکسٹائل مل میں انجینئر کے عہدے پر فائز تھا۔ ثمرہ بریرہ کی ہم عمر بھی اور سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ اس کے بعد نمرہ میٹرک میں اور حمرہ سیونتھ کلاس میں تھی۔ آسیہ ان کی بڑی بھابھی، ان کی سیکنڈ کزن بھی لگتی تھیں۔ سعیدہ کی نندیں نجمہ اور سلمیٰ، آسیہ کی بھابھیاں بھی تھیں۔ نجمہ کے شوہر رؤف اور سلمیٰ کے شوہر منور تھے۔ آسیہ لوگ بس تین بہن بھائی تھے جبکہ شہزاد صاحب تین بھائی اور تین بہنیں تھے۔ سعیدہ بھی گھر کی بڑی بھابھی تھیں۔ شہزاد صاحب کے بعد نجمہ پھر سلمیٰ پھر سمیعہ اور آخر میں بھائی خالد اور شاہد تھے۔ سب کی شادیاں خاندان ہی میں ہوئی تھیں۔ یوں سب کے ددھیال ننھیال ملے جلے تھے۔ نجمہ اور سلمیٰ نے بھی اپنے اپنے بیٹوں کے رشتے اسا اور کے لیے دیے تھے۔ انہیں بھی صاف انکار کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نجم صاحب بیٹی اپنے سے بھی اونچے خاندان میں دینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ان کی خواہش جائز تھی، لیکن بہن بھائیوں کا خلوص انمول ہوتا ہے۔ ان کی نخوت نے سب کا دل دکھایا تھا۔ پھر دونوں بہنوں نے اپنے اپنے بیٹوں کے رشتے ثمرہ کے لیے پیش کردیے۔ بڑے بیٹے ثمرہ کے جوڑ کے نہ تھے سو شہزاد صاحب نے سلمیٰ کے دوسرے نمبر کے بیٹے احمر کے لیے ثمرہ کا رشتہ دے دیا۔ نجمہ سلمیٰ آپس میں دیورانی جٹھانی تھیں اور ان کا ایکا مثالی تھا۔ شہزاد صاحب کی سلمیٰ سے زیادہ بنتی تھی اس لیے انہوں نے اسے ہی رشتہ دیا جس پر نجمہ نے بالکل برا نہیں منایا۔ وہ اپنے بھائی بھابھی کو ماں باپ کا درجہ دیتی تھیں۔ ان کے بچوں کی تربیت کی دل سے معترف تھیں۔

سعیدہ بیگم خاندان میں کسی بھی تقریب میں جاتیں ان کا سر ڈھکا رہتا تھا۔ اسی طرح ان کی بیٹیوں کے سر پر جما اسکارف کبھی ڈھیلا نہیں پڑتا تھا۔ ان کی حتمی المقدور کوشش ہوتی کہ خود کو اور اپنی اولاد کو بڑی برائیوں سے بچائے رکھیں اور ہر ممکن حد تک دین کے احکامات پر عمل کریں۔ جہاں عمل کم ہوتا وہاں بھی وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھیں، مگر پروقار ڈھکے ہوئے ملبوسات میں سر ڈھکے دھلے دھلائے چہروں پہ معصومیت کو میک اپ کی جگہ اوڑھے سلیقے سے بیٹھی رہتی تھیں۔ ثمرہ اور نمرہ سمجھدار اور سنجیدہ مزاج تھیں البتہ حمرہ سب سے چھوٹی گھر بھر کی لاڈلی تھی اور شوخ مزاج تھی، وہ کبھی کبھی ماں سے الجھ پڑتی تو تب سعیدہ بیگم پیار سے سمجھاتیں اور حجاب میں لپٹے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہتیں۔

"اس حجاب کے ہالے میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہیں میری بیٹیاں۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا حمرہ۔ خوب صورتی کا اثر فوری تو ہوتا ہے مگر گہرا نہیں۔ حیا کا اثر فوری نہیں، لیکن گہرا اور دیرپا ہوتا ہے اور میری بچیوں میں حیا ہے۔ جو اللہ پاک کا پسندیدہ وصف ہے۔" تب اس کا قلق دور ہوجاتا تھا ان ہی باتوں کی وجہ سے وہ تینوں مطمئن ہوجاتی تھیں اور حجاب کے ہالے میں خود کو محفوظ محسوس کرنے لگی تھیں۔

✡ ✡ ✡

مجھ میں بے لوث محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
تم جو چاہو میری سوچوں کی تلاشی لے لو

رات کا دوسرا پہر تھا، رات چاندنی بھی نہ تھی۔ اسے چاندنی رات پسند بھی نہ تھی۔ کیونکہ وہ اپنے محبتوں اور شدتوں میں چاند کو بھی ہمراز بنانا گوارا نہ کرتا تھا۔ وہ چاند جو جوبن کی راتوں میں عین اس کی کھڑکی کے سامنے اونچائی پہ کھڑا مسکراتا ہوا اس کے کمرے میں تانکا جھانکی کرتا دکھائی دیتا تھا۔ ایسے میں وہ کمرے کی کھڑکی بند کرکے پردے بھی برابر کردیتا تھا۔ اس کا محبوب ستاروں جیسا تھا، سو اسے ستارے ہی پسند تھے۔ نور کا منبع۔

لازم تو نہیں کہ زباں اظہار کرے
کچھ جذبوں کو احساس ہوا دیتے ہیں
خاموش محبت بھی عبادت ہے فراز
ایسی محبت کو فرشتے بھی دعا دیتے ہیں

اب پتا نہیں اس کی محبت کو فرشتے دعا دیتے تھے یا نہیں۔ اس کی بس اتنی ہی خواہش تھی کہ اس کی خوشیاں بھی اسے مل جائیں اس پری وش کو' جو اس کی روح پہ قابض تھی' دل و جان میں جز ولازم کی طرح بسی تھی۔ جس کے خیال سے وہ لمحہ بھر بھی جدا نہیں ہو پاتا تھا۔ یہ اس کے اختیار سے باہر تھا۔ وہ بے خبر تھی اور یہ باخبری کے امتحان میں گھرا نالائق طالب علم۔ اگر وہ چاہتا تو اس سے اظہار محبت کرکے اسے پا سکتا تھا' لیکن یہ اس کی اقدار کے منافی تھا۔ وہ ایسی کسی بھی حرکت کو چھچھورپن گردانتا تھا۔ خواہ اسے نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑتا اور وہ اسے کھو دینے کو نقصان سمجھتا بھی کب تھا۔

"محبت ملن سے مشروط نہیں۔"

یہ اس کا فلسفہ تھا۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کے لیے یہی احساس خزینہ زیست کی مانند تھا۔

☼ ☼ ☼

نجمہ اور سلمٰی ابھی ابھی رخصت ہوئی تھیں۔ بریرہ اور اسا ور گیٹ تک ان کے ساتھ گئی تھیں۔ آسیہ بیگم میں ہمت ہی نہ تھی۔ لاؤنج کی سینٹر ٹیبل پر چمکیلے خوب صورت نیلے ریپر میں لپٹا وہ ایک کلو مٹھائی کا ڈبا انہیں کیکٹس کے پودے کی مانند لگ رہا تھا۔ آسیہ بیگم اور نجم صاحب ساکت بیٹھے تھے۔

انہیں خلوص سے لایا گیا وہ ڈبا اپنے چہروں پر طمانچوں کی صورت محسوس ہو رہا تھا گو کہ سلمٰی اور نجمہ نے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا تھا کوئی طنز طعنہ نہیں دیا تھا۔ ان کے انداز نارمل ہی تھے۔ انہیں بھی تعلقات کی خرابی کا ڈر تھا نہ ہی وہ سلمٰی اور نجمہ کے بیٹوں میں سے کسی کے لیے راضی تھے۔ غرور ٹوٹا تو اب بھی نہیں تھا۔ انہیں جو چیز کند چھری سے زخم دے رہی تھی وہ تھی ثمرہ کی عمر۔ یعنی اس کی کم عمری۔ وہ ان کی بریرہ کی ہم عمر تھی اور منگنی شدہ ہو گئی تھی یہاں بھی اب اسا ور کو چھوڑ کر بریرہ کے لیے رشتوں کی لائن لگنی شروع ہو گئی تھی۔ ان کی تشویش بجا تھی۔ اب بھی نہ ہوتی تو سراسر بے وقوفی ہوتی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے فی الوقت موجود چند رشتوں پہ نظر ثانی کی اور کالز کرکے ملاقات کے اوقات طے کیے اس پورے ہفتے وہ ان فیملیز سے ملاقاتیں کرتے رہے فون پر معاملات ڈسکس کرتے رہے ادھر ادھر انویسٹی گیشن کرواتے رہے۔ بالآخر دو ہفتے بعد وہ حتمی نتیجے پر پہنچ ہی گئے۔ تین میں سے ایک رشتہ فائنل ہو گیا۔

سلمان علی... ایک نامور کنسٹرکشن کمپنی میں پراجیکٹ انجینئر کے عہدے پر فائز' اعلا سرکاری عہدے سے ریٹائرڈ جاگیردار باپ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ ماں معروف این جی او کی ڈائریکٹر تھی۔ بڑا بھائی معروف چائلڈ اسپیشلسٹ' بھابھی گائنا کالوجسٹ اور بہن اسکن اسپیشلسٹ' بہنوئی ہارٹ سرجن۔ گھر کا ماحول آزادانہ' اسلام آباد کے پوش ایریا میں بنگلہ تھا۔ بس اور کیا چاہیے۔ بس ایک ڈیمانڈ تھی لڑکے کی طرف سے کہ اسا ور جاب چھوڑ دے۔ جہاں خاندان کا ہر فرد جاب کر رہا تھا وہاں ایسی ڈیمانڈ عجیب تو لگی' لیکن یہ سوچ کر پروا نہ کی کہ گھر کی عورتوں کو جاب کرتا دیکھ کر مرد عموماً" بے زار آجاتے ہیں۔ سلمان بھی ایسا ہی ہو گا۔ منگنی کا ان کے ہاں رواج نہ تھا۔ نکاح پر اصرار کیا گیا۔ نجم صاحب نے ہامی بھر لی اور ساتھ ہی اسا ور کو جاب سے ریزائن کرنے کا کہہ دیا گیا۔ سال بھر بعد رخصتی ہونی تھی۔ یوں نکاح کا فنکشن ارینج کر لیا گیا۔ میریٹ اسلام آباد کے کرسٹل بال روم ہال میں بکنگ کروائی گئی۔ نجم صاحب نے گویا تجوری کا منہ کھول دیا۔

"سب کچھ اتنا عالیشان اور شاندار ہونا چاہیے کہ یہ فنکشن مدتوں یاد رہے۔" نجم صاحب تکبر سے بولے۔ یہ فنکشن مدتوں ہی یاد رکھا جانے والا تھا۔ ان کی بات حرف بہ حرف پوری ہونی تھی۔ اسٹیج' سجاوٹ' کیٹرنگ' مینو' استقبال ہر چیز بے مثال تھی۔ لازوال تھی۔ ٹی پنک پھولوں سے سجے اسٹیج پہ ایک شان اور تمکنت سے بیٹھی اسا ور نجم مکمل سفید لباس میں شہزادی ہی تو لگ رہی تھی۔ سلمان کی چوائس پر اس کا

اور اساور دونوں کا لباس مکمل سفید تھا۔ چاند سورج کی جوڑی سجی تھی۔

پھر نکاح کی رسم کا وقت آیا اور اساور نجم لمحوں میں اساور سلمان علی بن گئی۔ آنسو ٹوٹ کر گال پر سے پھسلتے ہوئے نکاح نامے پہ گرے تو آسیہ بیگم ضبط بھلا کر اساور سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ بریرہ کے بھی آنسو بہہ نکلے۔ وہ دانش کے کاندھے سے لگ کر سسکنے لگی۔ مہمانوں کے ڈنر کے دوران اساور دوستوں کے ہمراہ رہی تو ان کی خوش گپیوں اور چھیڑ چھاڑ سے وہ بہتر محسوس کرنے لگی۔ آسیہ بیگم اور بریرہ بھی نارمل ہو چکی تھیں۔ محفل میں پھر سے رنگ بکھر گئے تھے۔ خاندان کی کچھ چلبلی لڑکیاں ڈانس پیش کرنے کے لیے ڈیک پر گانا سیٹ کروا رہی تھیں۔ سعیدہ بیگم حسب طریق اپنی بیٹیوں کے ساتھ ایک کونے میں قدرے الگ تھلگ سی ٹیبل پر پورے وقار کے ساتھ براجمان تھیں۔ نجم صاحب اب پرسکون بیٹھے شہزاد صاحب سے گپ شپ میں مصروف تھے۔ اسٹیج پر سلمان علی کے پہلو میں طمانیت سے بیٹھی اساور کسی بات پہ مسکرا رہی تھی۔ آسیہ بیگم اسے دیکھ کر کھل کر مسکرائیں۔ اسٹیج سے کافی دور انٹرنس کے پاس کھڑے عشق کے پیکر کی دو محبت بھری آنکھوں نے اپنی اولین محبت کو مسکراتے دیکھا اور خود بھی مسکرا دیا۔ اس کی زندگی خوش تھی اس کے چار سو خوشیوں کی کلیاں چٹکنے لگیں۔ وہ کلیوں کو پھول بنتا دیکھتا رہا۔ ہر شخص کے چہرے پر کھلی مسکراہٹ کا محرک جدا تھا، ہر شخص دوسرے کے محرک سے انجان تھا۔ صد شکر کہ انسان غیب کا علم نہیں جانتا۔

☆ ☆ ☆

نجم صاحب سکون سے آنکھیں موند لیتے، آسیہ بیگم شکر کے سجدے میں گر جاتیں، بریرہ کی آنکھوں میں شرارت مچلنے لگتی اور دانش مبہم سا مسکرا کر ادھر ادھر ہو جاتا جب اساور کے قہقہے سنائی دیتے، جب اس کے چہرے پہ شفق، دھنک جیسے رنگ بکھراتی اور وہ ست رنگ اس کے چہرے کو کھلتا پھول بنا دیتے۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے اپنے دل میں مقام دے دیا ہے۔ سلمان تقریباً" روز ہی اسے کال کرتا لمبی لمبی باتیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی خوش مزاج سا بندہ تھا اور اس کا سینس آف ہیومر بھی غضب کا تھا۔ بس ایک بات تھی کہ وہ گھر اور گھر والوں کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ کبھی اساور بات کرتی تو وہ خوب صورتی سے ٹال جاتا تھا۔ اس کی باتوں سے ہمیشہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یورپ سیٹل ہونا چاہتا ہے۔ اس کی فیملی ویل آف تھی، لیکن ملک سے باہر جانے کا شاید کسی نے نہیں سوچا تھا۔ اس کے بہن بھائی نے اسپیشلائزیشن بھی پاکستان سے ہی کیے تھے۔ البتہ اس نے اپنے جیٹھ احسان علی کی بیوی مریم کے بارے میں سنا تھا کہ اس نے اسپیشلائزیشن امریکا سے کیا تھا اور وہ شادی کے بعد امریکا ہی سیٹل ہونا چاہتی تھی، لیکن احسان نہیں مانے تھے سو وہ بھی یہیں جاب کر رہی تھی۔ یہ سب باتیں ابتدائی ملاقاتوں میں معلوم ہوئی تھیں اور بس۔ اس کے بعد ان کی جانب سے خاص آمدورفت بھی نہ ہوتی تھی اور نہ ہی سلمان کوئی گھریلو بات کرتا تھا۔

اساور کی جاب سے متعلق بھی اس نے یہی کہا تھا کہ اسے جاب کرنے والی لڑکیاں پسند نہیں، خاص طور سے وہ شادی کے بعد خواتین کی جاب کے حق میں بالکل نہ تھا۔ یہ ایک بالکل نارمل سی بات تھی جس گھر کی تمام خواتین جاب کرتی ہوں وہاں عموماً" کوئی نہ کوئی اولاد اس سیٹ اپ کے خلاف ضرور ہوتی ہے۔ بس یہی سوچ کر اساور نے اپنی اتنی بہترین جاب سے ریزائن کرتے ہوئے ذرا بھی قلق محسوس نہ کیا۔ آسیہ بیگم نے بھی اسے یہی کہہ کر سمجھایا تھا کہ

"بیٹا شادی کے بعد عورت کی جاب صرف اس کا گھر ہونی چاہیے۔ شوہر کی کیئر، بچوں کی بہترین تربیت اور نوکروں کی بجائے اپنے ہاتھ سے کام کرنا، نوکروں پر کم سے کم انحصار کرنا ہی عورت کی جاب کے جزو ہیں۔" اساور دل سے قائل ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اساور اور سلمان کی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ اب وہ اکثر دن میں کئی بار کال کرلیتا تھا۔ البتہ نکاح کے بعد سے نہ تو ان کے گھر سے کوئی اساور کے گھر آیا تھا نہ ہی سلمان نے کبھی ساس سسر یا سالے' سالی سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ دونوں بس ایک دوسرے میں ہی خوش اور مگن تھے۔ نکاح بلاشبہ ایک مضبوط بندھن ہے۔ منگنی کا رشتہ ہوتا تو آسیہ بیگم تشویش کا شکار ہوتیں' لیکن اب وہ بھی مطمئن تھیں۔ ان ہی سکون بھرے روز و شب میں بریرہ کے لیے ایک انتہائی بہترین پروپوزل آیا۔ مسعود لغاری' مشہور انڈسٹریلسٹ تھے اور ان کی وائف مسز شاہانہ مسعود کا اسلام آباد میں ذاتی پارلر تھا جس کا بڑا نام اور رتبہ تھا۔ شاہانہ بھی عام پارلر اونرز کی طرح پرسنالٹی کے برعکس انتہائی ڈیسنٹ' ویل ڈریسڈ اور سوبر خاتون تھیں اور ان کے چہرے پر انتہائی نیچرل میک اپ ہمہ وقت رہتا تھا ان کے دو ہی بچے تھے۔ بڑی بیٹی رامین ایم فل سائیکالوجی تھی اور شادی کے بعد شوہر کے ہمراہ کینیڈا اسیٹل تھی۔ اکلوتا بیٹا اسفندیار لغاری سوفٹ ویئر انجینئر تھا۔ یہ پوری فیملی کینیڈین نیشنل تھی اس لیے اسفندیار اور رامین کی تعلیم بیرون ملک ہی ہوئی تھی۔ اسفندیار کا اپنا سافٹ ویئر ہاؤس تھا۔ بریرہ سے اسفندیار کی عمر کا فرق واضح تھا' لیکن سوچ بچار اور تحقیقات کے بعد نجم صاحب اتنے مطمئن ہوئے کہ یہ فرق نظر انداز کردیا گیا۔ بریرہ محض انٹر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اسفندیار کی فیملی میں سب ہی اعلا تعلیم یافتہ تھے۔ اس عذر پر شاہانہ بیگم نے وعدہ کیا کہ وہ لوگ خود بریرہ کو اعلا تعلیم دلوانے میں بھرپور تعاون کریں گے۔ اس معاملے میں اسفندیار بھی ہم خیال تھا۔ انہیں بریرہ اس قدر پسند آگئی تھی کہ وہ ہر عذر کو چٹکیوں میں اڑا رہی تھیں۔ یوں اساور کے نکاح کے ٹھیک چھ ماہ بعد بریرہ کے بھی نکاح کی تاریخ رکھ دی گئی۔ رخصتی دونوں کی ایک ساتھ ہونا طے پائی۔ ان تمام

فیصلوں میں اساور کے سسرالیوں کو بھی بھرپور طریقے سے شامل رکھا گیا۔

یوں ایک سہانی سی شام اسی سی بی آر ہال میں بریرہ بھی دلہن کا روپ وھارے بجلیاں گراتی اسٹیج پہ براجمان تھی۔ باٹل گرین اور انک بلیو کامدار لانگ شرٹ اور ٹراوزر میں ملبوس میچنگ زیورات اور لائٹ مگر خوب صورت میک اپ میں پریوں کا سا معصوم روپ لیے بریرہ اپنے شہزادوں سی آن بان والے شریک حیات کے ہمراہ بیٹھی خوب جچ رہی تھی۔ اسے یہ اعزاز حاصل تھا کہ اسے اس کی ساس نے خود تیار کیا تھا جو کہ اپنے پارلر میں صرف چنیدہ برائیڈز کو ہی تیار کرتی تھیں ایک عالم بریرہ کی قسمت پر رشک کر رہا تھا' مسٹر اینڈ مسز لغاری کی شہرت ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ شہر کی کریم کی حیثیت سے سب ہی انہیں پہچانتے تھے۔ فنکشن میں سلمان تمام وقت اساور کے ہمراہ رہا۔ اس نے فخر سے اسے سب سے ملوایا تھا۔ اس کی چھوٹی لاڈلی بہن کا نکاح تھا۔ اس کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے برعکس سلمان چپ چپ سا رہا۔ بڑا داماد ہونے کے ناطے اسے بیٹوں کی طرح نجم صاحب کے ساتھ انتظامات میں پیش پیش رہنا چاہیے تھا' لیکن وہ وی آئی پی گیسٹ بنا رہا۔

بیٹی خوش ہو تو ماں باپ داماد کی ہزاروں خامیوں کو اگنور کر دیتے ہیں اور کسی بھی شکوے کو زبان پہ لانے سے پہلے ہی دفن کر دیتے ہیں۔ ماں باپ کے لیے ہر لحظہ اپنی اولاد کی خوشی مقدم ہوتی ہے۔ ایک بار والدین کے عہدے پہ فائز ہو جانے کے بعد وہ اپنی خوشی اپنی چاہت حرف غلط کی طرح فراموش کر دیتے ہیں بس نجم صاحب اور آسیہ بھی اسی کیفیت میں تھے۔ ان کی پلاننگ اس بار بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی' وہ اسی سرخوشی میں اپنی بروقت عقل مندانہ حکمت عملی پر لوگوں سے داد و تحسین وصولتے پھر رہے تھے۔ جب انسان عروج پر بیٹھا ہو تو اس کی گردن پر سجا خوش نما چہرہ اونچا ہی رہتا ہے وہ جہاں سے گزرتا ہے اٹھے سر کے ساتھ گزرتا ہے اور اٹھے سر کے ساتھ چلتے ہوئے وہ زمین پہ گرا کیلے کا چھلکا نہیں دیکھ پاتا۔ کیلے کا چھلکا' جو الٹا گرا ہو تب چھلکا پھسلتا ہے اور اگر سیدھا گرا ہو تب اس پر آنے والا پاؤں پھسلتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انسان گرتا ہے اور بری طرح گرتا ہے۔ کمر کے بل گرتا ہے اور منہ کے بل گرنے والے نہیں جانتے کہ کمر کے بل گرنا زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ وجود کا سارا بوجھ اس کمر پر ہی تو ہوتا ہے۔ نجم صاحب اور آسیہ بیگم کی کمر توڑنے کے لیے سلمان علی بھی کیلے کا چھلکا ثابت ہونے والا تھا۔ الٹا ہو تا یا سیدھا گرنا لازم ہے۔

☼ ☼ ☼

حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے
کسی چراغ میں ہم ہیں کسی کنول میں تم
کہیں جمال ہمارا کہیں تمہارا ہے
وہ کیا وصال کا لمحہ تھا جس کے نشے میں
تمام عمر کی فرقت ہمیں گوارا ہے
ہر اک صدا جو ہمیں بازگشت لگتی ہے
نجانے ہم ہیں دوبارہ کہ یہ دوبارہ ہے
وہ منکشف مری آنکھوں میں ہو کہ جلوے میں
ہر ایک حسن کسی حسن کا اشارہ ہے
عجب اصول ہیں اس کاروبار دنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اتارا ہے
کہیں یہ ہے کوئی خوشبو کہ جس کے ہونے کا
تمام عالم موجود استعارا ہے
نجانے کب تھا! کہاں تھا مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کبھی گزارا ہے
یہ دو کنارے تو دریا کے ہو گئے ہم تم
مگر وہ کون ہے جو تیسرا کنارا ہے

وہ اپنے روز مرہ کے جنون میں مگن تھا۔ روز ڈائری لکھنا' روز اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے اشعار ڈھونڈنا انہیں ڈائری میں رقم کرنا اس کا نام لکھنا اور لکھتے ہی

جاتا۔ شاید کبھی اس ماہ رو ماہ جبیں کو یہ سب شدتیں دکھانے کا موقع مل ہی جائے۔ شاید کبھی وہ اس کے دل کے ساتھ ساتھ اس کی دنیا میں بھی رنگینی بکھرانے آہی جائے۔ بس وہ ایسا ہی تھا۔ اپنے ہی جذبوں میں قناعت پسند۔ بے لوث۔

☼ ☼ ☼

بریرہ کے نکاح کے بعد سے اساور کو سلمان کے بدلے بدلے انداز کھٹک رہے تھے۔ اس کے رویے میں عجیب سی رکھائی اور سرد مہری ہوتی تھی۔ اساور مزاجا" صلح جو اور نرم خو لڑکی تھی اور لڑائی جھگڑوں اور اختلافات سے دور بھاگتی تھی۔ سو سلمان کی رکھائی محسوس کرنے کے باوجود اس نے سوال کرنے سے پرہیز کیا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ اپنا رویہ نارمل رکھے تاکہ وہ بھی دھیرے دھیرے نارمل ہو جائے' لیکن اب ایسا ہوتا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ پھر بلی تھیلے سے باہر آہی گئی۔ اس روز بھی دوپہر کو وہ لنچ کے بعد آرام کی غرض سے کمرے میں آئی تھی جب سلمان کی کال آئی۔ بیڈ پر نیم دراز وہ اس سے گپ شپ میں مگن ہو گئی۔ باتوں باتوں میں بریرہ کی سسرال کا تذکرہ آیا تو سلمان بھڑک اٹھا۔

"بڑی اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے تم لوگوں نے۔ مانتا ہوں بڑے لوگ ملے ہیں تمہاری بہن کو' لیکن اب تم لوگ ہر وقت اسی کا راگ الاپتے رہو گے کیا؟" اس کے تذلیل بھرے انداز پر اساور دنگ ہی تو رہ گئی۔ چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ پھر بدقت خود کو نارمل کیا اور قصدا" ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

"تو آپ کوئی کسی سے کم ہیں کیا؟" اس نے جان بوجھ کر دلبرانہ انداز اپنایا اور مزید بولی۔

"اچھا ہے نا بریرہ کو ایسا بندہ ملا ورنہ ہمارا کپل دیکھ دیکھ کر بریرہ خوامخواہ جیلس فیل کرتی رہتی۔" محض سلمان کو نارمل کرنے کی خاطر وہ ایسی اوچھی بات کہہ گئی ورنہ سب جانتے تھے کہ بریرہ بہن پر جان دیتی

"تو کیا اب تم حسد محسوس نہیں کرتی بریرہ سے؟" کچھ بری طرح سے چبھا تھا اساور کو۔ وہ پھر ضبط سے پی گئی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو سلمان۔ آپ اپنا موازنہ اسفندیار سے کیوں کر رہے ہیں۔ میرے لیے آپ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی شخص نہیں۔" اس کی بات کی صداقت میں ایک فیصد بھی شک کی گنجائش نہ تھی' لیکن وہ جانتی نہیں تھی کہ ابھی مزید اسے کیا کیا بھگتنا ہے۔

"نکاح والے روز جیسے تم کھلی پڑ رہیں تھیں' اس کا تعارف کرواتے وقت تمہارے انداز میں جو فخر و غرور تھا' اساور صاحبہ میں اندھا نہیں ہوں۔ اتنی خوش تو تم میرے ساتھ کبھی نہیں ہوئی۔" وہ منجمد ہو گئی۔ یہ سب کچھ ٹھیک سے چلتے چلتے اچانک غلط کیوں ہونے لگا تھا' اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ بہت مشکل سے ہمت مجتمع کر کے جب وہ بولی تو اس کی آواز بھیگی بھیگی سی تھی۔

"آپ غلط سوچ رہے ہیں سلمان' وہ میری چھوٹی لاڈلی بہن ہے۔ اس کے حوالے سے اسفندیار بھی میرے لیے دانش جیسا....." سلمان تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"اسفندیار نہ تو دانش جیسا ہے نہ وہ دانش ہے۔ وہ تمہارا بہنوئی ہے اور نامحرم ہے تمہارے لیے۔"

"نامحرم۔" اساور نے تعجب سے موبائل کان سے ہٹا کر اسے گھورا۔ یہ لفظ اس شخص کے منہ سے کچھ اجنبی سا لگ رہا تھا جس کا خاندان پاکستان میں ہی لندن' امریکا کا کلچر لے کر چلتا تھا اسے یہ لفظ عجیب لگنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ دین ان کے خاندان کے لیے بھی نماز' روزہ' زکوۃ سے آگے کچھ بھی نہ تھا' لیکن ناجائز وکالت کے وقت دین وہ آخری کیل جیسا حربہ ہوتا ہے۔ جو دنیادار لوگ آزماتے ہیں اور بڑی ڈھیٹ قسم کی بے شرمی سے آزماتے ہیں۔ اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے۔

"اس قدر تو تم اب تک مجھ سے بھی فرینک نہیں

ہوئی جتنا تم اسفندیار سے فری ہو رہی تھی۔ میں جو تمہارا شوہر ہوں۔ تمہاری وفاؤں کا اصل حق دار۔"
"سلمان۔" اساور چیخی۔
"میری وفاؤں پہ شک کر کے مجھے میری ہی نظروں میں مت گرائیں۔ میرے لیے آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔" بے بسی سے وہ رو پڑی۔ دانش ور کہتے ہیں کہ جو آپ کا دوست ہے اسے آپ کی وضاحتوں کی ضرورت نہیں اور جو دشمن ہے وہ کبھی آپ کی وضاحتوں کا اعتبار نہیں کرے گا۔ وہ سلمان کو کس کیٹگری میں ڈالتی؟ یہ ہمارا المیہ ہے کہ آج کل سب سے زیادہ وضاحتیں ہمیں اپنوں کو ہی دینی پڑتی ہیں۔ وہ رو رہی تھی اور سلمان اعتبار نہیں کر رہا تھا۔ ابھی اسے ایک لمبا عرصہ وضاحتیں دینی تھیں۔
"اب یہ رونا دھونا بند کرو اور یہ بات یاد رکھنا کہ مجھے تمہارا یوں ہر کسی سے فری ہونا قطعی پسند نہیں۔" سلمان کا انداز بے لچک اور دو ٹوک تھا۔ اساور کے آنسو یک لخت تھم گئے۔ وہ ہاتھوں سے چہرہ رگڑ کر بے تاثر لہجے میں بولی۔
"ٹھیک ہے آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" چند ایک باتوں کے بعد سلمان نے فون بند کر دیا۔ اساور کتنی ہی دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔ سوچتی رہی۔ اس نے خود کو بہلانے کے لیے تاویلیں گھڑلیں۔
"کوئی بات نہیں کچھ مرد ایسے ہوتے ہیں، اپنے قریبی رشتوں کے حوالے سے ازحد پوزیسو۔ میں آئندہ احتیاط سے چلوں تو ان کی شکایات دور ہو سکتی ہیں۔" وہ اساور تھی۔ بہل سکتی تھی، لیکن مدمقابل سلمان علی تھا۔ اسے بہلانا ممکن ہی نہ تھا۔ نجم صاحب جگہ جگہ کہتے پھرتے تھے۔
"ہم نے داماد ایسا چنا ہے جو لاکھوں میں ایک ہے۔" وہ بالکل صحیح دعوا کرتے تھے۔ سلمان علی واقعی لاکھوں میں ایک تھا۔ عقل کل بننے والے کو حقیقی عقل کل خواب غفلت سے جگانے والا تھا۔ بہت جلد۔۔۔

تلخ حقیقتوں کے بے نقاب ہونے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ انسان فطرتاً"خوش گمان ہے شاید اسی لیے لمبی عمر جیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جب اساور کی خوش گمانیوں کے گھروندے کو پہلی شدید ترین ضرب لگی۔ وہ آسیہ بیگم کے ساتھ کچن میں ڈنر کی تیاری کے دوران مدد کروا رہی تھی۔ نجم صاحب کسی کلائنٹ کے ساتھ کال پہ بات کرتے کرتے روم میں چلے گئے تھے۔ اوپن کچن سے وہ سامنے لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے دانش اور بریرہ پر گاہے بگاہے نظریں ڈال لیتی تھی۔ وہ چمکتے دمکتے کاؤنٹر پر سبزیاں پھیلائے کھٹا کھٹ سلاد کے لیے سبزیاں کاٹ رہی تھی جب ذرا فاصلے پر پڑا اس کا موبائل روشن ہوا۔ رنگ ٹون کی آواز پر آسیہ بیگم نے ہنڈیا بھونتے بھونتے مڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جس کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی تھی۔
"امی جسٹ ویٹ سمیعہ کی کال ہے۔ میں آتی ہوں۔" وہ کہتی ہوئی کچن ٹاول سے ہاتھ پونچھتی موبائل اٹھا کر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ آسیہ بیگم نے سلاد کے لیے بریرہ کو بلالیا۔ وہ جانتی تھیں سمیعہ اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اور دو سال قبل ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ سخت گیر سسرال میں پریشان رہا کرتی تھی تو کبھی کبھی اساور سے بات کر کے دل ہلکا کرلیا کرتی تھی۔ آسیہ بیگم کو وہ ذاتی طور پر بے حد پسند تھی۔ بے حد سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اگر دانش سے بڑی نہ ہوتی تو وہ ضرور اسے بہو بنالیتیں۔ اس وقت بھی وہ پریشان ہی تھی اس لیے اساور کو کال کی تھی۔ اس سے بات کرتے کرتے اساور اپنے کمرے میں جاکر بیڈ پر نیم دراز ہوگئی۔ تقریباً" دس منٹ گزرے ہوں گے جب کال ویٹنگ بیپ بجنے لگی۔ اساور نے موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا "سلمان کالنگ" وہ متذبذب ہوگئی، لیکن سمیعہ کو بیچ میں ٹوکنا اسے بالکل مناسب نہیں لگا تو اس نے سوچا کہ سلمان کال کو ویٹنگ پہ دیکھ کر خود ہی انتظار کرلے گا" مگر یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ سلمان نے کال کرنا ترک نہیں کیا۔ اس نے سمیعہ سے معذرت کر کے سلمان کی کال لی۔ اور۔۔۔

"کس سے بات ہو رہی تھی جو میری کالز اگنور کرتی رہی تم۔۔۔" اس کے انداز میں رچے بسے شک نے اساور کو سانپ کی طرح ڈسا وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ اس نہج پر آجائے گا۔ اس نے لاکھ وضاحتیں دیں مگر وہ قائل نہیں ہوا۔ چھ ماہ جان چھڑکنے والے محبت بھرے شوہر کا رول پلے کرتے کرتے یکایک وہ پینترا بدل کر روایتی شوہرانہ حاکمیت دکھانے لگا تھا' یہ کایا پلٹ اساور کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو۔ ابھی یہ درجن بھر دوستیاں ختم کرو مجھے یہ فضولیات بالکل پسند نہیں۔ شادی کے بعد تمہارے تمام روابط ختم۔ خواہ وہ دوست ہوں یا رشتہ دار۔ میں کل ہی تمہیں نئی سم بھجوا دوں گا۔ اس میں صرف اور صرف میرا نمبر ہونا چاہیے۔ سمجھی تم۔ صرف میرا نمبر۔"

"سمجھ گئی۔"

"گڈ۔" مردانہ انا کو تسکین ملی تھی۔ نسوانی پندار کو ٹھیس لگی تھی۔ اگلے دن نئی سم پہنچ گئی۔ اس نے اس میں سلمان اور اپنے گھر والوں کے نمبرز سیو کر کے پرانی سم توڑ کر پھینک دی۔ اگر وہ اس چیز سے خوش ہوتا تھا تو اساور کے نزدیک یہ برا سودا نہ تھا' لیکن اگر وہ خوش ہو بھی جاتا تو۔۔۔

اس کے اعتراضات کی فہرست طویل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جواب دیتی تو بھی پھنستی' چپ رہتی تب بھی وہ بھڑکتا۔ بس وہ مہر بہ لب سہتی جا رہی تھی' اس نے کسی کو اس معاملے کی بھنک نہیں پڑنے دی تھی۔ وہ خود کو اپنی طفل تسلیوں سے بہلا رہی تھی کہ رخصتی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا' لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ حالات بگڑتے ہی جا رہے تھے۔ ان ہی دنوں دانش کو (اے سی سی اے) ACCA مکمل کرتے ہی لاہور میں جاب آفر ہوئی۔ آفرز اسلام آباد کی بھی تھیں' لیکن لاہور والی آفر بے حد پرکشش تھی۔ گھر والوں سے بے حد اٹیچ منٹ کے باوجود اسے یہ آفر قبول کرنا ہی پڑی کیریئر کا معاملہ تھا۔ سب نے دل پر پتھر رکھ کر اسے دعاؤں کے سنگ رخصت کیا تھا' لیکن اسے جذباتی طور پر ایڈجسٹ کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ جاب کے بعد جونہی وہ فارغ ہوتا گھر فون کرتا ایک ایک فرد سے بات کرتا کبھی اسکائپ پر بلا لیتا۔ وہ اساور سے بہت اٹیچڈ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی کمی بری طرح محسوس کرتے تھے۔

اس روز بھی معمول کے مطابق سب سے بات کرنے کے بعد اس نے اساور کو دوبارہ اس کے موبائل پر کال کی۔ انہیں بات کرتے بمشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ بیچ میں سلمان کی کال آنے لگی۔ اس نے بے پناہ کوفت محسوس کرتے ہوئے دانش کو کال بیک کرنے کا کہا اور سلمان کی کال وصول کی۔ دوسری طرف وہ بھرا بیٹھا تھا۔

"تمہیں عزت کی زبان راس نہیں آتی جب میں نے بکواس کی تھی کہ یہ نمبر کسی کو نہیں دینا تو۔۔۔"

"کسی کو نہیں دیا۔ یہ دانش کی کال تھی' وہ لاہور چلا گیا ہے تو ہمیں۔۔۔" ایک بار پھر اس کی بات پوری نہیں ہوئی۔

"تو ہیل ود۔۔۔ جب میں نے کہہ دیا کہ کوئی نہیں تو کوئی نہیں۔ کیا مجھے ہر روز نئے سرے سے قواعد و قوانین دہرانے پڑیں گے؟۔"

"آپ ایک ہی بار تفصیل سے تمام قواعد و قوانین کلیئر کر دیں۔ بہتر ہو گا۔" پہلی بار اس کے لہجے میں تلخی جھلکی۔

"تو ٹھیک ہے پھر سنو۔ نہ کوئی دوستیاں نہ کوئی تعلق داریاں۔ تمہارا تعلق صرف مجھ سے ہے اور رخصتی کے بعد تمہارا موبائل بھی ختم۔ گھر والوں سے جب مجھے ضرورت محسوس ہوئی تو خود بات کروا دیا کروں گا۔ ملنے کے لیے بھی تم نہیں جاؤ گی وہ لوگ آیا کریں چند گھنٹے گزار کے واپس اور میکے میں رات رہنے کا تو بھول ہی جانا۔ مجھے عورت گھر میں اچھی لگتی ہے۔ نو آؤٹنگ' نو ہوٹلنگ' نو شاپنگ۔ تمہاری ضرورت کی ہر چیز تمہیں گھر پر مل جایا کرے گی۔ مجھے تمہارا آوارہ عورتوں کی طرح باہر پھرنا بالکل پسند

نہیں۔" اساور کا دل کٹ کٹ کر خون ہو رہا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے فریز ہو گئی تھی۔ شدید خواہش کے باوجود وہ یہ جملہ لبوں پہ لانے سے قاصر تھی کہ
"تمہاری ماں، بہن، بھابھی کیا سب آوارہ عورتیں ہیں؟" اس وقت اس کا صرف دماغ کام کر رہا تھا، جسم جیسے مفلوج ہو چکا تھا۔
"ابھی سوچ لو۔ اختلاف ہے تو ابھی فیصلہ کر دیتا ہوں۔" اس جملے میں پنہاں دھمکی نے اساور کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی بھر دی۔
"نہیں۔ ٹھیک ہے۔ آپ کو آئندہ شکایت نہیں ہو گی۔"
"گڈ۔"
"کیا میری ساری عمر اسی ڈکٹیشن میں گزرے گی؟"
"کیا یہ سب اب تک کی پر تعیش سہل زندگی گزارنے کی سزا ہے؟۔"
"کیا یہ میرے ماں باپ کے تکبر کی سزا ہے؟۔"
سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں سے پانی کا ایک قطرہ ٹپکا اور پھر وہ پتلی سی لکیر کی صورت اس کے گال پہ تیرتا ہوا ٹھوڑی پہ جا رکا۔ اگلی لکیر کے اس قطرے تک پہنچنے پہ وہ لڑھک کر اس کی گود میں جا گرا۔ اور بھی قطاریں بندھ گئیں۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ زندگی اسے ایسے بھیانک موڑ پر لا کھڑا کرے گی جہاں آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ ہو گا۔ جب نہ زخموں پر لگانے کو مرہم ملے گا اور نہ ہی پیاس بجھانے کو پانی۔

☼ ☼ ☼

محبت اس طرح جیسے گلابی تتلیوں کے پر
محبت زندگانی کی جبین ناز کا جھومر
محبت آرزو کی سیپ کا انمول سا گوہر
محبت حسرتوں کی دھوپ میں امید کی چادر
محبت ہے تیرے گیسو
تیری پلکیں
تیری آنکھیں
محبت ہے تیری باتیں
محبت ہے تمہارے ہجر کی اور وصل کی راتیں
محبت ہے تیری دھڑکن
محبت ہے تیری سانسیں
محبت تیری خاموشی
تمہاری بات جیسی ہے
محبت کو اگر سمجھو تمہاری ذات جیسی ہے۔

ڈائری لکھتے لکھتے اس نے آخر میں یہ نظم لکھی اور پین ڈائری کے بیچ میں رکھ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ہر رات کا پہلا پہر وہ اپنی خاموش محبت کے نام کرتا تھا جو بھی اس کے دل میں ہوتا اسے حوالہ قرطاس کر کے پر سکون ہو جاتا تھا۔ کئی سال گزر گئے تھے اور ڈائریاں بھر پڑی تھیں اس کے دل کی حکایتوں سے۔ کئی سالوں سے وہ صرف ڈائری کو ہمراز بنائے بیٹھا تھا۔ اگر وہ سارا مواد جمع کرتا تو اس کی خاموش محبت پر ایک بے حد دل فریب ناول تخلیق ہو سکتا تھا۔ وہ خود بھی اپنی اس سوچ پہ ہنس دیتا تھا۔ اگر وہ ادیب ہوتا تو ناول تیار کر بھی چکا ہوتا، لیکن وہ صرف محب تھا۔ وہ صرف اپنے جذبے کاغذوں کے حوالے کرتا تھا۔ اگر وہ کوشش کرتا تو شاعر بھی بن سکتا تھا، لیکن وہ دوسروں کی شاعری میں اپنے دل کی کیفیات ڈھونڈ کر رقم کرنے پر ہی اکتفا کرتا تھا۔ شاید اسے اعتماد نہ تھا اپنی تحریری اور فنی صلاحیتوں پر۔ اعتماد اگر تھا تو بس ایک چیز پر۔
اپنی محبت پر، اپنے جذبوں پر، اپنی سچائی پر، اپنی محبت کے لیے اپنے جذبوں کی سچائی پر۔ سچا شخص لوگوں سے تقاضا نہیں کرتا۔ سچائی کے پھل کا انتظار کرتا ہے۔ صبر اور استقامت سے۔

☼ ☼ ☼

آسیہ بیگم دیکھ رہی تھیں، سوچ رہی تھیں اور موازنہ کر رہی تھیں۔ اساور کھوئی کھوئی رہتی، اجڑی صورت پریشان آنکھیں، الجھا انداز، چڑچڑا لہجہ۔ بریرہ خوش رہتی، مزید کھلی کھلی، وہ اگر کندن تھی تو اسفندیار

کی محبت اور توجہ نے اس کے چہرے پہ گلاب کھلا دیے تھے۔ وہ اگر سہانا موسم تھی تو اسفندیار کی چاہتوں اور مان نے اس کے چہرے کو دھنک رنگ سے سجا دیا تھا۔ بریرہ کو محبت نے اعتماد دیا تھا۔ اساور کو محبت نے کنگال کر دیا تھا' فقیر کر دیا تھا۔ وہ اساور جسے کبھی غصہ آتا ہی نہ تھا' اب غصہ اور جھنجلاہٹ اس کا وطیرہ بنتے جا رہے تھے۔ وہ تنگ مزاج' چڑچڑی اور بدلحاظ ہوتی جا رہی تھی۔ بریرہ اس کی لاڈلی بہن تھی' وہ مر کر بھی اس سے حسد نہیں کر سکتی تھی' لیکن اس کے چہرے پہ پھیلی شفق ایک بار ضرور اساور کو آئینہ دیکھنے پہ مجبور کر دیتی تھی اور وہ ہر بار آئینہ دیکھ کر پچھتاتی تھی۔

آسیہ بیگم کا گمان تھا کہ شاید رخصتی میں تاخیر کی وجہ سے وہ چڑچڑی ہو رہی ہے کیونکہ سال پورا ہو چکا تھا' لیکن اساور کے سسرال والے رخصتی کے معاملے پر سنجیدہ نہیں ہو رہے تھے۔ دونوں بہنوں کی اکٹھی رخصتی والی شرط کی وجہ سے بریرہ کے سسرال والے بھی اب تقاضا کرنے لگے تھے' لیکن اس وقت آسیہ کسی اور ہی نہج پر سوچ رہی تھیں۔ اسی سوچ کے تحت انہوں نے نجم صاحب سے مشورہ کیا۔

"بریرہ ابھی چھوٹی ہے' اس کی رخصتی ذرا لیٹ ہو بھی جائے تو وہ محسوس نہیں کرے گی' لیکن اساور کے ساتھ یہ زیادتی ہے۔ میں سوچ رہی ہوں عالیہ بیگم سے دو ٹوک بات کی جائے۔" نجم صاحب کی حمایت پر انہوں نے اسی وقت اساور کی ساس کو کال ملائی' لیکن رخصتی کی بات کرنے پر عالیہ بیگم نے ان پر دھماکا ہی کر ڈالا۔

"کیسی باتیں کر رہی آپ آسیہ۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سلمان کی جاب ختم ہو گئی ہے۔ دن بھر تو وہ اساور کے ساتھ فون پر بزی رہتا ہے' کیسے ممکن ہے کہ اس نے بتایا نہ ہو۔ ایسے میں رخصتی لینا تو بنتا ہی نہیں۔ نہ سلمان ایگری ہے اور نہ ہی علیم یہ بات پسند کریں گے کہ سلمان کے ساتھ ساتھ اس کی وائف بھی ہم پر ڈیپنڈنٹ ہو جائے۔ ہر کسی کی اپنی لائف ہے' اپنے پرسنل ایکسپینس ہیں۔ آج کے دور میں کوئی کسی کو سپورٹ نہیں کر سکتا۔" وہ آخر این جی او کی ڈائریکٹر تھیں۔ ایسی نان اسٹاپ مدلل تقاریر میں مہارت رکھتی تھیں۔ وہ اور بھی بہت کچھ بول رہی تھیں جو آسیہ بیگم ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ سنتے جا رہی تھیں۔ اساور کے چہرے پر چھایا اضمحلال اور رنگت میں کھلی سرسوں اب کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ آسیہ بیگم کو بہت کچھ غلط ہونے کے اشارے مل رہے تھے۔

ہاتھ زخمی ہوئے کچھ اپنی خطا تھی شاید
میں نے قسمت کی لکیروں کو مٹانا چاہا

☆ ☆ ☆

اس روز وہ سعیدہ کے ہاں ڈنر پر انوائیٹڈ تھے۔ کتنے عرصے سے پریشانیوں کے گھیرے میں پھنسے وہ لوگ کہیں نہ نکلے تھے۔ سعیدہ نے فون کر کے دعوت دی تو آسیہ بیگم کو قفس میں روزن کا سا احساس ہوا۔ بوجھل دل و دماغ کو تھوڑی دیر تازگی کا غسل دینا بہتر تھا۔ انہوں نے خوش دلی سے دعوت قبول کی اور اساور اور بریرہ کو تیاری کا کہہ دیا۔ اساور کو شروع ہی سے اپنی سعیدہ پھپھو اور ان کے گھر کا ماحول بے حد پسند تھا۔ اپنی ماں کے خیالات کے برعکس اسے کبھی ان کا ماحول گھٹن زدہ نہیں لگا تھا۔ وہ ان کی اقدار کی قدر دان تھی۔ ان کی بچیوں کے حجاب میں لپٹے معصوم چہرے اسے بہت بھلے لگتے تھے۔ عمران کا اکلوتا بیٹا تھا' لیکن اکلوتا ہونے کے باوجود بگڑے مزاج کا نہیں تھا۔ سلجھا ہوا' سوبر اور سنجیدہ۔ سلام دعا سے زیادہ اس نے کبھی ان لڑکیوں سے بات چیت نہ کی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ ہی بیٹھتا تھا حالانکہ اساور کے حسن کے آگے بڑے بڑے پانی بھرتے تھے' لیکن وہ عمر تھا۔

مجموعی طور پر ان کے گھر کا ماحول اس قدر اپنائیت بھرا اور کمفوٹیبل ہوتا تھا کہ اساور اپنا کوئی ہم عمر کزن نہ ہونے کے باوجود بھی وہاں سکون محسوس کرتی تھی۔ سو وہ بہت دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ ڈارک سی گرین لانگ شرٹ کے ساتھ وائٹ ٹراؤزر اور دوپٹا لیے'

میچنگ وائٹ سینڈل پہنے' نیچرل سا میک اپ کیے جب وہ کمرے سے نکلی تو لاؤنج میں تیار کھڑی آسیہ بیگم نے پرس کی زپ بند کرتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر... عرصے بعد اسے یوں تیار فریش دیکھ کر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے چہرے پر چاندنی کی مانند پھیلا سکون و اطمینان ان کے اپنے دل میں شانتی کی سبز چادر پھیلا گیا۔ ماں باپ ان کے دل میں اترنے والا سکون بھی ان کی اولاد کے چہرے کی مسکان سے مشروط ہوتا ہے۔ اپنی ذات کے لیے مسکرانا تو وہ کب کا چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ اگر اس وقت ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی یہ جان لیتی کہ سکون کے یہ پل چند گھنٹوں میں کسی چیز میں بدلنے والے ہیں تو وہ گھر سے باہر ہی نہ نکلتیں' لیکن یہ لاعلمی کتنی بڑی نعمت ہے جس کی بدولت ہم چند پل تو سکھ کے گزار ہی لیتے ہیں۔ اسی لاعلمی کے عطا کردہ سکون کے زیر اثر انہوں نے سعیدہ کے گھر قدم رکھا تھا۔ آسیہ بیگم سعیدہ کے ساتھ کچن میں ہی چلی گئیں۔

نجم اور شہزاد صاحب عمر سمیت لاؤنج میں محفل جما کر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کو نمرہ اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ نمرہ' ثمرہ اور بریرہ اپنی خوش گپیوں میں مگن تھیں۔ حمرہ کمپیوٹر پر کوئی ورڈ پزل کھیل رہی تھی۔ اساور سکون سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اس کی گیم دیکھنے لگی' ساتھ ساتھ اسے ہنٹ دیتی جارہی تھی۔ حمرہ اس کی دلچسپی سے بہت خوش ہورہی تھی۔ عین اسی وقت پاس پڑا اس کا موبائل بجنے لگا۔ وہ گھرا اٹھی۔ دیکھے بنا بھی وہ جانتی تھی یہ کال سلمان ہی کی تھی۔ اس کی رنگت لمحوں میں سفید پڑی تھی۔ حمرہ کی اس کی جانب پشت تھی۔ باقی بھی کسی کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا' وہ ٹون سائلنٹ پہ کرتی اٹھ کر باہر نکلی تو لاؤنج میں بیٹھے عمر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف لپکی۔ کچھ تھا اس کے چہرے پہ جو عمر اس کے چہرے سے نظر ہٹا نہیں سکا تھا۔ اساور کی اڑی رنگت' عجلت اور ہاتھ میں دبا موبائل' وہ الجھ سا گیا۔ کال بس بند ہونے والی تھی جب اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی ریسیو کرلی۔

"کہاں تھی اتنی دیر سے؟" وہی مزاج۔

"سلمان میں سب لوگوں کے بیچ بیٹھی تھی' اٹھ کر سائڈ پہ آنے میں ٹائم لگا۔" یوں ہی فضول وضاحتیں دینی پڑتی تھیں سلمان کو۔ ادھر اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"کیوں۔ کہاں ہو تم؟"

"سعیدہ پھپھو کے گھر۔" اور روانی میں کہہ کر وہ بے اختیار پچھتائی وہ یہ بھی تو کہہ سکتی تھی کہ گھر پر مہمان آئے ہوئے ہیں۔

"کس کی اجازت سے۔" سلمان کا لہجہ سرد ہوا۔

"فی الحال میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہوں سو ان ہی کی اجازت کی پابند ہوں۔" وہ چبا چبا کر بولی تو سلمان مزید بھڑکا۔

"محترمہ اساور سلمان صاحبہ آپ میرے نکاح میں ہیں اور دنیا کے کسی بھی کونے میں چلی جائیں آپ میری مرضی اور اجازت کی پابند رہیں گی۔"

"اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو مجھے اپنے ساتھ رکھیں۔ رخصتی کروائیں اور پھر چلائیں اپنی مرضی۔" نجانے کیوں آج وہ دوبدو مقابلے پہ اتر آئی تھی اور یہ چیز اسے بہت مہنگی پڑنے والی تھی۔

"میں تمہیں کئی دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ مجھے یہ آوارہ گردیاں ہرگز پسند نہیں ہیں۔ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ ابھی اور اسی وقت اپنے گھر واپس جاؤ۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں تمہیں لینڈ لائن پر کال کرکے چیک کروں گا لہٰذا مجھ سے ڈرامہ بازی کرنے کا سوچنا بھی مت۔" اساور کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"سلمان پلیز یہ کیا بچپنا ہے۔ میں امی ابو کے ساتھ آئی ہوں' ہماری دعوت ہے یہاں' ابھی ڈنر بھی نہیں لگا' میں کیا کہہ کر واپس جاؤں۔ کچھ تو خیال کریں۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"میں کچھ نہیں جانتا' یہ تمہارا ہیڈک ہے۔ آدھے گھنٹے بعد میں کال کروں گا اور اگر گھر سے تمہارا لینڈ لائن پک نہ ہوا تو اسی وقت طلاق لکھ کر بھجوادوں گا۔"

"سلمان..." اساور کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

اس نے فون بند کردیا تھا۔ ضبط کی انتہاؤں کو جکڑے وہ ڈرائنگ روم سے نکلی اور سیدھی نجم صاحب کے سامنے جاکھڑی ہوئی۔ عمر بری طرح چونکا۔ نجم صاحب بھی اس کا سفید چہرہ دیکھ کر پریشان ہوئے۔

"ابو... مجھے... گھر... جانا ہے... ابھی۔ اسی وقت۔" الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر لبوں سے آزاد ہو رہے تھے وہ خود کو رونے سے باز رکھنے کی کوشش میں ادھ موئی ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے...؟" اسی لمحے برتنوں کی ٹرے اٹھائے آسیہ بیگم لاؤنج میں لگے ڈائننگ ٹیبل پر لگانے کے لیے آئی تھیں۔ اساور کی بات سن کر ان کے نقوش تن گئے۔

"میری طبیعت خراب ہو رہی ہے ابو پلیز..." وہ ہذیانی سی ہو رہی تھی' اس کی تیزی سے سفید پڑتی رنگت' بار بار گھڑی کو دیکھنا۔ عمر نوٹ کر رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے اساور یہاں ڈنر کھنے لگا ہے' تمہارے تماشے قابل برداشت ہوتے جا رہے ہیں۔" آسیہ بیگم کا ضبط جواب دیتا جا رہا تھا۔ سعیدہ نے ان کا بازو دبا کر حوصلہ دیا اور آگے آئیں۔

"اساور۔ میرا بچہ کھانا کھا کر چلی جانا۔ طبیعت خراب ہے تو کمرے میں لیٹ جاؤ میں ڈنر وہیں لگوا دیتی ہوں۔" بریرہ' نمرہ' ثمرہ' حمرہ سب ہی باہر آگئی تھیں۔ اچھا خاصا تماشا کھڑا ہو گیا تھا۔ اساور نے گھڑی کو دیکھا' دس منٹ اسی میں لگ گئے تھے۔ گھڑی کی سوئیاں اسے نیزوں جیسی لگ رہی تھیں' یکایک اس نے سعیدہ بیگم کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"پلیز پھپھو جانے دیں پلیز پھپھو۔" وہ بلک بلک کر رو دی۔ سب دم بخود رہ گئے۔ عمر سب سے پہلے اس ٹرانس سے نکلا اور تیزی سے آگے بڑھا۔

"آپ لوگ بیٹھیں پلیز ماموں' ممانی ریلیکس میں چھوڑ آتا ہوں اساور کو۔ چلیں پلیز۔" اس کے کہنے کی دیر تھی کہ اساور نے باقاعدہ گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ ایک لمحے کو عمر گنگ رہ گیا۔ پھر اس نے چابی اٹھائی اور پورچ کی طرف بھاگا۔ کچھ تو تھا جو بے حد غیر معمولی تھا۔ ڈرائنگ روم میں فون پر بات کرتے ہوئے اس کی دبی دبی آوازیں باہر لاؤنج میں عمر نے سنی تھیں۔ پہلے درشت اور پھر روہانسا ہوتا لہجہ۔ وہ الجھے ذہن کے ساتھ انتہائی فاسٹ ڈرائیو کر رہا تھا کیونکہ وہ اساور کا بار بار گھڑی دیکھنا محسوس کر چکا تھا۔ پندرہ منٹ میں وہ گھر پہنچ چکا تھا۔ اساور جس طرح مخبوط الحواس ہو رہی تھی وہ اسے یوں گیٹ پر اتار کر نہیں جا سکتا تھا اس لیے اس کے ساتھ اندر لاؤنج تک چلا آیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سکون سے بیٹھ کر حواس قابو کر لے تو وہ واپس آجائے گا لیکن ایک اور انہونی اس کی منتظر تھی۔ جب اس نے لاؤنج میں قدم رکھا تو لینڈ لائن فون بج رہا تھا۔ اساور اسے دھکیل کر بھاگتی ہوئی ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف گئی تو وہ حق دق رہ گیا۔

اساور نے بجلی کی سی تیزی سے ریسیور اٹھایا اور اس کے لبوں سے ادا ہوتے جملے نے عمر کو منجمد کر دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"مسلمان میں گھر آگئی ہوں اب آپ پانچ منٹ بعد میرے موبائل پر کال کریں۔" ریسیور کریڈل پر پٹخ کر وہ بے دم سے پاس پڑے صوفے پر گر گئی۔ لاؤنج کے دروازے پر جمے کھڑے عمر کو لگا اب وہ کبھی ہل ہی نہ سکے گا۔ صوفے کی پشت پر سر گرائے آنکھیں موندے بیٹھی اساور نے کسی خیال کے تحت سر اٹھایا تو عمر کو یوں کھڑا دیکھ کر جیسے ہوش میں آئی۔

"اوہ... عمر بھائی۔" وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی۔

"اساور۔" وہ مزید بول ہی نہ پایا۔

"وہ... عمر بھائی..." وہ شرمندگی میں غرق ہو گئی۔

"کبھی اپنا سمجھ کے بتایا تو ہوتا کہ آپ پہ کیا گزر رہی ہے؟" بے اختیارانہ کیفیت کے زیر اثر وہ جو کہہ گیا اسے خود بھی احساس نہ تھا۔ اس کی اساور سے بھلا کب ایسی بے تکلفی تھی جو وہ ایسی بات اس سے شیئر کرتی۔ اسی سوچ کے تحت حیران ہو کر اساور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور جیسے بے خود سی ہو گئی۔ کیا تھا عمر کی آنکھوں میں۔ وہ سمجھ نہ پائی۔ لیکن وہ اس کی آنکھیں پڑھ رہا تھا۔ کسی آسان سادہ کتاب کی طرح۔

دکھ، ملال، تکلیف، اذیت، ناقدری۔ اور بہت کچھ۔ جو عمر کو اپنے دل پر اترتا محسوس ہوا تھا۔ یکلخت وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور اساور پر نظر ڈالے بنا باہر نکل گیا۔

"مین گیٹ اچھی طرح بند کرلیں۔" اساور نے اس کی بات سنی تھی۔ آخری بات۔

☆ ☆ ☆

اور پھر اساور کی زندگی میں شامل عذابوں میں تواتر آگیا۔ اس پر اپنی سانسیں تنگ پڑنے لگیں۔ سلمان مینٹل ٹارچر کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس نے سزاؤں کا آغاز کردیا تھا اور اس کی سزائیں ایسی ہوتی تھیں کہ اساور بے اختیار خدا سے موت کی آرزو کرنے لگتی۔ دن بھر وہ اسے ننگے پاؤں انگاروں پہ چلاتا اور رات کو یہ انگارے تیزاب ملے لقموں کی مانند گویا اسے چبا کر حلق سے اتارنے ہوتے۔

وہ اسے راتوں کو باہر لان میں جاکر بات کرنے کا کہتا۔ دسمبر کی سرد ترین راتوں میں کئی کئی گھنٹے ٹھنڈ میں ٹہلنا خواہ کتنے بھی سویٹر اور شالیں لپیٹ لو۔ اور پھر وہ گردوپیش کی آواز سے اندازہ لگاتا کہ وہ واقعی باہر آئی ہے یا جھوٹ بول رہی ہے۔ کبھی اگر وہ بازار چلی جاتی اور اسے پتا لگ جاتا تو رات بھر جاگنے کی سزا دیتا۔

کال ملاتا، بات کرتا رہتا، کبھی خاموش بھی ہوجاتا لیکن اسے سونے نہ دیتا۔ گھنٹے بعد کال بند ہوتی تو پھر ملاتا۔ نیند بھگانے کے لیے اساور ٹہلنے لگتی، ٹہل ٹہل کر ٹانگیں شل ہوجاتیں تو بیٹھ جاتی، نیند کے جھٹکے آنے لگتے تو سخت زمین پہ بیٹھ جاتی، کمرے میں ہوتی تو کارپٹ پر بیٹھ جاتی۔ لیکن نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ وہ لڑھکنے لگتی۔ ایک بار نیند نے غلبہ پایا، فون ہاتھ سے لڑھک گیا۔ اس ظالم نے لائن کاٹ کر پھر ملایا۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔

"اب اگر تمہاری آنکھ لگی تو لینڈ لائن پر کال کرکے پورے گھر کو جگادوں گا۔" وہ زہریلے انداز میں بولتا۔

وہ ڈر جاتی۔ پھر ٹہلنے لگتی۔ کمر اکڑ کر تختہ ہوجاتی، پاؤں دکھتے ہوئے پھوڑا بن جاتے۔ سردیوں کی راتوں میں یوں جاگ جاگ کر اس کی طبیعت بگڑ جاتی۔ اسے لگتا وہ مرجائے گی، دماغ کی کوئی نس پھٹ جائے گی۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ نہ وہ مرتی نہ وہ ظالم ظلم سے چوکتا۔ گھر والوں کو کچھ خبر نہ تھی۔

ان ہی بوجھل دنوں میں بریرہ کی ساس نے قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے رخصتی کی تاریخ مانگی تو نجم صاحب اور آسیہ بیگم چاہ کر بھی انکار نہ کرسکے۔ یوں ایک ماہ بعد کی ڈیٹ فکس کردی گئی۔ بریرہ کے نکاح کو بھی سال ہونے والا تھا جبکہ اس کی شادی چھ ماہ بعد ہی کرنے کا وعدہ ہوا تھا۔ لیکن اساور کی سسرال کے عجیب و غریب رویے کی بنا پر وہ مزید نہیں روک سکتے تھے۔ اساور دل سے خوش ہوتی اگر اس کی زندگی طوفانوں کی زد میں نہ ہوتی۔

نجم صاحب کے کان میں کچھ اڑتی اڑتی خبریں پہنچی تھیں۔ ان کے ایک جاننے والوں کا اساور کی سسرال میں کافی آنا جانا تھا۔ ان کی بیٹی اساور کی جٹھانی حریم کی کالج فیلو رہ چکی تھی۔ اس کے ذریعے ان تک خاصی تشویش ناک خبریں پہنچی تھیں۔ سلمان کے بڑے بھائی احسان کے اپنی بیوی حریم سے تعلقات کشیدہ ہوچکے تھے اور گمان غالب تھا کہ جلد ہی ان میں علیحدگی ہوجاتی۔ یہ بات وہ لوگ شروع سے جانتے تھے کہ حریم امریکہ میں سیٹل ہونا چاہتی تھی اس کی پرورش اور تعلیم بھی وہیں کی تھی، تو یہی بات ان کے مابین اختلاف کا باعث بنی اور بڑھتے بڑھتے علیحدگی کی نوبت آگئی۔ حریم نے مزید بتایا تھا کہ علیم صاحب اور عالیہ بیگم کے بیچ بھی اول روز سے انڈر اسٹینڈنگ نہ تھی، ان کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے اور یہ سب گھر میں برملا ہوتا تھا۔ چونکہ وہ دونوں بزنس پارٹنرز بھی تھے، اس لیے بمشکل تمام اپنی اپنی اغراض نے انہیں ساری عمر اس بندھن میں باندھے رکھا۔ دوسری طرف اساور کی اکلوتی نند نرمین جو کہ اسکن اسپیشلسٹ تھی، اس کے بھی اپنے شوہر سے اختلافات چل رہے تھے۔ اس کی اپنے شوہر سے لو میرج تھی اور دھواں دھار افئیر کے

بعد شادی کر کے اب اس کے شوہر کو اس پر اعتبار نہیں رہا تھا' کچھ وہ بھی آزاد روش اور فرینک طبیعت کی مالک تھی' ساتھی کولیگز سے حد درجہ فری تھی اور یہ بات شادی کے بعد اچانک ہی اس کے شوہر کو گراں گزرنے لگی تھی۔ حریم کی اطلاعات کے مطابق ان کا رشتہ بھی خطرے میں ہی تھا کیونکہ غلطی ہونے کے باوجود بھی نرمین اپنی غلطی ماننے اور جھکنے پر تیار نہ تھی۔ شاید ان ہی سب باتوں کی بنا پہ سلمان اس قدر تکلیف دہ عادات اور پیچیدہ شخصیت کا مالک بن گیا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود سلمان کی شخصیت میں موجود سقم ابھی نجم صاحب سے پوشیدہ ہی تھے۔ حریم نے اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن اساور کی صلح جو فطرت کی بدولت سلمان کی شخصیت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا بہت جلد وہ انتہائی بدنما طریقے سے اٹھنے والا تھا۔ شاید ان ہی وجوہات کی بنا پہ سلمان کی رخصتی کے لیے کوئی بھی سنجیدہ نظر نہ آتا تھا۔

بریرہ کی ڈیٹ فکس ہونے پر ایک بار پھر اساور نے سلمان کو رخصتی کے لیے فورس کیا تھا اور ایک بار پھر اسے سزا کا شکار بننا پڑا تھا۔ یہ اسی رات کے بعد کی بات ہے جب فجر کی اذانوں کے ساتھ اس کی سزا ختم ہوئی تو وہ کارپٹ سے اٹھ کر بیڈ پر لیٹنے کے بعد قابل نہ رہی تھی' موبائل وہیں گرا اور وہ کارپٹ پر ہی بے سدھ ہو گئی۔ صبح آسیہ بیگم اسے جگانے آئیں تو اسے یوں پڑا دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ اسے آوازیں دیں تو وہ کسی چرسی کی طرح جھومتی ڈولتی اٹھی اور بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کے اٹھنے پر اس کے نیچے سے برآمد ہوتے موبائل کو دیکھ کر آسیہ بیگم کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ لیکن انہیں مہر بہ لب ہونا پڑا۔ وہ بری طرح بخار میں تپ رہی تھی۔

آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے' بڑی بڑی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی' زرد گیندے سا کملایا مرجھایا چہرہ' بال جیسے گند کا ڈھیر۔ وہ بال جو ریشم کے لچھے تھے' جن میں کوئی پونی' کوئی کیچر نہ ٹکتا تھا نہ کوئی ہیئر اسٹائل بنایا جاتا وہی ریشمی لچھے اب سڑی ہوئی کھچڑی جیسے ہو رہے تھے۔ کپڑے اس نے شاید ایک ہفتے سے نہ بدلے تھے جو ہر روز نت نئے ڈریسز پہنتی خوشبوؤں میں بسی رہتی تھی۔ وہ بری طرح تشویش کا شکار ہوئی تھیں۔ کچھ تھا جو بے حد غلط تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔

''کہاں غلطی ہوئی میرے مولا جو آج یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے؟'' وہ اس کے سرہانے بیٹھی سسک اٹھیں۔ بعض دفعہ انسان قبر میں اتر جاتا ہے لیکن مرتے دم تک نہ تو اپنی غلطی سمجھ پاتا ہے نہ ہی سدھارنے کا موقع مل پاتا ہے۔ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ پہلی ٹھوکر پہ ہی اپنی غلطی ڈھونڈ کر اسے ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی توفیق کی بات ہے۔

انہوں نے نجم صاحب سے دوٹوک بات کی۔

''آپ ڈائریکٹ علیم بھائی سے بات کریں کہ طریقے سے رخصت کرا کے لے جائیں اساور کو۔ پھر بھلے سے سلمان اسے ساری رات جگائے یا سارا دن ستائے لیکن یہ روش درست نہیں۔ لمحہ لمحہ بے چاری کو اپنے ساتھ اٹکائے رکھتا ہے۔ حالت دیکھیں اس کی کس قدر بدتر ہو گئی ہے۔''

نجم صاحب کے ماتھے پر تفکر بھری لکیروں میں چند مزید پریشان لکیروں کا اضافہ ہوا تھا۔ ان کے شانے جھکتے جا رہے تھے۔ بریرہ کی شادی کی تیاریاں عروج پہ تھیں اور اساور کے معاملات بگڑنے لگے تھے۔ لیکن جب علیم صاحب سے رابطہ کیا تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ سلمان نہ تو جاب کے لیے سنجیدہ ہے نہ رخصتی کے لیے لہٰذا اگر وہ چاہیں تو اساور کی طرف سے طلاق کا مطالبہ کر دیں۔

نجم صاحب گنگ رہ گئے۔ ان کا بی پی شوٹ کر گیا۔ آسیہ بیگم کو انہیں سنبھالنا محال ہو گیا۔ وہ رات اساور پہ ایک بار پھر بھاری تھی۔ علیم صاحب کی سلمان سے اس معاملے پہ تلخ کلامی ہوئی تھی اور غبار اس نے اساور پہ نکالا۔ اس کی برداشت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنے ماں باپ سے یہ سب کیوں چھپا رہی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں

شاید خاندان میں بدنامی کا خوف تھا' یا یہ خوش گمانی تھی کہ رخصتی کے بعد سب سیٹ ہو جائے گا۔ جو بھی تھا ٹھیک نہیں تھا۔

دانش کی جاب ابھی نئی نئی تھی اس لیے وہ گھر کم کم آتا تھا پھر جب سے بریرہ کی ڈیٹ فکس ہوئی تھی اس نے گھر آنا بند کر دیا تھا تاکہ شادی کے لیے اسے چھٹیاں لینے میں دقت کا سامنا نہ ہو۔ وہ بہت سی پریشانیوں سے بے خبر تھا۔ لیکن اس نہج پہ آکر نجم صاحب نے اسے کال کر کے سب کچھ بتانا ضروری سمجھا۔ وہ اساور سے بے حد اٹیچ تھا اس کی پریشانی فطری تھی۔ نجم صاحب نے اسے اساور سے بات کرنے کے لیے کہا تھا۔ اساور کی ایسی حالت کے پیچھے انھیں کوئی طوفان چھپا نظر آ رہا تھا جو وہ چھپائے بیٹھی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اس نے بتانا ہوتا تو بتا دیتی۔ لیکن نہیں بتایا تھا تو گمان غالب تھا کہ وہ دانش سے ضرور شیئر کر لیتی۔

لیکن.....

دانش نے کال بھی کی' پوچھ بھی لیتا۔

لیکن پوچھنے کی نوبت نہ آئی۔

اس رات وہ طوفان آیا جس نے ان کے گھر کی ایک ایک بنیاد ہلا ڈالی۔ اس رات کیا ہوا تھا؟

☼ ☼ ☼

شہر آزاد کو کھلتی ہوئی کھڑکی کی تھکن
میری آنکھوں کو بھگوتی ہوئی آوارہ ہوا
دوش دیوار پہ بیزار گھڑی کی ٹک ٹک
میرے انجام پہ روتا ہوا سانسوں کا ستار
ٹوٹی الماری میں بکھرے ہوئے چاہت کے نقوش
رقص کرتی ہوئی تنہائی کے پیاسے سائے
میں اکیلا ہوں مگر پھر بھی' اکیلا تو نہیں

"آج دل کیوں اداس ہے؟ مضمحل کیوں ہے؟ آج دل کا درد سہا کیوں نہیں جا رہا۔ آج دنیا بری کیوں لگ رہی ہے۔؟ کیا میری محبت بھی وصل سے مشروط ہے؟ نہیں۔ میرا دل گواہی دے گا کہ میری محبت سطحی نہیں۔ سطحی ہوتی تو دل کی بجائے دنیا گواہ ہوتی میری محبت کی۔ یا کم از کم وہ گواہ ہوتی۔ لیکن میرے خدا اور میرے دل کے سوا کوئی گواہ نہیں۔ میرے لیے اس کی خوشی مقدم ہے۔ وہ خوش ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ تو کیا۔ تو کیا وہ خوش نہیں ہے؟ کیا وہ دکھی ہے؟ کیا اس کا دکھ میرے دل کو چھو رہا ہے۔؟ ہاں یہی بات ہوئی۔ ورنہ آج کیوں۔ اچانک آج کیوں ایسی کیفیت ہونے لگی۔ کس سے پوچھوں۔ کیسے پوچھوں۔"

وہ بے بسی سے پین ڈائری کے بیچ رکھ کر اسی ڈائری پہ سر رکھ کر بیٹھ گیا۔ وہ محب تو تھا مگر وہ ایک بات سے بے خبر تھا۔ اور وہ یہ کہ محبت خواہ یک طرفہ ہو یا دو طرفہ' ایک ٹیلی پیتھی خود بخود تخلیق ہو جاتی ہے۔ اور اس ٹیلی پیتھی کا ربط اسے خبریں پہنچاتا تھا۔ اور آج تو اس کا اداس ہونا بنتا تھا نا۔

کیونکہ آج کی رات اس کی محبت پہ بہت بھاری تھی۔ آج کی رات کیا ہونے جا رہا تھا؟

☼ ☼ ☼

کچھ حقائق اگر نجم صاحب نے اسے بتائے تھے تو کچھ الجھی بکھری ٹوٹی پھوٹی کڑیاں بریرہ نے بھی اسے تھمائی تھیں جنہیں استعمال کرتے ہوئے اس نے کھوج لگائی تھی اور کڑیوں کو ملاتا تھا۔ دانش نے اساور کو کال کی تھی اور بریرہ کی رخصتی کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ بچپن کے قصے' آپس کی نوک جھونک' چھوٹی چھوٹی لڑائیاں۔ یہ پرانے کھاتے کھول کر وہ اساور کو یہ تاثر دینا چاہ رہا تھا کہ وہ ناسٹیلجک ہو رہا ہے۔ یوں اساور کے دل کی پتھریلی ہو جانے والی زمین نم ہوتی اور وہ بھڑکے بنا وہ سب کہہ ڈالتی جو سننا اور جاننا دانش کا مقصد تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی رہا تھا جب اچانک بیچ میں سلمان کی کال آنے لگی۔ عرصے بعد لاڈلے بھائی سے یوں بات کر کے وہ ذہنی طور پر بے حد سکون محسوس کرنے لگی تھی۔ لیکن سلمان کی مسلسل آتی کال۔ اسے جیسے ضد ہو گئی۔ چاہے آر ہو یا پار۔ آج اس کی کال نہیں لینی۔ وہ بات کرتی رہی لیکن دوسری طرف اس چیز سے بے خبر

دانش نے اساور کی توجہ بٹتی صاف محسوس کی تھی۔
سات آٹھ مرتبہ ٹرائی کرنے کے بعد سلمان نے لینڈ لائن پہ کال ملائی۔ ضد اور غصے کے باوجود اساور نے لینڈ لائن کی آواز گونجتی سنی تو اس کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ سردیوں کی راتوں میں خاموشی میں گونجنے والی بیل آسیہ بیگم نے بھی سنی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کال پک کرتیں اساور کو پک کرلینی چاہیے تھی۔ اسی سوچ کے تحت اس نے دانش کو کال بند کرنے کا کہا اور دروازے کی طرف بھاگی مگر دیر ہوچکی تھی۔ آسیہ بیگم فون پک کرچکی تھیں' اساور کمرے کے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ وہ ہولڈ کروا کر مڑی تھیں۔ عجیب سا تاثر تھا ان کے چہرے پر۔
"سلمان کی کال ہے۔" اتنا ہی کہہ وہ کمرے میں چلی گئیں۔ سلمان کا موڈ انہیں بگڑا ہوا لگا تھا اور اساور کا چہرہ بھی خوف زدہ سا لگا۔ سو آج پہلی بار۔ کمرے میں آکر وہ دروازہ بند کرنے کی بجائے جھری رکھ کر دیکھنے لگیں۔ آج وہ سننا چاہتی تھیں کہ ان دونوں کے بیچ گفتگو کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ نجم صاحب نے چونک کر ان کی اس حرکت کو دیکھا پھر وہ بھی اٹھ کر ان کے پاس آکھڑے ہوئے۔ اساور بات کررہی تھی۔ سلمان دھاڑ رہا تھا۔
"کس کمینے سے بات کررہی تھی تم؟"
اساور کے دل میں غیض اور تنفر کا ابال اٹھا۔ چہرہ انگارہ ہوگیا۔
"اپنی زبان کو لگام دیں۔ میں اپنے بھائی سے بات کررہی تھی۔" اس کے ضبط کی طنابیں اس کے ہاتھ سے پھسلتی جارہی تھیں' سات آٹھ ماہ ہوگئے تھے اس یہ ٹارچر جھیلتے۔
"یہ کس قسم کے بھائی ہیں جو آدھی راتوں کو بہنوں کو فون کرتے ہیں۔" صحیح کہتے ہیں لوگ کہ سانپ کی قسمت میں وہ زہر کہاں جو رشتہ دار عداوت میں اگلتے ہیں۔ اساور کو اس سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ بیمار ذہنیت کا حامل تھا۔ وہ اساور کو بھی بیمار کررہا تھا۔ وہ چبا چبا کر بولی۔
"یہ ان شوہروں سے لاکھ درجہ بہتر ہیں جو اپنی بیویوں کو ان کے ماں باپ کے گھر بٹھا کر ٹارچر کرتے ہیں اور اپنی بیمار ذہنیت کو تسکین پہنچاتے ہیں۔"
ادھر اگر سلمان اس کے لب و لہجے پر سن ہوا تھا تو ادھر جھری میں کھڑی آسیہ بیگم نے بے اختیار دروازے کا پٹ چھوڑ کر ہاتھ دل پر رکھ کر سانس روکی تھی یا شاید رکی سانس بحال کرنے کی کوشش کی تھی۔
"یہ کیا ہورہا ہے میرے مالک۔" انہوں نے تہ دل سے اس رب کو پکارا تھا جسے اکثر لوگ بری گھڑی میں ہی یاد کرتے ہیں۔ اساور کا جسم کپکپا رہا تھا' سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں' آنکھیں لہو ٹپکانے کو تیار تھیں' اس کی برداشت کی حدیں تمام ہو چاہتی تھیں۔ اس نے بساط سے بڑھ کر خود پر جھیلا تھا یہ عذاب۔
"کس کی ایما پر اتنا بول رہی ہو تم۔ ابھی تین لفظ منہ پر ماروں گا تو سارا غرور و طنطنہ دھرا رہ جائے گا۔ تم ہو کیا چیز۔؟" اور بس..... بس ہوگئی تھی۔ اساور حلق کے بل چلائی۔
"ہاں ہاں دو مجھے طلاق ابھی اور اسی وقت۔ جان چھوڑو میری۔ معاف کرو مجھے۔ دو مجھے طلاق۔ دو نا۔ بولتے کیوں نہیں۔؟" وہ ہذیانی ہورہی تھی۔ آسیہ بیگم دوڑ کر اس تک آئیں ریسیور ہاتھ سے لے کر کریڈل پر پٹخا اور مڑ کر اسے دو تھپڑ لگانا چاہتی تھیں لیکن۔ وہ تیورا کر کارپٹ پر گری اور ساکت ہوگئی۔

★ ★ ★

زندگی مجھ کو بتا
کسی گناہ کی ہے سزا؟

وہ ساکت بنجر نگاہیں چھت پر گاڑے لیٹی تھی۔ کسی بھی احساس سے عاری' خالی خالی ویران آنکھیں' جو ایک نظر دیکھے تو رو پڑے۔ پہلو میں دھرے ساکت ہاتھ کی پشت پہ لگے کینولا سے جڑی ڈرپ سے قطرہ قطرہ زندگی کی رمق اس کی رگوں میں دوڑانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس کے ساکت وجود کو اٹھ کر حرکت کرنے کی طاقت دینے کی کوشش کی جارہی تھی لیکن وہ خود' نفسیاتی طور پر آمادہ نظر نہیں آتی تھی۔

زندگی نے اس سے اپنی تمام تر رعنائیوں کا بدلہ سود سمیت وصول کرلیا تھا جو کبھی اس نے گزاری تھی۔ زندگی نے اسے دکھا دیا تھا کہ دیکھو میرا ایک چہرہ یہ بھی ہے۔ کسی بھول میں نہ رہنا۔

اسپتال کے پرائیوٹ روم میں ایک طرف رکھے بینچ پہ آسیہ بیگم آنسوؤں سے تر چہرہ لیے بیٹھی تھیں۔ دانش اور بریرہ ایک طرف مغموم سے کھڑے تھے۔ نجم صاحب ڈاکٹر سے بات کرنے نکلے تھے۔ دانش کو ایمرجنسی میں بلوایا گیا تھا۔ اساور کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا لیکن بروقت ٹریٹمنٹ سے اب اس کی حالت خطرے سے باہر تھی تاہم ڈاکٹرز نے مزید دو روز اسے انڈر آبزرویشن رکھنے کا کہا تھا۔ وہ ہوش میں آچکی تھی لیکن کسی سے بھی بات نہیں کرتی تھی۔ نجم صاحب کو احساس جرم مارے دے رہا تھا۔

دو کٹھن دن مزید اسپتال میں گزار کر جب وہ لوگ گھر پہنچے تو نجم صاحب اساور کو یک دم گلے لگا کر بھینچ لیا۔ اور بس.... ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے اور اساور بکھر بکھر کے رودی۔ اس کا رونا ایسا دل دہلانے والا تھا جیسے کوئی قریبی عزیز فوت ہوگیا ہو۔ جیسے جسم کو کانٹوں پہ گھسیٹا جارہا ہو' اور ایسا ہی حال تو ہوا تھا اس کا۔ سلمان نے اس کی روح کو کانٹوں پہ گھسیٹا تھا۔ اس کی انا کو کند چھری سے زخمی کیا تھا۔ رو رو کے اس کا پورا چہرہ سوج گیا۔ وہ اسے سنبھال سنبھال کر تھک گئے اس کے آنسو پونچھ پونچھ کر آسیہ بیگم کا دوپٹا بھیگ گیا لیکن اس کے آنسو نہ تھمے۔ اس نے سب کو رلا دیا۔ سال بھر کا غبار تھا۔ موسلا دھار بارش کے بنا کیسے تھم جاتا۔ ان کے گھرانے پہ ایک اور بھاری دن طلوع ہوا تھا۔ اشکوں بھرا۔ پچھتاووں بھرا۔ آج نجم اور آسیہ کو ہر وہ پرپوزل یاد آرہا تھا جو اساور کے لیے آیا تھا اور ریجیکٹ ہونے کے بعد جہاں جہاں بھی ان کی شادیاں ہوئیں وہ سب ہی خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے بچوں والے تھے۔ ہر فرد کے اشکوں کی مختلف وجوہات تھیں۔ دکھ' اداسی' پچھتاوے' احساس زیاں۔

اور پھر جب اساور کے آنسو ذرا تھمے تو اس نے ایک ایک لفظ کہہ سنایا۔ ہر بات بتائی' ہر اذیت' اپنا دل کھول کے دکھا دیا۔ وہ سب صدمے سے گنگ تھے' الفاظ گم تھے' حواس سلب تھے۔ آسیہ بیگم نے تڑپ کر اسے گلے لگایا۔

"میری شہزادی بیٹی' میری لاڈوں پلی گڑیا' میرا بچہ سب کچھ تنہا اپنی ذات پہ سہتی رہی بیٹا مجھے تو بتایا ہوتا' کبھی کوئی اشارہ ہی دیا ہوتا بیٹا۔" ان کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

"کیا کہتی امی۔ کہ آپ کی لاڈوں پلی بیٹی سے زندگی کا سب سے اہم رشتہ ہی نبھایا نہیں جارہا۔ میں آپ کی تربیت آزما رہی تھی امی آخری حد تک میں نے بہت کوشش کی امی۔ بہت...."

اس کے لہجے میں اس قدر بے بسی تھی کہ ان سب کے دل کٹ کے رہ گئے۔ نجم صاحب طیش سے مٹھیاں بھینچنے لگے۔

"وہ گھٹیا انسان میری بیٹی کو اس قدر ٹارچر کرتا رہا اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔ ہم یہاں رخصتی پہ زور دیتے رہے وہ تو رخصتی سے قبل ہی اس کا جینا دوبھر کیے ہوئے تھا۔ بعد میں تو وہ اسے نوچ کے کھا جاتا۔ اور وہ اس کا نام نہاد عزت دار باپ۔ ان سب کا تو حشر کردوں گا میں۔ کورٹ میں گھسیٹوں گا۔ ناک رگڑواؤں گا۔ ایسا بے عزت کروں گا کہ ساری عمر منہ چھپاتا پھرے گا۔" آسیہ بیگم دہل گئیں۔

"اسے کورٹ میں گھسیٹیں گے بدنامی کے چھینٹے ہماری بیٹی کا دامن بھی آلودہ کریں گے۔ آپ خود جج ہیں بہتر سمجھتے ہیں کورٹ کے ماحول کو۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ مرد کا معاشرہ ہے' یہاں ہر صورت الزام عورت کے ہی سر آتا ہے۔"

ان کی بات تو تلخ تھی مگر سچ تھی۔ نجم صاحب خاموش ہوگئے۔ پھر ایک ہفتے کے اندر اندر انہوں نے اساور کی طرف سے سلمان کو خلع کا نوٹس بھجوا دیا۔ سلمان کی طرف سے بھی جلد ہی طلاق کے کاغذات موصول ہوگئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ معاملہ طول پکڑ

جائے گا' ایسا کچھ بھی نہ ہوا حتی کہ ایک فون کال تک نہ آئی اور سال بھر کا تکلیف دہ بندھن دنوں میں اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

جو سنتا دنگ رہ جاتا۔ بریرہ کی رخصتی میں محض پندرہ روز باقی تھے۔ اس کے سسرال والے فوراً" آئے۔ مسٹر اینڈ مسز مسعود لغاری کے ہمراہ اسفندیار اور رامین بھی تھے۔ رامین دو روز قبل ہی کینیڈا سے بھائی کی شادی اٹینڈ کرنے آئی تھی' اس کے شوہر نے عین وقت پر ہی آنا تھا۔ اساور کی طلاق کا سن کے وہ سب ہی چلے آئے۔

نجم صاحب اور آسیہ بیگم جوان کے ردعمل سے دل ہی دل میں خوف زدہ سے تھے' یوں پوری فیملی کو آتا دیکھ کے مزید پریشان ہو گئے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ان کا ردعمل کافی مثبت تھا۔ شاہانہ بیگم نے پہلے آسیہ کو دیر تک گلے لگائے رکھا پھر اساور کو بلوا کر اسے بازوؤں کے حلقے میں لیے بیٹھی رہیں۔ ایک بار پھر سب آبدیدہ ہو گئے۔ رامین نے بریرہ کو اپنے ساتھ بٹھالیا' وہ بھی رو رہی تھی' رامین مسلسل اسے تسلیاں دیتی رہی۔ ان کی یوں آمد کا مقصد بھی سامنے آگیا تھا۔ مسعود لغاری صاحب نے سمجھ داری اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے بریرہ کی رخصتی کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کرنے کا فیصلہ سنایا جب تک اساور جذباتی طور پر بہتر نہ ہو جاتی۔ اساور کے جذبات کا اس حد تک خیال کرنے پر وہ سب دل سے ان کے ممنون ہو گئے۔ نجم صاحب نے رسما" انکار بھی کیا اور یہی کہا کہ رخصتی مقررہ وقت پر ہی ہو گی لیکن مسعود صاحب نے انہیں ٹوک دیا۔

"جیسے رامین ہماری بیٹی ہے ایسے بریرہ کے ساتھ ساتھ اساور بھی ہماری بیٹی ہے۔ اور ہمارے لیے بیٹیوں کے جذبات بیٹوں سے زیادہ مقدم ہیں۔ آپ کچھ برا محسوس نہ کریں۔ اسفندیار کی مرضی سے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ آپ کو جب سہولت ہو آپ ہمیں بتا دیجیے گا۔" اساور کے سسرال سے جتنی اذیت ملی تھی' بریرہ کے سسرالیوں نے ایک ہی ملاقات میں اس کا کافی حد تک مداوا کر دیا تھا۔ وہ جو بریرہ کی آئندہ زندگی کے حوالے سے خدشات کا شکار ہو چلے تھے' اب کافی پرسکون ہو گئے۔

دانش نے اساور کے موبائل سے وہ سم نکال کر ضائع کر دی اور اس میں نئی سم ڈال کر اساور کو موبائل تھمایا تو اس نے نفرت سے موبائل پرے پھینک دیا۔ دانش دکھ سے مسکرا دیا۔ رشتے داروں کا تانتا بندھ گیا' افسوس کے لیے آتے' کریدتے' ہمدردیاں جتاتے اور کھا پی کر چلے جاتے۔ یہ سب اساور کی تکلیف کو بڑھا دیتا تھا۔ اس روز بھی ایسی ہی ایک فیملی کے جانے کے بعد اساور اشک بھری آنکھیں لیے بیٹھی تھی جب دانش اس کے پاس آبیٹھا۔

"اساور۔ جتنا جلد ہو سکے خود کو سنبھالو۔" اس نے نرمی سے اس کے دونوں ہاتھ تھامے تو وہ اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"تمہارے بھرم کی جو کرچیاں بکھری ہیں انہیں خود اپنے ہاتھوں سے سمیٹو' پھر چاہے انگلیاں کتنی بھی فگار ہوں وہ دنیا والوں کو مت دکھانا' دنیا یوں بھی چہرہ دیکھتی ہے' ہاتھ ٹٹول کر زخم صرف اپنے تلاشتے ہیں اور ان پر مرہم لگاتے ہیں۔ دنیا والے آپ کے پاس بیٹھ کر آپ سے ہمدردی جتاتے ہیں اور دوسروں کے پاس بیٹھ کر آپ کے بھرم کی دھجیاں تقسیم کرتے ہیں۔ جتنی کرچیاں بکھرنی تھیں بکھر گئیں' باقی سمیٹ لو۔ اس سلسلے کو اب رک جانا چاہیے۔ دنیا والے محبت جتا کر بھی راکھ میں دبی چنگاریاں کھرچ کھرچ کر نکالتے ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ عمل تکلیف دہ ہے۔ لیکن ہم انہیں ٹوک نہیں سکتے' ورنہ وہ ان ہی چنگاریوں کو ہوا دے کر شعلہ بنا دیں گے۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔" اور اساور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جن جن لوگوں نے کبھی اساور کا رشتہ مانگا تھا وہ بطور خاص آتے اور سارا معاملہ سن کر ہمدردی جتا کر آخر میں اپنی بہوؤں کی باتیں شروع کر دیتے اور بڑھا چڑھا کر بتاتے کہ کس طرح انہوں نے اپنی بہوؤں کو ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا ہوا تھا۔ کہنے والوں کی زبانیں بھلا کب

رکی ہیں' یہ تک کہا گیا کہ اب تو اساور کو رنڈوا یا بچوں والا ہی قبول کرے گا۔ جنہوں نے کبھی اساور کا رشتہ مانگا تھا ان میں سے کچھ لڑکے اب بھی کنوارے تھے لیکن اب وہ بھلا کیوں اساور کو مانگتے۔ اور اب نجم صاحب شدت سے خواہاں تھے کہ ان میں سے کوئی بھی اساور کا رشتہ ایک بار پھر مانگ لے۔ لیکن اپنے منہ سے کسی کو کہنا اپنا تھوکا ہوا چاٹنے کے مترادف تھا۔ وہ ساری ساری رات اس سوچ میں جاگتے گزار دیتے کہ اب ہو گا کیا۔

☆ ☆ ☆

ان ہی دنوں آسیہ بیگم کے بھائی بھابھی رؤف اور نجمہ اور چھوٹے بھائی بھابھی منور اور سلمی نے اپنے بڑے بیٹوں علی اور اظفر کے رشتے پکے کر دیے۔ سب جانتے تھے کہ نجمہ بیگم نے اپنی نند آسیہ بیگم کو دکھانے کے لیے ایسا کیا کیونکہ علی اور اظفر دونوں کے لیے آسیہ بیگم نے انکار کیا تھا۔ رؤف اور منور نے بھی اکلوتی بہن کے جذبات کا لحاظ نہ کیا اور بات پکی ہونے کی مٹھائی خاندان بھر میں بانٹی۔ لڑکیاں بھی نجمہ نے اپنے میکے سے پسند کی تھیں۔ علی کی منگیتر ثوبیہ اور اظفر کی منگیتر ثومیہ دونوں نجمہ سلمی کی چھوٹی بہن سمیعہ کی بیٹیاں تھیں۔ ہمیشہ کی طرح اتفاق و محبت کی مثال قائم کرتے ہوئے نجمہ بیگم نے دونوں لڑکیاں اپنی بہوئیں بنانے کی بجائے ایک لڑکی سلمی کو بہو بنانے کے لیے کہا۔ یوں یہ رشتے طے پا گئے۔

ان کے چھوٹے بھائیوں خالد اور شاہد کی بیویاں فائزہ اور شازیہ مبارک باد دینے آئی تھیں۔ فائزہ نے دبے لفظوں میں اعتراض کیا۔

"آپا ابھی تو اساور کا معاملہ تازہ تھا آپ کو یوں مٹھائی نہیں بانٹنی چاہیے تھی۔" نجمہ بیگم تو تڑپ اٹھیں۔

"ارے تو کیا ان کی خاطر ہم اپنے بیٹوں کی خوشیاں نظر انداز کر دیں۔ ان کا تو اپنا کیا ہی سامنے آیا ہے۔ بڑا غرور تھا ان کو اپنی بیٹی کی خوب صورتی اور اپنی مالی حیثیت پہ۔ ہمارے بیٹوں کے لیے کیسی نخوت سے انکار کیا تھا آسیہ آپا نے۔ آج پچھتا رہی ہیں۔"

"ایسا تو نہ کہیں آپا۔ بے چاری دکھی ہیں۔" سلمی دہل گئیں۔

"ارے تو کیا غلط کہا میں نے۔ ایک سے ایک اونچے رشتے کے چکر میں کیسے کیسے ہیرا لڑکے گنوائے انہوں نے۔ ہمارے بیٹوں کو چھوڑو۔ اور بھی بہت تھے۔ مگر انہیں تو پیسہ' اسٹیٹس' شان و شوکت درکار تھی۔ نکاح پہ بھی کیسا پانی کی طرح پیسہ لٹایا تھا۔ اتنا بے جا اسراف اللہ کو بھی پسند نہیں۔ اور اللہ کو ناراض کر کے قائم کیا جانے والا رشتہ بھلا خوشی دے سکتا ہے؟ سعیدہ بھابھی کتنا صحیح کہتی تھیں۔ سچ کہوں تو ہم نے ہمیشہ ہی سعیدہ بھابھی کی۔ باتوں کا مذاق اڑایا لیکن اب سوچوں تو احساس ہوتا ہے کہ سعیدہ بھابھی کبھی ان خرافات میں نہیں پڑیں اور دیکھ لو کتنا سکون ہے ان کے گھر میں۔ ان کی ثمرہ کو بہو بنا کے ہمارے گھر میں بھی وہی سکون اتر آئے گا۔ اس وقت تو یہ نہیں سوچا لیکن اب آسیہ آپا کا انجام دیکھ کر سوچتی ہوں سعیدہ کا عمل بہترین تھا۔ ہمیں بھی دین کے طریقوں کو اپنا لینا چاہیے۔ آخر جانا تو اسی اللہ کے پاس ہے۔ پھر دنیا اور اس کے طور طریقوں نے تو نہیں بچاؤ کرنا ہمارا۔"

نجمہ بیگم کا حرف حرف سچائی میں ڈوبا تھا۔ سعیدہ بیگم نے نہ کبھی کسی کو ٹوکا نہ وعظ و نصیحت کی۔ وہ یہی کہا کرتی تھیں کہ انسان کو اپنا اعمال نامہ ستھرا رکھنا چاہیے' اور آج ان کا خاموش عمل سب ہی کو احساس دلا رہا تھا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ نجمہ اور سلمی ثمرہ کی دفعہ چاہ رہی تھیں کہ منگنی کا اچھا سا فنکشن رکھا جائے۔ لیکن سعیدہ بیگم نے مخالفت کی اور مجبوراً" انہیں سادگی سے انگوٹھی پہنانی پڑی۔ نجمہ بیگم سخت برگشتہ تھیں اور عین ممکن تھا کہ شادی تک یہ بدگمانی بڑھ کر نفرت میں بدل جاتی لیکن اس سے پہلے ہی شہزاد صاحب نے رازداری کا وعدہ لے کر بہنوں کو سعیدہ کی مخالفت کی اصل وجہ بتا دی۔ سعیدہ نے منگنی کے جوڑے' ہال اور ڈنر کے خرچے اور دیگر ممکنہ خرچوں کا تخمینہ لگا کر وہ رقم نکالی اور اس میں سے احمر کو منگنی کے

نام پر دیے جانے والے تحائف کی رقم الگ کر کے باقی رقم ایک مستحق لڑکی کی شادی کے لیے ادا کر آئیں۔ اللہ کی رضا کے لیے انسان ایک قدم اٹھاتا ہے تو اللہ پاک منزل کو جاتا اس کا پورا راستہ ہی سہل بنا دیتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

پوچھنے والے
تجھے کیسے بتائیں آخر؟
دکھ عبارت تو نہیں جو تجھے لکھ کر بھیجیں
یہ کہانی بھی نہیں ہے کہ سنائیں تجھ کو
نہ کوئی بات ہی ایسی کہ بتائیں تجھ کو
زخم ہو تو تیرے ناخن کے حوالے کر دیں
آئینہ بھی تو نہیں ہے کہ دکھائیں تجھ کو
یہ کوئی راز نہیں جس کو چھپائیں تو وہ راز
کبھی چہرے کبھی آنکھوں سے چھلک جاتا ہے
جیسے آنچل کو سنبھالے کوئی اور تیز ہوا
جب بھی چلتی ہے تو شانوں سے ڈھلک جاتا ہے
اب تجھے کیسے بتائیں کہ ہمیں دکھ کیا ہے؟

لوگ بہت کچھ کہہ رہے تھے اور وہ سنتا تھا اور دل دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب ڈوب جاتا۔ وہ وہی رات تھی، بالکل وہی رات جب اس کے وجود پہ بے معنی سی اداسی چھائی تھی جب اس کا دل دکھ کے گھر میں لپٹا ہوا کرلا رہا تھا اور وہ اپنے دل کی ٹیلی پیتھی کے رموز سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ وہی رات تھی جو اس کی محبت پہ بھاری گزری تھی۔ اسی رات وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو کر اسپتال جا پہنچی تھی۔ کیا گزری تھی اس کے نازک دل پر، وہ چاہ کر بھی جان نہیں سکتا تھا۔ کس سے پوچھتا، کیسے پوچھتا۔ اس کا بس چلتا تو وہ جا کر اس کی پلکوں کے آنسو سمیٹ کر اپنی آنکھوں میں بھر لیتا۔ اس کے دل میں بھرے دکھ کے طوفان کسی غیر مرئی طاقت کے ذریعے کھینچ کر سمندروں کے حوالے کر دیتا۔ اسے اتنی خوشیاں دیتا کہ اس کا دامن تنگ پڑ جاتا اس سے سنبھالنا مشکل ہو جاتیں، اسے اتنے سکھ دیتا کہ وہ دکھوں کا سامنا کر کے بھی ہنستی مسکراتی ہی رہتی۔ لیکن اس کے بس میں ہوتا تب نا۔ وہ راتوں کو سو نہیں پا رہا تھا ان سب اذیتوں کی داستانیں سن سن کر۔ کتنے دن کتنی راتیں اس نے اس کے دکھ میں بے کل گزاریں اور اس پری وش کو خبر بھی نہ تھی کہ کوئی اس کے لیے یوں بھی تڑپتا ہے۔ اس نے مرد کا جو روپ دیکھ لیا تھا سہ لیا تھا اس کے لیے وہی بہت تھا۔ وہ بے کلی کی انتہاؤں پہ تھا۔

کیسے اسے دیکھوں، کیسے اس کا درد بانٹوں، کیسے اسے دکھوں سے دور کروں۔ دل ایک راہ دکھاتا تو تھا، لیکن دماغ انکاری تھا۔ وہ سمجھے گی میں اس پر ترس کھا رہا ہوں۔ وہ اپنی ہی تجاویز رد کرتا رہا۔

☼ ☼ ☼

تین سیڑھی اوپر کھڑی بطخ اپنے درجن بھر بچوں کو اپنے تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں پھلانگنے کی لگن میں مگن دیکھ رہی تھی۔ بچے چھلانگ مارتے پھر لڑھک جاتے پھر اٹھتے پھر اچھلتے پھر گرتے، بطخ کسی قسم کی مدد کرنے کے موڈ میں نہ تھی۔ بطخیں یوں ہی اپنے بچوں کی تربیت کرتی ہیں، خود اپنے زور بازو پر کوشش کر کے ہدف تک پہنچنا ہے خواہ ہزاروں بار گرنا پڑے۔

یہ مت کہو خدا سے میری مشکلیں بڑی ہیں
یہ مشکلوں سے کہہ دو میرا خدا بڑا ہے

اسا ور لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ نظریں جمائے پلک جھپکے بنا وہ ویڈیو دیکھ رہی تھی جو دانش نے اس کے فیس بک ٹائم لائن پہ اسے ٹیگ کر کے شیئر کی تھی۔

آتی ہیں آندھیاں تو کر ان کا خیر مقدم
طوفاں سے ہی تو لڑنے خدا نے تجھے گھڑا ہے

بطخ کے بچے ایک ایک کر کے سیڑھیاں پھلانگتے جا رہے تھے اور اوپر چڑھتے جا رہے تھے۔ جیسے جیسے ہر بچہ سیڑھی چڑھتا ویسے ویسے اسا ور کی آنکھوں سے بہتی لڑیوں میں روانی آتی۔ آسیہ بیگم اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھیں اور پھر وہ بھی اسکرین پہ چلتا منظر دیکھ کر پس منظر میں چلتے گیت کو سن کر ٹھہر گئیں۔ دونوں کے دلوں پر یہ گیت ایک سا اثر کر رہا تھا۔ دو

ڈھائی منٹ کی انتھک محنت کے بعد سارے بچے سیڑھیاں چڑھ کرماں کے پاس پہنچ چکے تھے اور اب بچے اپنے بچوں کو ایک جھرمٹ کی صورت لیے منزل کی جانب چل پڑی تھی۔ ویڈیو کلپ ختم ہوا۔ آسیہ بیگم کی محویت ٹوٹی تو وہ آگے آئیں' اساور کی ان کی طرف پشت تھی۔ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر وہ آگے ہوئیں تو دل دکھ سے بھر گیا۔ اساور کی قسمت میں اب صرف رونا ہی رہ گیا تھا شاید۔ لیکن اساور کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی تھا۔ کوئی نئی امید' کوئی بے دار ہوتا حوصلہ' کوئی عزم۔ آسیہ بیگم کو قدرے ڈھارس ہوئی۔ اور پھر جب اساور کے مسئلے پر لوگوں کے تبادلہ خیال میں "تقریبا" خاتمہ ہو گیا' اڑتی دھول بیٹھنے لگی' غم کی موجیں تھمنے لگیں تب سعیدہ بیگم نے ان کے گھر جانے کا قصد کیا۔ آسیہ بیگم نے کئی بار سوچا اور نجم صاحب سے ڈسکس بھی کیا تھا کہ سعیدہ افسوس کے لیے نہیں آئی تھیں۔ لوگوں کی آمدورفت اور ہمدردی کی آڑ میں طعنوں تشنوں سے مغموم اور کبیدہ خاطر ہونے کے باوجود سعیدہ کا نہ آنا انہیں چبھ رہا تھا۔ دل میں کہیں یہ خیال بھی ابھرتا تھا کہ عمر کے رشتے سے بھی انہوں نے انکار کیا تھا شاید اس لیے سعیدہ اب دل میں خوش ہوں گی اور آئیں گی بھی نہیں۔ لیکن کہیں نہ کہیں دل کے کسی کونے سے اپنی ہی سوچ کی تردید بھی ابھرتی تھی۔ عمر کے رشتے سے انکار کے باوجود سعیدہ کے خلوص و محبت میں ذرہ بھر بھی کمی نہ آئی تھی۔ پھر اب وہ کیسے بدگمانی پال لیتیں۔ لیکن دل ہی تو ہے۔

پھر اس خوب صورت سی شام جب اساور عرصے بعد اچھا سا ڈریس پہن کر کچن میں آئی اور اپنا فیورٹ کیک بیک کیا' بہت محنت سے اس پر آئسنگ کی اور بریرہ نے چائے بنائی' یہ سب لوازمات لیے وہ لوگ لاؤنج میں آکر بیٹھے ہی تھے جب سعیدہ کی آمد ہوئی۔ ان کو آتا دیکھ کر وہ سب ایک بار پھر ایک نئے تفصیلی انٹرویو کے لیے خود کو تیار کرتے ہوئے جذباتی اور ذہنی طور پر تناؤ کا شکار ہوئے تھے۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد اس تناؤ کا شائبہ بھی محسوس نہ ہو رہا تھا۔ اور وجہ وہی سعیدہ کا ازلی نرم اور پر خلوص انداز۔ انہوں نے آتے ہی جوش سے پوچھا۔

"ارے۔ اتنا خوب صورت کیک۔ یقینا" میری بیٹی نے بنایا ہو گا۔ ہے نا۔" ان کے محبت بھرے انداز پر اساور کھل کر مسکرا دی۔

"جی پھپھو۔ اور دیکھیے آپ کی قسمت کہ آپ اسے چکھنے خود آگئیں۔ شاید اس لیے اس کیک کو بنانے کی خواہش مجھے کچن میں کھینچ لائی تھی کہ آج میری پیاری پھپھو آنے والی تھیں۔" اساور کی محبت سے کی گئی بات پر سعیدہ نے اسے گلے لگا لیا اور دیر تک گلے لگائے اسے پیار کرتی رہیں۔ ان کے اس پیار میں ہی ان کا دکھ اور اس کو دی جانے والی تسلی ایک تھپکی اور نرم گرم آغوش کی صورت موجود تھی۔ انہوں نے بنا ایک لفظ ادا کیے اس حادثے کا خاموش افسوس بھی کر لیا تھا اور کسی کو تکلیف بھی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ ان کا یہی طور طریقہ تھا جس کی بنا پر اساور کا دل ان کی طرف کھنچتا تھا۔ وہ وہیں صوفے پہ ساور کا سر اپنی گود میں رکھے بیٹھ گئیں اور ہولے ہولے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلاتی باتیں کرنے لگیں۔ روٹین کی گپ شپ' چھوٹی حمرہ کی شرارتیں اور سمجھ داریاں' پھر دانش کی جاب کا پوچھتی رہیں' بریرہ کی پڑھائی کے حوالے سے سوال کیے۔ سب ہی کچھ تو پوچھا تھا بس نہیں سوال کیا تو بریرہ کی رخصتی کا یا اساور کی طلاق کا۔ آج پہلی بار آسیہ بیگم کو سعیدہ سے اپنائیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے بصد اصرار انہیں ڈنر پہ روکا تا کہ وہ بھائی سے بھی مل سکیں۔ اس سے قبل انہوں نے کبھی سعیدہ سے ایسی محبت نہیں جتائی تھی' لیکن آج انہیں بھی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ سعیدہ کے طور طریقے گھٹن زدہ نہیں بلکہ گھٹن بھرے قفس میں روزن جیسے تھے۔ اساور ان کی گود میں سر رکھے سکون سے آنکھیں موندے لیٹی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلا سکون و اطمینان آسیہ بیگم کو ایک نئی

خلش میں مبتلا کر گیا۔ کیا تھا جو وہ نام نہاد ماڈرن ازم ' نمود و نمائش اور مغرب کی اندھی تقلید میں غرق ہو کر سعیدہ کو انکار نہ کرتیں۔ لیکن اب۔ اب پچھتائے کیا ہووت..... وہ کیسے اپنے منہ سے کہہ دیتیں۔ وہ تو نجم صاحب سے بھی نہ کہہ سکتی تھیں کیونکہ اس رشتے پہ وہ اتنے مخالف نہ تھے۔ لیکن اب..... اب صرف اور صرف پچھتاوے تھے۔

☼ ☼ ☼

انسان پیسے کے پیچھے کتے کی طرح بھاگتا ہے ' جاہ و حشمت کے لیے رال ٹپکاتا پھرتا ہے ' سرپٹ دوڑتا ہے اور ان انسانوں کے پیچھے دوڑتا ہے جن کے پاس یہ دونوں چیزیں ہوں۔ نہ اس کی دوڑ ختم ہوتی ہے نہ ہوس اور جب وہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرتا ہے تب اسے وہ رب یاد آتا ہے جس نے اپنے لیے ایک قدم اٹھانے پہ دوڑ کر آنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ دنیا کے پیچھے تو جتنا بھاگو وہ اتنا ہی آپ سے دور بھاگتی ہے اور آپ اور تیز بھاگتے ہیں پھر جب آپ کو لگنے لگتا ہے کہ آپ نے دنیا کو پا لیا۔ تب ہی..... ہاں تب ہی آپ آخری قدم پہ لغزش کا شکار ہو کر ذلت سے اپنی جھولی بھر لیتے ہیں۔ اللہ پاک فرماتا ہے مجھے چھوڑ کر دنیا میں جس چیز کے پیچھے بھاگو گے میں تمہیں اسی کے ہاتھوں ذلیل و خوار کردوں گا اور اگر ساری دنیا کو چھوڑ کر ہم اللہ کے پیچھے بھاگیں تو ایک توبہ..... بس ایک توبہ سچی پکی والی..... اور کروڑوں گناہ ایسے معدوم جیسے کوئی نومولود بچہ ' بے گناہ معصوم۔ وہ تو قیامت کے روز بھی گناہ گار بندوں کی بخشش کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کے نامہ اعمال میں سے عذر نکلوائے گا۔

یہی تو فرق ہے رحمٰن اور انسان میں۔ اللہ پاک مہلت پہ مہلت دیتے ہیں ' چانس پہ چانس ' ہلکا سا جھٹکا دیتے ہیں۔ تہس نہس نہیں کرتے۔ اے میرے بندے سدھر جا..... حب الٰہی کی جھلک دکھاتے ہیں ' انسان کی ہرجائی فطرت بھی دکھاتے ہیں۔ انسان سمجھے تو تب نا۔ اتنا اعلا دماغ پا کر بھی اے انسان تو سمجھتا کیوں

نہیں۔ اے انسان کیوں اتنا جاہل ہے تو۔

وہ دو متکبر و مغرور۔ اللہ کے عاجز بندے جو عاجزی بھلا بیٹھے تھے' اپنی چھوٹی سی سلطنت میں ننھے منے فرعون بنے بیٹھے تھے' دولت اور ہوس کی بنیاد پہ انسانوں کو پرکھتے تھے' آج بلک بلک کر سسک سسک کر خانہ کعبہ کے سامنے سجدہ ریز اپنی لاڈلی بچی کی روٹھی خوشیوں کا سوال کررہے تھے۔ انہیں آج بھی اپنی ہی غرض یاد تھی۔ وہ آج بھی اللہ کی خاطر نہیں آئے تھے' اپنی اولاد کی خاطر آئے تھے۔ اسی دولت اور جاہ و حشمت کی بنیاد پہ کیے جانے والے بریرہ کے رشتے سے انہیں ٹھوکر نہیں ملی تھی اس پہ شکر گزار تھے۔ وہ ایک ہی ٹھوکر پہ اوندھے منہ جا گرے تھے۔ انسان کس قدر خود غرض ہے۔ اللہ کے در پہ کھڑا ہو کر بھی وہی دنیا مانگتا رہتا ہے جس سے ٹھوکریں کھا کر آیا ہوتا ہے۔ پھر بھی اللہ اسے نامراد نہیں رکھتا۔ وہ اس پر بھی بندے کو نوازتا ہے کہ دنیا کی خاطر ہی سہی پر میرے بندے نے مجھے مشکل کشا مانا۔ پندرہ روزہ عمرے میں وہ دنیا بھلائے عبادت میں مشغول رہے۔ جس اولاد کی خوشیاں مانگنے آئے تھے اسے بھی بھلائے کوئی کانٹیکٹ کیے بغیر وہ پندرہ دن نجم صاحب اور آسیہ بیگم نے مکمل اپنے رب کے سنگ گزارے تھے۔ اس غفور الرحیم نے ان کے دلوں کو کامل تیقن سے منور کر کے واپس بھیجا تھا۔

عمرے سے واپس آتے ہی انہوں نے بریرہ کے سسرال والوں کو انوائٹ کر کے رخصتی کی تاریخ دے دی تھی۔ اساور کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے وہ اب باقی معاملات سدھارنا چاہتے تھے۔ تیاریاں پھر سے شروع کی گئیں' گہما گہمی پھر سے جاگ اٹھی' لیکن فرق یہ تھا کہ آسیہ بیگم نے سب کچھ سادگی سے کرنے کی درخواست کی تھی جسے شاہانہ بیگم نے فراخدلی سے قبول کر لیا تھا۔ اساور نے خود کو بہت جلد سنبھال کر اپنے اعصاب کی مضبوطی کا سب کو قائل کر لیا تھا۔ بریرہ اس کے دکھ اور اپنی پہلے رخصتی ہونے پر قدرے بے چین تھی' لیکن باقی سب کا رویہ نارمل ہی رہا۔

☼ ☼ ☼

اس نے تحمل سے اپنی ماں کی ساری بات سنی تھی اور ان کی التجا بھری درخواست مکمل ہونے کے بعد مکمل سکون کے ساتھ چند جملے کہے تھے جنہیں سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئی تھیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔" ان کی حیرت پر وہ ہنسا تھا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ وہ چڑ گئیں۔

"میں سنجیدہ ہوں۔" وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"میری پیاری اور بھولی سی ماں میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں ساری عمر آپ سے اس شادی کے بارے میں کبھی اپنی خواہش کا اظہار نہ کرتا کیونکہ ایسا کر کے مجھے اپنا آپ خود غرض لگتا' لیکن شاید میری محبت سچی تھی اسی لیے اللہ نے خود ہی یہ خیال آپ کے دل میں ڈال دیا۔ اپنے جذبات میں آپ کو نہ بتاتا لیکن آپ کے التجا بھرے انداز پہ مجھے خدشہ ہوا کہ آپ ساری عمر اس احساس جرم کا شکار رہیں گی کہ آپ نے مجھے مجبور کیا تھا۔ بس اسی لیے بتا دیا۔" آخر میں اس کا لہجہ شرارتی ہوا تو حیرت سے اسے دیکھتے دیکھتے انہوں نے زوردار دھمو کا اس کے کندھے پہ جڑ دیا۔ وہ کراہ کر رہ گیا۔

"ماں سے مخولیاں۔ شرم تو نہ آئی ایسے محبت کا اظہار کرتے ہوئے۔" وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"اچھا اب پرے ہٹو۔" انہوں نے اسے دھکیلا تو وہ پھر سے ان کے آگے آگیا اور ہاتھ جوڑ دیے۔

"اب ناراض تو نہ ہونا نا' میری جان سے پیاری ماں۔" وہ مسکرا دیں۔

"اچھا اب مجھے جانے بھی دو۔ بریرہ کی رخصتی کی ڈیٹ فکس ہو چکی ہے' مجھے ابھی اور اسی وقت جانا ہو گا تاکہ کارڈز میں اساور اور تمہارا نام بھی شامل ہو جائے۔ ورنہ بیٹھے رہنا۔" انہوں نے دھمکی بھرا انداز اپنایا تو وہ بھی ڈرنے کی ایکٹنگ کرنے لگا اور ہاتھ پکڑ کر انہیں کمرے سے باہر نکالنے لگا۔

"وہ نہیں امی پلیز آپ جائیے جلدی۔"

"ہاں ہاں ابھی تمہاری من چاہی بیوی گھر آئی نہیں اور تم مجھے گھر سے نکالنے لگے ہو۔ توبہ توبہ۔ قرب قیامت۔" انہوں نے جاہل عورتوں کے انداز میں گال پیٹے تو وہ پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"امی واویلا واپس آکر کیجیے گا۔ میں یہیں بیٹھا ہوں کہیں نہیں جاؤں گا آپ کی واپسی تک۔"

"ہاں تم ابھی سے نکمے نکھٹو زن مرید بن کر بیوی کے گھٹنے سے لگے رہنے کی پریکٹس کرو۔" مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

☆ ☆ ☆

اپنی خاطر جاگے ہو سوئے ہو
اپنی خاطر ہنسے ہو روئے ہو
کس لیے آج کھوئے کھوئے ہو
تم نے آنسو بہت بہے اپنے
تم بہت سال رہ لیے اپنے
اب میرے صرف میرے ہو کے رہو

گرم گرم آنسو اس کے چہرے کو نم سی تپش دیتے لڑھک لڑھک کر اس کی گود میں جمع ہوتے جا رہے تھے کثافتیں دھل رہی تھیں زنگ دھل رہے تھے دل کے کاسے پر نئی نکور قلعی چڑھنے لگی تھی محبت کی برسات سے دل میں ساکت مردہ پڑے جذبے بھیگ کر بے دار ہوتے جا رہے تھے۔

اب مجھے اپنے درد سہنے دو
دل کی ہر بات دل سے کہنے دو
میری بانہوں میں خود کو بہنے دو
مدتوں زخم خود سہے اپنے
تم بہت سال رہ لیے اپنے
اب میرے صرف میرے ہو کے رہو

دل پر تواتر سے گرنے والے آنسو اس پرانے زنگ آلود نام کو رگڑ رگڑ کر دھو رہے تھے کھرچ کھرچ کر مٹا رہے تھے اور آنسوؤں کے بعد کھلنے والی مسکان نے اس نئے نام کو اس کے دل میں گلابوں کے بیچوں بیچ پہنچانا تھا۔ اس کے اندر دل کے اونچے مسند پر کلیاں کھلا کر ایک سیج سجائی تھی اور اس سیج پر اس کے سنگ اس مسیحا کو بٹھانا تھا جو اس کے زخموں پر کچی کلیوں کے پھاہے رکھنے آگیا تھا۔ شہزادی کے جسم میں چھپی ناقدری کی سوئیاں نکال کر محبتوں اور چاہتوں کے دیپ روشن کرنے والا شہزادہ آگیا تھا۔

حسن ہی حسن ہو ذہانت ہو
عاشقی ہوں میں تم محبت ہو
تم میری بس میری امانت ہو
جی لیے جس قدر جیے اپنے
تم بہت سال رہ لیے اپنے
اب میرے صرف میرے ہو کے رہو

کتنا واضح فرق تھا... فائیو اسٹار ہوٹل کے خوب صورت ترین ہال کی اس دلفریب اور عالیشان تقریب میں ہونے والے نکاح اور یہاں اس کے اپنے جنت نظیر گھر میں موجود اس کے اپنے بیڈ روم میں بیڈ پر بیٹھے بیٹھے ہونے والے نکاح میں۔ وہاں وہ عالیشان پیراہن میں شہزادیوں کی مانند سجی تھی اور یہاں وہ سادہ مگر خوب صورت اور پروقار گھریلو لڑکی کے روپ میں جچی

تھی۔ وہاں اس کا حسن دنیا جہاں کے مردوں نے دیکھا اور سراہا تھا اور یہاں۔۔۔ صرف وہی ایک شخص ابھی ابھی یہاں اس سے مل کر نکلا تھا جو اب ساری زندگی کا ہم سفر تھا' جو اس کے حسن و عزت کا محافظ تھا اور وہی اصل محافظ تھا۔

رہتے ہو رنج و غم کے گھیروں میں
دکھ کے آسیب کے بسیروں میں
کیسے چھوڑوں تمہیں اندھیروں میں
تم کو دے دوں گا سب دیے اپنے
تم بہت سال رہ لیے اپنے
اب میرے صرف میرے ہو کے رہو

اس بے انتہا خوب صورت کارڈ پہ اس کی بے حد خوب صورت رائٹنگ میں لکھی یہ نظم پڑھتے ہوئے اس کی محبت کی شدت اور سچائی کھڑے کھڑے اساور کو اپنا اسیر کر گئی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا جہاں سے وہ ابھی ابھی اسے یہ کارڈ اور ایک ادھ کھلی گلاب کی کلی پکڑا کر نکلا تھا۔ اس کا دل محبت اور احترام کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

پورا ہال اس قدر لاتعداد سرخ گلابوں سے سجا ہوا تھا کہ ہر شخص مہکا جا رہا تھا۔ آسیہ اور انجم صاحب کی دونوں بیٹیوں کو اکٹھا رخصت کرنے کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ اسٹیج پر دو کپلز پوری شان سے براجمان تھے۔ بریرہ اور اسفندیار اور۔۔۔ جی ہاں بالکل اساور اور عمر شہزاد احمد۔ خاموش محبت کا فاتح سکندر۔ دونوں بہنیں سرخ و سفید امتزاج سے بنے لہنگوں میں ملبوس مسرتوں سے لبریز تھیں۔ آسیہ بیگم اور انجم صاحب کی پلکیں آج بھی نم تھیں۔ سعیدہ بیگم اور ان کی بیٹیاں خوشی سے سرشار۔ بریرہ اور اساور پر سکون و مطمئن' پرانے رشتے نئے خوب صورت رشتوں میں ڈھل کر اذیتوں کی دھول پر پانی چھڑک رہے تھے۔ رنگ بھری یہ رات 'نئی' شفاف اور اجلی سوچوں کے طلوع کا منظر پیش کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ اس کی محبتوں کی شدتوں پہ حیرت زدہ تھی تو مخفی رکھنے پر شکوہ کناں بھی تھی۔ بے یقین بھی تھی اور نازاں بھی۔

"اتنی محبت تھی تو کبھی ظاہر کیوں نہ کیا' کوشش کیوں نہ کی۔" اس کا شکوہ مچل کر لبوں پہ آگیا تو عمر سو جان سے فدا ہوا۔ اس کے مہندی اور چوڑیوں بھرے ہاتھ تھام کر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"مجھے میرے رب نے نوازا ہے۔ جو تم مجھے ملی۔ ورنہ خود سے یہ خواہش اگر میں کرتا تو اپنی نظروں میں گر جاتا' مجھے یہ اقدام خود غرضانہ لگتا۔ میں اپنی محبت کی سچائی کو آزمانا چاہتا تھا۔ میرے رب نے مجھے مایوس نہیں کیا۔" اس کی آنکھوں میں سمندر تھا' جذب کا' خلوص کا' محبت کا۔۔۔ اور اس سب سے بڑھ کر۔۔۔ عزت کا۔ جس نے عزت کرنا سیکھ لیا وہ محبت کرنا بھی سیکھ جاتا ہے اساور جذبوں کی یورش سے گنگ تھی۔ خدا نے اس قدر اذیتوں کے بعد ایسا ثمر دینا تھا' یہ اسے پہلے پتا ہوتا تو کبھی شکوہ نہ کرتی۔ اسے اپنے رب پہ بے انتہا پیار آیا۔

آپ کے قرب سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا
زندگی اتنی دل آویز بھی ہو سکتی ہے

اس کے سرگوشی نما خوب صورت سے اظہار نے عمر کو دیوانہ کر دیا۔ اساور کا دل عمر کی محبت پا کے دمک اٹھا تھا۔ عمر کا دل اساور کو پا کے سنور گیا تھا۔ وہ دونوں بنے ہی ایک دوسرے کے لیے تھے۔

ہر دن ہے محبت کا ہر رات محبت کی
ہم اہل محبت ہیں ہر بات محبت کی
ہم درد کے ماروں کا اتنا سا حوالہ ہے
تنہائی ہے گھر اپنا اور ذات محبت کی
سینے میں اترتے ہیں الفاظ محبت کے
آنکھوں سے برستی ہے برسات محبت کی

☆ ☆

ماہم علی

ویلنٹائن ڈے

آج معمول سے زیادہ سردی تھی۔ بادل بھی چھائے ہوئے تھے۔ اندر کی تنہائی سے گھبرا کر میں سامنے والی پارک میں چلی گئی۔ پارک میں اکا دکا لوگ موجود تھے۔ ہمیشہ کی طرح میں جا کر بینچ پر بیٹھ گئی۔

سردی سے کپکپاتے جسم کو میں نے چادر سے ڈھانپنے کی ناکام کوشش کی میرے بینچ سے آگے والے بینچ پر ایک اور لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ چپس کھانے کے ساتھ ساتھ موبائل پر کسی سے گفتگو بھی کر رہی تھی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بات کرتے وقت اس کی آواز کبھی اونچی اور کبھی بہت دھیمی ہو جاتی تھی کسی کی باتیں چوری چھپی سننا اصولاً "بری بات ہے۔" مگر اس لڑکی کی باتوں میں ویلن ٹائن کا ذکر سن کر میں چونکے بنا رہ نہ سکی۔

آہ! کل 14 فروری ہے میرے لیے دکھوں بھرا دن تین سال ہو گئے مجھے اپنی نادانی میں کی گئی غلطی کی سزا اب بھی یاد ہے' 14 فروری کا وہی ظالم دن تھا۔ جب میرے اپنے میری نادانیوں کی وجہ سے مجھ سے دور ہو گئے تھے۔ اتنے دور کہ میں اب چاہتے ہوئے بھی ان کو آواز نہیں دے سکتی ہوں۔

میرے اندر کا دکھ اچانک بڑھ گیا تھا۔ وہ لڑکی اب بھی موبائل سے لگی ہوئی تھی۔ خود پر قابو پانے کے بعد میں اٹھ کر اس نادان لڑکی کے پاس چلی گئی جو گھر والوں سے چھپ کر ویلن ٹائن منانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے فوراً "موبائل کان سے ہٹا کر بند کر دیا۔

"مجھے نہیں پتا کہ تم کون ہو اور نہ تم مجھے جانتی ہو مگر میرا مقصد تمہیں سمجھانا ہے۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی میری طرح اپنوں کا بھروسا گنوا دو۔ میری طرح جان بوجھ کر غلطی کا خمیازہ ساری زندگی بھگتو۔"

"کون ہیں آپ؟ اور یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" وہ لڑکی حیرت سے بولی۔

"میں کل وہ تھی جو آج تم ہو اور میں نہیں چاہتی کہ تم وہ بنو جو آج میں ہوں۔ چلو ان باتوں کو چھوڑو میں تم کو اپنی کہانی سناتی ہوں۔ سن کر تم کو سمجھ آئے گی حالانکہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اپنا ماضی کا کمزور گوشہ کسی کے ساتھ شیئر کرنے کا' آج دل پر پتھر رکھ کر میں اپنی ماضی کی کہانی تم کو سنانا چاہتی ہوں' کیونکہ میں نہیں چاہتی ہوں کہ کوئی بھی لڑکی ایسی غلطی کرے جو میں کر چکی ہوں۔" وہ لڑکی کشمکش میں تھی۔

"بہت زیادہ وقت نہیں لوں گی؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ وہ الجھن میں مجھے دیکھتی ہوئی بینچ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

"میں زارش سلمان تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ گھر بھر کی لاڈلی۔ بھائیوں کی تو مجھ میں جان تھی۔ امی اور بابا بھی مجھ سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ میٹرک تک مجھے بھائی اسکول چھوڑنے جاتے تھے الگ الگ دن کو ڈیوٹی ہوتی تھی تینوں بھائیوں کی۔ وہ دن بہت اچھا تھا جب میں نے میٹرک پاس کیا اس دن بابا نے شاندار پارٹی رکھی گھر میں۔

پھر میرا داخلہ شہر کے مشہور کالج میں ہوا۔ کیونکہ ڈاکٹر بننا میرا شوق تھا اور بابا کا خواب بھی میں بہت محنت سے پڑھتی تھی وہاں کالج میں ہمارا الگ گروپ بنا ہوا تھا۔ جس میں میرے علاوہ پانچ اور لوگ تھے کرن' رملا' علی' احمد اور کاشف ان سب میں میری دوستی کاشف کے ساتھ زیادہ تھی۔ کاشف بھی مجھے پسند کرتا تھا۔ اس طرح ایک دن میں لائبریری سے آئی تو وہ سب زور و شور سے کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔

"کیا بات ہے۔ اتنا شور کیوں مچایا ہوا ہے؟" میں کاشف کے قریب بیٹھ گئی۔

"چلو زارش آگئی ہے اب وہ فیصلہ کرے گی' چلو بتاؤ زاری اس بار ہم ویلن ٹائن پر کہاں جائیں گے۔" رملا نے سب کو خاموش کروا کر مجھ سے پوچھا۔

"ویلن ٹائن تو میں نے کبھی نہیں منایا تم لوگ جگہ کا فیصلہ کرو۔"

"کیا مطلب ہم جگہ کا فیصلہ کریں۔ تو کیا تم نہیں جاؤ گی۔" کاشف نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"دراصل مجھے کہیں باہر جانے کی اجازت نہیں ہے اور اس طرح اس دن کو منانے کے لیے میں باہر

جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"
"لو یہ کیا بات ہوئی جس کے لیے میں نے یہ پروگرام بنایا ہے۔ جب یہ نہیں جا رہی ہے پھر کیا فائدہ ؟ پھر میں بھی نہیں جا رہا ہوں۔" کاشف نے ناراضی سے کہا۔
"کیا ہے زارش تمہارے بغیر تو ذرا بھی مزا نہیں آئے گا۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ ہم گھر والوں کو بغیر بتائے جائیں گے۔ گھر سے کالج آئیں گے اور پھر یہاں سے چلے جائیں گے۔" کرن نے تو پورا پروگرام ترتیب دے لیا۔
"کیا ہے یار چلی چلو نا گھر والوں کو کون بتائے گا۔"
مجھے تذبذب میں دیکھ کر کرن نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔
"میں نے گھر والوں سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی اور نہ میں کاشف کو ناراض کرنا چاہتی تھی۔ چلو ٹھیک ہے۔ مگر ہم جلدی واپس آئیں گے۔" میں نے کہا۔
"ہاں جلدی واپس آئیں گے۔" علی نے کاشف کو دیکھ کر آنکھ ماری' میرے دوست کے گھر ویلن ٹائن پارٹی ہے۔ ہم سب وہاں جائیں گے۔" بہت مزا آئے گا۔" سب اس بات پر متفق ہوئے۔
گھر آکر میں تھوڑی پریشان تھی۔ یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ میں کون سا غلط کام کر رہی ہوں۔
اگلی صبح منصوبے کے مطابق ہم کالج کے ساتھ والی دوکان کے سامنے چلے گئے۔ وہاں رملہ اور کرن میرا انتظار کر رہی تھیں۔ تھوڑا آگے جا کر کاشف کی گاڑی کھڑی تھی۔ علی اور احمد بھی ساتھ تھے۔ "جلدی سے سب بیٹھو۔ شکر ہے کہ تم آگئی زارش۔"
"کیسے نہ آتی میں نے بھی بلایا تھا۔" کاشف نے کہا۔
"ہاں اب تک کون تم کو انکار کر پایا ہے۔ کسی کی اتنی جرات کہ میرے یار کے کہنے پر نہ آئے۔" احمد کی بات پر سب نے قہقہہ لگایا' یوں ہم سارے راستے پر ہنسی مذاق کرتے رہے اور پھر آدھ گھنٹہ بعد ہم ایک خوب صورت بنگلے کے سامنے رک گئے۔ جو کہ انتہائی سنسان جگہ پر تھا۔
"کاشی یہ تمہارے دوست کا بنگلہ تو ڈریم لینڈ ہے مائی گاڈ۔" رملہ نے کہا۔
"اندر چلو یہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔" کاشف نے کہا۔
ہم سب اندر چلے گئے۔ اندر سے واقعی بنگلہ بہت خوب صورت تھا۔ اندرونی ہال میں جوں ہی ہم داخل ہوئے۔ میوزک کی تیز آواز نے ہمارا استقبال کیا۔ وہاں کافی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ کچھ لڑکیاں اسٹیج پر ڈانس کر رہی تھی۔ مجھے یہ سب دیکھ کر کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر درمیانی عمر کا آدمی ہماری طرف آگیا۔
"ہیلو ینگ مین کیسے ہو تم بہت دیر کر دی تم لوگوں نے۔" وہ آدمی کاشف کو گلے ملتے ہوئے بولا۔
"لیٹ تو نہیں ہوئے ہیں ابھی تو 9 بجے ہیں۔"
"لیٹ ایسے کہ یہ پارٹی تو رات 12 بجے سے جاری ہے اچھا اب سب کا تعارف کروا دو۔ اس نے کاشف کو کہا۔
"ہاں یہ کرن رملہ اور زارش میں اور یہ علی اور احمد ہیں۔" کاشف نے تعارف کروایا کاشف کو آغا فیضان کے دوست کہنے پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہ کاشف سے عمر میں کافی بڑا تھا۔
"واؤ سب کو دیکھ کر بہت اچھا لگا۔" آغا فیضان نے کہا۔
"چلو اندر اور انجوائے (مزے) کرو۔" آغا فیضان نے انجوائے پر کافی زور دیا۔ رملہ اور کرن گھوم پھر کر اندرونی ہال دیکھ رہی تھیں۔ جبکہ میں کافی نروس وہاں کھڑی رہی۔
"آؤ نہ رک کیوں گئی۔ کاشف نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گیا۔ مجھے ایک سائڈ پر کرسی پر بٹھا کر کاشف وہاں سے چلا گیا۔ رملہ اور کرن نہ جانے کہاں رہ گئی تھیں ہمیں نے ان کی تلاش میں نگاہیں دوڑائی لیکن وہ کہیں بھی نظر نہیں آئیں مجھے پریشانی نے گھیر لیا۔ وہاں میں نے کافی وقت گزارہ مگر کسی کا کوئی پتا نہیں

تھا۔

ہال میں عجیب سا سماں تھا۔ اسٹیج پر لڑکے اور لڑکیاں بے ہودہ رقص کررہے تھے اور بعض اپنے اپنے پارٹنر (ساتھی) کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

"آپ کیوں خاموش بیٹھی ہے۔" نہ جانے کب آغا فیضان میرے ساتھ والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا تھا۔

"جی! لگتا ہے آپ پہلی بار ایسی پارٹی میں آئی ہو۔" آغا میرے قریب ہو کر کہنے لگا۔ میں نے اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ مجھے خاموش دیکھ کر آغا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چلیں آؤ تمہیں انجوائے کرواؤں۔"

"کیا بے ہودگی ہے چھوڑو میرا ہاتھ۔" میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

"چھوڑ بھی دیں گے اتنی بھی کیا جلدی ہے۔" اس نے کمینگی سے کہا جبکہ میرا حال بہت برا تھا۔

"کاشف کاشف رملہ کرن اور علی کہاں ہو تم سب۔" میں نے باری باری سب کو آواز دی۔ مگر بے سود وہ لوگ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ سب لوگ آپس میں اتنے مگن تھے کہ کسی نے بھی میری چیخنے کی آواز نہ سنی۔

"نکالو جتنی آوازیں نکال سکتی ہو اور رہا کاشف اس نے ہی تم کو میرے پاس لایا ہے۔ بقول اس کے بہت ٹاپ چیز ہو تم۔" وہ خباثت سے مسکرایا اور پھر مجھے گھسیٹ کر اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے بھرپور مزاحمت کی۔ مگر بے سود۔ وہ مجھے گھسیٹ کر سامنے کمرے میں لے آیا۔

"یا اللہ میری عزت بچالیں۔" روتے روتے میں نے پوری شدت سے خدا کو پکارا' شاید وہ لمحے قبولیت کے تھے۔ باہر بہت شور مچا ہوا تھا۔ لوگوں کے دوڑنے کی آوازیں آرہی تھی۔ اس سے پہلے کہ آغا مجھ سے مزید بدتمیزی کرتا اس کا موبائل بج پڑا اور نہ جانے دوسری طرف سے کسی نے کیا کہا۔ وہ مجھے وہاں چھوڑ کر بھاگتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے بھی موقع پاکر باہر کی طرف بھاگی۔ مگر باہر بھی ذلت اور شرمندگی میری منتظر تھی۔ باہر اپنے کزن ڈی ایس پی وقاص کو دیکھ کہ میرے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔

مجھے نہیں پتا تھا کہ پولیس وہاں کیوں آئی تھی۔ وقاص کی آنکھیں مجھے دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے فیضان آغا کو کمرے سے نکلتے دیکھا تھا اور اس کے کمرے میں صرف میں تھی اس نے میرے بھائی کو فون کرکے بلایا اور پچھلے دروازے سے مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا۔ مجھے دیکھ کر بھائی کے آنکھوں میں جو درد اور کرب تھا۔ وہ دیکھ کر میرا مر جانے کو دل کرتا تھا سارے راستے بھائی نے ضبط کر کے گاڑی چلاتا رہا۔ تین بار حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

بھائی گاڑی کھڑی کرکے فوراً" میری طرف دیکھے بغیر اندر چلا گیا۔ مرے مرے قدموں سے میں خود کو گھسیٹتی اندر آئی سامنے امی بابا اور میرے دو بھائی کھڑے تھے۔ میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی کہ میری کیا کیفیت تھی۔ بھائیوں کی آنکھیں بالکل سرخ تھیں آج ان کی لاڈلی بہن نے ان کا اعتماد کھو دیا تھا ان کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ رہے بابا جان' ان کی خاموشی سے مجھے اور بھی خوف آرہا تھا۔ مجھ میں اندر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں وہاں دروازے پر رک گئی۔ بابا چلتے ہوئے میرے پاس آئے۔

"مجھے تم پر بہت مان تھا۔ بہت بھروسا تھا اور اب مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی کی بڑی غلطی تم کو کالج میں داخل کرنا تھا۔ شاید اب میں کبھی بھی تم پر اعتماد نہ کر سکوں۔ تم نے مجھ کو جیتے جی مار دیا ہے۔ ایک پل میں سو بار مرنا کسے کہتے ہیں وہ یہی ہے' جو تم نے کیا۔" بابا جان ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے اور میں دل ہی دل میں مرنے کی دعا مانگ رہی تھی۔

"بابا جان میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"تمہارا قصور کیوں نہیں ہے۔ کیا وہ لوگ تم کو زبردستی لے گئے تھے۔ تم خود اپنی مرضی سے گئی

تھیں۔ ان کے ساتھ ہمیں بتائے بغیر۔"
باباجان نے امن کو اشارہ کیا۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ چاروں غصے سے چلے گئے اور میں روتے ہوئے امن کے ساتھ لپٹ گئی۔ ماں کی گود میں بہت سکون ہوتا ہے ماں کے گلے لگ کر میں خوب روئی ۔لیکن میرے آنسو میری غلطی کا مداوا نہ کرسکے۔ پھر چند دنوں کے بعد امن نے مجھے بتایا۔ باباجان نے میرا رشتہ طے کیا تھا۔ میرا دکھ ایک بار پھر بڑھ گیا۔ کہ مجھ سے پوچھا تک نہیں مگر میں تو یہ حق گنوا چکی تھی۔ میں نے خود کو وقت کی دھار پر چھوڑ دیا۔ میری شادی بہت سادگی سے ہوئی۔ محض نکاح کر کے مجھے سعید کے حوالے کیا گیا۔
سعید کا رویہ کچھ عرصے تک تو ٹھیک رہا۔ مگر نہ جانے اسے کیسے میرے ساتھ اس واقعے کا پتا چلا پھر میری سزا میں مزید اضافہ ہوگیا۔
لیکن اب سعید مجھے کچھ نہیں کہتا مگر جب میں اس کو دوسری لڑکیوں سے افیئر چلانے سے منع کرتی ہوں۔ تو وہ مجھے یہ واقعہ یاد دلا کر میرا جینا حرام کر دیتا ہے۔"
وہ لڑکی ساکت ہو کر میری کہانی سن رہی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔
"سنو پیاری لڑکی 'ویلن ٹائن' کچھ بھی نہیں ہوتا۔ محبوب کو خوش کرنے کے لیے ہم اپنے گھر والوں کا بھروسا توڑتے ہیں یہ سارا کسارا دھوکا ہوتا ہے۔ جو بنا سوچے سمجھے آپ اپنوں کو دیتی ہو۔
سرخ لباس پہن کر لڑکیاں اکثر غیر مردوں کے ساتھ یہ محبت کا دن منانے چلی جاتی ہیں اور ان میں اکثر کے ساتھ میرا جیسا سلوک ہوتا ہے اور شادی کے دن یہ جوڑا ان کے نصیب میں نہیں ہوتا اور اپنے قریبی رشتوں کو بھی کھو دیتی ہیں اور ان کے لیے ساری عمر یہ ایک غلطی ندامت اور بے عزتی کا سبب بن جاتی ہے۔
اس لڑکی کا چہرہ ندامت سے بھیگ گیا۔ میں وہاں سے بوجھل قدموں سے چلی گئی۔
میں اپنی غلطیوں کی اتنی بڑی سزا پا چکی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی میری خطا بڑی تھی یا سزا۔

تنزیلہ ریاض

رابنزل

مہر کو کہانیاں سننے کا بے حد شوق ہے۔ اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کررہی ہے' اس لیے اس نے اپنے پاپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ کہانی سناتے ہوئے اسے کوئی یاد آجاتا ہے' جسے وہ راپنزل کہا کرتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراض رہتی ہے اور ان کو سلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتی' وہ ابا سے جتنی نالاں اور متنفر رہتی' لیکن ایک بات حتمی تھی کہ امی سے اسے بہت محبت تھی' لیکن اسے محبت کا مظاہرہ کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کی زبان ہمیشہ کڑوی ہی رہتی۔ نینا اپنے خرچے مختلف ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔

سلیم کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ چند سال پہلے میٹرک کا رزلٹ پتا کرکے وہ خوشی خوشی گھر واپس آرہا تھا کہ ایک گاڑی سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے اور وہ ایک ٹانگ سے معذور ہوجاتا ہے۔ ذہنی بیمار ہونے کی وجہ سے اس کی ماں نے مثبت قدم اٹھاتے ہوئے محلے میں ایک چھوٹی سی دکان کھلوادی' سلیم نے پرائیویٹ انٹر کرکے بی اے کا ارادہ کیا۔ سلیم کی غزل احمد علی کے نام سے ایک ادبی جریدے میں شائع ہوجاتی ہے' جو اس نے نینا کے ہاتھ بھجوائی تھی۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا۔ وہ اپنی بہنوں میں قدرے دبی ہوئی رنگت کی مالک' لیکن سلیقہ شعاری میں سب سے آگے تھی۔ صوفیہ کی شادی جب کاشف نثار سے ہوئی تو پورے خاندان میں اسے خوش قسمتی کی علامتی مثال بنادیا گیا۔ کاشف نہ صرف چلتے ہوئے کاروبار کا اکلوتا وارث تھا' بلکہ وجاہت کا اعلا شاہکار بھی تھا۔ کاشف خاندان کی ہر لڑکی اور

دوستوں کی بیویوں سے بہت بے تکلف ہو کر ملتا' جو صوفیہ کو بہت ناگوار گزرتا تھا۔ صوفیہ کو خاص کر اس کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بری لگتی تھی۔ جو بہت خوب صورت اور ماڈرن تھی اور اس کی خاص توجہ کاشف کی طرف رہتی۔ حبیبہ کی وجہ سے کاشف اکثر صوفیہ سے کیے ہوئے وعدے بھول جاتا تھا۔ صوفیہ کے شک کرنے پر کاشف کا کہنا تھا کہ یہ اس کا کاروباری تقاضا ہے۔

بی بی جان 'صوفیہ کی ساس کو کاشف سے جھگڑا کرنے سے منع کرتی ہیں' لیکن صوفیہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی اور اکثر و بیشتر کاشف سے بحث کرنے لگتی جو کاشف کو ناگوار محسوس ہوتا۔ صوفیہ پریگننٹ ہو جاتی ہے اور بی بی جان کاشف سے صوفیہ کا خیال رکھنے کو کہتی ہیں۔

شہرین نے ضد کرکے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جاکر سمیع سے شادی تو کرلی' لیکن پچھتاوے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ حالانکہ سمیع اسے بہت چاہتا ہے' اس کے باوجود اسے اپنے گھر والے بہت یاد آتے ہیں اور وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے اور زیادہ تر پلز لے کر اپنے بیڈ روم میں سوئی رہتی ہے۔ سمیع نے اپنی بیٹی ایمن کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلالیا جو گھر کا انتظام بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ سمیع اور شہرین دونوں ایمن کی طرف سے لاپروا ہیں اور ایمن اپنے والدین کی غفلت کا شکار ہو کر ملازموں کے ہاتھوں پل رہی ہے۔ اماں رضیہ کے احساس دلانے پر سمیع غصہ ہو جاتا ہے اور ان کو ڈانٹ دیتا ہے۔ شہرین کے بھائی بہن راستے میں ملتے ہیں اور سمیع کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔

سلیم' نینا سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ نینا صاف انکار کردیتی ہے۔ سلیم کا دل ٹوٹ جاتا ہے' لیکن وہ نینا سے ناراض نہیں ہوتا اور ان کی دوستی اسی طرح قائم رہتی ہے۔ نینا کے ابا بیوی سے سلیم سے نینا کی دوستی پر ناگواری ظاہر کرتے ہیں اور بیوی سے کہتے ہیں کہ اپنی آپا سے نینا اور سلیم کے رشتے کی بات کریں۔

زری کے نمبر پر بار بار کسی کی کال آتی ہے۔ اور زری ماں سے چھپ کر اس سے باتیں کرتی ہے۔

نینا کی اسٹوڈنٹ رانیہ اسے بتاتی ہے کہ ایک لڑکا اسے فیس بک اور واٹس ایپ پر تنگ کررہا ہے "آئی لو یو راپنزل" لکھ کر۔ نینا' سلیم کو بتا کر رانیہ کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کہتی ہے۔

حبیبہ کے شوہر مجید کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا سارا پیسہ کاشف کے کاروبار میں انویسٹ کردیتی ہے۔ اس کے اور کاشف کے تعلقات بہت بڑھ گئے ہیں۔ کاشف صوفیہ سے چھپ کر حبیبہ سے ملنے جاتا ہے اور صوفیہ کی آنکھوں پر اپنی محبت کی ایسی پٹی باندھ دیتا ہے' کہ اسے اس کے پار کچھ نظر آنا ہی بند ہو جاتا ہے۔ حبیبہ کاشف پر شادی کے لیے دباؤ ڈالتی ہے۔ کاشف کے گریز اختیار کرنے پر اپنا روپیہ واپس مانگتی ہے اور یوں پہلی دل فریب کہانی اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔ کاشف انکار کردیتا ہے۔ حبیبہ غصے میں کاشف کے تھپڑ ماردیتی ہے۔

شہرین اماں رانیہ کے توجہ دلانے پر ایمن کی سالگرہ جوش و خروش سے ارینج کرتی ہے۔ سالگرہ کا تھیم "راپنزل" رکھتی ہے۔ سالگرہ والے دن شہرین کی امی اور بہنوں کے کوسنے' طعنے اور بددعائیں سارے ماحول کو داغ دار کردیتی ہیں۔ شہرین سر کے درد کی شدت سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔

اب آگے پڑھیے

آٹھویں قسط

ڈیڑھ گھنٹہ وہ دونوں ہی پریشانی سے ایک دوسرے کے چہرے دیکھتی رہی تھیں۔ ابا بھی واپس دکان پر چلے گئے تھے اور امی اپنا موبائل نہیں اٹھا رہی تھیں۔ وہ دونوں اس دوران دعا کرنے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھیں پھر اطلاع آہی گئی۔

نوشی باجی کا انتقال ہو گیا تھا اور ڈاکٹرز بچے کو بھی نہیں بچا سکے تھے۔

"میرا دل کہتا تھا یہی ہوگا۔ میرا کیلی رہ جائے گی..... مجھے پتا تھا میرا کیلی رہ جائے گی..... مجھے ہمیشہ میرا میں "کونین کاشف نثار" کی جھلک نظر آتی تھی۔ ہمیشہ۔" نینا مرنے والی کا افسوس نہیں کررہی تھی بلکہ مرنے والی کی باقیات کا

افسوس کر رہی تھی۔ زری نے دیکھا اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے نینا کو رونے والے مواقع پر کم ہی روتے دیکھا تھا۔

"میرا مشورہ ہے کہ آپ مریضہ کو اعتماد میں لیجئے۔ انہیں ان کی بیماری کے متعلق بتایئے۔ ہو سکتا ہے بہت سے لوگ میری اس بات کی مخالفت کریں لیکن میں سمجھتا ہوں کسی بھی قسم کے مریض سے اس کی بیماری کے متعلق چھپانا بہت بڑی زیادتی ہے۔ برین ٹیومر کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ اس کا علاج۔ پھر اس کے ذیلی اثرات۔ یہ چلنے کے لیے ایک لمبی ناہموار پتھریلی ٹوٹی پھوٹی سڑک کی طرح ہے۔ میں قطعاً" آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ لیکن یاد رکھیں زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کل کیا ہو گا یہ کوئی نہیں بتا سکتا ہم صرف علاج کر سکتے ہیں اور وہ ہم کریں گے تاکہ مریض کو فائدہ پہنچ سکے۔ اس لیے مریض کو پتا ہونا چاہیے کہ وہ علاج کی غرض سے جن پروسیجوز سے گزر رہا ہے جن تکالیف کو سہہ رہا ہے۔ وہ سب اس کے فائدے کے لیے ہیں۔ وہ مثبت سوچے گا تو علاج کے نتائج بھی مثبت نکلیں گے۔" ڈاکٹر رضی نے سمیع کو بتایا تھا۔

آج شہرین کو عارضی طور پر ڈسچارج کیا جا رہا تھا۔ تین دن بعد بائیوپسی کے لیے دوبارہ آنا تھا۔ ڈاکٹر رضی نے اس کا کیس بورڈ کے سامنے رکھا تھا۔ سمیع نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے، اس کی سماعتیں سن تو رہی تھیں لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اتنا اکیلا تو اس نے اپنے آپ کو زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ کس سے بات کرتا، کس سے اپنا دکھ کہتا۔

"آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات۔" ڈاکٹر رضی اس کی غائب دماغی کو محسوس کر کے بولے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب کیا سمجھوں۔ لگتا ہے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ آپ مجھے سچ سچ بتائیں موت شہرین سے کتنی دور ہے۔؟" وہ بت ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کے دل میں لاتعداد خدشات جمع تھے۔ ڈاکٹر رضی نے نفی میں ایسے سر ہلایا کہ سمیع کو اپنے خدشات مزید درست لگنے لگے۔

"سمیع صاحب آپ موت کو کیا سمجھتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ انسانی زندگی کی وہ فیز ہے جسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی جاتی ہے، حالانکہ اس کی کوئی اہمیت یا حیثیت نہیں ہوتی۔ یہ ایک پردہ ہے جو دو زندگیوں کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ کیمرے کے اندر ایک باریک سا پردہ ہوتا ہے جسے اپرچر کہتے ہیں۔ جب کیمرے کی آنکھ روشنی کو نگل کر اندر لے جاتی ہے تو ایک سیکنڈ کے لیے یہ پردہ اپنی جگہ چھوڑتا ہے۔ روشنی یہاں سے گزر کر پردے پر زندگی سے بھرپور تصویر کو محفوظ کر لیتی ہے اور اپرچر واپس اپنی جگہ پر آ جاتا ہے۔

موت ایسا اپرچر ہی ہے جو انسان کو اس فانی سے لافانی دنیا میں لے جاتا ہے۔ اور بس اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کام کب ہو گا کیسے ہو گا۔ یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا نا۔ اور پھر میں چوک میں بیٹھا بنگالی بابا تو ہوں نہیں۔ جو الٹی سیدھی پیشگوئیاں کر کے نوٹ بناتا ہے۔ میں تو معالج ہوں۔ علاج کی حکمت بیان کر سکتا ہوں۔ علاج کر سکتا ہوں۔ میں تو اپنا کام ہی کروں گا نا۔

موت کے متعلق تو کوئی بھی حتمی طور پر نہیں بتا سکتا۔ کون جانتا ہے کہ میں یہاں سے اٹھوں اور دس قدم چل کر ہارٹ اٹیک سے مر جاؤں۔ یا آپ اپنی گاڑی لے کر نکلیں اور سڑک پر کوئی ٹرک آپ کو کچلتا ہوا موت کے گھاٹ اتار دے۔ یہ تو اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ انسان کو اتنا اختیار ہی کب ہے۔" ان کا انداز بارعب اور دبدبے والا تھا لیکن سمیع کو ان کی باتوں سے ذرا سا حوصلہ ضرور ملا۔

"میں یہ سب آپ کو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ خود کو اور باقی اہل خانہ کو ذہنی طور پر تیار کیجیے اور مریضہ کو بھی بتایئے۔ ان کی بیماری کی نوعیت ایسی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی ذہنی کارکردگی پر فرق پڑ سکتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت متاثر ہو سکتی ہے۔ بہتر ہے انہیں اپنے مکمل حواسوں کے ساتھ دنیاداری کے تمام جھمیلے

کمیٹنے دیں اور پھر انسان کے اللہ کے ساتھ بہت سے معاملات ہوتے ہیں۔ جس کی خبر صرف انسان کو ہی ہوتی ہے۔ اسے اپنے لیے کیا مانگنا ہے۔ اللہ کی راہ میں کیا کیا دینا ہے۔ یہ اسے ہی پتا ہوتا ہے۔
اس لیے اپنی اہلیہ کو آگاہ کیجیے تاکہ وہ اللہ کے ساتھ اپنے تجارتی معاملات نبٹا سکیں۔ اپنی توانائی کو بحال رکھتے ہوئے ان کی مدد کیجیے۔" ایک معالج جس قدر نصیحت کر سکتا تھا اتنی تو ڈاکٹر رضی نے کر ہی دی تھی۔ سمیع کے حواس ابھی بھی نارمل نہیں ہو پا رہے تھے۔ اسے تو خود فی الحال حوصلے کی ضرورت تھی۔
"ڈاکٹر رضی.... لیکن یہ کیوں ہوا.... میرا مطلب کوئی توجیہ ہوگی اس ٹیومر کی۔" وہ خود بھی اپنی کیفیت کو مناسب الفاظ دینے میں ناکام ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو پوچھنا چاہتا ہے کیسے پوچھے۔
"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم پوری ہسٹری لے کر ہی کچھ کہہ پائیں گے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے بتایا مریضہ ذہنی تناؤ کا شکار رہی ہیں۔ اور اینٹی ڈیپریشن کا مسلسل استعمال کرتی رہی ہیں۔ تو شاید یہ وجہ ہو۔ لیکن بہرحال اس بارے میں کوئی بھی معالج حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ کندھے اچکا کر بولے تھے۔ سمیع نے سر ہلایا لیکن تاسف نے اس کے پورے وجود کا گھیراؤ کیا تھا۔
"میری محبت گھن کی طرح کھا گئی تمہیں شیریں۔ کس کس بات کی معافی مانگوں تم سے" وہ سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم فلم میں کام کرو گے؟" رخشی نے اس سے پوچھا تھا۔
"خدا کی مانو رخشی بیگم۔ بالکل ہی عقل سے پیدل سمجھ لیا ہے کیا۔" وہ ہنس کر بولا تھا۔
"خدا کو تو مانتی ہوں۔ کافر نہیں ہوں میں شہزادے۔ تم میری بات مانو۔ تمہارے جیسے جاکلیٹی ہیروز کی فلم انڈسٹری کو سخت ضرورت ہے۔ وہ جو پرانے پرانے لوگ اپنی ماں باپ کے سہارے ہیرو بنے بیٹھے ہیں۔ پہلی ہی فلم سے سب کی دکانیں بند کردو گے تم۔" وہ اپنے لہجے پر زور دے کر بولی تھی۔
"تم پاگل ہو رخشی۔" کاشف نے سر جھٹکا تھا۔
"تمہارا قصور ہے۔ تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔" وہ منہ پھٹ تو تھی ہی۔ ترکی بہ ترکی بولی تھی۔
"خوب صورت عورتوں کو پاگل کرنا میری مشغلہ ہے۔" وہ بھی اسی کے انداز میں بولا تھا۔ رخشی نے قہقہہ لگایا۔
"اس مشغلے کو کاروبار بھی بنایا جاسکتا ہے۔" وہ مشورہ دے رہی تھی۔ کاشف نے ہنسی روکتے ہوئے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔
"تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ ایک ہی فلم سے تم زمین سے آسمان پر پہنچ جاؤ گے۔ شہرت تو ملے گی ہی۔ دولت بھی چھپر پھاڑ کر آئے گی۔" وہ سمجھا رہی تھی۔
"نہیں بھئی مجھے ایسے کوئی شوق نہیں ہیں۔" کاشف نے پہلے انکار کر دیا لیکن چند دن بعد ایک محفل موسیقی سے واپسی پر جہاں رخشی نے اسے بطور خاص مدعو کیا تھا۔ واپسی پر گاڑی میں ہی رخشی نے یہ موضوع چھیڑ دیا۔
"تم نے دیکھا تھا کتنے اداکار آئے ہوئے تھے۔ خرم ملک کو دیکھا تھا۔ کتنا برا لگ رہا تھا۔ جھریاں اور آنکھوں کے حلقے نہیں چھپتے اب اس کے کسی بھی میک اپ سے۔ جتنا مرضی چوچا کا بن لے۔ چہرے سے پتا چل جاتا ہے کہ ستر سال کا ہو گیا ہے۔" اسی ہیرو جس کے سامنے وہ اسے سرجی سرجی کہہ کر گفتگو کرنے کے بہانے ڈھونڈتی رہی تھی اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ طنزیہ انداز اپنا کر بولی تھی۔
"ستر کا نہیں ہو گا یار۔ چالیس بیالیس کا ہو گا۔ اتنا برا تو نہیں لگ رہا تھا۔ اچھا خاصا وجیہہ لگ رہا تھا۔" کاشف

نے اس کی بات کی تردید کی تھی۔
"تم اس لیے کہہ رہے ہو یہ سب کیونکہ تم نے اسے نزدیک سے نہیں دیکھا تھا۔ تمہیں اس کے چہرے پر وہ موٹا موٹا میک اپ نظر نہیں آیا جو مجھے نظر آرہا تھا۔ بالکل گنجا ہو گیا ہے۔ وگ پہنی ہوئی تھی۔ چالیس بیالیس کا تو اس کا بیٹا ہو گا اب" وہ اسی انداز میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی کرتی ہوئی بولی تھی۔
"اس کے باوجود اس نے آپ کو بہت اچھا مین ٹین کیا ہوا ہے۔ توند بالکل نہیں نکلی ہوئی تھی۔ سنا ہے کسی بہت مہنگے جم میں جاتا ہے۔ ابھی بھی ساری محفل کی جان تھا وہ۔ ہر چیز پر اس کے آتے ہی جیسے رونق سی چھانے لگی تھی۔" کاشف نے بھی اخبار میں پڑھے ہوئے کسی پرانے انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی تھی۔
"یہی تو فائدہ ہوتا ہے ہیروز کو۔ ہر چیز تک ان کی رسائی ہو جاتی ہے۔ جم بھی جاتے ہیں۔ اسکن کے ڈاکٹرز سے گولیاں بھی لے لے کر کھاتے ہیں تاکہ جوان نظر آئیں اور پھر دوسری بات خوب کہی تم نے۔ مجھے تو ذرا پسند نہیں یہ خرم ملک۔ اس کا سارا چارم کیمرے تک محدود ہے۔ ان جیسوں کو پبلک کے سامنے پیش ہی ایسے کیا جاتا ہے کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ جبکہ تم جیسے کسی میک اپ کسی کیمرے کی روشنی کے محتاج نہیں ہوتے۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں کاشف نثار' تمہارے اندر ایک بہت بڑا ہیرو چھپا ہوا ہے۔" وہ اتنی لمبی تمہید کے بعد اپنا موقف بیان کر رہی تھی۔ کاشف نے گردن اکڑاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور پھر اپنے زعم اور احساس تفاخر پر ذرا سا قابو پا کر بولا۔
"میری تعریف کرنے کا کوئی موقع ضائع نا کیا کرو تم۔"
"کیوں کروں۔" وہ اپنے مخصوص چلبلے انداز میں بولی پھر مشہور پنجابی گیت گنگنانے لگی تھی۔
"منڈہ شہر لور دا۔ میرے دل تے تیر چلاوے۔" کاشف نے قہقہہ لگایا۔
"تم ہنستے جاؤ۔ لیکن میری بھی ضد ہے۔ تمہیں ہیرو بنا کر ہی چھوڑوں گی۔" وہ ہنستے ہوئے جتانے والے انداز میں بولی تھی۔
"تمہاری باتیں سن سن کر لگتا ہے۔ اس سمندر میں اترنا ہی پڑے گا۔ ایک آدھ فلم کرنی ہی پڑے گی۔" کاشف نے بھی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔
"ایک آدھ کر کے دیکھو۔ لائن نا لگ گئی پھر کہنا۔" وہ اسے مزید چڑھا رہی تھی۔ کاشف نے سر ہلایا تھا۔
رخشی پہلی ملاقات سے ہی اسے' اس کی شخصیت کو' اس کے خدوخال قد کاٹھ کو اتنا دل کھول کر سراہتی تھی کہ وہ دل ہی دل میں خود کو واقعی شہزادہ سمجھنے لگا تھا۔ پہلے بھی اس کے سراہنے' چاہنے والے کم نہیں رہے تھے لیکن رخشی نے تو جیسے اس کی تعریفوں کے پل باندھنے کا ٹھیکا ہی لے لیا تھا۔ وہ ڈیڑھ مہینے کی شناسائی میں اسے اپنے ساتھ فلم انڈسٹری کی جانب سے منعقد کی جانے والی پارٹیز میں بھی لے گئی تھی۔

یہ کاشف سے کسی طور ڈھکا چھپا نہیں تھا کہ پنجابی فلموں کے دور میں کس علاقے کے لوگ راج کر رہے تھے اور فلم انڈسٹری کی کیا حیثیت تھی لیکن پھر بھی اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ ایسی پارٹیز میں زیادہ تر عورتیں رخشی کی طرح بہت کھلے ڈلے انداز والی تھیں۔ شراب کے نشے میں باربی کیو اور سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ رقص و سرور والی محفلیں اس کے لیے ایک نیا مختلف اور انوکھا تجربہ تھا۔ اسی لیے جب رخشی نے اسے فلم میں ہیرو بننے کی پیش کش کی تو وہ بظاہر انکار کرتا رہا لیکن دل میں یہ شوق ضرور سر اٹھنے لگا تھا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔

☆ ☆ ☆

نوشی باجی آپریشن تھیٹر میں پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں۔ انہیں اندرونی چوٹیں آئی تھیں جس کا پتا چلنا

مشکل تھا کیونکہ ان کی زچگی قریب تھی اور ڈاکٹر ضروری ٹیسٹ کرتے ہوئے کترا رہے تھے۔ اسی لیے فوری سرجری کی ہدایت کی گئی تھی لیکن تمام تر عجلت کے باوجود ان کی جان نہیں بچائی جاسکتی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ نیناا اور زری ابا کے ساتھ ان کے گھر ہی پہنچ گئے تھے۔ میت اگرچہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی تھی لیکن محلے والے اور کچھ رشتہ دار جمع ہو چکے تھے۔ کہرام مچا ہوا تھا۔

نوشی باجی کی ساس خوب اونچی آواز میں بین ڈال رہی تھیں۔ ان دونوں کو دیکھا تو اٹھ کر آئیں اور باری باری دونوں کے گلے لگ کر پانچ منٹ تک مسلسل روتی رہیں۔ زری کے آنسو بھل بھل گرنے لگے تھے۔ نینا نے خود کو ان سے علیحدہ کیا اور پھر تلخ سے انداز میں پوچھنے لگی۔

"مہر کہاں ہے؟" نوشی باجی کی ساس نے ان کی جانب دیکھا پھر ناک صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"وہ اپنی پھپھی کے پاس بیٹھی ہے۔ اسے وہیں رہنے دو۔ بچی ہے گھبرا جائے گی۔ تم لوگ یہاں میرے پاس بیٹھو۔"

"ہم یہاں بیٹھ کر کیا کریں خالہ جی۔ ہم بھی اس کی پھپھی کے پاس چلے جاتے ہیں۔" نینا ایک بھی آنسو بہائے بغیر بولی تھی۔ زری نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ موقع کی نزاکت کا احساس کیے بغیر بدتمیزی پر اتر آئی تھی۔ یہ بھی اس کے مزاج کا مخصوص حصہ تھی۔

"ہائے ہائے بیٹی۔ بہت پیار تھا تمہیں مرنے والی سے۔ کچھ دیر تو یہاں بیٹھ کر غم منالو۔" وہ اس سے مصنوعی روہانسے انداز میں بولیں۔ نینا نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں انہیں دیکھا۔ زری کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتی۔ نینا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور نوشی باجی کی ساس کی طرف منہ کر کے بولی۔

"اب کا ہے کا غم کریں خالہ جی۔ آپ جاری رکھیں اپنی سرگرمی۔ ہم مہر کے پاس بیٹھتے ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے کی جانب آگئی تھی۔ زری کو اس کی دماغی حالت پر شبہ سا ہوا ہوا۔ اس نے دعا کی تھی کہ ابا لوگ اسپتال سے میت کے ساتھ جلدی سے آجائیں۔ وہ نینا کی بدتمیزی کی وضاحتیں نہیں دے سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے کہا تھا نا کہ کاشف نثار کے اندر ایک ہیرو قید ہے؟" رخشی نے اس کی تصویر کو سراہنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ دونوں سید اسحاق گل کے اسٹوڈیو میں بیٹھے تھے' اس کی تصویریں ان کے سامنے بکھری تھیں جبکہ وہ رخشی کے ساتھ ان کی میز کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ فلم انڈسٹری کے لیے عرصے سے کام کرنے والے ایک بہت ہی ماہر فوٹوگرافر نے اس کا پورٹ فولیو تیار کیا تھا۔

نئے اسٹائل کا ہیرکٹ اور شیو بنوانے والے کے لیے اس نے مہنگے ترین اسٹائلسٹس سے مشورے لیے تھے۔ کپڑے جوتے اور گھڑیاں تو اس کے شوق میں شامل تھیں ہی لیکن اب وہ ان چیزوں کو مزید اسٹائلش طریقوں سے استعمال کرنے کے گر سیکھ رہا تھا۔ رخشی کو ہر کام کی جلدی تھی اور اس کے جلدی مچانے کے نتائج اتنے حیران کن تھے کہ کاشف نثار کو مزا آنے لگا تھا۔ اسے وجیہہ نظر آنے کا پہلے بھی خبط تھا اور رخشی کے زندگی میں آنے کے بعد اس شوق میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ نکھر کر سامنے آیا تھا۔

رخشی نے اسے چند پروڈیوسرز سے بھی ملوایا تھا۔ وہ سب کاشف کو دیکھ کر بہت متاثر تھے اور انہوں نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی تھی۔ وقتی طور پر اس کی توجہ اپنے کام اور گھر سے ہٹتی جارہی تھی لیکن وہ صوفیہ کو ذرا سا بھی شک نہیں ہونے دیتا تھا۔ صوفیہ اس بار زچگی کے لیے اپنی امی کے گھر جانے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن ابھی ساتواں

مینہ شروع ہونے میں چند دن باقی تھے لیکن کاشف اپنے رویے سے اسے اس قدر اعتماد میں لے چکا تھا کہ اسے اب کاشف کی ساری سرگرمیاں صرف کاروباری تقاضے نظر آتے تھے۔ رخشی اسے ایک بڑے ڈائریکٹر سے ملوانے کے لیے لائی تھی۔
"اس میں تو کوئی شک نہیں۔ بندہ تو بڑا کمال کا ڈھونڈ کر لائی ہو رخشی بیگم۔" وہ خالصتاً" فلمی انداز میں اس کی تعریف کر رہے تھے۔
"رخشی نے پہلے کبھی کوئی عام بندہ ملوایا ہے آپ سے سرجی۔" وہ ذومعنی انداز میں مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔
"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کیا اسے کچھ آتا ہے بھی یا صرف شکل ہی شکل ہے؟" انہوں نے استفہامیہ انداز میں کاشف کا چہرہ دیکھا۔
"میرا مطلب ہے فلم کے لیے اور بھی بہت سے لوازمات درکار ہوتے ہیں۔ فلم خالی خولی خوب صورت ہیرو سے نہیں بن جاتی۔ اداکاری وہ بھی فلمی اداکاری بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اپنے جذبات کو ڈائیلاگ کے ساتھ ملا کر پبلک کے خون کو گرمانا کوئی عام بات ہے کیا۔ پھر گھڑسواری 'سوئمنگ۔ رقص۔ بھی آنا چاہیے۔ یہ سب کرلیں گے تمہارے کاشف صاحب۔" ان کا انداز استہزائیہ سا تھا۔
"بالکل کرلیں گے۔ آپ کاشف صاحب کو ہلکا نہ لیں۔" رخشی لجاجت بھرے لہجے میں بولی تھی۔
"ہلکا تو بالکل نہیں لے رہا۔ بندہ تو غضب کا لائی ہو۔ لیکن اناڑی ہے۔ انڈسٹری کی صورت حال تم جانتی ہی ہو۔ اناڑیوں پر محنت کرنے کا حوصلہ ختم ہوگیا ہے اب مجھ میں۔"
"آئے ہائے۔ آپ کون سا بوڑھے ہوگئے ہیں جو حوصلہ ختم ہوگیا ہے۔ آپ ذرا غور کریں۔ میرا مشورہ ہے کہ ایک بار رسک لے کر دیکھیں۔ رخشی آپ کی خیر خواہ ہے۔ آپ کا نمک کھایا ہے۔ اچھی چیز سب سے پہلے آپ کو دکھاتی ہوں۔ کاشف میں ہیرو بننے کا بہت مارجن ہے۔ ان کو چانس دے کر دیکھیں۔ آپ میرے فیصلے کو داد دیں گے۔" وہ منت بھرے انداز میں بولی۔
کاشف کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ جب اس میں 5+ پوٹینشل تھا۔ سارے پروڈیوسرز اس کی تعریف کر رہے تھے تو ایک ڈائریکٹر کی منت کیوں کرتا وہ۔ لیکن وہ خاموش رہا تھا کیونکہ رخشی نے اسے پہلے ہی ہدایت کی تھی کہ کسی بات میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔
"ہوں۔ اب تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو کرنا ہی پڑے گا نا کچھ۔ اچھا بھئی کاشف نثار۔ ہیروئن کے بھائی کا رول کرلو گے۔ ایک آدھ ہیروئن بھی ہوگی ساتھ۔ رونے دھونے اور جذباتی طور پر پبلک کا دل جیتنے کا بڑا موقع ملے گا اس رول میں۔ ہیرو تو نہیں لیکن سائڈ ہیرو ضرور بنا سکتا ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کر بولے تھے۔ کاشف نے ناگواری سے نفی میں سر ہلایا۔
"نہیں...." رخشی نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا پھر اس سے پہلے کہ وہ اس کے انکار کی کوئی وضاحت دیتی۔ کاشف نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا تھا۔
"میں کسی ایسی تھرڈ کلاس فلم میں کام کرنا ہی نہیں چاہتا جس میں دو دو من کی ہیروئن کو کندھوں پر اٹھا کر ٹھمکے لگانے پڑیں یا کرتے کے گریبان کو پھاڑ کر بڑھکیں مارنی پڑیں.... کوئی اچھی چیز ہو تو بتایئے ورنہ ایسی کوئی مجبوری تھوڑی ہے مجھے.... وہ تو رخشی ہی اصرار کرتی رہتی ہے ورنہ مجھے کوئی شوق نہیں کسی فلم میں کام کرنے کا" وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔ سید اسحاق گل کے چہرے کے تاثرات یکدم بگڑے۔
"اسی لیے تو میں نے کہا کہ اناڑی بندہ ہے.... ایسے بندوں کو پرفارمنگ آرٹ کی الف بے بھی نہیں پتا ہوتی.... فلم کتنا بڑا اور اہم میڈیم ہے ایسے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے.... ان کے لیے فلم فقط ہیروئن کے لالی پوڈر سے شروع

ہو کر اس کے پراندے اور اس کے رنگین کپڑوں سے ڈھکے جسم تک محدود رہتی ہے..... جس کو فلم کی اہمیت ہی نہیں پتا... وہ فلم میں کام خاک کرے گا" سید اسحاق گل صاحب کے انداز میں اس قدر تضحیک تھی کہ کاشف نثار کے ماتھے پر ناگواری کی تیوریاں نمایاں ہونے لگیں۔

"جس طرح کی فلمیں آپ بنا رہے ہیں.... ایسی فلم کی اہمیت تو واقعی نہیں پتا مجھے.... تھکے ہوئے اداکار.... ننگے ناچ اور وہی ڈز ڈز ٹھاٹھاہ کرتے مصنوعی ہتھیاروں سے معاشرے کی جو خدمت آپ لوگ کر رہے ہیں وہ آپ کو ہی مبارک ہو بھئی.... میری طرف سے سات سلام ایسی فلم کو....." کاشف استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔ سید اسحاق گل ایک بڑا پروڈیوسر ڈائریکٹر تھا۔ اس کا پارہ یکدم ہائی ہوا تھا۔

"ارے برخوردار اتنا ہی جوش اٹھ رہا ہے معاشرے کا تو خود کوئی فلم کیوں نہیں بنا لیتے۔ آخر ہم بھی تو دیکھیں کہ پھر فلم کیسی ہوتی ہے.... بناؤ فلم تو پتا چلے ناورنہ باتیں کرنے والے تو یہاں وہاں بکھرے پڑے ہیں.... اور اگر یہ سب نہیں کر سکتے تو اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور رفوچکر ہو جاؤ اور دوبارہ کبھی اسٹوڈیو میں نظر نا آنا' یہ نا ہو کہ مجھے اپنے ملازموں سے باہر کا راستہ دکھانا پڑے۔" یہ آخری وار بڑا کاری تھا۔ کاشف اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر کھا جانے والی نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے اس ڈائریکٹر کو دیکھا۔

"ایسا ہے تو پھر اب آپ کو فلم بنا کر دکھانی ہی پڑے گی.... دکھاؤں گا بھی اور سکھاؤں بھی کہ فلم کہتے کسے ہیں" اس نے سید اسحاق گل کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا۔ یہ بھی ایک کھلا چیلنج تھا۔ وہ واقعی کسی فلمی ہیرو کی طرح بڑھک مار کر باہر نکلا تو رخشی نے چند لمحے سوچا پھر وہ بھی کاشف کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔

"تم واقعی فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اسی روز شام کو جب کاشف اس ڈائریکٹر سے جھگڑ کر نکلا تو رخشی نے اس سے فون پر پوچھا تھا۔ کاشف اپنے شوروم میں تھا لیکن اس کا دماغ اور دل ابھی تک وہیں اسی ڈائریکٹر کے کمرے میں بھٹک رہا تھا۔ اسے سخت بے چینی ہو رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فٹافٹ ایک اعلا سی فلم بنا کر اس کے منہ پر دے مارے۔

ڈیڑھ دو مہینے کے عرصے میں اس نے رخشی جیسی بی گریڈ ڈانسر کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ رقص و سرور سے بھرپور رنگیلی تقریبات میں شرکت کی تھی۔ کچھ تھکے ہوئے اداکاروں اور پروڈیوسرز کی محافل میں بیٹھ کر سگریٹ پھونکے تھے اور اسے لگنے لگا تھا کہ یہ تو کوئی کام ہی نہیں تھا جو وہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے قدرت نے اتنی اچھی شکل دی تھی۔ وہ اس کے سہارے بڑی بڑی باتیں کرنے والے سید اسحاق گل اینڈ کمپنی کے منہ بند کر سکتا تھا۔

"میں دوغلا اور منافق کبھی نہیں رہا.... جو کہا ہے وہ کر کے دکھاؤں گا..... تم مجھے بتاؤ مجھے ابتدا کہاں سے کرنی چاہیے؟" وہ ٹھوس لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"صدقے جاؤں.... میں نے جیسا تمہارے بارے میں سوچا تھا.... قسم خدا کی تم اس سے کہیں زیادہ اچھے اور سمجھ دار انسان ہو.... اب رخشی ٹھونک بجا کر حلفیہ یہ کہہ سکتی ہے کہ انڈسٹری کو کاشف نثار جیسے مرد کی ہی ضرورت ہے.... تم فکر مت کرو.... رخشی تمہارے ساتھ ہے" وہ بہت جوش سے بولی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے کیا ہوا تھا؟" شہرین نے سرہانے کے سہارے بیٹھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اس کی ڈریس سب ختم ہو چکی تھیں۔ نرس کچھ دیر پہلے ہی برنولا وغیرہ اتار کر انہیں فارغ کر چکی تھی۔ اس کے چہرے پر نقاہت کے آثار تو تھے لیکن وہ پہلے سے بہتر نظر آتی تھی جبکہ سمیع خود کو برسوں کا بیمار سمجھ رہا تھا۔ اس کا دماغ بالکل ماؤف تھا۔ ایک سوچ آ رہی تھی' ایک جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے زندگی اس کے لیے اس مقام پر اس کے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے

حالانکہ ڈاکٹر رضی نے اسے کافی ہدایات اور تسلیاں دی تھیں لیکن برین ٹیومر کا لفظ ہی ایک ایسا آکٹوپس تھا جس نے سمیع کے حواسوں کو جکڑ لیا تھا۔

"مجھے کیا ہوا تھا سمیع...؟" شہرین نے اس کی خاموشی سے اکتا کر دوبارہ سوال کیا تھا۔ اسے اپنی امی اور بہنوں کا رویہ تو یاد تھا اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ ان کی باتوں نے اسے ہرٹ کر دیا تھا تب ہی اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی لیکن وہ سمیع کی جامد خاموشی سے زیادہ بے چین تھی اور چاہتی تھی کہ سمیع چپ نا رہے۔ سمیع نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"عشق... ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ تمہیں عشق ہوا تھا" وہ بدقت مسکرا کر بولا تھا اور بیڈ کی ساتھ والی تپائی پر پڑی چند ضروری چیزیں سمیٹنے لگا تھا۔ وہ گھر جا رہے تھے۔ شہرین کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔

"تھا نہیں... ہے... مجھے ابھی بھی تم سے عشق ہے۔" وہ اسی کے انداز میں لیکن ابھی بھی پر زور دیے کر بولی تھی اور پھر بغور اس کے چہرے کی جانب دیکھا تھا۔ یہ ایک عجیب میکانکی عمل تھا۔ وہ اس بات پر شرمندہ تھی کہ اس کے گھر والے ہمیشہ سمیع کے خلاف رہتے تھے اور وہ اس کی دل جوئی کرنے کی بجائے خود بیمار ہو کر بستر پر پڑ جاتی تھی۔ بہت ضروری تھا کہ وہ اپنے الفاظ سے کبھی کبھی سمیع کے ٹوٹے دل اور مجروح جذبات کو پر سکون کرنے کی کوشش کر سکے اور یہ بات وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ سمیع کو محبت کا والہانہ اظہار ہمیشہ بے حد خوش کر دیتا تھا۔

وہ اس کے چہرے کی جانب ہی دیکھ رہی تھی آیا وہ کیسا خوشگوار رد عمل ظاہر کرتا ہے۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ وہ خوشی سے نہال ہو گا اور مزید کچھ کہے گا لیکن وہ تو مسکرایا تک نہیں تھا۔ اس کی جانب دیکھا تھا نا ہی اس کی بات کا جواب دیا تھا۔

"چلیں..." وہ اس کی جانب دیکھے بنا بولا تھا۔ شہرین کو اس کا انداز بہت بجھا ہوا لگا۔ وہ بیڈ سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے کہنے پر اپنی جگہ سے اٹھی اور پھر اس کے برابر آ گئی۔ سمیع نے کچھ کہے بنا اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور پھر وہ ہاسپٹل کے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ شہرین کو اس کی خاموشی پر حیرت بھی ہوئی۔ ادائی وغیرہ وہ سب کر چکا تھا۔ اس لیے اطمینان سے لمبے سے کوریڈور سے گزر کر وہ اسپتال کے گلاس ڈور سے باہر نکل آئے تھے۔ دھوپ اور اس کی حدت نے استقبال کیا تھا لیکن گرمی میں زیادہ شدت نہیں تھی۔ ہوا بھی مسلسل چل رہی تھی۔ اس لیے شہرین کو موسم خوش گوار سا لگا۔

"تم یہاں کھڑی ہو... میں پارکنگ سے گاڑی لے کر آتا ہوں۔" باہر نکل کر جہاں تین چار اسٹیپس بنے تھے سمیع نے اس کا ہاتھ چھوڑنا چاہا تھا لیکن اس نے مزید مضبوطی سے تھام لیا۔

"میں بھی ساتھ چلتی ہوں نا..." اس نے کہا تھا اور ساتھ ہی پہلا اسٹیپ اتری تھی۔

"نہیں تم رکو... زیادہ چلنا پڑے گا' تم تھک جاؤ گی۔" سمیع نے انکار کیا تھا۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے حیدر آباد گاڑی پارک کر آئے ہو... یہ اسپتال کے پیچھے تو پارکنگ ہے۔ اتنا سا چل کر نہیں تھکوں گی میں۔" وہ قطعیت سے بولی تھی۔ سمیع بھی اسٹیپ اترنے لگا تھا۔

"میں نے تو اس لیے کہا تھا کہ تم تھک جاؤ گی۔ یہاں تو پارکنگ کی جگہ تھی ہی نہیں۔ میں نے بالکل باہر کی طرف پارک کی ہوئی ہے گاڑی۔"

"نہیں تھکوں گی میں... ذرا سا سر درد اور بلڈ پریشر ہائی ہوا ہے میرا... کینسر نہیں ہو گیا مجھے جو بار بار تھک جاؤ گی' تھک جاؤ گی کی گردان کر رہے ہو... تمہارے ساتھ واک کرنا اچھا لگتا ہے مجھے۔" وہ چڑ کر بولی تھی لیکن سمیع اس کے منہ سے لفظ "کینسر" سن کر جامد سا ہو گیا تھا۔ اس نے تینوں اسٹیپس اتر کر اتنے تھکے ہوئے انداز میں

قدم بڑھائے تھے کہ شہرین چونکے بنا نہ رہ سکی۔
"مجھے تو لگتا ہے تم تھک گئے ہو... میری وجہ سے تمہیں بہت خوار ہونا پڑتا ہے لیکن تم فکر نا کرو... تمہاری ساری خواری ختم ہونے والی ہے۔" وہ اس کو صرف ہنسانے کے لیے نیم مزاحیہ سا انداز اختیار کر رہی تھی لیکن سمیع نے اسے ٹوک دیا۔
"چپ کرو شہرین... باقی باتیں گھر جاکر کرلینا۔ کتنا بولتی ہو تم۔" شہرین کو اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔
"وقت بدل گیا ہے اور وقت بدل جاتا ہے۔" وہ گہری سانس بھر کر بولی تھی۔
"یہ کس نے کہا؟" سمیع کو احساس ہوا تھا کہ اس پر طنز کیا گیا ہے۔ اس لیے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"صنم بلوچ نے کہا تھا... ایک ڈرامے میں..." شہرین ناک چڑھا کر بولی تھی۔
"غلط کہا تھا... ہمارا مشکل وقت تو بدلا ہی نہیں کبھی۔" شہرین کا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا جسے شہرین نے چھڑانا چاہا تھا۔
"کیا ہوا سمیع... سب ٹھیک ہے نا... ایمن ٹھیک ہے؟" وہ اس کے جملے سے زیادہ اس کے انداز سے پریشان ہوئی تھی۔
"ہاں بالکل..." ابھی بھی اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ شہرین اپنی جگہ پر رک گئی۔ سمیع کو بھی توقف کرنا پڑا۔
"کیا ہوا... رک کیوں گئی ہو؟" وہ اس کی جانب دیکھے بنا پوچھ رہا تھا۔ شہرین اس کے سامنے آگئی تھی۔
"تم میری طرف دیکھ کیوں نہیں رہے۔ میں کب سے یہ بات نوٹس کر رہی ہوں۔ تم نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا۔" وہ شکوہ نہیں کر رہی تھی بلکہ اپنی پریشانی کا اظہار کر رہی تھی۔
"یہ بات تو نہیں ہے شہرین۔" سمیع نے لاچاری سے کہتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ سورج کی روشنی اس کے چہرے کا احاطہ کر رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے مزید نمایاں ہونے لگے تھے۔
"سب خیریت ہے نا؟" وہ پوچھ رہی تھی سمیع سے چند لمحے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔
"ایک ہی بات بار بار کیوں پوچھ رہی ہو۔" وہ پھر مسکرایا تھا۔
"اتنا پریشان کیوں ہو... میری وجہ سے بالکل بھی پریشان مت ہو... میں اتنی جلدی مرنے ورنے والی نہیں ہوں... اور ذرا سے سر درد سے کوئی مرتا بھی نہیں ہے۔" وہ اسے تسلی بھی ایسے دے رہی تھی کہ سمیع کا چہرہ مزید بجھنے لگا پھر اس نے اپنی شرٹ میں اٹکائے ہوئے سن گلاسز اتار کر شہرین کی آنکھوں پر لگا دیے تھے۔
"اللہ نا کرے شہرین... ایسی باتیں مت کرو۔ اللہ کرے میری عمر بھی تمہیں لگ جائے... اللہ کرے تمہیں کبھی کوئی گرم ہوا چھو کر بھی نا گزرے۔" وہ اسے دعا دے رہا تھا۔ شہرین اس کے والہانہ انداز پر مسکرائی تھی۔ سمیع نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور گاڑی کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں فلم بنانا چاہتا ہوں؟" اس نے پرعزم لہجے میں کہا۔ حبیب رضوی نے اس کی جانب دیکھا اور اس کے انداز کو جی بھر کر داد دی۔
"میں آپ کے حوصلے کی داد دیتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ رخشی نے حبیب رضوی کو انڈسٹری کا سب سے شاطر دماغ کہہ کر کاشف سے ملوایا تھا۔ وہ ڈائریکٹر تھا اور نئے نئے تجربات کرتا رہتا تھا۔ اس نے سوالیہ انداز میں ان کی جانب دیکھا۔
"...میں رہ کر مگر مجھ سے بیر پال لیا ہے آپ نے اور پھر ضد بھی یہ ہے کہ آخری کنارے تک جائیں گے۔ یہ

آپ کا حوصلہ ہی تو ہے۔" وہ ہنسا تھا۔ رخشی نے یقیناً" اسے کاشف اور اسحاق گل کے جھگڑے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ کاشف کو اس کی وجاہت کے بعد کوئی اس کے ہمت و حوصلے کی داد دے رہا تھا۔ اسے اپنے بدن میں جوش کی ایک نئی لہر بھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسی لیے حبیب رضوی کا اگلا جملہ اسے بھایا نہیں تھا۔

"دیکھیں کاشف صاحب میں زیادہ باتیں بنانے والا فنکار نہیں ہوں۔ نا ہی ادیب یا شاعر ہوں کہ الفاظ کو گھما پھرا کر خوب صورت شکل دے کر ایک تلخ بات کو آپ کی سماعتوں کے لیے قابل قبول بنا سکوں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے ایک غلط فیصلہ کیا۔ اسحاق گل سے جھگڑ کر آپ یہاں اپنی جگہ نہیں بنا پائیں گے۔ انڈسٹری میں پرانے لوگوں کے لیے جگہ تنگ ہوتی جارہی ہے اور آپ تو بالکل ہی نئے نکور ہیں.... کوئی تجربہ نہیں۔ کوئی بیک گراونڈ نہیں۔ یہاں بڑے بڑے گھاگ بیٹھے ہیں۔ آپ یہ سب ہینڈل نہیں کرپائیں گے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا تھا۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے رضوی صاحب.... سید اسحاق گل اور کمپنی کو زیادہ ہی سر پر چڑھا رکھا ہے آپ نے.... مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ انڈسٹری کے ایسے پرانے مال کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت کیا ہے۔ پوری انڈسٹری کو ان لوگوں نے یرغمال بنا رکھا ہے لیکن کب تک.... آخر کبھی تو ان سب پرانی چیزوں کو متروک قرار دینا ہی پڑے گا اور پھر نیا ہونا کوئی خامی تھوڑی ہے.... ہم نئے ہیں تو کیا.... کبھی تو پرانے ہوں گے نا.... تجربہ تو کام کرنے سے ہی آتا ہے.... سمندر میں اتریں گے تو تیرنا سیکھ ہی جائیں گے رضوی صاحب۔ یہی چلن ہے زمانے کا۔ کوئی بھی انسان ماں کے پیٹ سے ڈگری لے کر نہیں نکلتا۔" وہ ان کی بات کو چٹکیوں میں اڑا کر بولا تھا۔

"میں اس بات سے انکار نہیں کرتا لیکن سمندر میں آنکھیں بند کرکے نہیں ناک بند کرکے چھلانگ لگائی جاتی ہے۔ یعنی حالات اور وقت کے مطابق خود کو ڈھالنا ہی دانش مندی ہے۔ آپ فلم بنائیں۔ انڈسٹری کو پرجوش لوگوں کی بہت ضرورت ہے لیکن تجربہ اور جوش دونوں ہی ضروری ہیں۔ اسحاق گل سے بیر پال کر آپ کسی بھی اسٹوڈیو میں کام نہیں کرپائیں گے۔ میری مانیں تو سید صاحب سے صلح کرلیں۔ آپ کہیں تو میں ثالثی کی کوشش کروں۔" اس نے پیش کش کی تھی۔ کاشف نے ناگواری سے سرہلایا۔ رخشی نے اس کی جانب ناصحانہ انداز میں دیکھا تھا۔

"رضوی ٹھیک کررہا ہے کاشف.... تم بے شک اس کے ساتھ کام مت کرو لیکن اس سے بگاڑو بھی مت.... نیا نیا کام ہے.... سب کے ساتھ بنا کر رکھنا ہی عقل مندی ہے۔ میرا مشورہ ہے کوئی بدشگونی والا کام نہ کرو۔" رخشی نے بھی اسے مشورہ دیا تھا۔ کاشف نے ان دونوں کی جانب دیکھا، پھر کندھے اچکائے تھے۔

"آپ لوگ کہتے ہیں تو مان لیتا ہوں۔ ورنہ مجھے.... اس کاٹھ کباڑ میں دلچسپی نہیں ہے۔" اس کے انداز میں رعونت تھی۔ اس کا اشارہ انڈسٹری کے سب سے زیادہ تجربہ کار شخص کی طرف تھا۔ رخشی نے اس کو جتنے کے اتنے اونچے جھاڑ پر چڑھا دیا تھا کہ باقی سب اسے اپنے سامنے بونے نظر آرہے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی ہیرو سمجھنا شروع کردیا تھا۔ حبیب رضوی نے اپنی میز پر پڑے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملانا شروع کیا تھا۔ چند لمحوں بعد کال ریسیو کرلی گئی اور اس کے چند لمحے بعد سید اسحاق گل لائن پر تھا۔

"اسپیکر آن کردو رضوی.... کاشف تک بھی ساری گفتگو پہنچنی چاہیے۔" رخشی نے کہا تھا۔ حبیب رضوی نے اسپیکر آن کردیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"یہ سادہ پلاؤ ہی بنوایا ہے.... قورمہ نہیں بنوایا.... اب ان لوگوں کا کیا کروں گی جو چاول نہیں کھاتے۔ سارا خاندان بھوکا بیٹھا ہے یا ہے۔ اور خدا جھوٹ نا بلوائے تو ہر گھر میں تین نا سہی کم از کم دو تو ضرور ہی شوگر کے مریض نکل آئیں گے۔ چاولوں کو دیکھ کر سب نے ناک بھوں چڑھانی ہے۔ مجھے تو خود ڈاکٹر نے چاولوں سے پرہیز بتایا ہے۔ اللہ کا شکر ہے مجھے شوگر نہیں ہے لیکن رات کے وقت چاول ہضم نہیں ہوتے مجھے۔ اس سے بہتر تھا

دو دیگیں حلیم کی اتروا لیتے۔ خرچا بھی بچ جاتا اور سب کھا پی کر رخصت ہو جاتے... اب یہ چاول کون کھائے' کون انکار کردے' مجھے کیا خبر۔" یہ نوشی باجی کی ساس تھیں۔
نمنا کی نگرانی میں خالہ نے پلاؤ کے بڑے بڑے دیگچے باورچی خانے میں بھجوائے تھے۔ ایک ڈھکن اٹھاتے ہی نوشی باجی کی ساس خالہ کشور نے اعتراض شروع کردیا تھا۔ ان کے خاندان میں یہ روایت تھی کہ جس گھر میں مرگ ہوئی تھی اس گھر کی بہو کے میکے والے جنازہ سے فراغت کے بعد سارے خاندان کو کھلا پلا کر رخصت کرتے تھے۔
"جن کو پلاؤ نہیں کھانا' ان کے لیے چائے بنوالی ہے۔ پاپے اور ڈبل روٹی بھگو بھگو کر کھالیں۔" یہ جواب نمنا نے نہیں دیا تھا۔ یہ آواز باورچی خانے کے ایک کونے سے آئی تھی۔ نمنا نے دیکھا اور پھر دوبارہ سے گہری سانس بھر کر دیگچے کا ڈھکن ٹھیک کرنے لگی۔ مرحومہ اس کی سگی بہن نہیں تھی لیکن سگی بہن سے بھی بڑھ کر تھی اور پھر ایسی جواں سال ناگہانی موت نے تو اہل محلہ کو بھی تڑپا دیا تھا۔
نوشی باجی کی ساس کے انداز نے اسے پریشان نہیں کیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھیں۔ خود غرض اور منہ پھٹ... اور یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی' لیکن نمنا نے کبھی ان سے زیادہ بات نہیں کی تھی۔
نوشی باجی ہمیشہ ہی ٹوک دیا کرتی تھیں کہ کہیں وہ ان سے کوئی بدتمیزی نا کرے۔ اس لیے ابھی بھی وہ چپ ہی رہی تھی۔ وہ اور زری زیادہ تر وقت مہر کے ساتھ ہی رہی تھیں۔
"سارا خاندان تھو تھو کرے گا کہ آصف کے سوہرے ایسے بھوکے ننگے تھے کہ چائے' پاپے کھلا کر بھیج دیا۔" خالہ نے تڑخ کر اس سمت میں منہ کرکے جواب دیا تھا جہاں سے انہیں مشورہ دیا گیا تھا۔
"پہلے آپ فیصلہ کرلیں کہ سارے خاندان کو بی پی ہے یا شوگر... تھو تھو کیوں کریں گے بھلا... یہ فوتگی والا گھر ہے۔ کسی کے ماے چاچے کا ولیمہ نہیں ہے۔ قورمے پلاؤ اپنے اپنے گھر جاکر بھی کھائے جاسکتے ہیں۔" وہ اب سامنے آگیا تھا۔ اس کا صحیح نام کیا تھا' یہ تو نمنا نہیں جانتی تھی لیکن سب ہی اسے پپو کہتے تھے۔ نوشی باجی کا دیور تھا اور نکھٹو آوارہ کے طور پر مشہور تھا۔ اس لیے گھر میں کم ہی نظر آتا تھا۔
"او پاگل خانے آ... تیرا بیچ میں بولنا ضروری نہیں ہے۔ یہ خاندانی نزاکتیں ہیں۔ دنیاداری تو کرنی پڑتی ہیں۔ مرنے والوں کے ساتھ مرا تھوڑی جاسکتا ہے۔ پیٹ سب کے ساتھ لگا ہے۔ صبح سے مرگ والے گھر میں آئے بیٹھیں ہیں۔ بھوک لگ جانا فطری سی بات ہے' لیکن تیرے کھوتے دماغ میں نہیں آئیں گی یہ باتیں۔ تو چپ ہی رہ۔" خالہ کشور اسے گھور کر بولی تھیں۔
"پیٹ سب کے ساتھ لگا ہے۔ دل نہیں لگا گیا۔ یا وہ گھروں میں پانی والے کولر میں رکھ آئے ہیں سب... کسی کی بیٹی کسی کی ماں مری ہے اور سارے لوگ اسی کے گھر والوں سے یہ شکایت کررہے ہیں کہ پلاؤ پکوالیا۔ قورمہ کیوں نہیں۔ خدا کے غضب سے ڈریں ماں جی۔ لوگوں سے ڈر ڈر کر تو خاک ہاتھ نہیں آنے والی۔" وہ بعجلت بولا تھا' پھر اس نے اکیلے ہی بڑا سا دیگچہ اٹھایا اور بالکل ایک طرف کردیا۔ اس کے بعد دوسرے کے ساتھ بھی یہی عمل دہرایا۔ دیگچہ کافی بھاری تھا اور وہ اتنا دبلا پتلا سا تھا کہ اس کے اس عمل نے نمنا کو حیران کیا۔
"خدا سے نا ڈرتی ہوتی تو ابھی یہ دیگچے واپس بھجوا دیتی مگر میری عادت نہیں ہے ایسی۔ بڑا نرم دل ہے میرا۔ رانی بنا کر رکھا ہوا تھا میں نے نوشی کو... یہ بہن کھڑی ہے اس کی... اسی سے پوچھ لو۔ مجال ہے کبھی شکایت کا موقع دیا ہو۔" یہ موقع کی نزاکت کا احساس کیے بغیر شروع ہوگئی تھیں لیکن آواز بہت دھیمی تھی جو باورچی خانے تک ہی محدود تھی۔ نمنا کا دل چاہا وہ یہاں سے نکل کر واپس صحن میں چلی جائے جہاں اس کی امی اور خالہ بیٹھی تھیں لیکن خالہ نے ہی کہا تھا کہ یہ دیگچے کچن میں رکھوا کر میرا انتظار کرنا۔
"جی جی' ایک آپ کا دل نرم ہے' ایک آپ کے بیٹے کا... اتنا نرم کہ بیوی کے مرنے پر جنازے میں شرکت کے

لیے نہیں آسکا۔ بہت غلط کیا بھائی نے۔ اتنی اچھی تھیں نوشین بھابھی... لیکن..." وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا تھا۔ خالہ کشور نے گھور کر پھر اسے دیکھا۔

"کیسے آجاتا... چوہدری سے نہیں آنا تھا... سعودیہ سے آنا تھا... اور وہ تو بے چارہ آنا چاہتا ہی تھا... لیکن میت کی حالت ایسی نہیں تھی کہ زیادہ دیر رکھا جاسکتا۔ اس کے یہاں پہنچنے تک تو دفنائے ہوئے بھی چوبیس گھنٹے گزر جانے تھے... پھر کاہے کو ٹکٹ پر پیسے ضائع کرتا۔" وہ تنک کر بولی تھیں۔ نینا کو ان کی بات سن کر بھی کوئی افسوس نہیں ہوا... نوشی باجی چلی گئی تھیں۔ اس کے دل میں اب اس خاندان کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کے لیے نوشی باجی مرحوم نہیں ہوئی تھیں۔ آصف بھائی مرحوم ہوگئے تھے۔

"ہاں جی جانے دیں' یہ سب بے کار کی باتیں... آپ نے بھائی کو روک دیا کہ دو مہینے بعد جب روزی کی شادی ہوگی تب ہی آنا... ابھی آؤ گے تو ٹکٹ کے پیسے ضائع ہوں گے۔ آپ کو اور آپ کے بیٹے کو انسانوں کی نہیں ریالوں کی بہت فکر ہے۔" وہ لگی لپٹی رکھے بغیر بولا۔

"ہاہ... مرن جوگا ناہووے تے... دفع ہو ادھر سے نکل... شرم نہیں آتی ماں کو ٹونے (طعنے دینا) لگاتا ہے۔"

نینا کی موجودگی کو محسوس کرکے وہ ذرا سا شرمندہ ہوگئی تھیں۔

"جارہا ہوں... مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے یہاں کھڑے ہو کر وقت ضائع کرنے کا اور بی بی آپ تو راستے سے ہٹیں... اندر جاکر بیٹھیں... یہاں کون سی دعائے مغفرت ہو رہی ہے... ہم سورۃ فاتحہ نہیں پڑھ رہے جو آپ کا یہاں کھڑے رہنا ضروری ہے۔" وہ کچن کے دروازے سے نینا کی طرف دیکھتا ہوا تنک کر بولا اور پھر باہر نکل گیا۔

"اے بیٹی اس کی بات کو دل پر نالینا... یہ ذرا چھوٹے دماغ کا ہے... بچپن میں ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا نا اسے... بڑا علاج کروایا تھا اس کا لیکن فائدہ نہیں ہوا۔ اس بیماری کا اثر ابھی بھی دماغ پر ہے۔" وہ وضاحت کر رہی تھیں۔ یہ بات اپنے اس بیٹے کے متعلق وہ پہلے بھی بتاتی رہتی تھیں۔

"نکالو ذرا تھوڑا سا پلاؤ... دیکھوں کیسا ہے... بڑے کا گوشت تو نہیں ڈلوایا نا... ہمارے یہاں نہیں کھاتا کوئی... سب کا پرہیز ہے... آئے ہائے بھوک تو ہے ہی نہیں۔ بس رسم دنیا نبھانے کو کھالیتی ہوں تھوڑا سا... ہائے ہائے اللہ کے کام ہیں سارے..." وہ دیکھ بھی رہی تھیں کہ نینا اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں لیکن پھر بھی بولتی جارہی تھیں۔ نینا کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل آئی۔ اس کا صبر اور ظرف بس اتنا ہی تھا۔

"کاش ہم نے اس گھر میں بیٹی دینے کی بجائے بکری دے دی ہوتی... زیادہ سکھی رہتے۔" خالہ کبھی کبھار بہت جلے دل کے ساتھ یہ جملہ بولا کرتی تھیں۔ نینا کو یہ جملہ پہلی بار سمجھ میں آیا تھا۔ اس کا دل مزید بوجھ ہوگیا۔ مہر کے لیے اس کے دل میں پھر درد اٹھا تھا۔ وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ تھکا ہوا وجود لے کر کاؤچ پر گرسا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا بہت لمبی مسافت طے کرکے آیا ہے۔ شہرین کو گھر ڈراپ کرکے وہ ڈاکٹر میلوڈینا سے ملنے چلا گیا تھا۔ اسے سیکنڈ اوپینئن (دوسری رائے) درکار تھا۔ انہوں نے بھی ساری رپورٹس دیکھنے کے بعد بایوپسی کا کہا تھا اور مشورہ دیا تھا کہ شوکت خانم میں چیک کروالیں۔ سمیع کو ایسے لگتا تھا جیسے ہر لمحہ اس کے لیے ایک نئی اذیت لکھتا چلا جارہا تھا۔ لاؤنج میں اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

وہ چند لمحے ایسے ہی ادھ موا سا کاؤچ پر بیٹھا رہا' پھر وہ سیدھا ہوا تھا۔ اسے چند ضروری کال کرنی تھیں۔ اماں رضیہ نے اسے اس کی والدین کی آمد کا فون پر بتایا تھا اور یہ بھی اصرار کیا تھا کہ وہ شہرین کے پاس اسپتال آجاتی ہیں' وہ گھر آجائے لیکن سمیع نے انکار کردیا اور کہا کہ وہ انہیں کال کرلے گا۔ اس کے بعد اسے وقت ہی نہیں مل سکا

تھا تناہی اس کا دل چاہا تھا۔ اب شیرین کے گھر آجانے کے بعد اس کا دل چاہا کہ وہ انہیں فون کرے۔
اسے شیرین کے لیے بہت سی دعائیں جمع کرنی تھیں۔ اس نے سائڈ ٹیبل پر پڑا ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر گود میں رکھا تھا۔ اس کی امی کو لمبی لمبی کالز کا شوق تھا اور وہ پی ٹی سی ایل سے ہی کال کرتی تھیں۔ اس لیے اس نے اس فون کو استعمال کرنے کا سوچا تھا۔ رنگز جاتی رہی تھیں، پھر گھر کی ملازمہ نے فون اٹھالیا تھا۔
"باجی امی کو بلوا دیں... میں سمیع۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا اور پھر وہ انتظار کرنے لگا تھا۔ امی نے آنے میں پورے پانچ منٹ لیے تھے اور اس دوران سمیع سوچتا رہا تھا کہ انہیں کیا کہے کہ وہ جو دل میں شیرین کے خلاف اتنا بغض رکھتی ہیں، وہ منٹوں میں ختم ہو جائے۔
"یاد آگئی بیٹا جی... تمہیں ہماری... بڑی مہربانی۔" امی نے فون اٹھاتے ہی پہلا طنزیہ جملہ بولا۔ سمیع کو ذرا بھی دکھ نہیں ہوا اسے احساس تھا اس نے ان سے ملاقات نا کر کے اچھا نہیں کیا تھا۔
"آئی ایم سوری امی... دراصل شیرین ٹھیک نہیں تھی۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ امی نے اس کی بات کاٹ دی۔
شکر ہے تمہیں سمجھ میں آگئی کہ شیرین ٹھیک نہیں ہے۔ یہی بات میں تمہیں سمجھانا چاہ رہی تھی۔"
"امی خدارا... ختم کر دیں یہ غصہ... بیمار ہے وہ... بہت بیمار..." اس نے گہری لمبی سانس بھرتے ہوئے التجا کی تھی۔
"بیٹا جی... تم اس کے نخرے اٹھانا بند کر دو... دوسرا بچہ پیدا کرنے جا رہی ہے... اب تو سمجھ لو اس چالاک عورت کی رمز یں... وہ انگلیوں پر نچا رہی ہے تمہیں..." وہ چلا کر بولی تھیں۔ انہیں اس بات کا بہت ہی زیادہ غصہ تھا کہ سمیع اور شیرین نے ان سے یہ بات چھپائی تھی اور پھر سمیع نے ان کی اپنے گھر پر آمد پر ان سے ملاقات بھی گوارا نہیں کی تھی۔
"دوسرا بچہ... یہ کس نے کہہ دیا آپ سے..." سمیع انتہائی حیران ہوا تھا۔
"بہت لوگ ہیں اور بھی، جو ہمیں تم لوگوں کی باتیں بتا دیتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے سمیع کہ تم نہیں بتاتے۔ تم ہمیں اپنا دشمن اور اس عورت کو اپنا سب سے بڑا خیر خواہ سمجھتے ہو... میری دعا ہے کہ تمہیں اس بار بیٹے کی خوشی ملے اور پھر اس بیٹے کو بھی کوئی لڑکی کالا جادو کر کے اپنا گرویدہ بنا لے جیسے تمہاری شیرین بیگم نے تمہیں بنایا ہے، تو پھر تمہیں پتا چلے کہ جب اولاد ایسے دکھ دیتی ہے تو کیسا کلیجہ پھٹتا ہے..." وہ بنا سوچے سمجھے بولتی چلی جا رہی تھیں۔
"امی آپ کا دل نہیں دکھتا... بددعائیں دیتے ہوئے..." اس نے اتنا ہی کہا... اس کا دل اتنا بھرا ہوا تھا کہ اسے لگا وہ رو دے گا۔ وہ رندھا ہوا جا رہا تھا۔ امی کے الفاظ اس کا دل چیر رہے تھے۔
"نہیں... میری روم روم سے، سانس سانس سے اس حرافہ کے لیے بددعائیں نکلتی ہیں... صرف بددعائیں..." امی اسی انداز میں بولی تھیں۔ ان کے دل میں اس قدر خفگی تھی کہ انہیں بیٹے کی بجھی ہوئی آواز سے بھی کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔
"تو پھر آپ کو مبارک ہو امی... لگتا ہے اللہ نے آپ کی سن لی ہے۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا اور پھر فون بند کر دیا۔ مزید کیا کہتا وہ...
اسے لگا تھا بس بھری ہوئی آنکھیں بہنے کو ہیں، شاید وہ بہہ ہی جاتیں کہ سمیع کو احساس ہوا وہ کسی کی نگاہوں کی زد میں ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا، پھر اس کی نگاہ اپنے پاؤں میں پڑے بال پر پڑی... بال کو دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ کوئی اور بھی ہے۔ وہ ایمن تھی اور اس کی جانب ہی دیکھ رہی تھی کہ شاید وہ

بال اٹھائے گا اور اسے دے گا۔ سمیع چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا بنا کچھ کہے' کچھ سنے۔
''میرا دل چاہتا ہے میری بیٹی بالکل تمہارے جیسی ہو۔'' اس کے کانوں میں اپنا ہی کہا ہوا جملہ گونجا تھا۔
''کیوں؟'' شہرین کا مسکراتا ہوا سراپا کیسے آنکھوں کے سامنے سج سا گیا تھا۔
''اس لیے کہ دنیا میں خوب صورتی کی کمی ہوتی جارہی ہے۔ دنیا کو خوب صورت لوگوں کی ضرورت ہے۔۔۔ تمہارے جیسے لوگوں کی۔۔۔'' اس نے کبھی کہا تھا اور شہرین کھلکھلا کر ہنسی تھی۔
''میری دعا ہے کہ میری بیٹی اپنی دادو جیسی ہو۔۔۔ وہ مجھ سے بہت ناراض رہتی ہیں۔۔۔ ان کی پوتی ان جیسی ہوگی تو وہ اس سے اور بھی زیادہ پیار کریں گی۔۔۔ پھر شاید ان کی ناراضی مجھ سے ختم ہوجائے۔''
شہرین کے چہرے پر کیسی معصومیت چمکنے لگی تھی۔ سمیع کو یاد آیا تھا۔ اس نے ایمن کا چہرہ دیکھا اور پھر بنا اسے مخاطب کیے' اس کی بال تھمائے' اسے کوئی مثبت رسپانس دیے' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ اسے پتا نہیں چلا تھا۔ ایمن اسے کیسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

''بادشاہو۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ رضوی فلم بنائے اور اسحاق گل اس کے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑا نا ہو۔'' حبیب رضوی نے ابتدائی علیک سلیک کے بعد مدعا بیان کیا تھا۔
''مبارکاں جناب مبارکاں۔۔۔ جم جم بناؤ۔'' دوسری جانب سے آنے والی آواز اسپیکر کے ذریعے کمرے میں گونج رہی تھی۔
''دنیا لڑکا متعارف کرواؤں گا۔۔۔ کاشف نثار۔۔۔ بڑا چن کر ہیرا ڈھونڈا ہے۔۔۔ آئے گا اور چھا جائے گا۔''
کاشف کو اس کے چیخنے کے انداز پر ناگواری محسوس ہوئی تھی۔
''اچھی بات ہے بھائی۔۔۔ نئے تجربے ویسے بھی راس آجاتے ہیں تمہیں۔۔۔ میری نیک تمنائیں تم سب کے ساتھ ہیں۔'' آواز میں وہی پرانی گرم جوشی نمایاں تھی۔ کاشف نے چیئر کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔ شاید سید اسحاق گل کو یاد بھی نہیں تھا اس کے بارے میں۔۔۔
''سید صاحب آپ کو اپنے ہیرو سے ملوانا چاہتا ہوں۔۔۔ وقت نکال کر کسی روز کھانا کھائیں ہمارے ساتھ۔۔۔ تازہ مچھلی کو مسالا لگوائیں گے۔ تبولہ اور حمس (عربی چٹنی سلاد) کے ساتھ' دبئی کا ذائقہ بھول جائیں گے آپ۔۔۔ ساتھ آپ کی پسندیدہ امپورٹڈ بوتل بھی ہوگی۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے پیش کش کررہا تھا۔
''ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ آج ہی رکھ لو۔۔۔ دلنشین کو بھی بلاؤ نا۔۔۔ مچھلی ہو۔۔۔ امپورٹڈ بوتل ہو۔۔۔ اور کوئی خوب صورت غزل' نا سننے کو ملے تو ہر چیز ادھوری ادھوری لگتی ہے۔'' سید اسحاق گل نے رضامندی دی تھی۔ حبیب رضوی نے تابعداری سے سر ہلایا' جیسے وہ اسے ٹیلی فون ریسیور سے دیکھ ہی رہا ہو۔
''دلنشین کہاں ہم غریبوں کی دعوت قبول کرے گی۔ وہ اب گورنر ہاؤس میں غزلیں سنانے جاتی ہے۔ ایوان صدر میں جلوے بکھیرتی ہے۔ ہمارے تو فون کا جواب بھی نہیں دیتی سرجی۔۔۔ مگر تسی فکر نا کرنا۔۔۔ رخشی ہے نا۔۔۔ اس کی آواز میں۔۔۔ میڈم نور جہاں کے گانے سنیں گے۔'' حبیب رضوی نے اسی انداز میں کہا تھا۔
''نہیں۔۔۔'' سید اسحاق کی قطعیت بھری آواز ریسیور میں ابھری تھی۔
''اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا میں۔۔۔ ہر گامے گاتھے کو اٹھا کر ہیرو بنانے لے آتی ہے۔ ٹکے ٹکے کے لوگوں کے ساتھ پھرتی ہے۔ سو سو روپے لے کر میڈم کے گانے گادیتی ہے۔ دماغ پھر گیا ہے اس کا۔۔۔ ادب آداب بھولتی جارہی ہے۔ انسانوں کی پرکھ بھی نہیں رہی اسے۔ اس کا باب ختم ہوچکا اب۔۔۔'' وہ ناگواری بھرے لہجے میں کہہ

رہا تھا۔ یہ ایک تیر سے دو شکار ہو گئے تھے اور بالکل بے خبری میں ہو گئے تھے۔ کاشف اور رخشی کے چہرے کا رنگ بدلا' وہاں حبیب رضوی بھی ڈگمگا سا گیا۔

"آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں۔۔۔ اپنی لڑکی ہے۔۔۔ کوئی غلطی شلطی ہو گئی تو معاف کر دیں۔۔۔ لیکن منہ نا موڑیں۔۔۔ آپ کی آشیرباد کے بغیر تو وہ واقعی ختم ہو جائے گی۔۔۔ میری فلم تو پھر ڈبے میں ہی پڑی رہ جانی ہے۔" وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ رخشی برا سا منہ بنا کر حبیب رضوی کے عقب سے ہو کر سامنے سامنے کرسی پر آ بیٹھی تھی۔ کاشف نے اسے جتاتی نظروں سے دیکھا۔

"میرے لیے تو وہ ویسے ہی ختم ہے رضوی۔۔۔ میں اب اس کی شکل نہیں دیکھوں گا۔" سید اسحاق گل نے اتنا کہا' پھر وہ ہی قصہ دوبارہ سنانے لگا تھا کہ کیسے رخشی کسی عام سے بندے کو اسٹوڈیو میں لیے پھر رہی ہے اور اس بندے نے اس کی بڑی بے عزتی کی ہے۔

اسحاق گل نے کاشف کے کہے گئے ہر جملے کو مرچ مسالا لگا کر حبیب رضوی کو سنایا تھا۔ کاشف نے اس دوران بہت مشکل سے خود کو کچھ بھی کہنے سے روک کر رکھا تھا' کیونکہ رضوی مسلسل ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

"میرے منہ پر کہتا ہے کہ مجھے فلم بنانی نہیں آتی۔ وہ مجھے کہتا ہے کہ میں فلم بنا کر دکھاؤں گا کہ فلم کہتے کسے ہیں۔ وہ مجھے تڑیاں (دھمکیاں) لگا رہا تھا اور وہ رخشی بھی اسی کے ساتھ تھی۔۔۔ وہی لائی تھی اسے۔۔۔ وہ رخشی کل کی لڑکی۔۔۔ جس کی دو کوڑی کی عزت نہیں تھی۔ جسے داتا دربار سے میں اٹھا کر انڈسٹری میں لایا تھا۔ عزت دلوائی۔۔۔ کام سکھایا۔۔۔ وہی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس پنج انسان کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔

اب میں بھی دیکھتا ہوں کہ کیسے فلم بناتے ہیں یہ۔۔۔ اتنا ہی ماٹھا سمجھ لیا ہے اسحاق گل کو۔۔۔ جس کا دل چاہے گا وہی منہ اٹھا کر فلم بنالے گا کیا۔۔۔ اب یہ ہمیں ہمارے کام سکھائیں گے۔" وہ بہت غصیلے اور طنزیہ انداز میں بات کر رہا تھا اور اس نے جس طرح کے الفاظ استعمال کیے تھے' اس سے کاشف کا پارہ بھی بہت ہائی ہو گیا تھا۔ رخشی کے چہرے کے تاثرات بھی بالکل بدل گئے تھے۔ حبیب رضوی نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے پہلے فون کا اسپیکر اور پھر چند لمحوں بعد فون ہی بند کر دیا تھا۔

"اسحاق گل تیری میری ختم ہو گئی۔۔۔ بس رخشی سے مک گئی تیری۔۔۔ اب تو میں سو فیصد کاشف کے ساتھ ہوں۔۔۔ وہ سارے گر اسے سکھاؤں گی' جو فلم بنانے میں کام آتے ہیں۔۔۔ یہ اسحاق گل سمجھتا کیا ہے خود کو۔۔۔ اسے تو اب رخشی مزا چکھائے گی۔" رخشی بڑبڑا رہی تھی۔ اسحاق گل کے انتہائی ہتک آمیز رویے سے کاشف کے دل میں فلم بنانے کا خیال مزید پختہ ہوا تھا۔ وہ اپنے فیصلے پر مزید مستحکم ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نینا کچھ کھالو۔" امی نے اس کے لیے پلیٹ بنائی تھی' پھر بہت امید سے اس کے لیے لائی تھیں۔ وہ اپنے بستر میں لیٹی تھی۔ لحاف اپنے اوپر اس طرح ڈال رکھا تھا کہ گردن کے سوا سارا وجود چھپا ہوا تھا۔ حالانکہ موسم میں کوئی خنکی نہیں تھی۔ پنکھا فل اسپیڈ کے ساتھ چل رہا تھا اور کمرے کی کھڑکی بھی کھلی تھی۔ اس کے باوجود انہیں اسے اس طرح لیٹا دیکھ کر بے حد گھٹن اور الجھن محسوس ہوئی۔

نوشین کے انتقال کو پانچ دن گزر چکے تھے۔ وہ سب' خاندان میں ہونے والے اس نقصان کو برداشت کرنے کے عمل سے گزر رہے تھے۔ ان کی بہن نے اپنی بیٹی کھوئی تھی' تو گھر کے بیٹوں کے لیے بہن نہیں رہی تھی۔ وہ ان کی بھانجی تھی۔ وہ سب افسردہ تھے لیکن نینا کا حال سب سے برا تھا۔ چند دنوں میں اس کا چہرہ بالکل پھیکا پڑ گیا

تھا۔ وہ برسوں کی بیمار لگنے لگی تھی۔ یہ بھی اس کی عجیب سی شخصیت کا ایک رخ تھا یا تو کسی سے الفت کا مظاہرہ کرتی ہی نہیں تھی لیکن جس سے کرتی تھی، پھر اس پر جان وار کرنے کو بھی تیار رہتی تھی۔ نوشین سے اس کی محبت ڈھکی چھپی نہیں تھی لیکن اس کے اس طرح چلے جانے سے وہ اتنا اثر لے گی یہ بھی ان کے گمان میں نہیں تھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے امی۔۔۔" وہ لیٹے لیٹے بولی تھی۔ انداز میں پژمردگی بے حد نمایاں تھی۔ اس سے پہلے کہ امی مزید کچھ پوچھتیں یا کہتیں وہ اپنا منہ چھپائے ہوئے بولی۔

"امی میں نے آپ سے کہا تھا مہر سے ملنے چلتے ہیں۔ اسے کچھ دن کے لیے یہاں لے آتے ہیں۔" امی نے گہری سانس بھری۔

"کیسے لے آئیں نینا۔۔۔ اس کی دادی سخت برا مانتی ہیں۔ کل ہم کلمہ طیبہ کا ورد کرنے گئے تو سب کے درمیان میں بیٹھی کہتی ہیں کہ بس تین دن ہو گئے۔ تین دن کا ہی سوگ ہوتا ہے۔۔۔ اب نا آئے کوئی منہ اٹھا کر۔۔۔ تمہاری خالہ نے کہا کہ مہر کو ہمارے ساتھ بھجوا دیں تو ناک چڑھا کر بولیں مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ دادی کے گھر رہے یا نانی کے، ایک ہی بات ہے لیکن مہر کے باپ نے منع کیا ہے۔ وہ کہتا ہے ایسے بچی کو ماں کے بغیر رہنے کی عادت نہیں پڑے گی۔ اس کی عادتیں خراب ہوں گی۔" امی کے انداز میں کس قدر تاسف تھا یہ نینا کو محسوس بھی نہیں ہوا تھا۔

"آپ چلیں تو سہی۔۔۔ میں خود ان سے بات کر لوں گی۔" اس نے لحاف ابھی بھی منہ سے نہیں اتارا تھا۔

"کہہ تو رہی ہوں اس کی دادی ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔ صاف کہتی ہیں آپ کی بیٹی مر گئی۔۔۔ مہر ہماری بیٹی ہے۔ اس کے فیصلے ہم کریں گے۔" امی کو نوشین کی ساس کا لہجہ یاد آیا تو ان کے چہرے کے تاثرات بھی بگڑ سے گئے تھے۔ نینا خاموش ہو گئی۔

"اچھا اٹھو۔۔۔ کھانا کھاؤ۔۔۔" وہ اسے پھر سے اٹھنے کی تحریک دے رہی تھیں۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" جواب آیا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔۔۔ لیکن اٹھو تو سہی۔۔۔ دیکھو اتنے مزے کے قیمہ کریلے بنائے ہیں زری نے۔۔۔ سلاد اور پودینے کی چٹنی بھی ہے۔۔۔ تھوڑا سا کھا لو۔۔۔" وہ بہت پیار بھرے لہجے میں بولی تھیں۔ وہ پھر بھی نہیں اٹھی تھی۔ امی نے آگے بڑھ کر اس کا لحاف تھوڑا سا ہٹانا چاہا تھا۔

"نہیں کریں امی۔۔۔ سونے دیں۔" وہ چڑ کر بولی۔ امی نے گہری سانس بھری۔ وہ دن بہ دن بہت چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی اور انہیں اس کی اسی بات پر غصہ آتا تھا۔

"تھوڑا سا کھا لو۔۔۔ شکل دیکھو۔۔۔ بہت کمزور ہو رہی ہو۔۔۔ اٹھو شاباش۔۔۔ کھانا کھاؤ۔۔۔ نہاؤ۔۔۔ کپڑے تبدیل کرو۔۔۔" وہ اسے اٹھنے کے لیے مسلسل کہہ رہی تھیں۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔۔۔ کہا تو ہے نہیں کھانا۔۔۔ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو سب۔" وہ اکتا کر بولی تھی۔ انداز میں بدتمیزی نمایاں تھی۔ امی نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔ وہ کبھی کبھی اپنی بدمزاجی سے ان کا کس قدر دل دکھا دیتی تھی۔ زری ایک منٹ پہلے ہی کمرے میں آئی تھی۔ اسے بھی اس کا انداز اچھا نہیں لگا تھا۔

"چلو تمہاری مرضی۔۔۔ لیٹی رہو ایسے ہی۔۔۔ آئیں امی ہم کھاتے ہیں۔۔۔ اس کے پاس تو بیٹھنا بھی گھاٹے کا ہی سودا ہے۔" زری نے بالکل اسی کے انداز میں امی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تھا۔

"میں کب کہہ رہی ہو کہ میرے پاس بیٹھو۔۔۔ جاؤ سب یہاں سے۔" اب کی بار وہ غرا کر بولی تھی۔

"اٹھ بھی جائیں امی۔۔۔ کتنے نخرے دیکھنے ہیں اس کے۔۔۔ آپ کے لاڈ پیار نے سر چڑھا لیا ہے اسے۔۔۔ چھوڑ

دیں اس کے حال پر۔ ہمیں بھی دکھ ہے نوشی باجی کا۔ لیکن قدرت سے کون لڑ سکتا ہے۔ اللہ کی مرضی تھی کوئی کیا کر سکتا ہے۔ یہ محترمہ ایسے پیش آ رہی ہیں سب سے جیسے ہم سب نے مل کر مارا ہے نوشی باجی کو۔" زری انتہائی غصے سے بولی تھی۔

"جاؤ۔ جاؤ۔ نکلو یہاں سے۔" اب کی بار نینا کا انداز انتہائی طنزیہ تھا۔ زری تو اس کے پاس بیٹھی ہی نہیں تھی۔ امی جو اس کے بے حد قریب بیٹھی تھیں۔ وہ بھی برا مان کر اٹھ گئیں۔ ان کے دل کو اس کے اس رویے سے سخت ٹھیس پہنچی تھی لیکن وہ ایسی ہی تھی۔ بد مزاج۔ خود سر۔ بد تمیز۔ اور دن بہ دن اس کی یہ عادات مزید پختہ ہوتی جا رہی تھیں۔ زری کو امی کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر نینا پر مزید غصہ آیا تھا لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔

"اولاد کا نا ہونا بھی آزمائش ہے اور اولاد کا ہونا بھی آزمائش ہے۔" امی نے نینا کے لحاف میں چھپے وجود کو دیکھتے ہوئے تاسف سے سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم کب تک یوں ہی بیٹھے رہو گے۔" وہ لیپ ٹاپ کھول کر اس پر کب سے وہ لفظ لکھ کر گوگل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو ڈاکٹر رضی نے اسے بتایا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر شہرین کا ٹیومر کس نوعیت کا ہے اور پھر اس کا علاج بعد کے اثرات وغیرہ۔ وہ چاہتا تھا اسے کچھ نہ کچھ تو پتا ہو۔ ورنہ تو دماغ کوئی بھی راستہ سمجھانے سے انکاری تھا۔

اس نے گوگل کے تلاش کے خانے میں ڈینڈرو گلیوما لکھ کر اسکرین کی طرف اسی غائب دماغی سے دیکھنا شروع کیا تھا۔ گوگل نے اس کے سامنے چند صفحات اگل دیے تھے۔ پہلے والا لنک کھولتے ہی اس پر بڑا بڑا میڈیکل ایمرجنسی لکھا آنے لگا تھا۔ ایک کارنر میں سرخ سا نشان بار بار جلتے بجھتے ہوئے خطرے کے نشان کو نمایاں کر رہا تھا۔ پہلے ایک دو فقروں میں ہی اس بیماری کو خوف ناک قرار دیا گیا تھا جس سے سمیع کی ہمت مزید جواب دے گئی تھی۔ اس کے اندر اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ کچھ بھی پڑھ پاتا۔ وہ صرف لیپ ٹاپ کی اسکرین کی جانب دیکھنے میں مگن تھا۔

اسے پتا نہیں چلا تھا کب شہرین اس کے عقب میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سمیع نے چہرے کے تاثرات کو فوراً نارمل کرنے کے لیے پیچھے کی جانب نہیں دیکھا تھا۔

"تم سوئی نہیں اب تک۔ میں تو سمجھا تھا تم سو چکی ہو۔"

"ایک دن اسپتال کے کمرے میں سو جانے سے عادتیں بدل نہیں جایا کرتیں۔ تم گھر میں موجود ہو لیکن بیڈ روم میں نا ہو تو سونا تو دور کی بات ہے۔ میں اس بیڈ روم میں بیٹھ بھی نہیں سکتی۔" وہ استحقاق بھرے انداز میں بولی تھی۔ سمیع مسکرایا کیونکہ وہ اب اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

"اس کا مطلب میں تمہاری عادت بن چکا ہوں؟" وہ اسے چڑا رہا تھا۔

"پختہ عادت۔ انفیکٹ (حقیقت) میں تمہاری ایڈیکٹ ہو چکی ہوں۔" وہ سابقہ انداز میں بولی اور ساتھ ہی اس کی کرسی کے پیچھے آ کر اس کی گردن میں بانہیں حمائل کی تھیں۔ سمیع کے وجود میں جنبش بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے شہرین کے اس محبت بھرے انداز کا خیر مقدم بھی نہیں کیا تھا۔ شہرین کے دل کو ایک اور ٹھیس پہنچی۔ سینے میں کہیں پھر ٹیس اٹھی تھی۔ اسے سمیع کے انداز اس قدر بدلے بدلے لگ رہے تھے کہ وہ پریشان ہوتی جا رہی تھی جبکہ سمیع کو احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

"ایڈیکشن کوئی اچھی چیز تو نہیں ہوتی۔" سمیع مسکرایا یا شاید اسے بہلانے کے لیے مسکرانے کی سعی کی۔

"اچھی چیز کی ایڈیکشن ہو جائے۔ تو پھر اس سے اچھی چیز کوئی نہیں ہوتی۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جتانے والے انداز میں بولی تھی۔ دل میں خواہش اٹھی تھی کہ سمیع اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ دے۔

اسے شدید احساس ہوا تھا کہ جس دن سے اس کی امی نے سمیع کی تذلیل کی تھی' اس دن سے سمیع کا رویہ اس کے ساتھ بدل سا گیا تھا اور یہ بات اسے بہت اذیت دے رہی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" جب سمیع اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں بولا تو وہ اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر رکھ کر بولی تھی کہ شاید اب وہ اپنا ہاتھ بڑھائے گا اور اس کے گال پر رکھے گا۔ اس کے گال کو سہلائے گا.... کبھی کبھی کوئی تسلی' دلاسا' مرہم پھایا ور کار نہیں ہوتا.... دل چاہتا ہے کوئی ہاتھ ہو جو آپ کے ہاتھ کو تھام لے اور بس سکون مل جائے۔ لمس میں زندگی ہے۔ لمس میں توانائی ہے۔ انسان کے درد دل کا مداوا انسان ہی کر سکتا ہے۔ انسانی رشتوں میں قیمتی ترین رشتہ.... میاں بیوی کا رشتہ.... میاں بیوی کا رشتہ خون کا رشتہ نہیں ہوتا لیکن اس رشتے سے خون کے رشتے ضرور جنم لیتے ہیں۔

شہرین کا دل چاہا وہ خود آگے بڑھے اور سمیع کے گلے لگ جائے.... اور یہ کون سا پہلی بار ہوتا جو وہ اس کے گلے لگ جاتی لیکن اس لمحے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ سمیع کی بے زاری اسے بہت ڈرا رہی تھی۔ کیا وہ اس سے لاپروا ہوتا جا رہا تھا۔ کیا وہ اس کے دل میں اپنی قدر و اہمیت کھونے لگی تھی۔ ایک کے بعد ایک خدشہ اسے اپنے حصار میں لے رہا تھا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ تم نے مجھے "اچھا" قرار دیا ہے اس بات پر خوش ہونا چاہیے یا مجھے "چیز" قرار دیا ہے اس پر افسوس کرنا چاہیے۔" اس کی آواز میں بے دلی نہیں تھی لیکن کچھ تھا جو شہرین کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا وقت بدل گیا ہے۔ پہلے تم میری سب باتوں پر صرف خوش ہوا کرتے تھے اور اب تمہیں افسوس ہونے لگا ہے۔" یہ ایک شکوہ تھا جو سادہ سے انداز میں کیا گیا تھا۔

"مجھے تو نہ جانے کس کس چیز پر افسوس ہونے لگا ہے شہرین.... اتنا افسوس.... کہ دل چاہتا ہے....." اس نے لمبی گہری سانس بھری اور فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ شہرین کا سارا وجود سرد ہونے لگا اور اسی لمحے اس کی خاموشی کو محسوس کر کے سمیع نے اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ توانائی کی ایک انوکھی لہر اس کے ہاتھوں سے سفر کرتی ہوئی شہرین کے ہاتھوں تک منتقل ہوئی تھی۔ وہی لمس جس کے لیے شہرین لمحہ بھر پہلے بے قرار ہوئی جاتی تھی۔ فی الوقت اسے بے چین کر گیا تھا۔ سمیع نے اس کا ہاتھ تھامے تھامے اسے اپنے سامنے کر لیا تھا۔

"کیا دل چاہتا ہے سمیع.... اور ایسے کیوں کہہ رہے ہو.... کیوں افسوس ہو رہا ہے تمہیں.... میں اپنی امی کے رویے کی معافی مانگتی ہوں تم سے.... میں جانتی ہوں تم بہت ہرٹ ہو.... لیکن پلیز معاف کر دو۔" وہ اس کے سامنے آ کر التجائیہ انداز میں بولی تھی۔ سمیع کے دل کو جیسے کسی نے چیر ڈالا۔ وہ اپنی امی کے رویے کی بات کر رہی تھی' جبکہ اسے تو یاد ہی نہیں تھا۔ شہرین کے علاوہ اسے کوئی یاد نہیں تھا۔ وہ کیسے یاد رکھتا کسی کو.... اس کے علاوہ دنیا میں کون تھا اس کا۔ وہ جو اس کے سامنے تھی وہ اس کی دنیا تھا اور اس کی دنیا اندھیر ہوئی جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ اس نے شہرین کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"شہری.... ایک بات کہوں.... تم پریشان تو نہیں ہو گی۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ شہرین چونکی تھی لیکن اس سے پہلے وہ کچھ پوچھتی۔ سمیع نے اپنی بانہیں اس کی کمر کے گرد حمائل کی تھیں اور پھر اپنا سر اس کے وجود میں چھپا لینا چاہا تھا۔

"میں تھوڑی دیر رونا چاہتا ہوں شہرین.... پلیز پریشان مت ہونا.... اور کوئی سوال بھی مت کرنا.... کچھ مت پوچھنا.... اور ٹوکنا بھی نہیں.... بس مجھے رو لینے دو تھوڑی دیر.... تھوڑی سی دیر.... پلیز شہرین....."

وہ گلوگیر لہجے میں التجا کر رہا تھا۔ شہرین ہکا بکا اسے دیکھنے لگی۔ سمیع کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں لبالب.... اس نے دیکھا چند آنسو اس کے گالوں پر پھسل آئے تھے.... اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی.... سمیع کی سسکیاں کمرے

میں گونجنے لگی تھیں۔
"سمیع..." اس نے تڑپ کر اس کے سر کو اپنی بانہوں کی قید میں بند کرلیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیسی ہو..." سلیم نے اس کے بے رنگ و رونق چہرے کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ دکان کے اندر آئی تھی اور پھر وا میں طرف کاؤنٹر پر بیٹھ گئی تھی۔ یہ کاؤنٹر دروازے کے بالکل پیچھے تھا اور اس پر بیٹھنے سے باہر کی جانب سے بیٹھنے والے پر نگاہ نہیں پڑتی تھی۔ باجی کے انتقال کے بعد وہ پہلی دفعہ اس سے ملنے آئی تھی اور وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس نے ان کی وفات کا کتنا زیادہ اثر لیا تھا لیکن اس کے پاس کہنے کے لیے کوئی الفاظ نہیں تھے۔ اس لیے اس نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ گفتگو کا موضوع کوئی اور ہی رکھا جائے کیونکہ اس کے چہرے پر لکھا تھا کہ وہ خالہ یا زری سے جھگڑا کر کے آئی ہے۔
"مجھے کیا ہونا ہے' ٹھیک ہوں۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔
"جھگڑ کر آئی ہو زری سے...؟" اس کے چہرے کے تاثرات سے یہی اندازہ کرپایا تھا۔
"مجھے تمہاری زری سے جھگڑنے کے علاوہ بھی اور بہت سے کام ہیں۔" وہ پہلے سے زیادہ برا منہ بنا کر بولی تھی۔
سلیم بے دلی سے مسکرایا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا اس کے سوا نینا کو کوئی سمجھ ہی نہیں پایا۔ وہ اداس ہوتی یا کسی بات پر افسردہ ہوتی تو اسی طرح لڑنے جھگڑنے لگتی تھی۔ ایک بے بس چھوٹے بچے کی طرح جسے تسلی دلاسا مانگنے کے لیے بھی رونا پڑتا تھا اور اس کی یہ رمز اس کی ماں ہی سمجھ پاتی تھی' بالکل اسی طرح وہ بدمزاج ہو کر ظاہر کرتی تھی کہ میں اداس ہوں اور کسی کو یہ بات سمجھ ہی نہیں آتی۔ سلیم تھا جو جانتا تھا کہ وہ رونا چاہتی تھی لیکن کسی کے سامنے رونے سے بہتر وہ یہ سمجھتی ہے کہ لڑ جھگڑ کر اپنی بھڑاس نکال لے۔
"دن بہ دن اتنی جھگڑالو کیوں ہوتی جارہی ہو نینا؟" وہ محبت سے اس سے پوچھ رہا تھا۔ نینا نے گھور کر اسے دیکھا۔
"اپنے کام سے کام رکھا کرو... مجھ پر غور و خوض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں لیب میں رکھا ہوا ایسا نہیں ہوں... سمجھے..." وہ غرا کر بولی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس بات پر بے حد ناراض ہوجاتا لیکن وہ بھی سلیم تھا جس نے بچپن سے اس لڑکی کے نخرے اٹھائے تھے۔ اپنی آئس کریم چپس اور جوس میں سے بچا بچا کر اس کے لیے حصہ رکھا تھا۔
"میں تمہاری ہر رمز سے واقف ہوں... غور و خوض کیے بغیر بھی... مجھ سے کیوں چھپاتی ہو اپنی فیلنگز (احساسات)..." وہ اب اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"اوہ مہاراجہ رنجیت سنگھ... زیادہ ہیرو بننے کی ضرورت نہیں ہے... تمہارے پاس آکر پانچ منٹ بیٹھ کیا جاتی ہوں... تم ایموشنل (جذباتی) ہی ہوجاتے ہو۔" وہ کاؤنٹر سے اتری تھی اور واپس جانے لگی تھی۔ سلیم نے یک دم اس کا ہاتھ پکڑا اور پھر التجائیہ انداز میں بولا۔
"پانچ منٹ پورے تو کرلو..." اس نے اس کی جانب دیکھا لیکن بولی کچھ بھی نہیں۔ ایسے ہی کھڑی رہی جیسے واقعی کسی فلم کی ہیروئن ہو... کوئی اور ہوتا تو اس کے تاثرات دیکھ کر ناک چڑھاتا ہوا اسے جانے دیتا لیکن وہ سلیم تھا اور وہ بھی نینا تھی جو جانتی تھی کہ سب سے لڑ جھگڑ کر اسے سلیم سے بہتر سامع کوئی نہیں ملنے والا۔
"بیٹھو... جب پانچ منٹ ہوجائیں تو چلی جانا۔" اس نے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے کہا تھا۔ نینا خاموشی سے دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

"رونا چاہتی ہو نا؟" وہ اب اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نینا نے ناگواری سے سر ہلایا۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی سلیم کے ہاتھ میں تھا۔
"رو لو... تھوڑا سا... کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ آنسو قیمتی ہوتے ہیں لیکن قیمتی چیزوں کی زکوۃ تو ادا کرنی پڑتی ہے۔" نینا نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ چہرے پر مخصوص خشونت تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، سلیم نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔
"ہاں یہ ایک ڈائیلاگ تھا... لیکن مجھے ان کو لکھنے کے پیسے ملتے ہیں... تم پیسے مت دینا... آنسوؤں کی زکوۃ دے دو... سمجھو میں بہت ضرورت مند ہوں ان آنسوؤں کا۔" وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ نینا کی آنکھیں بھری تھیں لیکن چہرے کے تاثرات ابھی بھی ویسے ہی تھے۔ اس نے سلیم کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر سامنے دیوار کی جانب دیکھا تھا۔
"مجھے رونا نہیں آتا... پتا نہیں کیوں..." وہ گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھی۔ آنکھیں ابلنے کو تیار تھیں۔
"سب انسانوں کو رونا آتا ہے لیکن تم رونے سے ڈرتی ہو... رونے سے سکون مل جاتا ہے نینا۔" وہ ناصحانہ انداز میں بولا۔
"ہاں..." اس نے کہا۔ پہلا آنسو پھسل کر گال پر آیا تھا۔
"کیونکہ مجھے چپ کروانے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر مجھے پتا ہو کہ مجھے کوئی چپ کروانے والا ہے تو میں بھی زور زور سے رو لوں... لیکن مجھے روتا دیکھ کر کوئی بھی مجھے تسلی نہیں دیتا۔ رونا تب ہی سکون دیتا ہے جب پتا ہو کہ کوئی ہے جو آپ کو دلاسا دے سکتا ہے۔" وہ اب روتے ہوئے بولی تھی۔ سلیم نے کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتا تھا فی الوقت اسے الفاظ کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ اس کی بات میں خود غرضی کی نمایاں جھلک تھی لیکن وہ اسے ٹوکنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر یلا آواز روتی رہی اور وہ اسے دیکھتا رہا۔
"ہو گئے ہو اب خوش... رو مر لیا ہے میں نے..." چند لمحے بعد اس نے اپنی آنکھیں خود ہی صاف کر لی تھیں۔
"اچھا کیا جو رو مر لیا... ورنہ تم مزید ایک ہفتہ خالہ اور زری سے جھگڑ جھگڑ کر انہیں نخرے دکھاتی رہتیں۔" وہ مسکرایا تھا۔
"ان سب کی کتنی فکر ہے تمہیں... میری فکر نہیں ہے۔" یہ شکوہ تھا جس نے سلیم کو مزید مسکرانے پر مجبور کیا۔
"چلی ملی کھاؤ گی۔" وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر پوچھ رہا تھا۔ نینا نے نفی میں سر ہلایا۔
"تم خالہ کو بولو نا کہ وہ مہر کو یہاں لے آئیں..." اس نے درخواست کی تھی۔
"اس کے دادا' دادی اسے یہاں نہیں بھیجنا چاہتے نینا۔ تم جانتی ہو ان کی ذہنیت... وہ ذرا وہمی سے لوگ ہیں... اس کی دادی نے امی کو صاف الفاظ میں کہا کہ بار بار مہر کو مت بلوائیں... وہ نہیں چاہتیں کہ نانا' نانی کے گھر جا کر مہر کو کوئی الٹی سیدھی پٹیاں پڑھے۔" سلیم نے بے چارگی سے کہا تھا۔
"اس ڈر سے اب ہم مہر سے لاتعلق تو نہیں ہو سکتے نا... وہ کچھ بھی کہیں گے تو کیا ہم مان لیں گے... وہ ہٹ دھرمی کر سکتے ہیں تو کیا ہم نہیں کر سکتے۔" حسب معمول وہ چڑ کر بولی۔ سلیم نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔
"مہر کا اپنے ابا کے گھر میں رہنا ہی بہتر ہے نینا۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

مکمل ناول

قرۃ العین خرم ہاشمی

وہی درد میری حیات ہے

شمائلہ نے اپنے خیالوں سے باہر آکر' آنے والے کو دیکھا تھا۔ نجانے کب سے گم سم سے بیٹھی وہ سوچوں کے تانے بانے بن رہی تھی جب' راشدہ نے اس کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

"اسے یہاں ہی بھیج دو اور تم چائے کی تیاری کرو۔" شمائلہ نے آہستگی سے کہا تھا۔ راشدہ سرہلاتی چلی گئی تھی۔ راشدہ اپنی مالکن کی خاموشی اور پریشانی کو سمجھتی تھی' مگر کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ میرا بار بار آنا آپ کو ناگوار گزرتا ہے' مگر میں کیا کروں میرا سب کچھ داؤ پہ لگا ہوا ہے! میں ساری کشتیاں جلا کر آیا ہوں' واپس نہیں پلٹ سکتا۔ اب صرف فیصلہ ہی ہوگا آر یا پار....! درمیانی کوئی راہ نہیں بچی اب.....!" آنے والے کے چہرے پہ رت جگوں کی چھاپ تھی۔ آنکھوں میں سرخی اور تھکن کے اثرات واضح تھے۔ شمائلہ نے آنے والے کا سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لیا۔ شکل و صورت میں اچھا تھا۔ مناسب جسم اور تقریباً" پانچ فٹ چار انچ کے قریب اس کا قد تھا اور اس کی شخصیت میں یہ ہی کمی تھی۔ باقی تعلیم' شخصیت یا بول چال میں وہ کسی طرح کم نہیں تھا اور یہ "کمی" بھی شمائلہ کو اس لیے محسوس ہوئی تھی کیوں کہ ان کے خاندان میں ہائٹس وغیرہ بہت آئیڈیل ہوتی تھیں۔ خود شمائلہ کی پانچ فٹ آٹھ انچ تھی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو....!" شمائلہ کی پوسٹ مارٹم کرتی نظروں سے خائف ہوتے ہوئے' اس نے ہاتھ میں پکڑی کار کی چابی گھماتے ہوئے پوچھا تھا۔

"وہ یہاں نہیں آئے گی۔ میں جانتی ہوں اس کی ضد کو' مگر تم اس سے مل سکتے ہو۔ مگر....!" شمائلہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"مگر کیا؟" اسے اجازت ملنے کی جتنی خوشی ہوئی تھی' مگر سن کر ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

"ہم شریف اور عزت دار لوگ ہیں ہمارے یہاں اجنبیوں کو صرف ڈرائنگ روم تک ہی محدود رکھا جاتا ہے۔ اگر آج تمہیں گھر کے اندر آنے کی اجازت مل رہی ہے تو صرف اس ایک کمی...." شمائلہ یہاں آکر سانس لینے کے لیے رکی تھی۔

"اس لیے کہ آپ مجھے اجنبی نہیں سمجھتی ہیں۔" سامنے والے نے پورے یقین سے کہا تھا تو شمائلہ اس کے اعتماد پہ خفیف سا مسکرائی تھی' مگر فوراً" ہی اسی سنجیدگی سے بولی تھی۔

"تمہاری حد سے بڑھی خود اعتمادی نے ہی آج ہمیں یہ وقت دکھایا ہے کہ ہماری عزت اور شرافت ہی آج سب کی نظروں میں مشکوک بن کر رہ گئی ہے۔"

"میں اس سب کے لیے شرمندہ ہوں۔" اس نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا تھا۔

"تمہیں ہونا بھی چاہیے اس لیے کہ ایک طرح سے اس سب کے ذمہ دار بھی تم ہی ہو۔" شمائلہ نے سخت لہجے میں کہا تھا۔ سامنے والا ہونٹ بھینچ کر رہ گیا تھا جو بھی تھا یہ ذلت اس نے خود مول لی تھی۔

"تم اس سے بات کرکے دیکھ لو۔ اگر وہ تمہاری بات سمجھ گئی تو ٹھیک ہے۔ دوسری صورت میں اس گھر کے دروازے اپنے لیے بند سمجھنا۔" شمائلہ نے

آواز دے کر راشدہ کو بلایا تھا۔

"انہیں چھوٹی بی بی کے پاس لے جاؤ۔" راشدہ نے اثبات میں سر ہلا کر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس کا رخ پیچھے والے صحن کی طرف تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد شمائلہ بے دلی سے ریموٹ ہاتھ میں پکڑے چینل سرچنگ میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پہ اضطراب بہت واضح تھا۔ جو پچھلے کتنے ہی عرصے سے اس کے دل کے

آنگن میں ٹھہر چکا تھا۔ دباؤ اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ بھی اب فوراً "فیصلہ چاہتی تھی" چاہے کچھ بھی ہوتا۔ اس کے بعد ہی آگے کا لائحہ عمل سوچا جا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج بھی وہ اپنے مخصوص حلیے میں تھی۔ بے ترتیبی سے سمیٹے گئے بال جو پشت پہ بکھرے ہوئے تھے۔ ملگجا سے سوٹ جس پہ لگتا ہے کہ کبھی استری کی

ہی نہیں ہو۔ اس کے سانولے سے چہرے پہ دکھ کی پرچھائیں اور آنکھوں سے چھلکتی ویرانی بہت واضح تھی۔ آسٹریلین طوطوں کے پنجرے کے پاس رکھی کرسی پہ وہ گم صم سی بیٹھی تھی' جب راشدہ اسے وہاں چھوڑ کر گئی اور اس کی موجودگی محسوس کرتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات یک دم پتھریلے ہوگئے تھے۔ وہ بہت خاموشی سے اس کا جائزہ لیتا آگے بڑھا تھا اور اس کے پاس آکر پنجوں کے بل بیٹھا تھا اور اس کے چہرے کو اپنی نظروں کی گرفت میں لیتا ہوا بولا تھا۔

"چلو اک خواب لکھتے ہیں
دکھوں کی رات لمبی ہے
کوئی مہتاب لکھتے ہیں۔۔۔!"

"میرا پیچھا چھوڑ دو۔"
اس نے سرد آواز میں کہا تھا

"ایک تمہیں ہی تو نہیں چھوڑ سکا آج تک" اس نے بے بسی سے اعتراف کیا تھا' مگر وہ بہت سرد نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ آج اس نے منہ نہیں پھیرا تھا۔ ورنہ آج سے پہلے وہ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھی۔ آج اس کے انداز میں کچھ الگ تھا جسے وہ سمجھ نہیں پارہا تھا' مگر اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ محبوب نے نظر کرم کی ہے۔

"میں ایسا کیا کروں کہ تم مان جاؤ؟" اس نے بے بسی سے پوچھا تھا۔

"اب بھی تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے؟" اس کی سرد آواز میں شعلوں کی لپک تھی' مگر سامنے والا آج ہر حال میں جیتنے ہی آیا تھا۔

"تم جانتی ہو کبھی غور کیا ہے کہ بچے ضد کرکے ہر بات کیوں منوا لیتے ہیں؟ وہ بحث' دلائل' منطق سے کام نہیں لیتے ہیں وہ ایسا ہتھیار استعمال کرتے ہیں جو کند نہیں ہوتا آج میرا بھی یہ ہی دل کررہا ہے کہ میں بھی اسی طرح ضد کروں اسی طرح زور زور سے روؤں' جانتی ہو کیوں؟" اس نے' خاموش بیٹھی لڑکی کی سوالیہ نگاہوں میں جھانکا تھا۔

"تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ انسان کسی نہ کسی ایک کے لیے ہی بچہ ہوتا ہے! یا بچہ بن جاتا ہے۔ اتنا بے بس اور بس بے بس کہ اس کی ساری منطقیں اس کی ساری عقل' طاق پہ دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ پتا نہیں کیوں' مگر تم سے اسی طرح ضد کرنے کو دل چاہتا ہے۔ زندگی میں کبھی خود کو اتنا بے بس و مجبور نہیں پایا اب بھی فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے تم بار بار انکار کروگی میں بار بار آؤں گا۔ اگر تم اپنی ضد نہیں چھوڑ سکتیں تو۔۔۔۔!

میری تو "محبت" کا معاملہ ہے۔ میں کیسے اپنی محبت چھوڑ دوں۔" اس کے آخری جملوں میں وہ چونکی تھی۔ زیر لب دہرایا تھا۔ "محبت"

"کیا محبت کو پالینا ہی سب کچھ ہے؟ اگر محبت پالینے کے بعد یہ نظریہ بدل گیا تو؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا تھا جیسے کسی نتیجے پہ پہنچنا چاہ رہی ہو۔

"آزما کر دیکھ لو۔۔۔!" اس نے دعوا کیا تھا۔

"میں کسی "تجربے" کے لیے نہیں ہوں کہ آپ کے دعوؤں پہ خود کو پرکھوں۔" اس کے چہرے پہ ناگواری پھیل چکی تھی۔

"میں کھلے دل سے آواز دے رہا ہوں کسی تجربے کے لیے نہیں! میرے دروازے کھلے ہیں تمہارے لیے جب جی چاہے آجاؤ! کیوں کہ اگر آزمائش ہی فیصلے کا ترازو ٹھہرا تو پھر پوری طرح ناپ تول کرلیں۔ کل کس نے دیکھا ہے؟ کون جانے کہ کیا ہو؟ اس لیے کوئی دعوا نہیں کروں گا' مگر میں اپنے حال' اپنے دل سے اچھی طرح واقف ہوں اور کہاں ہوں؟ اور کیا کرسکتا ہوں! بس وہی جانتا ہوں۔

اتنے سالوں سے اس یکطرفہ محبت کو لیے جی رہا ہوں اب اگر قسمت نے مجھے یہ موقع دیا ہے' تو اسے کیسے گنوا دوں؟ تم جو چاہو میں ضمانت دینے کو تیار ہوں' مگر پلیز اب یہ ضد چھوڑ دو۔ مان لو کہ قسمت نے تمہیں مجھ سے ایسے ہی ملوانا تھا۔ اب کیا مر جاؤں گا تو یقین کروگی میرا؟" اس نے بے بسی کی انتہا پہ کھڑے کہا تھا۔

بادلوں کی گھن گرج اور آنکھ مچولی جاری تھی۔ کسی

بھی لمحے بارش شروع ہو سکتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے اپنا لمس بخشا تو اس کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ ایسے جیسی کافی عرصے کی سوچ د بچار کے بعد وہ کسی فیصلے پہ پہنچ گئی تھی اس مسکراہٹ نے "آنے والے کو امید کا جگنو تھمایا تھا وہ بولی تو چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ کے برعکس لہجہ سرد ہی تھا۔

"میں نے یقین کیا۔" یہ لفظ سنتے ہی سائل کو ایسا لگا جیسے کسی نے اپنے خزانے کے منہ کھول دیے ہوں۔ ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

"میں نے یقین کیا اس شخص کا! جس نے مجھے جیتے جی بے یقینی کے اندھیروں میں لا کھڑا کیا ہے۔" اس کے منہ سے نکلے اگلے لفظوں نے اس کے چہرے کا رنگ اڑا دیا تھا' مگر فوراً" ہی اس نے خود کو سنبھالا اور اقرار کے لفظوں کو دہراتا واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس کے جاتے ہی لڑکی نے آنکھیں بند کریں اور چہرہ آسمان کی طرف کرلیا۔ اس کے چہرے کو بارش بھگو رہی تھی۔ جانے والے نے پلٹ کر' بارش میں بھیگتی' سانولی' سلونی سی لڑکی کو دیکھا تھا۔ دنیا کے لیے یہ بارش رحمت تھی اور اس کے لیے وہ بارش جیسی لڑکی رحمت تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے تیز تیز قدموں سے پلٹ گیا۔

لاؤنج میں بے زار بیٹھی شمائلہ' اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چونک گئی تھی۔ ایک بوجھ سا سر سے سرکا تھا۔ شمائلہ نے اطمینان سے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ جو پورے یقین سے اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ وہ فاتح تھا۔ اس لیے اب اس کی بات سننی اور ماننی ضروری ہوگیا تھا اور یہ ضروری کام شمائلہ نے فوراً" کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کنول کی بچی! شادی کروا کے کیسے گم ہوگئی ہو جیسے تمہارے آگے پیچھے تو کوئی رہا ہی نہیں ہے۔ بے وفا لڑکی چلو پیچھے ہٹو یہ جھوٹی محبت مت جتلاؤ۔" ہما نے گلے لگی کنول کی کمر پہ ہلکا سا مکا مارا تھا اور اسے خود سے الگ کرتے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولی تھی۔ کنول ہنستے ہوئے الگ ہوئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسی شاپنگ پلازہ کے فوڈ کورٹ میں لے آئی۔

"آرام سے بیٹھو یہاں پھر شکوے کرلینا۔ مجھے تو بہت بھوک لگی ہے تم کچھ لوگی؟" کنول نے کاؤنٹر کی طرف جاتے ہوئے شرارتاً" رک کر پوچھا تھا۔

"ہاں! تمہارا سر۔!" ہما نے دانت پیستے ہوئے کہا تو کنول ہنستے ہوئے مڑ گئی جبکہ ہما کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ آج ایک سال بعد کنول کو اچانک شاپنگ مال میں دیکھ کر ہما خوشی و حیرت سے چلا اٹھی تھی۔ دونوں کالج کے زمانے کی قریبی دوستیں تھیں کنول کی شادی ماسٹرز کرتے ہی ہوگئی تھی اور وہ شادی کے بعد فیصل آباد چلی گئی تھی' جبکہ ہما ایک اسکول میں جاب کررہی تھی۔ اس کی منگنی بھی ہوچکی تھی اور عنقریب شادی متوقع تھی۔

"ہاں اب بولو کیا کہہ رہی تھیں تم۔ میری جدائی میں بھی تم سدھری نہیں ہو۔ ویسے کی ویسے ہی لڑاکا ہو۔" کنول نے مسکراتے ہوئے ہما کو دیکھا تھا جو فش برگر سے مکمل انصاف کرتی ہوئی اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

"جی اور محترمہ تو ماشاء اللہ دن بہ دن نکھرتی ہی گئی ہیں۔ شادی کے بعد بات بات پہ ہنسی اور آنکھوں کی چمک لگتا ہے محسن بھائی کی محبت کا جادو پوری طرح چل چکا ہے۔" ہما نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا تو محسن کے نام پہ شرمگیں سی ہنسی اس کے لبوں پہ پھیل گئی۔ "بکو مت اور یہ بتاؤ تمہارے ہاتھ کب پیلے ہورہے ہیں۔" کنول نے موضوع پلٹ دیا تھا۔ ہما جانتی تھی کہ وہ فطرتاً" کافی شرمیلی ہے۔

"ان شاء اللہ بہت جلد' مگر تم نے کون سا آجانا ہے شادی پہ۔ آج بھی اتفاقاً" مل گئی ہو۔ تم سے اس بے وفائی کی امید نہیں تھی۔" ہما نے خفگی سے کہا تو کنول نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی' مگر کیا کروں شادی کے بعد مصروفیت ایک دم سے ہی اتنی

بڑھی کہ چاہتے ہوئے بھی تم سے رابطہ نہیں کر سکی۔ حمزہ بھائی اور آپی بھی شارجہ شفٹ ہوگئے۔ اس لیے لاہور آنا بھی بہت کم ہوگیا ہے آج کل وہ لوگ چھٹیوں میں آئے ہوئے ہیں۔ اسی لیے میں بہت مشکل سے محسن سے اجازت لے کر تین دن کے لیے رہنے آئی ہوں اور۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کرتی۔ ہما نے اسے ٹوکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مشکل سے کیوں؟ محسن بھائی نے تمہیں کیا قید کرکے رکھا ہوا ہے۔"

"بس ایسا ہی سمجھ لو دراصل محسن کو کہیں آنا جانا یا ملنا جلنا پسند نہیں ہے۔ پھر ان کے آفس جانے کا مسئلہ' وقت پہ کھانے وغیرہ کی تنگی ہو جاتی ہے اس لیے میں بھی کم ہی کہیں آتی جاتی ہوں۔"

کنول نے فوراً"شوہر کی طرف داری کی تھی۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم میری شادی پہ بھی نہیں آؤگی؟" ہما نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں میں ضرور آؤں گی۔ تم بس شادی کرو' باقی فکریں چھوڑو۔" کنول نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا پھر دونوں ایک گھنٹے کے بعد وہاں سے اٹھی تھیں' مگر دل ابھی بھی باتوں سے نہیں بھرا تھا۔ فون نمبرز کے تبادلے ہو چکے تھے۔ دونوں شاپنگ بیگز ہاتھ میں پکڑے پارکنگ ایریا میں آئیں تو ہما ایک دم سے بولی۔

"اب دیکھنا! شیری نے کتنی سنانی ہے مجھے انتظار کروانے پہ۔" اپنی کار کے پاس آتے ہوئے ہما نے شرارت سے کہا تھا۔ کنول دھیرے سے ہنس پڑی جب شیری کی نظر اس پر پڑی وہ جو غصے میں کھولتا' ہما کی طرف آرہا تھا ایک دم ہی ٹھنڈا ہوگیا تھا اور بہت خاموشی سے ان دونوں کو دیکھنے لگا تھا۔ کنول نے پاس آکر سلام کیا۔ جس کا جواب بہت سنجیدگی سے دیا گیا تھا۔

"تمہیں ایک بات بتانی تو بھول ہی گئی تھی میں' شیری بھی آج کل فیصل آباد میں ہوتا ہے اپنی جاب کی وجہ سے۔۔۔" ہما کے کہنے پہ کنول نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سرہلا دیا تھا۔ شیری' ہما سے ایک سال بڑا تھا'

مگر دونوں میں دوستی بہت تھی۔

"آؤ ہم تمہیں ڈراپ کر دیتے ہیں۔" ہما نے آفر کی تھی۔

"نہیں حمزہ بھائی کا ڈرائیور ہے میرے ساتھ دراصل آج ایمان کی سالگرہ ہے۔ اسی کی سرپرائز تیاری میں سب لگے ہوئے ہیں۔" کنول نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔ اور انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی کار کی طرف مڑ گئی تھی۔ ایمان سات سال کی بہت پیاری بچی تھی۔ کنول کی اس میں اور اس کی کنول میں جان تھی۔

"آج تمہاری یہ گمشدہ دوست کہاں سے مل گئی؟" کار چلاتے ہوئے شیری نے سرسری سے لہجے میں پوچھا تھا۔ ہما جو اس کے غصے نہ کرنے پہ خوش تھی۔ تفصیل سے اپنی اور کنول کی ملاقات کے بارے میں بتانے لگی تھی وہ کتنی خوش تھی اس کے لہجے سے پتا چل رہا تھا' مگر وہ ضبط کی کسی منزل سے گزر رہا تھا صرف وہ ہی جانتا تھا یا اس کا دل! جو آج بھی اسی کے احساس سے دھڑکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہاں کیوں کھڑی ہو دعا؟" شمائلہ نے بھیگتی رات کی پھیلی تنہائی اور تاریکی میں اسے گم صم سا پورچ کی سیڑھیوں پہ بیٹھے ہوئے دیکھا تو پاس آکر دھیرے سے بولی تھی۔ دعا نے ایک خاموش نظر اس کے چہرے پہ ڈالی تھی اور دوبارہ سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ شمائلہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ پچھلے کئی مہینوں سے وقت کی سختی اور آزمائش کی زد میں ان دونوں کا رشتہ بھی آگیا تھا۔ جس میں زیادہ ہاتھ شمائلہ کا تھا جو اس آزمائش اور مشکل وقت میں اس کا ساتھ نہیں دے پائی تھی' مگر وہ بھی اپنے حالات سے مجبور تھی۔ امریکا میں اس کا شوہر اور دونوں بچے اس کے واپس آنے کے منتظر تھے۔ جبکہ سب سے چھوٹا تین سال کا بیٹا اذان اس کے ساتھ تھا۔ دعا کا مسئلہ حل ہوتا تو وہ سکون سے واپس اپنے گھر جا سکتی۔

"دیکھو دعا!" شمائلہ نے گہری سانس لے کر بولنا شروع کیا۔ اس کا لہجہ متوازن اور سنجیدہ تھا۔

"جو کچھ بھی ہوا اس میں تمہارا قصور تھا یا نہیں یہ اب الگ بات ہے۔ جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اس پہ سوائے افسوس کرنے کے ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔" شمائلہ نے دیکھا کہ دعا کے گود میں رکھے ہاتھوں پہ پانی کے قطرے گر رہے تھے اس کا مطلب کہ وہ رو رہی تھی پچھلے کئی مہینوں سے وہ یہ کام تو مسلسل کر رہی تھی کہ شمائلہ اب چڑنے لگی تھی۔

"ہر وقت کا رونا۔" شمائلہ کو یہ نحوست لگتی تھی۔

"بہت اچھا ہوا ہے کہ تم نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا ہے آج کل تو کنواری لڑکیوں کو رشتے ملنا بہت مشکل ہے۔ تم تو طلاق یافتہ اور وہ بھی ایک الزام کے ساتھ......! خیر چھوڑو۔ میں اسے کل ڈنر پہ بلا رہی ہوں تاکہ باقی کے معاملات طے کر لیے جائیں۔ سادگی سے تمہارا نکاح کر کے تمہیں رخصت کر دوں گی۔ اس سے اگلے دن میری امریکا واپسی۔ اوپر والا پورشن پہلے ہی کرائے پہ ہے کافی سالوں سے وہ لوگ اچھی دیکھ بھال کر لیتے ہیں گھر کی۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں جہاں آنسوؤں کی قدر نہ ہو وہاں رونا بھی نہیں چاہیے۔ اب نہیں روؤں گی۔ آپ کے سامنے تو کبھی بھی نہیں۔ میں نے زندگی میں ایک بات تو ضرور سیکھی ہے کہ صرف رونے دھونے' ماتم کرنے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ دنیا کے پاس وہ نظر' وہ احساس ہے ہی نہیں جو ان سب کے پیچھے چھپی آپ کی تکلیف کو دیکھ یا محسوس کر سکے پھر ایسی توقع رکھنا فضول ہی ہوا نا یہاں سب وہی سمجھتے ہیں جو وہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا فائدہ خود کو ضائع کرنے کا۔" دعا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے خاموش بیٹھی شمائلہ کی طرف دیکھا تھا۔

"آپ نے اب تک جو بھی کیا۔ میں اس کے لیے احسان مند ہوں مگر زندگی میں دوبارہ کبھی آپ کو ایسی زحمت نہیں دوں گی۔ احساس کا' مان کا اور تعلق کا ہر رشتہ یہاں ہی مدفن کرتے ہیں۔ آج سے آپ بھی آزاد اور میں بھی.....!" دعا نے شمائلہ کے چہرے کے پھیکے پڑتے رنگوں کو دیکھا اور مڑ کر اندر چلی گئی تھی جبکہ شمائلہ اسی جگہ گم صم سی بیٹھی بھیگی رات کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔

ضروری تو نہیں ہوتا کہ تنہائی' اذیت اور خاموشی کا یہ سفر ہمیشہ دوسرے ہی کریں' کبھی کبھی یہ راتیں وہاں بھی ٹھہر جاتی ہیں جہاں روشن دن اور سویرے چمکتے ہوں۔ راتیں تو بس ذرا سا ساتھ چاہتی ہیں جیسے ہی وہ ساتھ ملتا ہے وہ فوراً "ڈیرا" ڈال لیتی ہیں اب دعا کے لفظوں نے سچ کا جو آئینہ دکھایا تھا۔ شمائلہ لاکھ انکار کرتی' مگر اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ رات اور اس کی اذیت ہمیشہ کے لیے ڈیرا ڈال چکی تھی۔ اپنی ذات کے تاریک حصے دیکھنا کب آسان ہوتا ہے؟ ضمیر کی چبھن اسی کا نام تو ہے۔

☼ ☼ ☼

"محسن پلیز جانے کی اجازت دے دیں میری بہت اچھی اور قریبی دوست ہے ہما۔" کنول نے چائے کا کپ ٹی وی دیکھتے محسن کو تھمایا تھا اور وہ مطالبہ دہرایا جو وہ پچھلے کچھ دنوں سے کر رہی تھی۔ ہما کا فون آیا تھا کہ شادی کی تاریخ وغیرہ طے ہو گئی ہے شیری کے ذریعے اسے آج کل میں کارڈ ملنے والا تھا۔ کنول نے یہ سنتے ہی محسن کو منانا شروع کر دیا تھا کیوں کہ محسن کو ایسی تقریبات میں جانا قطعی ناپسند تھا۔

"چھوڑو یار فضول کی تقریبات کو! اس سے بہتر ہے کہ ہم دونوں کہیں آؤٹنگ پہ چلیں گے۔ تمہیں اچھی جگہ سے ڈنر کرواؤں گا اور شاپنگ بھی!" محسن نے کنول کو بہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے نہیں کرنی کوئی بھی آؤٹنگ وغیرہ! میں نے ہما سے وعدہ کیا ہے اس کی شادی میں شرکت کا۔" کنول نے منہ پھلاتے ہوئے کہا تو چائے پیتا محسن چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"مجھ سے پوچھے بغیر میری مرضی جانے بغیر تم اس

طرح کوئی بھی وعدہ کیسے کر سکتی ہو؟" محسن نے سنجیدگی سے پوچھا تو کنول گھبرا گئی جانتی تھی کہ محسن کا دماغ کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی بات پہ الٹ سکتا ہے اور وہ کچھ بھی سوچ یا سمجھ سکتا ہے۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا میں تو صرف..."

کنول نے گھبرا کر وضاحت دینا چاہی مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ محسن کے ماتھے پہ تیوریاں بہت واضح تھیں۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے اپنی مرضی کرنے اور شوہر کو نظر انداز کرنے والی عورتیں بالکل پسند نہیں ہے' اگر تم اپنی مرضی کرنا چاہتی ہو تو شوق سے کرو' مگر پھر مجھ سے کوئی امید مت رکھنا۔" محسن نے غصے سے چائے کا کپ میز پہ رکھا اور تن فن کرتا اندر کمرے میں چلا گیا۔

"اف توبہ! جب مجھے پتا ہے محسن کے مزاج کا تو آرام سے اور تحمل سے اسے مناتی۔ ضد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خود ہی اپنے پاؤں پہ کلہاڑی ماری ہے میں نے۔" کنول نے خود کو کوسا اور گہری سانس لیتی اندر کمرے کی طرف چل پڑی کہ ابھی محسن کا منانا بھی بہت مشکل مرحلہ تھا۔ محسن غصے کا تیز ضرور تھا' مگر کنول سے محبت بھی کرتا تھا اس لیے زیادہ دیر تک اس سے ناراض نہیں رہ پاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ اس طرح جذباتی طور پر مجھے بلیک میل کر لیں گی تو آپ غلط ہیں۔ میں اپنے فیصلے سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیں آپ سب اور یہ رونے دھونے کا سین ختم کریں۔" اس نے پچھلے کئی دنوں کی مسلسل ذہنی اذیت اور رت جگے کی جھنجلاہٹ ماں بہنوں پہ نکالی تھی۔ تینوں بہنیں ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ وہ کبھی اتنا بد لحاظ نہیں رہا تھا بلکہ بڑے دو بھائیوں کی نسبت وہ اپنی تینوں بہنوں سے بہت قریب تھا۔

"امی دیکھ رہی ہیں آپ اس کے تیور۔ ایک غیر لڑکی کے لیے اپنوں کو چھوڑ رہا ہے۔" بینا باجی نے روہانسے لہجے میں کہا تو وہ جھنجلا کر بولا۔

"اف توبہ ہے میں نے بھلا کب کسی کو چھوڑنے کی بات کی ہے یہ سب تو آپ خود کر رہی ہیں بلاوجہ کی ضد کر کے۔"

"بلاوجہ کی ضد! یہ جانتے ہوئے بھی کہ پچھلے دو سالوں سے عظمیٰ سے تمہاری بات طے ہے' میں کیا منہ دکھاؤں گی اپنی بہن' اور تم نے کوئی حور پری ڈھونڈی ہوتی تب بھی کوئی بات تھی۔ ایک عام سی لڑکی اور اوپر سے طلاق یافتہ بھلا بتاؤ میرے بیٹے کے لیے وہ چڑیل ہی بچی تھی۔" ماں کی بات سن کر ناگواری کی شدید لہر اس میں اٹھی تھی۔ راحت بیگم نے بیٹے کے چہرے کے تاثرات سے جان لیا تھا کہ وہ ضبط کی کڑی منزل سے گزر رہا ہے۔

"دیکھیں امی! آپ نے اپنے سب بچوں کی شادی اپنی پسند سے کی ہے۔ اگر ایک کی نہیں بھی کریں گی تو کیا فرق پڑے گا؟ میں آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتا' مگر یہ میرا اٹل فیصلہ ہے! میں ابو سے بھی بات کر چکا ہوں اگر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو آپ کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے آخر بار ماں کو سمجھانا چاہا۔

"ہاں اس بے چارے کو اعتراض ہونا بھی کیسے ہے؟ جب جوان اولاد منہ زور ہو جائے۔ ویسے بھی یہ گھر اور اس کا سب انتظام تم لوگوں کے رحم و کرم پر ہے' باپ تو کئی سالوں سے بیمار ہو کر بستر سے لگا اپنا وقت گزار رہا ہے۔ اسی لیے تو تم لوگ اتنے منہ زور ہو گئے ہو۔" راحت بیگم نے غصے سے کہا تھا۔ عثمان علی کو مختلف جسمانی عارضے لاحق تھے۔ اس لیے کئی سالوں سے فراغت کے روز و شب میں وقت گزار رہے تھے ویسے بھی سب اولادیں اپنی اپنی لائف میں سیٹ تھیں۔ تینوں بیٹوں نے گھر کا انتظام بہت اچھی طرح سے سنبھالا ہوا تھا۔ اس لیے کسی طرح کی تنگی یا مشکل نہیں تھی اس گھر میں۔

"آپ سب میرے ساتھ ان کے گھر جائیں گی یا نہیں؟" اس نے حتمی لہجے میں پوچھا تھا۔

"نہیں! کبھی بھی نہیں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"
راحت بیگم نے بھی ہٹ دھری سے کہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش نظروں سے ان سب کے چہرے دیکھتا رہا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا تھا۔
"میں رشتے توڑنے کا قائل نہیں ہوں امی! نہ ہی ایسا کچھ چاہتا ہوں، مگر آپ لوگوں کی انا اور ضد ہر بات کو خراب کر رہی ہے، میں اگر ایک نئے رشتے کے لیے آپ سب سے لڑ سکتا ہوں تو آپ سب کے لیے بھی وہ سب کر سکتا ہوں جو میرا فرض ہے اور آپ لوگوں کا حق۔ بہرحال میں اس جمعہ کو نکاح کر رہا ہوں اگر آپ سب شامل ہونا چاہتے تو میری خوشی مکمل ہو جائے گی۔" اس نے مضبوط لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔
"وہ کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی یہ یاد رکھنا اگر تمہیں ہماری پروا نہیں تو ہمیں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔" راحت بیگم نے تنفر سے کہتے ہوئے منہ پھیر لیا تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر پہلے ماں اور پھر تینوں بہنوں کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جہاں انکار بہت واضح لکھا تھا۔ وہ غصے سے دروازہ بند کرتا کمرے سے نکل گیا تھا۔ پیچھے باتیں تھیں، شکوے تھے اور بددعائیں تھیں۔ جنہوں نے بڑی دور تک اس کا پیچھا کیا تھا مگر ارادوں اور زبان کے پکے ہر مشکل سے نمٹنا جانتے تھے۔ نامناسب حالات اور آزمائش ہونے کے باوجود اس نے اپنا کہا نبھایا تھا اور جمعہ کے دن اپنے چند قریبی دوستوں کی موجودگی میں دعا کو اپنا نصیب ہمیشہ کے لیے بنا لیا تھا۔ یہ اس کی وہ محبت اور جنون تھا جس کو پانے کی تمنا میں وہ ایک عرصے سے بے تاب تھا۔ اسے محبت کا ملن نصیب ہوا تھا۔ اس کی خواہش پہ کن لکھا جا چکا تھا۔ انسان اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق اپنی زمینی جنت کی بنیاد رکھتا ہے۔
اگر دیکھا جائے تو ہر فیری ٹیل کی طرح جب شہزادی کو شہزادہ مل جاتا ہے تو ہیپی اینڈنگ ہو جاتی ہے، مگر زندگی فیری ٹیل سے زیادہ دلچسپ اور حیران کن ہے زمین پہ دو ستاروں کا ملن جب ہوا تو کیا وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر فضا میں دور دور تک بکھر گئے یا ان ستاروں نے مل کر ایک نئی کہکشاں بنالی ہے۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرتا ہے۔

☆ ☆ ☆

محسن نے کال بیل کی آواز پہ ریموٹ صوفے پہ پھینکا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی آفس سے واپس آیا تھا۔ کنول اس کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ کچن میں مصروف اس نے بھی بیل کی آواز سنی تھی۔ چائے دم پہ رکھ کر کنول نے کچن سے نکل کر ایک نظر یونہی دروازے پہ ڈالی جہاں محسن کسی سے پوچھ رہا تھا۔
"جی آپ کون اور کس سے ملنا ہے؟" محسن نے اپنے سامنے کھڑے اسمارٹ سے لڑکے کو دیکھا تھا جو متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے شخص کے چہرے پہ پھیلے ناگوار تاثرات وہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اسی وقت کنول کی نظر اس پہ پڑی۔
"ارے شیری آپ!" کنول نے آگے بڑھ کر کہا تو محسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ شیری نے اسے دیکھ کر سکون کی سانس لی تھی۔
"محسن میں نے آپ کو اپنی بیسٹ فرینڈ ہما کے بارے میں بتایا تھا یہ ان کے بھائی ہیں اور ہما کی شادی کا کارڈ دینے آئے ہیں۔ صبح ہما نے فون کر کے ایڈریس لیا تھا۔" کنول نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی تو محسن کے چہرے کے تاثرات نرم پڑے۔
"آئیے آپ اندر تشریف لائیے۔" محسن نے حق میزبانی نبھایا تھا۔
"نہیں میں بس یہ کارڈ دینے آیا تھا۔" شیری نے کارڈ آگے بڑھایا۔
"اچھا نہیں لگتا آپ چائے پیے بغیر تو نہیں جا سکتے آئیے پلیز۔" کنول نے آہستگی سے کہا تو محسن نے بھی تائید میں سر ہلایا۔ شیری نے چھوٹے سے، مگر نفاست سے سجے گھر میں قدم رکھا تھا اور بہت گہری نظروں سے ہر چیز کا جائزہ لیا تھا۔ محسن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے، وہ بہت اچھی طرح سے

اس کے مزاج کو سمجھ چکا تھا۔ محسن بہت سنجیدہ اور لیے دیے انداز کا مالک تھا۔ کچھ دیر میں کنول چائے کی ٹرالی سجائے اندر داخل ہوئی۔ چائے پی کر شیری نے اجازت چاہی اور شادی پہ آنے پہ اصرار کیا جسے محسن نے سرہلا کر ان شاء اللہ کہا۔ وہ دونوں اسے دروازے تک چھوڑنے آئے جب محسن کے موبائل پہ کال آئی اور وہ فون سنتا اندر کی طرف چل پڑا۔

"ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے کبھی ایک دوسرے کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ آپ میرا موبائل نمبر رکھ لیں۔" شیری نے کچھ سوچ کر جیب سے ایک کارڈ نکال کر کنول کی طرف بڑھایا تھا۔ جسے کنول نے بخوشی تھام لیا۔

"آپ کا نمبر میرے پاس ہے ہمانے ایڈریس کے ساتھ ہی دیا تھا کہ اگر کوئی مشکل ہو تو آپ کے نمبر پہ کال کرکے پوچھ لوں۔" شیری نے مسکرا کر کہا تھا اور خدا حافظ کہتا ہوا گھر کی دہلیز پار کر گیا تھا۔ کنول بہت خوشی سے گنگناتے ہوئے چائے کے برتن سمیٹنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"محسن آج عافیہ آپی نے شاپنگ پہ جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ میں کھانا بنا جاؤں گی۔ آپ پلیز گرم کرکے کھا لیجیے گا۔ ہمارے انتظار میں بھوکے مت بیٹھے رہیے گا۔" کنول نے ناشتے کی ٹرے محسن کے آگے رکھتے ہوئے کہا تو اس نے تیزی سے واپس مڑتی کنول کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کنول نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا جو مصنوعی خفگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ آج کل تم زیادہ ہی اپنی مرضی نہیں کرنے لگی ہو؟"

"مرضی تو کب کی آپ کی تابع ہو چکی ہے۔ میری ایسی مجال؟" کنول نے بھی شرارتاً کہا تھا۔

"ہاں وہ تو ہے! تمہارے جملہ حقوق کے ساتھ ہی تمہاری سب مرضیاں بھی میری ہو گئی تھیں' اس لیے اس سے روگردانی برداشت نہیں کی جائے گی۔" محسن نے اس کا ہاتھ زور سے دبا کر چھوڑ دیا تھا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"جی جناب' مگر آپ کی آپی اس پابندی سے آزاد ہیں۔ اسی لیے وہ یہ مرضی کر سکتی ہیں۔" کنول نے منہ بسورتے ہوئے اپنے ہاتھ کو دبایا تھا۔ محسن اپنی محبت میں بہت پوزیسو تھا۔ اس کی شدت پسندی سے کنول بہت اچھی طرح سے واقف تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ محسن بہت اچھا اور محبت کرنے والا شوہر تھا' مگر یہ بھی سچ تھا کہ اپنی پوزیسو اور شدت پسند فطرت کے آگے وہ کسی اور کو نہیں دیکھ پاتا تھا۔ دراصل شدت پسندی مثبت ہو یا منفی وہ ہمیشہ اس ان دیکھی دیوار کی مانند ہوتی ہے۔ جو ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیتی ہے۔

کنول کے لیے کبھی کبھی بہت مشکل بھی ہو جاتی تھی جب محسن اپنی بات اور سوچ پر اڑ جاتا تھا۔ محسن کے جانے کے بعد کنول نے ناشتے کے برتن سمیٹے۔ برتن دھو کر' اپنا ناشتا بنایا اور لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ مارننگ شو پہ سرسری سی نظر ڈالتی وہ کاموں کی فہرست پہ غور کر رہی تھی جو اسے بازار جانے سے پہلے نمٹانے تھے۔ نو بجے کے قریب صفائی والی عذرا بھی آگئی۔ درمیانی عمر کی عورت تھی جو کنول کی شادی سے پہلے بھی اس گھر کی صفائی وغیرہ کر جاتی تھی۔ کنول کی شادی کو دو سال ہونے والے تھے اور وہ اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں بہت خوش اور مگن تھی۔ کنول نے دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کر دی' بارہ بجے کے قریب عافیہ آپی اپنے دو پیارے اور نٹ کھٹ بچوں کے ساتھ آگئیں۔ مزمل چھ سال کا اور طوبیٰ چار سال کی تھی۔ کنول کی دونوں بچوں سے بہت دوستی تھی۔ ان کے آتے ہی سونے گھر میں رونق اور چہل پہل ہو گئی تھی۔

"چلو بچوں جلدی سے کھانا ختم کرو۔ پھر بازار بھی جانا ہے۔" عافیہ آپی نے مزمل اور طوبیٰ کو گھورتے ہوئے کہا جن کا کھانے سے زیادہ انٹرسٹ ممانی کے ساتھ باتیں کرنے میں تھا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر موجود

تھے۔ کنول اپنے ہاتھوں سے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر طوبی کو کھلا رہی تھی۔ عافیہ آپی بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ بچے کھانا ختم کرتے ہی وہاں سے اٹھ گئے۔ کنول جلدی جلدی ہاتھ چلا کر برتن اٹھانے لگی۔ عافیہ آپی بھی اس کی مدد کے خیال سے ساتھ لگ گئیں۔ کنول خوش قسمت تھی کہ اسے سسرالی رشتے کے نام پہ ایک ہی قریبی رشتہ ملا تھا جو اس کے حق میں بہت اچھا اور شفیق انداز رکھتا تھا۔

عافیہ آپی محسن سے کچھ سال بڑی تھیں۔ اور اپنی شادی کے بعد فیصل آباد میں ہی مقیم تھیں۔ اس لیے آئے روز چکر لگاتی رہتی تھیں۔ کنول کو ان کا آنا اچھا لگتا تھا۔ اگر رشتوں میں تلخی اور بلاوجہ کی روک ٹوک اور تنقید نہ ہو تو وہ کبھی بھی الجھتے نہیں ہیں اور نہ ہی بوجھ کی طرح لگتے ہیں۔

”کنول ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو تو...!“ عافیہ آپی نے کچھ سوچتے ہوئے تمہید باندھی تھی۔ برتن دھوتی کنول نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

”جی آپی ضرور...!“ کنول نے حیرانی سے کہا تھا۔

”تم لوگوں کی شادی کو دو سال ہونے والے ہیں۔ میرے خیال سے اب تمہیں ڈاکٹر سے ضرور کنسلٹ کرنا چاہیے۔ ایسے معاملوں میں زیادہ دیر مناسب نہیں ہوتی۔“

عافیہ آپی نے بالآخر وہ بات کہہ ہی دی جو کافی دنوں سے کہنا چاہ رہی تھیں۔ کنول چپ چاپ انہیں دیکھتی رہ گئی۔ پھر گہری سانس لے کر بولی۔

”عافیہ آپی میں نے یہ بات محسن سے بہت بار کی ہے مگر وہ کسی کی نہیں سنتے۔ کہتے ہیں کہ ابھی ٹائم ہی کتنا ہوا ہے۔“

کنول نے بھی دل کی بات ان سے کہی تھی کیونکہ اس کے پاس بھی فی الحال ایسا کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا جس سے یہ سب شیئر کر سکتی۔

”اچھا تم پریشان مت ہو۔ میں محسن سے خود بات کرلوں گی۔ میری ایک جاننے والی لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ تمہیں خود ان کے پاس لے کر جاؤں گی۔“

عافیہ آپی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ کنول نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

”تم جانتی ہو میں نے ہم دونوں کے گھر کے بارے میں کیا کیا سوچ رکھا تھا۔“

وہ اسے رخصت کروا کے پورش ایریا کے اس چھوٹے مگر خوب صورت بنے گھر میں لے آیا تھا جو کچھ دن پہلے ہی اس نے کرائے پہ لیا تھا۔ دعا کو رخصت کروا کے وہ اپنے گھر نہیں لے جا سکتا تھا جہاں ایک محاذ اس کے خلاف پہلے ہی تیار تھا۔ دوسرا اس نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ دعا کو سب سے الگ رکھے گا۔ اور اس کے ساتھ پرسکون زندگی گزارے گا اور آہستہ آہستہ اپنے گھر والوں کو منائے گا۔ دعا نے خوب صورت ریڈ کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہلکے سے میک اپ اور کانوں میں پہنے خوب صورت سے ٹاپس اور اسی ڈیزائن کا لاکٹ پہنے وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ آج اس کے تاثرات سپاٹ نہیں تھے۔ ایک گھبراہٹ اور جھجک واضح تھی۔

اس گھر میں اس کا استقبال کرنے والا کوئی نہیں تھا دعا کو ایسی کوئی امید بھی نہیں تھی۔ اس نے یہ رشتہ امیدوں یا خوابوں کی بنیاد پہ نہیں جوڑا تھا۔ اس نے رشتہ اپنی مجبوری اور ضرورت کی بنیاد پر جوڑا تھا۔ وہ زمانے اور حالات کی گردشوں کا شکار بہت عام سی لڑکی تھی۔ کوئی سپر وومن یا آئرن لیڈی نہیں تھی کہ کسی رشتے اور سہارے کے بغیر کالے خوفناک ’ہوس کے پجاری بھیڑیوں کے درمیان محفوظ زندگی گزار لیتی۔ جوانی کی شام کا دورانیہ بھلے بہت مختصر سا ہوتا ہے مگر سب سے بھاری بھی یہ ہی وقت ہوتا ہے! اس لیے تو جوانی کی عبادت اور پاکیزگی کا عمل افضل ہے۔! اور اسی کا حساب بھی لیا جائے گا۔

دعا جتنا ذہنی طور پر سفر کر چکی تھی اسے سچ میں کسی سہارے ’کسی ہمدم کی ضرورت تھی اور اگر کوئی محبت کا دعویدار بھی ہو تو...! چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کا نشہ

اور خمار سر چڑھ کر بولتا ہے۔!

پورچ میں کار رکی تو اس نے دوسری طرف آکر کار کا دروازہ کھولا اور دعا کا ہاتھ پکڑ کر اسے نرمی سے باہر نکالا۔ دعا نے جھجکتے ہوئے ایک نظر اس کے مضبوط ہاتھوں پہ ڈالی تھی۔ پورچ کے ساتھ چھوٹا سا لان بھی تھا۔ بہت سے گملے بھی ایک طرف رکھے ہوئے تھے جن کی تراش خراش اور ترتیب دینے کی ضرورت تھی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے آیا۔ اور اپنی ہی ترنگ میں بولتا اسے گھر دکھانے لگا۔ گھر میں ابھی کوئی خاص سامان نہیں تھا۔ سوائے بیڈ روم کے جو آج کے دن کی مناسبت سے خوب صورت اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔ اس بیڈ روم کے ساتھ ٹیرس بھی تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر ٹیرس پہ لے گیا۔ رات کالی تھی ہمیشہ کی طرح مگر اس پہ چودھویں کا چاند سجا ہوا تھا۔ ہر سو پھیلی چاندنی اور رات کے اس پہر کہیں سے آتی رات کی رانی کی خوشبو ماحول کو سحر زدہ بنا رہی تھی۔ دعا نے اپنے اعصاب کو پرسکون ہوتے پایا تھا۔ وہ محفوظ تھی، کسی کی پناہ میں تھی کوئی تھا جو اس سے محبت کے بے تحاشا دعوے کر رہا تھا۔ اس کی خوشی ایسی تھی کہ جیسے کسی مرنے والے کو زندگی کی نوید مل جائے، جیسے کسی پیاسے کو آب حیات مل جائے، اس کے لیے بھی محبت کا ملنا ایسا ہی تھا۔

"ہم دونوں یہ گھر مل کر سجائیں گے۔ ہر چیز دونوں مل کر اور ایک ساتھ پسند کر کے لیں گے اور..." وہ اپنی رو میں کہہ رہا تھا۔

"اور اگر ہماری پسند مختلف ہوئی تو!" دعا نے پہلی بار لب کھولے تھے وہ چونکا، کچھ سوچا اور پھر بولا۔

"کوئی بات نہیں کبھی میں کمپرومائز کرلوں گا اور کبھی تم۔"

"کیا ہر چیز پہ کمپرومائز کیا جا سکتا ہے؟" دعا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ جواب الجھ رہا تھا۔ دعا کے پاس وقت اور حالات کا تلخ تجربہ اور سبق تھا جبکہ اس کے پاس اپنی محبت اور خوابوں کا خزانہ تھا! اب دیکھنا تھا جیت کس کی ہونی تھی۔

"ہاں اگر ہم چاہیں تو ہر بات، ہر چیز پہ سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔"

اس نے یقین سے کہا تھا۔ دعا نے ایک نظر اس پہ ڈالی اور پھر سامنے کی طرف رخ کر کے دور تک پھیلی چاندنی کو دیکھنے لگی۔ جبکہ وہ بہت جذب کے عالم میں اسے دیکھتا، مسکرا رہا تھا۔ جو چاندنی جیسی ہی تھی۔ بھلے دنیا کے لیے وہ عام اور معمولی سی لڑکی ہو مگر اس کے دل میں ہر دم روشنی اور سکون اس کی وجہ سے پھیلتا تھا۔ بالکل اسی چاندنی کی طرح۔

"آپ جانتے ہیں دور سے دیکھنے میں ہر چیز بہت خوب صورت اور دلکش لگتی ہے۔ جیسے آسمان پہ چمکتا یہ چاند! زمین والوں کے لیے اس سے زیادہ مکمل اور خوب صورت کوئی چیز نہیں ہوگی مگر پاس جانے پہ پتا چلتا ہے کہ چاند میں گڑھے بھی ہیں اور داغ بھی!"

دعا کی بات پہ وہ چونک گیا تھا۔

"آپ نے آج تک میری خوبیاں اور ظاہری تصویر دیکھ کر محبت کا دعوا کیا ہے مگر جب کسی کے ساتھ مستقل رہنا پڑے تب اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی محبت میں کہاں تک سچے اور مضبوط تھے۔"

"کم آن دعا! میری محبت اتنی کمزور نہیں ہے۔ اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے! تم تاریک پہلو دیکھنے کے بجائے روشن پہلو کیوں نہیں دیکھتی ہو۔"

اس نے چٹکیوں میں دعا کی بات اڑائی تھی۔ دعا نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا تھا جس کے چہرے پہ یقین واضح تھا۔

"سمجھنے، اور برتنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی کو جاننے اور اس کے ساتھ رہنے میں بہت فرق ہوتا ہے، اور یہ فرق کیا ہے وہ آج کے بعد آپ جانیں گے۔ میری دعا ہے کہ میرا تجربہ غلط نکلے اور آپ کا یقین سچ! کبھی کبھی دل چاہتا ہے تاکہ سب جھوٹ بھی سچ ہو جائیں اور ہم اپنے وہم و گمان سے ہار جائیں کیونکہ ان سے ہارنے کا دکھ کبھی بھی نہیں ہوتا ہے۔"

وعا نے سنجیدگی سے کہا اور مڑ کر اندر کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ جو اس کی باتوں کے جال میں الجھ گیا تھا۔ سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دعا کو یقین وقت کے ساتھ ہی آئے گا۔ اسے بس صبر اور تحمل سے کام لینا تھا اور اپنی محبت کو آزمانا تھا۔ جبکہ یہ نہیں جانتا تھا کہ محبت کو آزمایا نہیں جاتا ہے بلکہ محبت خود آزماتی ہے' کبھی لے کر اور کبھی دے کر۔ اور محبت اسے دے کر آزمانے والی تھی۔!!

☆ ☆ ☆

"کنول سب ٹھیک تو ہے آپ اور یہاں!" اسپتال کے ویٹنگ روم میں کنول کو بیٹھے دیکھ کر شیری نے پاس آکر بے اختیار پوچھا تھا۔ اپنی سوچوں میں گم کنول نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ عافیہ آپی طوبی کو لے کر واش روم گئی تھیں۔ وہ اس اسپتال کی مشہور گائنا کالوجسٹ سے اس کا چیک اپ کروا رہی تھی۔ عافیہ آپی نے محسن کو کس طرح سمجھایا۔ کنول نہیں جانتی تھی مگر اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ محسن مان گیا تھا۔

"جی سب ٹھیک ہے وہ میں اپنی نند...." کنول کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے کیا بتائے جب ایک وجیہہ اور اسمارٹ سے بندے نے آکر شیری کو متوجہ کیا۔ شیری نے گرم جوشی سے اسے گلے لگایا اور مبارکباد دی۔ اس کا نام احمد علی تھا اور کنول کو ان دونوں کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ احمد کو اولاد کی خوشی ملی ہے اور اس کی بیوی یہاں ایڈمٹ ہے۔ شیری اسی لیے وہاں آیا تھا۔ شیری نے کنول کا تعارف احمد سے بھی کروایا پھر اسے خدا حافظ کہتے ہوئے احمد کے ساتھ چلا گیا۔

"یہ کون تھا؟" عافیہ آپی نے پاس آتے ہوئے پر تجسس لہجے میں پوچھا تھا۔

"میری بیسٹ فرینڈ ہما کے بھائی ہیں۔ اسی شہر میں جاب کرتے ہیں۔"

کنول نے آہستگی سے تفصیل بتائی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا کہ پتا نہیں رپورٹس میں کیا آتا ہے؟ ڈاکٹر کیا کہتی ہے؟ تھوڑی دیر بعد ان کا نمبر آگیا۔ کنول دل ہی دل میں ڈرتی ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

☆ ☆ ☆

"پلیز کنول اب بس بھی کرو۔ کتنے ہی دن ہو گئے ہیں تمہارا یہ سنجیدہ اور روہانسا موڈ دیکھتے ہوئے۔"

محسن نے ٹی وی پہ نظریں جمائیں بیٹھی گم صم سی کنول کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ محسن کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

"دیکھو کنول! اس طرح رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ الٹا تم بیمار اور ڈپریشن کی مریض بن جاؤ گی۔ پلیز سنبھالو خود کو۔"

محسن نے نرمی سے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔ کنول اس کا ہاتھ تھام کر رو پڑی۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میرے ماں بننے کے چانسز بہت کم ہیں۔ شاید کوئی علاج' یا معجزہ ہی ہو۔"

کنول نے وہ بات پھر دہرائی جو اس کا دل چیرے جا رہی تھی۔ عافیہ آپی کے لیے بھی یہ شاکڈ تھا۔ محسن ان کا اکلوتا بھائی تھا۔ کنول لاکھ اچھی سہی مگر انہیں اپنے بھائی کی خوشیوں سے آگے تو نہیں تھی۔

"اندھیرے کو ختم کرنے کے لیے روشنی کی ایک کرن' چھوٹا سا ایک جگنو بھی بہت ہوتا ہے۔ اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو' ہم بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے کنسلٹ کریں گے۔ دعا کریں گے ابھی سے ناامید مت ہو۔"

محسن نے روتی بلکتی کنول کو دلاسا دیا تھا۔ جو بری طرف خوفزدہ اور پریشان تھی۔ عافیہ آپی کی چپ وہ محسوس کر چکی تھی۔ محسن اپنی بہن سے بہت محبت کرتا تھا اور ان کی ہر بات سر آنکھوں پہ رکھتا تھا۔ اگر انہوں نے کچھ ایسا ویسا محسن سے کہہ دیا تو... یہ سوچیں ہی کنول کی ہمت توڑ رہی تھیں۔

"محسن آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے؟" کنول نے وہ سوال کر ہی دیا جو اسے اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ محسن نے ایک نظر اس کے ڈرے اور گھبرائے ہوئے

چہرے کی طرف دیکھا۔ اور نرمی سے بولا۔
"اپنے دل سے سب اندیشے ' ڈر ' خوف نکال دو۔ میاں بیوی کا رشتہ صرف سکھ کا ہی نہیں ہوتا ہے ' دکھوں کی پیتی دوپہریں بھی مل کر کاٹنی ہوتی ہیں۔"
محسن کی یقین دہانی پہ کنول کا دل ٹھہرا ضرور تھا مگر اس کی اداسی اور پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ شدید گھٹن اور حبس کا شکار تھی۔ عافیہ آپی اب آتیں بھی تو ' محسن کے ساتھ کمرہ بند کر کے میٹنگ کرتی رہتیں۔ کنول سے ان کا رویہ کافی حد تک سرد ہو چکا تھا۔ محسن ' کنول کو لے کر لاہور کے مشہور اسپتال بھی جا چکا تھا۔ جہاں کے قابل ڈاکٹرز کی زیر نگرانی اس کا علاج ہو رہا تھا۔ ڈاکٹرز مکمل طور پر مایوس نہیں تھے۔ بس اللہ کے حکم اور حکمت کے منتظر ' اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔
ان حبس زدہ اور گھٹن میں ایک دریچہ کنول کے لیے کچھ دیر کے لیے ہی سہی تازہ ہوا کا جھونکا ضرور لے آتا تھا۔ وہ تھا شیری کے آنے والے مختلف ایس۔ ایم۔ ایس عام اور معمولی باتوں سے بھرے یہ میسیجز کنول کو پرسکون کر دیتے تھے۔ شیری کی ہلکی پھلکی ' مزاحیہ سی باتوں میں کھو کر وہ اکثر گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتی تھی۔ زیادہ تر یہ میسیجنگ تب ہوتی تھی جب کنول گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔
ہما کی شادی ' قریبی سسرالی رشتہ دار کی اچانک موت کی وجہ سے ملتوی ہو چکی تھی۔ اور اکثر ہما کی باتوں کی وجہ سے ہی شیری میسیجز کرتا تھا جس کی وجہ سے کنول جواب دے دیتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ' ہما ' سے ہٹ کر بھی باتیں ہونے لگی تھیں۔ کنول کی نیت میں کوئی فتور نہیں تھا۔ چونکہ وہ اپنی شادی سے پہلے سے شیری کو جانتی تھی۔ اس سے باتیں ' ہنسی مذاق کرتی تھی اس لیے اسے اب بھی ایسا کرنے میں کوئی برائی نظر نہیں آئی! مگر یہاں آ کر اس کی سوچ رک سی گئی تھی اس لیے کہ اب وہ کسی کی بیوی تھی۔ اور شوہر کے علم میں لائے بغیر کسی سے ایسا رابطہ رکھنا گناہ تھا۔ مگر کنول نے محسن سے کبھی کچھ چھپایا نہیں تھا تو اسے کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ ہما کی شادی ملتوی ہونے کا شیری نے بھی بتایا تھا اور ہما نے بھی۔ اور یہ سب محسن کے سامنے کی باتیں تھیں۔ مگر آہستہ آہستہ یہ دوستی بڑھتی جائے گی اس کا اندازہ نہ محسن کو تھا اور نہ کنول کو۔ ! کنول نے اس مشکل وقت میں اپنے رب سے رجوع کرنے کے بجائے ' وہ راستہ چنا تھا جو اس کا نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"شمائلہ آپی کچھ دن اور رک جاتیں تو ہمارے ولیمہ کی تقریب میں بھی شامل ہو جاتیں۔"
اس نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے ساتھ نفاست سے تیار بیٹھی دعا کو دیکھ کر کہا تھا۔ جو گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کے پکارنے پہ چونک کر اپنے خیالوں سے باہر آئی تھی۔
"ان کی فیملی نے پہلے ہی بہت انتظار کیا ہے میری وجہ سے!"
اس نے سرد لہجے میں کہا تھا۔
"کیا وہ اس شادی سے خوش نہیں تھیں؟"
"ایک وہ ہی ہیں جو اس شادی سے سب سے زیادہ خوش ہوئی ہیں۔ اس لیے تو سب کچھ "فوراً" بھگتا دیا۔ جیسے کوئی بوجھ ہوں میں۔"
دعا نے یاسیت سے کہتے ہوئے ' آخری جملہ بہت آہستگی سے کہا تھا۔ مگر وہ سن چکا تھا۔
"خیر مجھ سے زیادہ کس نے خوش ہونا تھا اس شادی سے ' اور اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو پا کر خوش ہیں تو دنیا کی کیا پروا۔"
اس نے گاڑی روک کر دعا کے لیے گجرے لیے تھے۔ اسے پہناتے ہوئے مسکرا کر بولا تھا۔
"یہ آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ کی فیملی بھی اس شادی سے خوش نہیں ہے کیا سچ میں آپ کو ان کی پروا نہیں ہے یا آپ نے ان کو یاد نہیں کیا اس موقع پہ۔"
دعا نے نرمی سے پھولوں کو چھوتے ہوئے بظاہر

سرسری مگر بجھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو اس کی ہنسی ایک دم غائب ہوگئی اور وہ سیدھا ہو کر خاموشی سے کار ڈرائیو کرنے لگا۔ مگر اس کے چہرے پہ پھیلا اضطراب بتا رہا تھا کہ دعا کی بات سچی ہے اور اس کے دل کو لگی ہے۔ وہ بھلے ظاہر نہ کرتا مگر اپنی زندگی کے اس اہم مرحلے پہ قدم قدم پہ ماں، باپ، بہن بھائیوں کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اسے یہ یقین تھا کہ کچھ وقت کے بعد وہ سب کو منا ہی لے گا۔

"مجھے میری بات کا جواب مل گیا ہے۔"

دعا نے گہری سانس لے کر آہستگی سے کہا تھا۔ ہوٹل کی پارکنگ میں کار رکی تو اترنے سے پہلے دعا بولی۔

"میں شرمندہ ہوں اپنی بات کے لیے مگر میں کیا کروں میں وقت اور حالات کے تجربے سے گزری ہوئی عورت ہوں جو سچ اور جھوٹ میں فرق کرنا اچھی طرح جانتی ہے۔ میں ناسمجھ لڑکی کی طرح خوابوں کی دنیا میں نہیں رہ سکتی ہوں۔"

"اب چلیں!" اس نے دعا کی بات کا جواب دینے کے بجائے اندر کی طرف چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ جہاں اس کے چند قریبی دوست اور کولیگز اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ، ان کے منتظر تھے!!

☼ ☼ ☼

سب کاموں سے فارغ ہو کر کنول اداس اور بددل سے گھر کے چھوٹے صحن میں آگئی۔ گملے میں لگے پودوں کو دیکھتی وہ بے معنی سی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اسے علاج کرواتے ہوئے چھ مہینے ہو چکے تھے مگر ابھی بھی کوئی امپرومنٹ نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق یہ ایک لمبا سلسلہ تھا۔ اس میں صبر اور برداشت چاہیے تھا۔ اور دوسرا سب سے بڑا مسئلہ، پیسہ بھی ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔ دوائیاں، انجکشن، مختلف کورسز جس کے لیے اچھی خاصی اضافی رقم چاہیے ہوتی تھی۔

محسن کی تنخواہ اچھی تھی۔ فی الحال تو وہ خوش اسلوبی سے یہ ذمہ داری نبھا رہا تھا مگر عافیہ آپی کے تیور یکسر بدل چکے تھے۔ وہ اب بر ملا محسن کو سمجھانے اور کنول پہ تنقید کرنے لگی تھیں۔ کنول کی بدقسمتی یہ تھی کہ میکے میں والدین جیسا مضبوط رشتہ کئی سال پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ والدین حیات نہیں تھے۔ حمزہ بھائی اپنی فیملی کے ساتھ پردیس میں جا بسے تھے۔ یہاں ایسا کوئی قریبی نہیں تھا جس سے کنول اپنے دل کی باتیں کرتی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ محسن ابھی تک آفس سے نہیں لوٹا تھا۔ کنول وہاں بیٹھ کر ہی محسن کا انتظار کرنے لگی۔ اور اسی کے بارے میں سوچنے لگی۔

محسن اسے لے کر بہت پوزیسو تھا۔ اسے پسند تھا کہ کنول اس کی مرضی اور بنائی گئی لائن کے مطابق چلے۔ کنول کو یہ بات پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مگر جیسے جیسے آزمائش بڑھتی جا رہی تھی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ پوزیسو ہم سفر کے ساتھ رہنا، بعض اوقات کتنا مشکل اور کٹھن ہو جاتا ہے۔ ان کی محبت پہ شک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی محبت میں جتنے خالص ہوتے ہیں، اتنا ہی زیادہ انتہا پسند بھی ہوتے ہیں۔ اور ایسی انتہا پسندی اکثر و بیشتر سانس لینے والے روزن ضرور بند کر دیتی ہے۔ کنول ذہنی اور جسمانی جس تکلیف سے گزر رہی تھی اسے اپنے دل کی بات کہنے، سننے اور سمجھنے والا فرد چاہیے تھا۔

ہوتا ہے ناکہ زندگی میں کہیں ہم ایسے الجھ جاتے ہیں کہ وہاں اپنے ہم سفر سے محبت سے زیادہ، انڈر اسٹینڈنگ، ہمدردی جیسے رویوں کی توقع زیادہ ہوتی ہے۔ مگر زندگی کے ہر معاملے میں انتہا پسندی جیسا رویہ رکھنے والے، کمزور اور منہدم ہوتی عمارت پہ اتنا وزن ڈالتے ہیں کہ نہ وہ عمارت بچتی ہے اور نہ وہ خود قائم کھڑے رہ پاتے ہیں۔ اسی وقت کنول کے موبائل کی میسیج ٹون بجی۔ تیری کا میسجز دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"دو نیوز ہیں آپ کے لیے ایک اچھی اور ایک بری۔"

"اچھا وہ کیا؟" کنول نے تجسس سے پوچھا تھا۔ کچھ سیکنڈ کے بعد ہی جواب آ گیا۔

"خوشی کی خبر یہ ہے کہ ہما کی شادی اگلے مہینے ہو رہی ہے اور بری خبر یہ ہے کہ میری ٹرانسفر لاہور ہو گیا ہے۔ آپ کے شہر کو الوداع کہنا پڑے گا بہت جلد۔"

میسج پڑھ کر کنول مسکرا دی۔ ہما کی شادی کا سن کر اسے دلی خوشی ہوئی تھی۔

"آپ کی لاہور ٹرانسفر ہو گئی ہے یہ تو خوشی کی بات ہے۔ آپ کی سب فیملی وہاں ہی ہے۔" کنول نے میسج لکھ کر سینڈ کر دیا۔

"ہوں۔ کیا سچ میں یہ خوشی کی بات ہے آپ کے لیے۔" کچھ وقفے کے بعد میسج آیا تو کنول کچھ الجھ کر سوچ میں پڑ گئی۔

"ہاں تو..." کنول نے جواب دیا۔

"اچھا مان لیا۔" اسمائلنگ فیس کے ساتھ جواب آیا تو کنول سر جھٹک کر رہ گئی۔ اسی وقت محسن کی کار کا ہارن سنائی دیا۔ تو کنول فوراً" سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خود کو سنبھالتی چہرے پہ مسکراہٹ سجائے اس کا استقبال کرنے کو تیار کھڑی ہو گئی کہ سارے دن کے تھکے ہارے شوہر کو روتی بسورتی بیویاں اچھی نہیں لگتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

"اچھا آپ لوگوں کی لو میرج ہے؟ کب... کیسے کہاں... ملے تھے آپ لوگ؟ ویسے سچ کہتے ہیں کہ محبت کچھ نہیں دیکھتی۔ کسی فرق کسی اونچ نیچ کو نہیں مانتی! کیا شادی میں کوئی شریک نہیں ہوا؟"

اس طرح کے اور اس سے ملتے جلتے کئی سوال ان دونوں نے بظاہر ہمدرد بنے مسکراتے چہروں سے سنے۔ لوگ ہمدردی میں ہنسی مذاق میں بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ جسے دعا سن کر مسکرا کر نظر انداز کر رہی تھی۔ یہ ہی حال اس کا بھی تھا۔ وہ بہت قریبی دوست تھے۔ جن کے تبصرے بے لاگ تھے۔ وہ سب کے منہ نہیں بند کر سکتا تھا۔ آج اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کہنے میں اور دنیا میں اصل میں فیس کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا تھا۔

واپسی پہ دعا نارمل ہی تھی۔ مگر اس کا موڈ سنجیدہ تھا۔ دعا کچھ مہینے پہلے اس سے بھی برے رویوں سے گزر چکی تھی۔ مگر اس کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔ سب سے زیادہ حیرانی کا اظہار ان دونوں کے ہائٹس کے فرق کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ دعا کا قد پانچ فٹ چھ انچ تھا۔ اور وہ بہت کمزور یا اسمارٹ لڑکیوں میں نہیں آتی تھی۔ جبکہ اس کی نسبت وہ کافی اسمارٹ تھا۔ اور اپنی جسمانی ساخت کی وجہ سے دعا سے چھوٹا لگتا تھا۔ جبکہ دونوں میں عمروں کا زیادہ فرق نہیں تھا۔ مگر عورت اپنی عمر سے کچھ سال بڑی ہی نظر آتی ہے۔

محبت کو پالینے کے بعد یہ حقیقت کا پہلا چابک اسے پڑا تھا کہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی وہ بلبلا کر رہ گیا تھا۔ مگر ابھی تو ابتدا تھی۔ وقت کے جلاد کے پاس تلخ سچائیوں کے چابک بے شمار پڑے تھے۔

"آئس کریم کھاؤ گی؟" اس نے ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے ہلکے پھلکے سے انداز میں پوچھا تھا۔ دعا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آئس کریم کھانے کے بعد جب وہ دونوں گھر پہنچے تو ذہن سے ہر بات کی تلخی کم ہو چکی تھی۔ ایک بار پھر وہ تھے اور ان کی بنائی چھوٹی سی جنت! جس کو دونوں مل کر سجا رہے تھے۔ سنوار رہے تھے ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ۔

☆ ☆ ☆

"محسن تم کب تک خود کو جھوٹی تسلی دیتے رہو گے؟ جانتے بھی ہو کہ کامیابی کے چانس بہت کم ہیں پھر بھی اپنا وقت اور پیسہ ضائع کر رہے ہو؟"

عافیہ آپی آج فیصلہ کر کے آئی تھیں کہ محسن کو سمجھا کر ہی جائیں گی۔

"عافیہ آپی پلیز! آپ بھی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ جو ہر وقت کنول کی تعریفوں کے پل باندھا کرتی تھیں اب اسی میں خامیاں نکالنے لگی ہیں صرف ایک بات کو جواز بنا کر۔"

محسن نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ عافیہ آپی کے بدلتے رویئے کو کافی عرصے سے دیکھ رہا تھا۔

"اس میں لاکھ خوبیاں ہوں مگر وہ تمہیں اولاد کی خوشی نہیں دے سکتی ہے! ایسی بانجھ عورت کا کیا کرنا۔"

عافیہ آپی نے تنفر سے کہا تو محسن ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اور جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپی! آپ میرے لیے بہت قابل احترام ہیں۔ مگر میں کنول کے لیے بھی یہ سب کچھ نہیں سن سکتا ہوں۔ براہ مہربانی دوبارہ یہاں آئیں تو خود کو بدل کر پہلے والی عافیہ آپی بن کر آئیں۔"

محسن کمرے سے باہر نکل گیا۔ جبکہ عافیہ آپی اس کے لفظوں پہ ساکت رہ گئی تھیں۔

"اس بانجھ عورت کی وجہ سے اپنی محبت کرنے والی سگی بہن کو اپنے گھر آنے سے منع کر رہا ہے۔ خدا پوچھے گا اس سے۔ جس نے میرا بھائی چھین لیا۔"

عافیہ آپی کوستی بددعائیں دیتی وہاں سے چلی گئیں۔ کنول سفید چہرہ لیے سب سنتی رہی۔ محسن نے اس کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھوں کو تھاما تو کنول بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ محسن نے اسے کچھ دیر رونے دیا۔ تاکہ اس کے دل کا غبار نکل جائے۔

"کنول! اب بس رونا نہیں ہے! اگر مشکل وقت میں آپ کا ساتھ دینے والا ہو تو اس ذات پہ یقین کامل رکھتے ہیں کہ جس نے مشکل وقت میں اکیلا نہیں چھوڑا' رونے کے لیے کسی مہربان کا کندھا عطا کیا زندگی میں اس سے بڑی بھی کوئی نعمت ہوتی ہوگی۔"

محسن کے لفظوں نے کنول کے دل کو ڈھارس دی تھی۔ وہ یکدم چپ ہوگئی۔ محسن نے اس کا بھیگا چہرہ اوپر اٹھایا اور بولا۔

"اب کوئی رونا دھونا نہیں۔ مضبوط بنو یار! اور شاباش اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ اس ہفتے ہم لاہور جا رہے ہیں۔"

محسن نے کہا تو اپنی ہی سوچوں میں الجھی کنول نے جواب دیا۔

"مگر ڈاکٹر سے کوئی اپائنٹمنٹ تو نہیں ہے اس ہفتے پھر لاہور کیوں جانا ہے؟"

"وہ اس لیے کہ آپ بھول رہی ہیں کہ آپ کی بیسٹ فرینڈ ہما کی شادی ہے۔ مہندی میں تو شرکت ممکن نہیں ہے۔ مگر ہم اس کی بارات کا فنکشن اٹینڈ کرہی لیں گے۔ ایک رات کسی ہوٹل میں گزار لیں گے صبح واپسی۔" ٹھیک ہے ناں! اب چلو مسکرا کر دکھاؤ۔"

محسن نے سارا طے شدہ پروگرام اسے بتاتے ہوئے آخر میں شرارت سے کہا تو کنول دھیرے سے مسکرا دی مگر اس کی آنکھوں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں وہ جانتی تھی کہ محسن نے یہ پروگرام صرف اس کی خوشی کے لیے ترتیب دیا ہے۔ ورنہ پہلے وہ جانے سے صاف منع کرچکا تھا کہ رات کو کہاں ٹھہریں گے۔ مگر اب کنول کو اداسی اور یاسیت سے نکالنے کے لیے اس کو یہ آئیڈیا اچھا لگا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر قسمت کی لگی گھاتوں سے کون باخبر رہا ہے کون بچ پایا ہے!

☆ ☆ ☆

دعا جس نے یہ شادی اپنی مجبوری اور ضرورت کے تحت کی تھی۔ آہستہ آہستہ کرکے دل سے اس رشتے کو قبول کرنے لگی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا' اس کا خیال رکھتا تھا' آؤٹنگ پہ لے کر جاتا تھا۔ فارغ وقت میں اس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتا رہتا تھا۔ دعا جو پہلے اس کی باتوں کو سرسری سا سنتی تھی آہستہ آہستہ ان میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ دراصل یہ وہ وقت تھا جب اسے دعا کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دعا کو آئس کریم بہت پسند تھی۔ روز رات کو اسے آئس کریم کھلانے کے بہانے لانگ ڈرائیو پہ یا واک پہ لے جاتا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے گھر والوں سے بہت دور ہوچکا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اپنے گھر کی ذمہ داری بہت ایمانداری سے پوری کررہا تھا۔ اور مہینے میں ایک دو بار ماں' باپ سے ملنے بھی چلا جاتا تھا۔

ماں جو پہلے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھیں۔ اب اکثر اس کا انتظار کرتیں۔ اسے خود فون کر کے بلا لیتیں۔ اور ایسا زیادہ تر ویک اینڈ پہ ہوتا تھا جب تینوں بہنیں بھی میکے آئی ہوتیں ان تینوں کے بچوں میں اس کی جان تھی۔ دراصل اسے بچوں سے بہت پیار تھا۔ اور اب بھی وہ ان سب سے ملنے کے لیے بھاگا آتا تھا دعا نے کبھی اس بات پہ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ خود رشتوں کی ٹھکرائی اور ترسی ہوئی تھی اس لیے ان رشتوں کی اہمیت کو سمجھتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ زیادہ عرصہ اپنی فیملی سے دور نہیں رہ پائے گا۔ اس نے صرف یہ دیکھنا تھا کہ کیا وہ اسے بھی اپنی فیملی سے متعارف کروائے گا یا نہیں! اپنے دعوؤں کے مطابق اس کی جگہ بنا سکے گا یا نہیں!

دوسری طرف راحت بیگم زیادہ عرصے تک اپنے بیٹے سے خفا نہیں رہ پائی تھیں۔ وہ ماں کو منانے اور ان کی ناراضی دور کرنے کے لیے آئے روز وہاں کے چکر لگاتا اور ماں باپ کے ساتھ وقت گزارتا۔ ان کا خیال رکھتا۔ بہنوں کے خفا ہونے کے باوجود پہلے کی طرح ان سے ملتا۔ بچوں کے ساتھ ہلا گلا کرتا۔ اس دوران اس کا سامنا اکثر و بیشتر عظمی سے بھی ہوتا رہتا! جو اس کی محبت میں ڈوبی' اس کے ارد گرد چکر لگاتی رہتی تھی۔ خالہ اور ان کے گھرانے سے اسے بہت لگاؤ تھا۔ پھر جب اسے پتا چلا کہ اس نے اسی گھر میں آنا ہے تو اس لگاؤ میں مزید اضافہ ہوا۔ مگر وقت نے ایسا داؤ کھیلا کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ مگر اپنی محبت اور خوابوں سے دستبردار ہونا آسان نہیں ہوتا ہے اور یہ ہی جوگ عظمی لے بیٹھی تھی۔ کیونکہ سب ہی اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔

راحت بیگم مایوس نہیں تھیں انہیں یقین تھا کہ وہ واپس ضرور پلٹے گا۔ بس ذرا صبر سے کام لینا تھا۔ یہ قانون فطرت ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف ضرور پلٹتی ہے۔

☆ ☆ ☆

محسن کا فیصلہ درست ثابت ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی کنول شادی میں آکر سب بھول گئی تھی۔ محسن ایک کونے میں بیٹھا کنول کو دیکھ رہا تھا جو ڈیجیٹل کیمرہ ہاتھ میں پکڑے اسٹیج کی طرف بڑھی تھی۔ اس کا خوب صورت کلچ اور موبائل میز پر پڑا ہوا تھا۔ محسن یہاں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ اس لیے بور ہو رہا تھا۔ اسی بوریت سے تنگ آکر اس نے اپنی پسندیدہ گیم کھیلنے کے لیے کنول کا موبائل اٹھا لیا۔ اس کے موبائل میں یہ گیم ڈاؤن لوڈ نہیں تھی۔ بے ارادہ ہی اس نے میسجز کھول لیے۔ یوں ہی سرسری نظر ڈالی تو وہ چونک گیا۔ شیری کے نام سے محفوظ نمبر کے میسجز کو کھولا۔ اور وہ حیران رہ گیا۔

"اتنے عرصے سے دونوں رابطے میں رہے ہیں اور مجھے کبھی بتایا ہی نہیں کنول نے۔"

محسن کے دماغ کی رگیں تن گئیں۔ حالانکہ میسجز میں کوئی بھی قابل گرفت بات نہیں تھی مگر جو بھی تھا یہ محسن کے علم میں نہیں تھا اور اسی بات کا غصہ محسن کا دماغ خراب کرنے لگا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور کنول کو تلاشتا آگے بڑھا تو وہ اسے شیری کے ساتھ کھڑی ہنستی ہوئی نظر آئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس تک پہنچا۔ کنول نے ہنستے ہوئے بے ارادہ اس پہ نظر ڈالی تو چونک گئی۔ محسن کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کنول کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ کنول کو یکدم چپ دیکھ کر شیری بھی چونکا۔ پھر محسن پہ نظر پڑتے ہی بے اختیار آگے بڑھ کر بولا۔

"بہت بہت شکریہ آپ اتنی دور سے خاص طور پر آئے۔"

محسن نے ایک سرد نظر اس پہ ڈالی اور کنول کی طرف دیکھ کر بھینچتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"چلیں۔!" اور تیزی سے واپسی کے لیے مڑ گیا کنول ہلکے ہلکے سے اس کے پیچھے بھاگی جبکہ شیری پریشان نظروں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

محسن رکیں میری بات تو سنیں؟ آپ کا موڈ یکدم کیوں آف ہو گیا ہے؟ کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟

محسن نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر چلتا رہا۔

اور کار کے پاس پہنچ کر غصے سے دروازہ کھولا۔ اور زور سے بند کیا۔ کنول بھی جلدی سے بیٹھ گئی تھی۔ محسن نے تیزی سے گاڑی موڑی اور زن سے چلا کر لے گیا۔ پیچھے اڑنے والی دھول رہ گئی تھی اور اس دھول میں کیا کیا گم ہونا تھا ابھی وہ باقی رہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ گھر میں داخل ہوا تو سارے گھر میں پھیلی خاموشی اسے بہت عجیب لگی تھی۔ آج روز کی طرح دعا نے اسے دروازے پہ ویلکم نہیں کہا تھا۔ اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا وہ دعا کو آواز دینے لگا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ پریشان ہو کر سارے گھر میں ڈھونڈنے لگا۔ عجیب اندیشے سے ستانے لگے تھے۔ بیڈ روم بھی خالی پڑا تھا۔ کچن کی لائٹس بھی آف تھیں۔ لاؤنج میں خاموشی اسی وقت ہلکے سے میوزک کی آواز آئی تو وہ آواز کی سمت چلتا ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ جہاں کی لائٹس بھی آف تھیں۔ مگر اندر پہنچ کر وہ بری طرح چونک گیا تھا۔ اندھیرے میں خوب صورت کینڈلز سے ہوتی روشنی' سینٹرل میز کے پاس نیچے کشن پہ بیٹھی خوب صورتی سی تیار' اپنے لمبے اور گھنے بالوں کو نفاست سے سیٹ کر کے گردن کے دائیں طرف ڈالا ہوا تھا اور وہ ہاتھ میں پکڑی چھوٹی موم بتی سے کیک پہ لگی چھوٹی چھوٹی موم بتیاں روشن کر رہی تھی۔ بیک گراؤنڈ میں بجتا رومانٹک میوزک' اس کا پسندیدہ تھا۔ کیک کے اطراف میز سرخ پھولوں سے سجے ہوئے تھے۔ وہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا اور دھیرے دھیرے چلتا اس تک پہنچا تھا۔ اور اس کے سامنے ہی نیچے قالین پہ رکھے کشن پہ بیٹھ گیا تھا۔

"سالگرہ مبارک ہو!"

اس نے آہستگی سے کہا تو موم بتیوں کی روشنی میں چمکتے اس کے چہرے کو دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"تم ساتھ ہو تو ہر لمحہ' ہر پل روشن ہے میرے لیے!" اس نے کہا تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ایسے ہر دعوے پہ وہ اسی طرح سوچ میں پڑ جاتی تھی۔ نجانے کیوں مگر اسے لگتا تھا کہ جیسے یہ دعوے برف کی ڈلی کی طرح ہوتے ہیں جو ذرا سی تمازت سے پگھل کر پانی بن کر بہہ جاتے ہیں۔ پیچھے نہ نشان رہتا ہے اور نہ ثبوت!

"یہ نہیں کہو گی کہ ہیپی برتھ ڈے مائی ڈیئر ورلڈ بیسٹ ہزبینڈ (دنیا کے بہترین شوہر کو سالگرہ مبارک)"

اس نے دعا کی خاموشی پہ شرارت سے کہا تھا۔

"نہیں! عورت وہ مرد نہیں چاہتی ہے جو ساری دنیا میں اچھا ہو! عورت اس مرد کو چاہتی ہے اس کے سامنے خود کو ہارتی ہے جو اس کے لیے 'اس کے حق میں ساری دنیا کی نسبت اچھا ہو! مضبوط پناہ گاہ کی طرح ہو کسی چٹان کی طرح۔"

دعا نے گم صم سے لہجے میں کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔ دعا کو ماحول کی سنجیدگی کا احساس ہوا تو فوراً" لہجے کو ہلکا پھلکا بناتے ہوئے بولی۔ "جلدی سے کیک کاٹیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

دعا کے کہنے پہ اس نے موم بتیاں بجھائے بغیر ایک طرف سے تھوڑا سا پیس کاٹا اور ہاتھ بڑھا کر دعا کو کھلانے لگا۔

"پہلے موم بتیاں تو بجھا لیتے۔"

دعا نے ہنستے ہوئے اسے یاد دلایا تھا۔

"نہیں انہیں روشن رہنے دو! ان کی روشنی اسی طرح تمہارے چہرے پہ پڑتی رہے اور جگمگاتی رہے۔ اس سے خوب صورت منظر ابھی ان آنکھوں نے نہیں دیکھا ہے اور وہ کہتے ہیں نا کہ "ایک بار دیکھا ہے' بار بار دیکھنے کی ہوس ہے' کچھ ایسا ہی معاملہ سمجھ لو۔"

اس کے کہنے پہ دعا بے یقین لہجے میں بولی تھی۔

"آپ مجھے بھی چھوڑ تو نہیں دیں گے؟"

"جس کے لیے سب چھوڑا جاتا ہے ناں' اسے کیسے چھوڑا جائے؟ جب اس بات کو سمجھ لو گی تو اپنے اندر کے ڈر کو بھی شکست دے سکو گی۔" اس نے پرسکون لہجے میں کہتے ہوئے' تھوڑی سی کریم اس کی ناک پہ لگا دی تھی۔

"آئی سمجھ میں محترمہ!!" دعا مسکراتے ہوئے اپنے

حال میں لوٹ آئی تھی۔ پھر ایک اچھے سے ڈنر اور لانگ ڈرائیو سے واپسی پہ اس کے ہاتھوں میں گجرے پہناتے ہوئے اس نے اعتراف کیا تھا۔
"یہ میری زندگی کی سب سے بہترین سالگرہ تھی اور اس فرد کے ساتھ جسے میں خود سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔"
دعا نے پھولوں کی خوشبو چاروں طرف پھیلتی جھومتی گنگناتی کھلکھلاتی محسوس کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"محسن!" کنول نے ہونٹ بھینچے گاڑی چلاتے محسن کے بازو کو ہلایا تو اس نے غصے میں کار کی اسپیڈ بڑھادی۔ کنول ڈر گئی۔ اور پریشان ہو کر شہر سے باہر نکلنے والے راستے کو دیکھنے لگی۔ یعنی محسن نے رات لاہور میں رکنے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔ اور واپس فیصل آباد جارہا تھا۔ مگر اتنی رات کو جب کہ کنول خوب صورتی سے تیار بھی تھی اور اس نے سونے کے زیورات بھی پہنے ہوئے تھے۔ محسن اتنی افراتفری میں اسے لایا تھا کہ وہ اپنی چادر لینا بھول گئی تھی۔
"محسن! اتنی رات کو سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ جو بھی بات ہے ہم آرام سے بھی کرسکتے ہیں مگر اس طرح۔۔۔" کنول نے محسن کو اندھا دھند گاڑی چلاتے دیکھ کر سمجھانا چاہا۔
"کیا بات کروگی تم؟ تم اپنا اعتبار کھو چکی ہو۔" محسن نے غصے سے اس کا موبائل جیب سے نکال کر اس کی گود میں پھینکا تھا۔ کنول نے ناسمجھی میں کانپتے ہاتھوں سے موبائل ہاتھ پر لیا۔ موبائل کی میسج ٹون بجی۔
"دیکھ لو تمہارے شیری صاحب کا ہی میسج ہوگا۔" محسن نے طنزیہ کہا تو کنول چونک گئی۔ اب اسے محسن کے غصے کی وجہ سمجھ آئی تھی۔ میسج شیری کا ہی تھا وہ پریشان تھا کہ "سب ٹھیک ہے؟ محسن اس طرح غصے میں کیوں چلا گیا؟" کنول نے کانپتے ہاتھوں سے میسج پڑھا۔
"محسن! میرے بات سنیں یہ سب۔۔۔!" کنول نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پہ زبان پھیری تھی۔
"کیا سنوں؟ تم کیسے خود کو جسٹی فائی کروگی؟ میرے علم میں لائے بغیر تم نے کسی نامحرم سے موبائل پہ دوستی رکھی ہوئی تھی؟ کیوں آخر؟ کون سی کمی دی تھی میں نے یا ایسے ظلم تم پہ کیے تھے کہ تم ایسے سہارے تلاش کرتی؟" محسن غصے سے چیخ رہا تھا۔ یہ سب اس کی برداشت اور سوچ سے آگے کا تھا۔ اس لیے وہ ضبط کھو رہا تھا۔ کنول جو آج سے پہلے اس بات کو معمولی سمجھتی رہی تھی آج اسے اپنی حرکت کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ واقعی محسن کیا کوئی اور بھی یہ موبائل چیٹ یا میسجز دیکھتا تو غلط ہی سمجھتا۔ کنول کے پاس دو راستے تھے یا تو وہ جھوٹ پہ جھوٹ بول کر اپنی غلطی کو چھپانے کی کوشش کرتی یا پھر اپنی غلطی کو تسلیم کرکے معافی مانگ لیتی۔ اسے دوسرا راستہ زیادہ بہتر لگا اور اس نے یہی کیا۔
"محسن میں مانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے مگر خدا کی قسم میری نیت میں کوئی فتور نہیں تھا میں پچھلے کچھ عرصے سے جس ذہنی اذیت اور تکلیف سے گزر رہی ہوں بس مجھے سمجھ ہی نہیں آئی کہ میں جانے انجانے میں کسی گناہ کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ آپ نے سب میسجز پڑھے ہیں اس میں کوئی بھی ایسی ویسی بات نہیں تھی مگر جو بھی تھا میں نے غلطی کی اور میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ پلیز مجھے معاف کردیں میں آپ سے بے وفائی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی پلیز محسن۔۔۔" کنول نے بری طرح روتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ محسن نے غصے سے اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مارا اور کار ایک جگہ روک دی۔ یہ دیکھے بغیر کہ یہ بالکل ویران اور سنسان جگہ تھی۔ کنول رو رہی تھی معافی مانگ رہی تھی۔ محسن کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اسے اس بات کا شدید دکھ اور غصہ تھا کہ اس کی بیوی کسی سے رابطے میں رہی تھی۔ اس کی غیرت کے لیے یہ تازیانہ تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا سب کچھ فنا کردے روتی بلکتی کنول کو دیکھ کر اسے ملال بھی ہو رہا تھا مگر کنول کی حرکت کے بارے میں سوچ کر

اس کا غصہ پھر سوا نیزے پہ پہنچ جاتا تھا۔ وہ دو انتہاؤں کے درمیان پنڈولم کی طرح جھول رہا تھا۔

"رونا بند کرو۔ گھر جاکر بات کریں گے۔" کچھ دیر بعد محسن نے خود پہ قابو پاتے ہوئے سرد لہجے میں کہا تو کنول خاموش ہو گئی۔ محسن نے کار اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی جب کسی نے اس کی طرف کا شیشہ ناک کیا۔ محسن نے سر گھما کر دیکھا تو چہرے پہ نقاب ڈالے پستول ہاتھ میں تھامے وہ اسے کار سے نیچے اترنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وقت کنول نے بھی چیخ ماری کیوں کہ اس کی طرف بھی پستول بردار آدمی کھڑا ہوا تھا۔ کنول نے ڈر کے محسن کا بازو دبوچ لیا تھا۔ محسن اگر گاڑی بھگانے کی کوشش کرتا تو وہ فائرنگ کردیتے کیوں کہ وہ دونوں ہی نشانے پہ تھے۔ محسن نے کار کا شیشہ نیچے کیا۔

"محسن پلیز! ان سے لڑنا مت' جو کہتے ہیں انہیں دے دو۔" کنول نے بار بار التجا کی تھی۔ محسن نے سر ہلا دیا تھا۔

"کار سے نیچے اترو دونوں۔" ان میں سے ایک نے غرا کر کہا تھا۔ وہ دونوں کار سے نیچے اتر آئے۔ کنول محسن کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک نے آگے بڑھ کر محسن کا موبائل اور والٹ جیب سے نکال لیا۔

"اپنا زیور اتار کر انہیں دے دو۔" اس سے پہلے کہ وہ کنول کی طرف بڑھتے محسن نے کہا تو کنول سر ہلاتے خوف سے کانپتے ہاتھ میں پہنی انگوٹھیاں اتارنے لگی۔ اسی وقت ایک ڈاکو نے دوسرے سے کہا۔

"کیا خیال ہے؟" اس کی آنکھوں میں خباثت واضح تھی۔

"خیال تو زبردست ہے' مگر ہم بائیک پہ ہیں۔" دوسرے نے بھی کنول پہ نظریں مرکوز رکھیں ہوئی تھیں۔ محسن ان دونوں کی گفتگو سن کر چونک گیا۔ پھر یک دم ہی اس کا غصہ ابھر آیا۔

"اپنی بکواس بند کرو کمینوں۔ خبردار جو کسی نے میری بیوی پہ بری نظر ڈالی۔" محسن نے طیش سے کہا۔

"تیری تو.....!" ان میں سے ایک ڈاکو نے اسے غلیظ گالی دی اور غصے سے اس پر فائرنگ کردی۔ کنول کی چیخیں رات کا سینہ چیر رہی تھیں۔

"جلدی کرو نکلو یہاں سے! پولیس چوکی یہاں سے دور نہیں ہے۔" اس کے دوسرے ساتھی نے روتی بلکتی محسن کو آوازیں دیتی' کنول کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تھا۔ محسن خون میں لت پت زمین پہ گرا ہوا تھا۔ کنول کی چیخنے' چلانے اور لاکھ مزاحمت کرنے کے باوجود وہ اسے گھسیٹتے ہوئے کار تک لے آئے' اپنی بائیک وہاں پہ ہی چھوڑ کر وہ کنول سمیت کار لے کر فرار ہو گئے۔ پیچھے زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا محسن اندھیری رات اور سنسان سڑک پہ اکیلا رہ گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"عفان اچھا لڑکا ہے۔ میرے خیال سے تمہیں اس کے پرپوزل پہ غور ضرور کرنا چاہیے۔" قریبی عزیز کی شادی کے فنکشن پہ عظمٰی کو اکیلا کھڑا دیکھ کر وہ پاس آکر بولا تھا۔ عفان عظمٰی کا چچا زاد تھا۔ خوب صورتی سے تیار اپنے حسن کو دو آتشہ کیے' عظمٰی نے ایک کٹھیلی نظر اس پر ڈالی تھی جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہا تھا۔

"دنیا اچھے لوگوں سے بھری پڑی ہے اب سب اچھوں سے ہی محبت تو نہیں ہو جاتی۔" عظمٰی نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے سامنے سجے اسٹیج کی طرف دیکھا تھا۔ جہاں مہندی کی رسم کے لیے دلہن کو لایا جا رہا تھا۔ عظمٰی جو پہلے ہمیشہ اس سے شرمائی اور گھبرائی ہوئی رہتی تھی۔ آج اسے نظر انداز کیے بہت اعتماد سے بول رہی تھی۔ یہ بات اسے چبھی تھی۔

"اچھا تو بات تمہاری محبت کی ہے۔" اس نے طنزیہ پوچھا تھا۔

"محبت صرف آپ کی جاگیر تو نہیں ہے کہ صرف آپ ہی دعویدار بنیں سب اپنی اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔" اس کے دل کو افسوس ہوا کچھ عرصے پہلے وہ بھی اسی حالت اور کیفیت سے گزر رہا تھا۔

"خود کو اذیت مت دو۔ تم نازک سی لڑکی محبت کے روگ سوگ کیسے پالوگی۔ چھوڑ دو یہ راہ۔ اپنی زندگی کی طرف دیکھو۔" اس نے سمجھانا چاہا تو وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"اس راہ سے کبھی کوئی واپس بھی پلٹا ہے؟ اپنے اختیار میں کب ہے یہ جمع تفریق، فائدہ نقصان، محبت کی ہے کوئی کاروبار یا سودا تو نہیں جو پہلے اتنے حساب کتاب رکھتی۔ یقین کریں اپنے بس میں ہوتا تو... تب بھی اس محبت کی منکر نہ بنتی۔ محبت کی توہین کیسے منظور کرلوں۔ خیر آپ چھوڑیں ان سب باتوں کو۔ اپنی کامیاب محبت کا جشن منائیں۔" عظمیٰ نے اپنی آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے رخ موڑ لیا تھا، مگر وہ دیکھ چکا تھا۔ سن چکا تھا اور سمجھ بھی چکا تھا کہ محبت میں سب ہی ضدی بچے کی طرح ہوتے ہیں جتنے ضدی اور اتنے ہی بے بس۔

✲ ✲ ✲

کنول پچھلی سیٹ پہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

"ہم زیادہ دیر تک اس گاڑی میں سفر نہیں کرسکتے ہیں۔ یہ خطرے والی بات ہوگی۔" کار چلاتے ہوئے شخص نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے ڈاکو سے کہا تھا جس نے محسن پہ فائرنگ کی تھی۔

"ہاں تو شہر کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے یہ کار اور اس لڑکی سے جان چھڑالیں گے۔ گاڑی روک سائڈ پہ میں پیچھے جاتا ہوں۔" اس نے ہوس زدہ نظروں سے پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ دوسرا اس کا مطلب سمجھ کر خباثت سے ہنسنے لگا تھا رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوچکی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا اسی لیے وہ دونوں مطمئن تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی روکتا۔ بیک مرر میں دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔

"باس! گڑبڑ ہے! لگتا ہے پولیس ہمارا پیچھا کررہی ہے۔" دوسرے نے بھی پیچھے گھوم کر دیکھا تھا۔

"گاڑی بھگا۔" اس نے چیخ کر کہا تھا، مگر تب تک پولیس وین ان کے قریب پہنچ چکی تھی اور انہیں رکنے کا اشارہ کرنے لگی، مگر بدحواسی میں ان لوگوں نے کار کی اسپیڈ بڑھادی جس کو دیکھتے ہوئے پولیس نے فائرنگ شروع کردی اور کچھ دیر اسی طرح گزری پھر پولیس کی فائرنگ سے ان کی کار کا ٹائر برسٹ ہوا اور کار ایک زوردار آواز کے ساتھ فٹ پاتھ سے ٹکرا کر رکی تھی۔ ڈرائیونگ کرنے والا کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہوگیا جبکہ دوسرے ڈاکو کے بازو پہ گولی لگ چکی تھی۔

کنول جو اس دوران ہوش میں آچکی تھی خوف زدہ سی بیٹھی رہ گئی جب پولیس نے ان سب کو اپنی تحویل میں لے کر فیصل آباد کے تھانے پہنچادیا۔ اس وقت فجر کی اذان ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی اور صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔ کنول ڈری سہمی سے تھانے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے بھی ڈاکوؤں کی ساتھی سمجھا جارہا تھا اور عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے اس سے مختلف سوالات کیے جارہے تھے۔ کنول رو رو کر اپنے ساتھ بیتی جانے والی صورت حال بتارہی تھی جب کوئی پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا اور سب اسے سلام کرنے لگے۔

"السلام علیکم سر! یہ خاتون بھی ان دونوں کے ساتھ ہی تھی جو خود کو مظلوم بتارہی ہے اور..." اسی وقت اپنی کیپ اتارتے اس کی نظر کنول پہ پڑی تو وہ چونک گیا۔

"آپ اور یہاں؟" کنول نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جو پولیس یونیفارم میں ملبوس تھا، مگر وہ اسے پہچان نہیں پائی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں اس دن شیری کے ساتھ تھا اسپتال میں جہاں آپ ملی تھیں انسپکٹر احمد علی نام ہے میرا۔" اس نے اپنا تعارف کروایا تو کنول کے دماغ میں جھماکا ہوا تھا اور اسے احمد علی سے ہوئی ملاقات یاد آگئی تھی۔

✲ ✲ ✲

"مم... ڈاکٹر نے بہت احتیاط کرنے کو کہا ہے۔ آپ

نے کسی بھی طرح کی کوئی ٹینشن نہیں لینی ہے۔"
راحت بیگم کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے بہت احتیاط کرنے کو کہا تھا۔ پچھلے دو دن سے وہ ماں کے ساتھ اسپتال میں ہی تھا باقی سب بھی آجا رہے تھے، مگر وہ تو ماں کی پٹی سے لگ کر ہی بیٹھ گیا تھا۔ ماں کے کمزور اور زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس نے اپنی محبت کرنے والی ماں کا دل دکھایا ہے۔ انہیں تکلیف پہنچائی ہے۔ اپنی مرضی کرکے بڑے دونوں بھائیوں نے والدین کی پسند کے مطابق شادی کی تھی دونوں کی بیویاں غیر خاندان سے تھیں اس کے لیے راحت بیگم نے بہت پہلے ہی عظمیٰ کو چن رکھا تھا اور زبانی کلامی یہ رشتہ بھی طے تھا، مگر سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس نے اپنی پسند اور مرضی سے شادی کی۔ حتیٰ کہ اپنے گھر والوں کی ناراضی کا بھی خیال نہیں کیا۔

"امی آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" اس نے ماں کی خاموشی پہ بے چین ہو کر ان کا ہاتھ تھام کر پوچھا تھا۔ راحت بیگم نے مندی مندی آنکھوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولیں۔

"نہیں!" اس ایک لفظ سے اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی، مگر راحت بیگم آنکھیں بند کر چکی تھیں۔

"ہر والدین کی طرح ہم نے بھی تمہارے لیے وہ ہی سوچا جو بہتر لگا۔ والدین اولاد کا برا کب چاہتے ہیں، مگر جب اولاد ہی مان کو توڑ دے اس کی تکلیف اور اذیت کیا ہوتی ہے تم تب سمجھو گے جب خود باپ بنو گے۔" راحت بیگم نے نقاہت زدہ لہجے میں کہا تھا۔ وہ بوجھل دل سے وہاں سے نکلا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے فیصلے پہ پچھتا رہا تھا، مگر والدین کی نافرمانی کرنے کا احساس آج شدید ہو رہا تھا۔ شاید ماں کو تکلیف میں دیکھ کر حالانکہ ان کی بیماری حکم ربی تھی، مگر اتنے مہینوں کے چھپائے گلٹ کو آج روزن مل گیا تھا۔ دعا نے دو دن بعد اس کی صورت دیکھی تھی۔ بڑھی شیو، پریشان حال، گم صم سا۔

"میں کھانا گرم کر رہی ہوں تب تک فریش ہو جائیں۔" دعا نے اسے دیکھ کر نرمی سے کہا۔ وہ سر ہلا کر کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آیا تو دعا ڈائننگ میز پہ برتن رکھ رہی تھیں اس کے بیٹھتے ہی گرم گرم کھانا لے آئی۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد دعا چائے بنا کر کمرے میں آئی تو وہ چائے پیے بغیر بیڈ پہ لیٹا آنکھوں پہ بازو رکھے سو رہا تھا یا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ دعا گہری سانس لے کر رہ گئی۔ دوسری طرف آکر اس کے پاس بیٹھی اور نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ جیسے اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہو۔

"میں جانتی ہوں کہ کسی اپنے، بہت پیارے کو کھونے کا ڈر کیا ہوتا ہے؟" دعا ایسے بول رہی تھی جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔

"اور جب یہ ہی ڈر سچ ثابت ہو جائیں تو؟" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر چہرے پہ پھیل رہے تھے۔

"آپ جانتے ہیں کہ بدگمانی، اس تیز آندھی کی طرح ہوتی ہے جو سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے دیکھنے والی سب آنکھوں میں مٹی ڈال دیتی ہے کہ پھر ہم کچھ دیکھنے کے قابل نہیں رہتے ہیں۔ برا گمان تو کسی غیر کے لیے بھی نہیں رکھنا چاہیے اور جہاں بات کسی بہت اپنے اور پیارے کی آجائے تو بھلے اس سے ناراض ہو جائیں، مگر بدگمان نہیں جیسے کہ آج آپ ہو رہے ہیں مجھ سے بدگمان۔" دعا کے چہرے سے پھسل کر آنسو اس کے چہرے پہ گرے تو وہ چونک کر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ دعا کے آنسو اسے تکلیف دے رہے تھے، مگر وہ حیران بھی تھا کہ دعا کیسے اس کے دل کی بات جان گئی تھی۔ وہ سچ میں دل ہی دل میں دعا سے بدگمان ہو رہا تھا جس نے ایک بار بھی اس کی ماں کی خیریت دریافت نہیں کی تھی بلکہ اس کے سامنے نارمل رویہ پیش کر رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

"نہیں میں ناراض ضرور ہوا تھا، مگر بدگمان نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"ناراض ہوتے تو شکوہ ضرور کرتے اس طرح خاموشی سے چائے پیے بغیر آنکھوں پہ بازو رکھ کر نہ

لپٹ جاتے جیسے مجھے دیکھنا ہی نہ چاہتے ہوں۔" دعا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ اس کی سمجھ داری کو سراہتا' سرہلا کر رہ گیا۔
"آپ پہلے ہی بہت پریشان اور تھکے ہوئے آئے تھے اور مجھے اندازہ تھا کہ آپ نے اسپتال میں پریشانی میں کچھ نہیں کھایا ہوگا اسی لیے میں چاہتی تھی کہ آپ فریش ہو کر سکون سے کھانا کھالیں۔ اس لیے آتے ہی کوئی سوال نہیں کیا تھا سامنے والی کی خاموشی کا مطلب اس کی بے حسی نہیں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اپنوں کی بھلائی اور فکر کے خیال سے بھی یہ خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔" دعا نے نظریں جھکائے ہوئے کہا تو وہ بے اختیار مسکرا دیا۔
"مجھے نہیں اندازہ تھا کہ مجھے ایسی سمجھ دار اور محبت کرنے والی بیوی ملی ہے۔" اس کے شرارتاً" کہنے پہ دعا مسکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اگر آپ کہتی ہیں تو میں لیڈی کانسٹیبل کے ساتھ آپ کو گھر بھجوا دیتا ہوں۔ میری شیری سے بات ہوئی ہے۔ وہ فیصل آباد کے لیے نکل چکا ہے چاہے تو اس کا انتظار کرلیں۔" احمد علی نے مسلسل روتی ہوئی کنول سے کہا۔ جس کی ذہنی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ ایک رات میں ہی وہ کس قیامت سے گزری تھی۔
"میرے شوہر کے بارے میں کوئی اطلاع ہے' پتا نہیں وہ کس حال میں ہوں گے۔" کنول کی آنکھوں کے سامنے خون میں لت پت محسن بار بار آرہا تھا۔
"ہم انہیں ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں بہت جلد کوئی خبر ملے گی۔ آپ حوصلہ رکھیں۔" احمد علی کے کہنے پہ کنول نے اثبات میں سرہلا دیا اور پھر احمد علی نے اسے پولیس وین میں گھر بھجوا دیا۔ اس کی حالت بہت مخدوش ہو رہی تھی۔ دوپٹا نجانے کہاں رہ گیا تھا۔ کھینچا تانی میں کپڑوں کا برا حال ہو چکا تھا۔ احمد علی نے آتے ہی اسے کہیں سے لے کر چادر مہیا کردی تھی۔ جس میں خود کو لپیٹے جب وہ اپنے گھر پہنچی تو سارا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ ہوئے حادثے کی اطلاع عافیہ آپی کے ذریعے پہلے محلے کے کچھ قریبی گھروں تک پہنچی تھی پھر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی گئی تھی۔ دراصل محسن نے ہوش میں آتے ہی عافیہ آپی کو اطلاع کی تھی۔ محسن کو لاہور کے اسپتال لے جایا گیا تھا۔ اب کنول کو پولیس وین سے اتنے مخدوش حال میں اترتے دیکھ کر سب مختلف سوال کرنے کو بے چین تھے۔ گھر کی چابیاں اس کے پاس نہیں تھیں اسی لیے تالا توڑا گیا اور یوں کنول گھر کے اندر داخل ہوئی اور دروازہ بند کرکے وہاں ہی بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نجانے اسے کتنی دیر بیت گئی جب بیل بجی کنول بے حس و حرکت بیٹھی رہی' مگر دروازہ مسلسل بجنے لگا تو خود کو سنبھالتی اس نے دروازہ کھول دیا۔ شیری پریشان سا باہر کھڑا تھا۔
"کنول آپ ٹھیک تو ہیں۔" کنول کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ زیادہ دیر اس کے سامنے کھڑی رہتی۔ وہ فوراً" پلٹی تھی۔
"آپ خود کو سنبھالیں پلیز! محسن کا پتا چل گیا ہے۔ وہ لاہور کے اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔" شیری نے وہاں سے ہی اطلاع دی تھی۔ کنول فوراً" مڑ کر اس کے پاس آئی تھی۔
"پلیز مجھے محسن کے پاس لے چلو پلیز!" وہ منت کر رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ رہی تھی۔
"کنول خود کو سنبھالیں آپ۔ میں آپ کو لاہور لے جاؤں گا' مگر پہلے آپ اپنا حلیہ درست کریں اس طرح جائیں گی تو۔" شیری کے احساس دلانے پہ وہ شرمندہ ہوگئی۔
"میں ابھی آتی ہوں۔" کہہ کر اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی جبکہ وہ اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا اور احمد علی سے فون پر بات کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ آئی تو اس کا حلیہ بہتر تھا۔ بڑی سی چادر میں خود کو چھپائے وہ نقاہت کی وجہ سے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ شیری جانتا تھا کہ اسے آرام کی شدید ضرورت ہے' مگر وہ کبھی بھی نہیں مانے گی محسن کو دیکھے اور ملے بغیر اسے چین

نہیں آئے گا۔ اس کے اعصاب اتنے تھکے ہوئے تھے کہ اب نہ اس میں مزید رونے کی ہمت باقی رہی تھی اور نہ کچھ بولنے کی۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں بند کی تھیں اور تھوڑی دیر میں وہ سو چکی تھی۔ شیری نے آہستگی سے اس کی سیٹ کا لیور پریس کیا تاکہ وہ آرام سے سوتی رہی اور خاموشی سے کار چلاتا وہ مختلف سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔

احمد علی نے اسے حادثے کی ساری تفصیلات بتا دیں تھیں جو کنول نے پولیس کو بتائی تھیں۔ کنول کی حالت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اور یہ ہی بات اسے اذیت دے رہی تھی۔ محسن اتنے غصے میں وہاں سے کیوں نکلا تھا؟ یہ بات اسے ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی تھی اور کنول کی ایسی حالت نہیں تھی کہ وہ کسی بارے میں بات کرسکے۔ اپنی ہی سوچوں میں غلطاں وہ لاہور کے مشہور سرکاری اسپتال پہنچے۔ جہاں محسن کو کل رات لایا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

راحت بیگم کی حالت بہت بہتر ہوچکی تھی۔ سب نے ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ خاص کر عظمی نے بھی۔ ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی یہ سب کچھ دکھاوے کے لیے نہیں تھا وہ سچ میں ہی اپنی خالہ سے بہت اٹیچڈ تھی۔ راحت بیگم بھی اس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اسی لیے تو اسے اس گھر میں لانا چاہتی تھیں۔ بینا شام کے کھانے کی تیاری کررہی تھی کیوں کہ آج اس کا بھی واپسی کا ارادہ تھا۔ جب وہ وہاں پہ پہنچا۔

"چائے پیو گے؟" بینا باجی نے اسے آتے دیکھ کر پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گیا اور فریج میں سے پانی نکال کر وہاں ہی بیٹھ کر پانی لگا۔

"ابو مسجد گئے ہوئے ہیں؟" وہ ان کے خالی کمرے سے ہو کر آیا تھا۔

"ابو نے اور کہاں جانا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار واک کرنے چلے جاتے ہیں۔ مسجد تو ماشاء اللہ باقاعدگی سے جاتے ہیں۔" بینا باجی نے مسالا بھونتے ہوئے کہا تھا۔

"امی کے پاس نہیں گئے؟" بینا باجی نے اسے خاموش دیکھ کر سوال کیا تھا۔

"گیا تھا ان کے پاس! وہ عظمی سے باتیں کررہی تھیں۔ میں پانی پینے کچن میں آگیا۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"عظمی نے بہت ساتھ دیا ہے اس مشکل وقت میں بغیر کسی صلے یا غرض کے! امی سے اور اس گھر سے محبت دیکھ کر ہم سوچتے تھے کہ ہماری والدین کو آخری عمر میں بہو کا سکھ اور ہمیں محبت کرنے والی بھابھی مل جائے گی، مگر جو رب کو منظور.....!" بینا باجی نے افسردگی سے کہا تھا۔

"آپ لوگ اپنی ضد پہ اڑے ہوئے ہیں۔ دعا بھی رشتوں کو جوڑنے والی ہے۔" اس نے کہا تو بینا باجی اسے سرد نظروں سے دیکھتی بولی تھیں۔

"جس لڑکی نے تمہیں ہم سب سے دور کردیا۔ تم اسے رشتے جوڑنے والی کہہ رہے ہو اس کی یہ خوبی صرف تم تک ہی محدود ہے میرے بھائی!" بینا باجی نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

"تم جاؤ یہاں سے مجھے امی سے بات کرنی ہے۔" اس نے اپنا غصہ عظمی پہ نکالا تھا جو اس کے لہجے اور لفظوں پہ شاکڈ رہ گئی اور آنکھوں میں ڈھیروں آنسو بھر کر بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

"یہ کس لہجے میں بات کی ہے تم نے اس سے! تمہاری خادمہ نہیں ہے وہ۔" راحت بیگم نے غصے میں کہا تو وہ سر جھٹک کر رہ گیا جیسے ماں سے بحث کرنے کا ارادہ نہ ہو۔

"میں دعا کو آپ سے ملوانا چاہتا ہوں۔" اس نے وہ بات کہہ دی جو پہلے نہیں سوچی تھی۔

"ہاں ضرور! میرے مرنے پہ لے آنا۔" راحت بیگم نے اطمینان سے کہا تو وہ تڑپ کر رہ گیا۔

"آخر کیوں امی! اس میں کیا برائی ہے جو آپ اسے اتنا ناپسند کرتی ہیں؟" اس نے جھنجلا کر پوچھا تھا۔

"اس میں لاکھ خوبیاں ہوں گی' مگر میرے لیے اس کی ہر خوبی بھی خامی ہی رہے گی۔ عظمیٰ کے سامنے وہ مجھے کبھی بھی نہیں اچھی لگ سکتی ہے۔" راحت بیگم نے اٹل لہجے میں کہا تھا۔

"امی مان لیں عظمیٰ نہیں ہے سامنے' آپ لا رہی ہیں اسے۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"میرے لیے صرف وہ ہی ہے سامنے تمہاری تم جانو۔" راحت بیگم نے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر جانے لگا جب پیچھے سے ماں کی آواز سنی تھی۔

"تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے شہریار!" اس نے پلٹ کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جس پہ لکھا رنج واضح تھا اور شکستہ قدموں سے وہاں سے چلا آیا تھا۔ رات دیر تک سڑکوں پہ بے مقصد گاڑی گھمانے کے باوجود وہ اپنی ذہنی حالت سے چھٹکارا نہیں پاسکا تھا۔ آج اسے سمجھ آیا تھا کہ ایک محبت کے لیے اتنی ساری محبتوں کو چھوڑنا اور اپنی جنت بنانا آسان نہیں تھا۔ آج بے کلی اتنی بڑھی تھی کہ محبت کا احساس اور خیال بھی دل کو تسلی نہیں دے رہا تھا۔ اسی اندھیرے میں امید کی ایک کرن نے راہ دکھائی تھی۔ اور وہ ایک نئی امید کا سرا تھامے اپنی بنائی جنت کی طرف لوٹا تھا جہاں اس کے آنے کی منتظر دعا کب سے دریچے سے لگی کھڑی تھی۔

آسمان پہ بکھرے ستاروں میں اپنے مقدر کا ستارہ ڈھونڈ رہی تھی جو باوجود کوشش کے اسے کبھی نہیں ملا تھا!

☼ ☼ ☼

محسن کی خوش قسمتی تھی کہ گولی اس کے بازو کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ مگر اتنی دیر نیم بے ہوشی کی حالت میں سڑک پہ گرے رہنے کی وجہ سے خون کافی ضائع ہو چکا تھا۔ کسی نے ترس کھا کر اسے قریبی سرکاری ہسپتال پہنچا دیا تھا مگر خود پولیس کیس کے ڈر سے بغیر شناخت کروائے چلا گیا تھا۔ اس ہسپتال میں علاج معالجے کی مناسب سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے اسے ایمبولینس کے ذریعے لاہور لایا گیا۔ جہاں فوری ٹریٹمنٹ کے بعد جب اسے تھوڑا سا بھی ہوش آیا تو اس نے اپنے گھر اطلاع پہنچائی تھی۔ عافیہ آپی اپنے شوہر خاور کے ساتھ روتی پیٹتی وہاں پہنچیں تو ڈاکٹر نے محسن کی حالت خطرے سے باہر بتائی مگر اسے آئی سی یو میں انڈر آبزرویشن رکھا گیا تھا۔ عافیہ آپی اپنے دونوں بچے گھر میں اپنی ساس اور چھوٹی نند عاصمہ کی زیر نگرانی چھوڑ کر آئی تھیں۔ محسن نے ہوش میں آتے ساری تفصیل انہیں بتادی تھی۔ پولیس بھی بیان لینے آئی تھی۔ کنول کہاں تھی اور کس حال میں تھی۔ محسن کو یہ فکر کھائے جارہی تھی۔ وہ بار بار ہوش میں آ کر کنول کے بارے میں پوچھتا تھا۔ پھر دوپہر تک اطلاع ملی کہ دونوں ڈاکو پکڑے گئے ہیں اور کنول کو برآمد کرلیا گیا ہے محسن پٹیوں میں جکڑا' بار بار عافیہ آپی کو فیصل آباد جانے کو کہہ رہا تھا۔

"پلیز آپی کنول کے پاس چلی جائیں پتا نہیں وہ کس حال میں ہوگی۔"

محسن کو وارڈ میں شفٹ کردیا گیا تھا۔ جب اس نے پاس بیٹھی بہن سے منت کی تھی۔ جن کا چہرہ کنول کے نام پہ سپاٹ ہو چکا تھا۔

"میں اپنے بھائی کو اس حال میں چھوڑ کر اس ڈائن کے پاس نہیں جاسکتی جو ہمارے گھر کی خوشیاں کھا گئی ہے۔ منحوس لڑکی جس دن سے بیاہ کر لائے ہیں صرف پریشانی اور تکلیفیں ہی دیکھی ہیں اور تم بھی ذرا ہوش سے کام لو۔ مت بھولو کہ وہ ساری رات ان ڈاکوؤں کے قبضے میں رہی ہے' کون جانے کیا ہوا اور کیا نہیں' ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

عافیہ آپی پھٹ پڑی تھیں۔ محسن زرد چہرہ لیے چپ ہو گیا۔ خاور یہاں موجود نہیں تھے۔ ڈاکٹر سے رپورٹس لینے گئے تھے۔

"آپی ایسے مت کہیں! کنول۔۔۔"

اسی وقت اس کی نظر کالی چادر میں لپٹی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی کنول پہ پڑی تھی۔ خوشی کی لہر اس میں دوڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ کنول کو پکارتا' دوسری نظر اس کے

پیچھے آتے شیری پہ پڑی تو اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اسے سب یاد آنے لگا تھا۔ اس شخص کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا اور یہ اسی کے ساتھ....."
محسن نے غصے سے سوچا تھا۔
"محسن! آپ ٹھیک تو ہیں؟" کنول محسن کے پاس آ کر بے اختیار رو پڑی تھی۔
"میں ابھی آرام کرنا چاہتا ہوں۔ آپی پلیز مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔"
محسن نے سرد مہری سے کہہ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ کنول شاکڈ رہ گئی تھی محسن نے ایک بار بھی اس کی حالت کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔
"چلو یہاں سے!" عافیہ آپی نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے محسن کو دیکھتی وہ وارڈ سے باہر نکل آئی۔ شیری پہلے ہی باہر کھڑا تھا۔ وہ محسن کا سرد مہر رویہ دیکھ چکا تھا۔ اسی وقت دو پولیس والے وہاں آ گئے۔
"آپ کا اغوا ہوا تھا؟ ہمیں آپ کا بیان ریکارڈ کرنا ہے۔ اس طرف آ جائیں۔"
پولیس والوں کے کہنے پہ کنول خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑی جبکہ عافیہ آپی نے حقارت سے منہ پھیر لیا تھا۔ شیری البتہ اس کے ساتھ ہی تھا۔
"آپ کا نام؟" پولیس والے نے پیپر پین پکڑتے ہوئے پوچھا تھا۔
"دکنول....." گم صم اسی حالت میں اس نے بتایا۔
"پورا نام کیا ہے بی بی!" پولیس والے نے پھر پوچھا تو وہ چونکی۔
"دعا کنول....!" اس کے لب ہلے تھے۔ کچھ دور کھڑے شیری نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ جو اپنا بیان لکھوا رہی تھی۔ اس نے موبائل میں وقت دیکھا۔ ولیمہ کی تقریب شروع ہو چکی تھی۔ گھر سے آنے والے فون بار بار اس کی خیریت دریافت کر رہے تھے اور وہ "میں آ رہا ہوں کچھ دیر میں" کہہ کر ٹال رہا تھا۔ وہ اسے اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اپنے دل سے چھپا تا مگر یہ اس کا دل جانتا تھا کہ وہ اس کی محبت میں کتنا آگے نکل چکا تھا۔ جو آج تک اس سے اور اس کی محبت سے انجان رہی تھی۔ مگر شہریار کا دل تو محبت میں گزرے پل پل سے واقف تھا۔ نجانے وہ کونسی قوت یا کشش تھی جو اسے دعا کے گرد دیوانہ وار چکر لگانے پہ مجبور کرتی تھی اور ان لمحوں میں وہ کیسے اپنے آپ پہ قابو پاتا تھا یہ وہ جانتا تھا یا اس کا رب!

☼ ☼ ☼

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہما اور دعا کنول بی اے میں زیر تعلیم تھیں دونوں کی دوستی کالج کے پہلے سال ہوئی تھی۔ اور گزرتے وقت کے ساتھ مضبوط ہوتی گئی تھی۔ ہما بہت زندہ دل اور شوخ لڑکی تھی جبکہ اس کے برعکس دعا کنول بہت شرمیلی اور کم گو سی لڑکی تھی۔ جبکہ شہریار عرف شیری بی کام فائنل ایئر کا طالب علم تھا۔ ہما کی زیادہ دوستی شہریار سے تھی۔ جو اکثر اسے لینے یا چھوڑنے کالج بھی آتا تھا اور اکثر و بیشتر اسے دعا کے گھر بھی لے کر جاتا تھا۔ یا جب دعا کنول ان کے گھر آتی تو واپسی پہ ہما کے ساتھ اسے چھوڑنے جاتا تھا۔ دعا اپنی شادی شدہ بہن شمائلہ کے ساتھ رہتی تھی۔ جس کے دو بچے تھے۔ جن میں دعا کی جان تھی۔ شمائلہ کا شوہر حمزہ امریکا میں سیٹل ہونے کے لیے دن رات محنت کر رہا تھا۔ اور بہت جلد اس کا ارادہ اپنی فیملی کو بلانے کا بھی تھا۔ اسی لیے اس نے شمائلہ پہ زور دیا تھا کہ بی اے کرتے ہی دعا کی شادی کر دو تاکہ اس کے فرض کو ادا کر کے وہ امریکا آ سکے۔
حمزہ دعا کے لیے فکر مند تھا۔ شمائلہ کو اس بات کی خوشی بھی تھی اور اطمینان بھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ شمائلہ جتنی خوب صورت تھی اس کے برعکس دعا کنول مناسب شکل و صورت کی مالک تھی۔ اس لیے اس کے رشتوں کی لائن نہیں لگی ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی شمائلہ دن رات اسی مقصد کی تکمیل میں لگی ہوئی تھی۔ فی الحال دعا ان سب معاملوں سے دور تھی۔ اس کی زندگی کالج، گھر، آپی کے دونوں کیوٹ بچے اور ہما تک ہی محدود تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کوئی بہت

آہستہ آہستہ اس کی سادگی اور معصومیت کا اسیر ہوتا جا رہا ہے؟

یہ سچ تھا کہ شہریار کو دعا سے محبت پہلی نظر میں نہیں ہوئی تھی۔ جیسے جیسے وہ اسے جانتا گیا' اس کی شخصیت کے وصف اس پہ کھلتے گئے وہ اس کا اسیر بنتا گیا۔ مگر ابھی وہ خود بھی ہاں اور نہ کے درمیان کھڑا تھا۔ بی اے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ ہی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ شیری بھی اسی یونیورسٹی میں تھا مگر ان سے سینئر اور اس کا ڈیپارٹمنٹ الگ تھا۔ یہ وقت اور روز کا ملنا شیری کی محبت کو گہرا کر گیا۔

مگر دعا کنول کے فائنل ایئر میں اس کی منگنی ہو چکی تھی جو کچھ مہینوں پہ ہی محیط رہی۔ ان دنوں شیری نے نئی نئی جاب شروع کی تھی۔ جب اچانک ہی اس پہ بم پھٹا کہ دعا کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ اپنی لاعلمی پہ خود کو کوستا رہ گیا اور دعا کنول ہنستی مسکراتی کسی اور کے سنگ رخصت بھی ہو گئی۔ شہریار کی خاموش محبت اس کے دل میں کرلاتی' بین کرتی رہ گئی۔ دعا کو سب گھر والے پسند کرتے تھے۔ راحت بیگم بھی اکثر اس کی عادتوں کی تعریف کرتی تھیں۔ شہریار جانتا تھا کہ راحت بیگم نے عظمیٰ کو اس کے لیے پسند کر رکھا ہے۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ ماں کو راضی کر ہی لے گا۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دعا کی شادی کے بعد شمائلہ بھی امریکا چلی گئی۔ ہما کا رابطہ بھی اس سے نہیں رہا اور اسی جدائی اور وقت نے اسے بتایا کہ دعا اس کے لیے کتنی اہم تھی۔ وہ اس کی محبت میں کتنی ہی منزلیں خاموشی سے طے کر گیا تھا۔

حمزہ کو کسی ضروری کام کی وجہ سے پاکستان آنا پڑا تو وہ فیملی کو بھی لے آیا۔ تب دعا کنول لاہور ملنے آئی اور اتفاقاً ہی اس کی ملاقات ہما سے شاپنگ پلازہ میں ہوئی اور شیری نے جب اسے اتنے دنوں کے بعد دیکھا تو کچھ دیر کے لیے گم صم ہی رہ گیا۔

اس ملاقات کے بعد اس کی بے چینی اور تشنگی بڑھ گئی تھی۔ مگر دعا کو خوش دیکھ کر وہ صبر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے کچھ مہینوں کے بعد ہما کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی اور جب کارڈ چھپے تو پہلا کارڈ ہما نے شیری کے ذریعے دعا کے گھر بھجوایا تھا۔ اور پہلی بار اس کے گھر جا کر اور محسن سے مل کر شیری کو اطمینان ہوا کہ دعا اپنے گھر میں آباد و شاد ہے۔ اس دوران دعا کے موبائل پہ وہ اکثر مختلف بہانوں سے میسجز کرنے لگا۔ کبھی ہما کا بہانہ بنا کر' کبھی شادی کی تیاریوں کا ذکر کر کے' کبھی کوئی اچھا سا میسجز شیئر کر کے وہ آہستہ آہستہ دعا کی دوستی کے دائرے میں آتا رہا۔ دراصل یہ شہریار کا شعوری عمل تھا جو اسے اپنی محبت کے آس پاس رہنے پر مجبور کرنے لگا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس دوستی کو پروان چڑھانے لگا۔ وہ رک بھی جاتا اگر دعا کنول کا رسپانس نہ ملتا۔ دعا کنول جو پہلے محتاط انداز میں میسجز کرتی تھی بعد میں وہ بھی دلچسپی دکھانے لگی تھی۔ دراصل یہ دعا کنول کی زندگی کا بھی وہ فیز تھا جب وہ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب اور پریشان رہتی تھی۔ اور اپنے اندر کی گھٹن اور حبس سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے یہ چھوٹا سا روزن ملا تھا۔ نفس سے لڑنے کو افضل جہاد اسی لیے کہا گیا ہے؟ خود سے لڑنا اس وقت جب آپ پہلے ہی اندر سے توڑ پھوڑ کا شکار ہوں بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے انسان کو برے گمان رکھنے اور مایوس ہونے سے منع فرمایا گیا ہے۔

کشتی میں ہوا چھوٹا سا سوراخ بھی اسے ڈبونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ابتدا ہمیشہ چھوٹے عمل سے ہی ہوتی ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں بہت قیامت ڈھاتی ہیں۔ شہریار نے اسی دوران جانا کہ دعا ذہنی طور پر بہت پریشان ہے۔ اسے یہ یقین ہونے لگا کہ دعا جو بظاہر محسن کے ساتھ خوش نظر آتی ہے دراصل خوش نہیں تھی۔ مگر اپنا بھرم رکھے ہوئے تھی۔ ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی تھی اس کے ناخوش رہنے اور مایوس ہونے کی۔

وہ اپنی سوچوں میں حقیقت کے سب رنگ خود ہی بھرنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کر لیا تھا کہ اگر دعا کو کبھی سہارے کی ضرورت پڑی تو وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔

اس دوران ہما کی شادی ملتوی بھی ہوئی اور کچھ عرصے کے بعد پھر تاریخ رکھی گئی اور ان ہی دنوں شہریار کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا تھا۔ اسے دعا کے نرم رویے سے لگنے لگا تھا کہ جیسے وہ بھی اس میں دلچسپی لے رہی ہو مگر ابھی واضح کچھ نہیں ہوا تھا اور ہما کی شادی کا دن آگیا۔ شہریار نے محسن کے ساتھ سجی سنوری ہنستی مسکراتی دعا کو آتے ہوئے دیکھا تو اس کا یقین ڈگمگانے لگا تھا۔ پھر محسن کا غصے سے وہاں سے جانا اور اس حادثے کا ہونا اس کے بعد کے سب بدلتی اور تلخ رویے اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔

اسے دعا کی سچائی کا یقین تھا مگر اور کسی کو بھی نہیں! جب تک محسن ہسپتال میں ایڈمٹ رہا۔ شہریار روز جاتا رہا۔ پھر ان کے جانے کے بعد کچھ مہینے تک شہریار کا دعا سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ دعا کا نمبر مسلسل بند ملتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دعا مشکل میں ہے مگر وہ اب اس کے گھر نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ ہسپتال میں ہی محسن اور عافیہ آپی کا سرد رویہ اور چبھتی نظریں وہ دیکھ چکا تھا۔ وہ ان دنوں شدید پریشان رہتا تھا اور ان دوڑتے بھاگتے روز و شب میں اسے وہ خبر ملی۔ جس نے کچھ دیر کے لیے ہی سہی اسے ساکت کر دیا تھا۔

"محسن نے دعا کو طلاق دے دی تھی!"

☆ ☆ ☆

شمائلہ، دعا کے اغوا کا سن کر پاکستان پہنچی تھی۔ اپنے شوہر اور دو بڑے بچوں کو چھوڑ کر تیسرے نمبر والے بچے کو لے کر جو ابھی چھوٹا تھا اور ماں کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا ارادہ مہینہ رہ کر جانے کا تھا۔ مگر جب وہ یہاں آئی تو چکرا کر رہ گئی۔ دعا کی زندگی بری طرح الجھی ہوئی تھی۔ دعا کے پاس بہن کے علاوہ کوئی اور قریبی رشتہ نہیں تھا اس لیے اس نے اسے ہی آواز دی تھی۔ شمائلہ اسے اس طرح بیچ میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ دعا کے مسئلے حل ہو جائیں اور وہ اپنے گھر میں آباد رہے مگر سب بے سود رہا اور دعا ماتھے پہ طلاق کا داغ سجائے واپس لوٹ آئی۔ یہ

شمائلہ کے لیے دھچکا تھا۔ بہت مشکل سے پہلے ہی دعا کی شادی کی تھی اب پھر اس کی ذمہ داری، شمائلہ کے سر آپڑی تھی اور اس پہ دعا نے اول سے لے کر آخر تک سب کچھ شمائلہ کو بتا دیا تھا۔ شمائلہ جو پہلے ہی جھنجلائی ہوئی تھی غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

"دعا تم کوئی دودھ پیتی بچی تھیں جسے یہ نہیں پتا تھا کہ اس طرح کی موبائل دوستی کا انجام کیا ہوتا ہے؟ بھلے تم شہریار سے واقف تھی مگر کیا تم محسن کے مزاج اور اپنی حدود کو نہیں جانتی تھی۔ تم نے خود اپنی عزت محسن کی نظروں میں کم کی تھی اور اوپر سے تمہارا اغوا!"

شمائلہ نے دعا کو جو ڈانٹا وہ الگ بات تھی۔ مگر جب شہریار دعا کی طلاق کا سن کر آیا تو شمائلہ نے اسے بھی بے نقط سنائی تھی۔ اور سارا الزام اس کے سر ڈال دیا کہ نہ وہ دعا کی زندگی میں دخل اندازی کرتا، نہ محسن وہ میسجز پڑھتا اور نہ اتنی رات کو غصے میں سفر کرتا جس کی وجہ سے ان دونوں کو اتنی بڑی تکلیف سے گزرنا پڑا تھا۔ شہریار یہ سن کر شاکڈ رہ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ محسن کے غصے کی وجہ اس کے میسجز بنے تھے۔ مگر دعا کی عدت ختم ہوتے ہی وہ وہاں پہنچا تھا۔ دعا نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر شہریار کے بار بار جانے اور بضد رہنے پہ مجبوراً اسے ملنا پڑا۔ شہریار نے وقت ضائع کیے بغیر اسے پرپوز کر دیا اور ساتھ ہی اپنی محبت کا بھی اظہار کیا۔ جس پہ دعا بھپر گئی تھی۔ اس نے شہریار پہ اپنے دل کا سب غبار اور فرسٹریشن نکالی تھی۔ اور شمائلہ کی طرح اسے ہی مورد الزام ٹھہرانے لگی وہ سب کچھ قبول کر کے تلافی کرنا چاہتا تھا۔

دعا بھی کسی طور پہ راضی نہیں تھی۔ وہ جس تکلیف اور صدمے سے گزری تھی اس کے لیے سب بے معنی ہو کر رہ گیا تھا مگر شمائلہ اب کوئی فیصلہ چاہتی تھی۔ وہ زیادہ عرصے تک پاکستان نہیں رک سکتی تھی۔ حمزہ اور بچوں کا اصرار بڑھ رہا تھا کہ جلد واپس آسکے۔ تبھی اس نے دعا سے دوٹوک بات کی تھی کہ اسے شہریار کے حق میں فیصلہ کر لینا چاہیے کیونکہ اس سے بہتر رشتہ اسے دوبارہ نہیں ملے گا۔ دوسری

صورت میں وہ اپنے لیے خود سوچ لے کہ آگے کیا کرنا ہے؟ شمائلہ کے اکھڑے اور بے زار رویے نے دعا کو غفلت کی نیند سے جگا دیا تھا اور اسے اپنے لیے سوچنے پہ مجبور کر دیا تھا اور اس سوچ کی ابتدا جہاں سے بھی ہوئی مگر اس کا اختتام شہریار پہ ہی ہوا تھا۔ اور جب آخری بار شکستہ حال شہریار اس کے سامنے اپنا کشکول پھیلائے آیا تو دعا نے ہاں کے سکے اس کی طرف اچھال دیے تھے شہریار حیرت اور خوشی سے گنگ رہ گیا۔ وہ محبت کے محاذ پہ جیت گیا تھا، مگر رشتوں کے محاذ پہ بری طرح ہارا تھا۔ جبکہ دعا اپنا آخری رشتہ بھی ہار کر خالی دل و دماغ لیے شہریار کے سنگ خاموشی سے رخصت ہوئی تھی۔ وہ خاموشی اتنی گہری تھی کہ دعا کے دل نے بے اختیار سوچا تھا۔

''اتنی خاموشی سے تو کوئی کسی مرنے والے کو بھی نہیں دفناتا ہے۔''

مگر یہ خاموشی اور سرد مہری شمائلہ گھر سے نکلنے تک تھی۔ شہریار نے اپنی زندگی اور اپنی بنائی چھوٹی سی جنت میں اس کا استقبال اتنی خوب صورتی سے کیا کہ دعا کے اندر سکون پھیلنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

دونوں اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم پارک میں چکر لگا رہے تھے۔ ہفتہ وار چھٹی ہونے کی وجہ سے پارک میں رش تھا۔ دعا جب چلتے چلتے تھک گئی تو ایک پر سکون گوشے میں موجود بینچ پہ بیٹھ گئی۔ شہریار نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میں تھک گئی ہوں، آپ راؤنڈ مکمل کر کے آجائیں۔''

دعا نے پھولی سانسوں کے ساتھ کہا شہریار اس کے پاس آکر بینچ پہ بیٹھ گیا۔

''تم ساتھ چل رہی تھیں تو خاموشی بھی باتیں کر رہی تھی اور چلنا بھی اچھا لگ رہا تھا۔ اب بیٹھ کر خاموشی کو سنتے ہیں۔''

شہریار نے شرارتاً کہا تو دعا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اب وہ اکثر اس طرح خوشی سے بھرپور ہنسی ہنس دیتی تھی۔ شہریار کی باتوں میں سحر تھا جو اسے اسیر کرنے لگا تھا۔ دعا نے سر گھما کر کچھ دور ہنستے کھیلتے، دوڑتے بھاگتے بچوں کو دیکھا۔ شہریار نے بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔

''تمہیں بچے بہت اچھے لگتے ہیں نا! اسی لیے تم شمائلہ آپی کے بچوں سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ بچہ بنا پھرتی تھیں۔ میں حما کے ساتھ جب کبھی بھی تمہارے گھر آتا، تمہیں ان کے ساتھ ہی مگن دیکھتا تھا۔''

شہریار نے ماضی کا ورق پلٹا تو دعا کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی تھی۔ اسے شدت سے ان سب کی یاد آئی تھی۔

''دعا! تم جانتی ہو بچوں کے پیار اور شرارتوں میں ایسی طاقت ہوتی ہے جو پتھر دلوں کو بھی موم بنا دیتی ہے۔ میرے گھر والے مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ وہ میرے اس فیصلے کو قبول نہیں کر رہے ہیں جبکہ.....!''

دعا نے سر گھما کر شہریار کی طرف دیکھا جو سامنے کی طرف دیکھ کر بات کر رہا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس گھر میں تمہاری مستحکم حیثیت کو قبول کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ جب ہمارے بچے ہوں گے تو وہ ضرور اپنی جگہ ان کے دلوں میں بنالیں گے۔ کہتے ہیں ناں کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔ امی ابو کو دونوں بھابھیوں کے برے رویے کے باوجود ان کے بچوں سے بے حد پیار ہے اور.....!''

شہریار اپنی دھن میں کہے جا رہا تھا۔

''ہمارے بچے؟ اور اگر نہ ہوئے تو.....!''

دعا نے سوالیہ انداز میں پوچھا تو شہریار یکدم چپ کر گیا۔

''یہ کیسی بات کر رہی ہو تم! اچھا سوچو یار!'' شہریار نے سر جھٹک کر کہا۔

''یہ ناممکن بات تو نہیں ہے؟ کیا آپ اپنے اور میرے رشتے کو اس سے مشروط کر رہے ہیں؟'' دعا نے دھڑکتے دل سے سوال کیا تھا۔

"نہیں محبت مشروط نہیں ہوتی کسی چیز سے بھی! میں نے یہ رشتہ اسی محبت کی بنیاد پہ بنایا ہے۔ مگر میں صرف عمومی رویے اور سوچ کی بات کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے امی کا دل ضرور نرم پڑ جائے گا۔"

شہریار نے امید بھرے انداز پہ کہا تو دعا چپ کی چپ رہ گئی۔ جبکہ شہریار اسی جوش سے بول رہا تھا۔

"میڈیکل رپورٹس کے مطابق میرے ماں بننے کے چانسز بہت کم ہیں کوئی دعا یا معجزہ ہی ایسا ممکن بنا سکتا ہے!"

دعا کے منہ سے نکلے لفظوں پہ شہریار نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ دعا کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آج نہیں تو کل شہریار یہ سچ جان ہی لے گا۔ اسی لیے اس نے بتادینا ضروری سمجھا تھا۔

اب کی بار شہریار چپ کا چپ رہ گیا تھا۔ کل رات جو امید کی کرن اسے نظر آئی تھی وہ بجھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
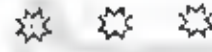
"ہیپی ویڈنگ اینورسری!"

ہنستی مسکراتی دعا نے شہریار کی سائڈ ٹیبل پہ پھول رکھتے ہوئے کہا تھا۔ شہریار جو ابھی بے دار ہی ہوا تھا دھیرے سے مسکرا دیا اور کہنی کے بل اٹھ کر پھولوں کو دیکھتا ان کی نرم پتیوں کو چھونے لگا۔

"پانچ سال ہوگئے ہیں آج!" شہریار نے کچھ سوچتے ہوئے حساب لگایا تھا۔ تو دعا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ تیار ہو جائیں میں ناشتا بنانے جا رہی ہوں۔"

دعا نے نرمی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

"شام کو تیار رہنا میں آفس سے جلدی گھر آجاؤں گا۔ پہلے تمہارے من پسند گفٹ لیں گے اور پھر اچھا سا ڈنر کریں گے۔ اور ہاں آج آئس کریم بھی کھائیں گے۔ کوئی ڈائٹنگ نہیں کوئی پابندی نہیں!"

شہریار نے ناشتا کرتے ہوئے پلان ترتیب دیا تو دعا نے سر ہلا دیا تھا اور اس کے جانے کے بعد لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ اور غور سے ہر چیز کو دیکھنے لگی۔ ہر چیز بہت اچھی اور اپنی جگہ پہ فٹ لگ رہی تھی۔ سارا گھر ان دونوں نے مل کر سجایا تھا۔ ایک دوسرے کی پسند سے۔ اس گھر کے ہر کونے میں بے شمار خوب صورت پل آج بھی زندہ تھے' سانس لیتے تھے۔ سچ میں یہ گھر ان دونوں کی چھوٹی سی دنیا' چھوٹی سی جنت تھی مگر!

دعا گھٹنوں میں سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی تھی۔ یہ جنت ادھوری تھی نامکمل تھی۔ نہ کسی اپنے کا ساتھ تھا اور نہ بچوں کی قلقاریاں تھیں جامد خاموشی جو اکثر اب ان دونوں کے رشتے پہ بھی طاری رہنے لگی تھی! وہ آج بھی ڈاکٹرز سے علاج کروا رہی تھی۔ ان کی دی ہوئی سب ہدایتوں پہ اس سے زیادہ' سختی سے عمل شہریار کرواتا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق وزن کنٹرول میں رکھنا تھا' اسی وجہ سے شہریار نے ہر طرح کی چیزیں گھر میں لانی چھوڑ دی تھیں۔ پہلے اکثر دونوں ہوٹلنگ کرنے' پزا کھانے یا آئس کریم کھانے چلے جاتے تھے۔ مگر اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔

شہریار نے امید نہیں چھوڑی تھی۔ وہ دعا کا ساتھ دے رہا تھا۔ مگر دن بہ دن خاموش اور سنجیدہ ہوتا جا رہا تھا اور یہ تب سے ہوا تھا جب تین سال پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ تب سے شہریار بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ چھٹی کا سارا دن وہ ماں کے پاس گزارتا تھا اور ویسے بھی اکثر چلا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ بہت تنہا اور اکیلی ہو گئی تھیں۔ دعا کا وقت زیادہ تر اسی کے انتظار میں گزرنے لگا تھا۔ شمائلہ سے کبھی کبھار نیٹ کے ذریعے سرسری بات چیت ہو جاتی تھی مگر دعا صحیح معنوں میں تنہا اور اکیلی اب ہوئی تھی۔ نہ سسرال کا پیار اور آسرا تھا اور نہ میکے کا مان! شہریار جو پہلے اس سے باتیں کرتا نہیں تھکتا تھا اب ساتھ ہوتا بھی تو لیپ ٹاپ پہ مصروف رہتا یا ٹی وی دیکھتا رہتا۔ دونوں کے پاس معمول کی چند باتوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا تھا ایک دوسرے کو کہنے کے لیے' شہریار اس کے ساتھ اپنے فرینڈز کی فیملی پارٹیز میں نہیں جاتا تھا کیونکہ ان دونوں میں قد اور جسامت کا فرق بہت واضح ہونے لگا تھا۔ دعا کی جسمانی ساخت فربہی مائل تھی اور وہ اپنی عمر

سے کچھ بڑی لگتی تھی۔ جبکہ شہریار کا معاملہ برعکس تھا۔ وہ دعا کو ہیل نہیں پہننے دیتا تھا کہ اس طرح وہ مزید لمبی لگتی تھی۔ پھر لوگوں کے سوال گھر والے مانے یا نہیں؟ بچے کیوں نہیں وغیرہ سے شہریار چڑنے لگا تھا۔ اس لیے اس نے ایسی جگہوں پہ جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ لوگوں کی زبانیں نہیں روک سکتا تھا۔ لوگ محبت ' ہمدردی اور احساس کی آڑ میں بہت کچھ سنا جاتے تھے۔

دعا اس خاموشی اور ویرانی سے تھکنے لگی تھی مگر بس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا اور اس کا ٹوٹنا' تنہائی ' اکیلا پن اسے اپنے رب کے مزید قریب کرتا جا رہا تھا۔ جو اپنے بندوں کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے جو توڑ کر خود سے جوڑ دیتا ہے۔ بس ذرا صبر اور ہمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ نفس کے گورکھ دھندے سے نکلنا اور لڑنا آسان نہیں ہوتا ہے اور آزمائش میں یہ نفس سرکش بھی زیادہ ہو جاتا ہے! مایوسی' ناامیدی اچھائی برائی کا فرق مٹانے لگتے ہیں مگر اب کی بار دعا نے اپنے رب کو امید سے نہیں بلکہ یقین سے پکارا تھا اور اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ اندھیرا چھٹنے کو ہے۔ اس نے پہلے کی طرح اپنی قسمت اور لکھے ہوئے درد و تکلیف سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ اسی درد میں اپنے رب کی رضا ڈھونڈنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

''تم جس اولاد کی تمنا اور خواہش میں اتنی تکلیف اٹھا رہی ہو جانتی ہو جب بڑا ہو کر وہی بچہ اپنی من مانی کرے اور والدین کے مان کو توڑ کر چلا جائے! اس کی تکلیف اور اذیت کا اندازہ کر سکتی ہو؟''

دعا ڈاکٹر کے کلینک میں ویٹنگ روم میں بیٹھی تھی جب کوئی اس کے پاس آکر ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھا اور دھیرے سے بولا تھا۔

''ہما! تم۔!'' دعا نے اسے دیکھا تو بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ہما نے تھکی ہوئی نظر اس پہ ڈالی تھی۔ اس کی گود میں چند ماہ کا بچہ بھی تھا۔

''میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا ہے۔'' دعا کنول نے تڑپ کر کہا تھا۔

''مگر ہمارے ساتھ برا کیا ضرور ہے تم نے۔''

ہما نے جواب دیا تو دعا لب کچل کر رہ گئی۔

''کنول' میں آج تم سے لڑنے یا شکوہ کرنے نہیں آئی ہوں اور نہ کسی بحث میں پڑنے 'مگر تم مانو یا نہ مانو تمہاری وجہ سے ہم سب کی زندگی رک سی گئی ہے۔ ابو کی وفات کے بعد تو جیسے سب کو چپ سی لگ گئی ہے۔ امی خاموشی سے در و دیوار دیکھتی رہتی ہیں' تم جانتی ہو کہ امی کو شہریار سے کتنی محبت تھی اور وہ کتنے سالوں سے اس کی خوشیاں دیکھنے کی منتظر' عظمیٰ آج بھی اس کا روگ لیے جی رہی ہے۔ امی کو عظمیٰ کے بے رنگ رہنے کا دکھ اور شہریار کی بے حسی کی بہت تکلیف ہے۔ اسی لیے وہ مزید بیمار ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو!''

ہما نے آبدیدہ لہجے میں کہا تو دعا دہل کر رہ گئی۔ دعا پہلے ہی شہریار کی سنجیدگی اور خاموشی کو جھیل رہی تھی۔ اگر ماں کو کچھ ہو گیا تو شہریار شاید ہنستا بولنا ہی بھول جائے گا۔

''میں شہریار کو جانتی ہوں۔ وہ تم سے کیے وعدے پہ قائم ہے اور جب تک تم اسے نہیں کہو گی' تب تک وہ اسی طرح اندر ہی اندر احساس ندامت کی آگ میں جلتا رہے گا۔''

ہما نے کہا تو دعا نے سر جھکا لیا کیونکہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

''امی نے اسے معاف کر دیا ہے اور تمہیں بھی بہو کے طور پر قبول کرنے پہ راضی ہیں مگر صرف ان کی یہ شرط یا خواہش سمجھ لو کہ وہ چاہتی ہیں کہ شہریار عظمیٰ سے دوسری شادی کر لے۔ شہریار نے کوئی جواب نہیں دیا ہے مگر اس کی خاموشی چیخ چیخ کر اعلان کر رہی ہے کہ وہ ماں کی بات اب کی بار رد نہیں کرنا چاہتا ہے مگر مجبور ہے تمہاری وجہ سے۔''

ہما کے کیے انکشاف نے دعا کو گنگ کر دیا تھا۔ اسی لیے شہریار پچھلے کئی دنوں سے گم صم سا رہنے لگا تھا۔

''فیصلہ اب تمہیں کرنا ہے دعا!'' ہما نے آہستگی

سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ دعا گم صم سی اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

چٹکی چاندنی میں خاموش، گم صم سی وہ کب سے میرس میں کھڑی ہوئی تھی جب شہریار اسے پکارتا ہوا آیا۔

"کیا ہوا دعا؟ ایسے کیوں اکیلی، گم صم سی کھڑی ہوئی ہو؟" شہریار نے پریشانی سے پوچھا تو دعا نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ شہریار کے دل کو کچھ ہوا۔

"دعا!" اس کے لب ہلے تھے۔ سب کے لیے وہ کنول تھی مگر اس کے لیے دعا تھی۔ اسی لیے وہ شروع سے یہ ہی نام پکارتا تھا۔

"آج سے کئی سال پہلے اماوس کی رات میں، جب روشنی کی کوئی کرن نہیں تھی ایک فیصلہ میں نے کیا تھا۔ کسی کے فیصلہ سنانے سے پہلے۔۔۔"

دعا نے رخ موڑ کر سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ شہریار نے الجھ کر اسے دیکھا تھا۔

"کیسا فیصلہ؟"

"محسن کو چھوڑنے کا فیصلہ۔" دعا نے کہا تو شہریار شاکڈ سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

"محسن نے تمہیں خود چھوڑا تھا یا اس نے تمہیں طلاق دی تھی۔" شہریار کے لب حیرت سے ہلے تھے۔

"اس نے مجھے نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ سنا کر طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔"

دعا نے اعتراف کیا تو شہریار حیرت سے اسے دیکھتا نفی میں سر ہلانے لگا تھا۔ جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو۔ جبکہ دعا دل میں پھیلتے درد کو لیے، اسی گھر میں ٹھہری رات میں پہنچ گئی، جہاں اس کی تقدیر نے پانسا پلٹا تھا۔

☆ ☆ ☆
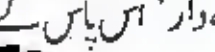
اس ہوئے ہولناک حادثے کے بعد سے دعا کی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔ وہ سب کے لیے ایک چٹ پٹی خبر بن چکی تھی۔ محلے دار، آس پاس کے لوگ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرنے لگے تھے۔ محلے کی عورتیں ہمدردی سے بہانے بہانے سے اس سے ایسے ایسے سوال کرتیں کہ دعا کا دل چاہتا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ گھر سے باہر نکلتی تو سب سر سے لے کر پاؤں تک اسے گھورتے، اوباش لڑکے اس کی طرف دیکھ کر اشارہ کرتے اور قہقہہ لگا کر ہنستے! اس کی عزت محفوظ رہی تھی اس کا یقین کسی کو بھی نہیں تھا۔ اس بات پہ سب استہزائیہ انداز میں ہنس پڑتے۔ یہ تو باہر کی صورت حال تھی۔ گھر میں اس سے بھی برا ماحول ہو چکا تھا۔ عافیہ آپی ہر روز آجاتی تھیں اور بستر پہ لیٹے بیمار محسن کے آگے واویلا مچاتیں، شور کرتی تھیں کہ بدنامی کی اس پوٹ کو گھر سے نکالو۔ دعا سے نفرت کا اظہار کرتیں اور محسن چپ رہتا۔ محسن نے اسے بلانا اسے دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ عجیب سی سوچوں میں گم رہتا تھا۔

جب تک اس کا زخم بھرا گھر کا یہ ہی ماحول رہا۔ مگر جب محسن نے گھر سے باہر جانا شروع کیا تو صحیح معنوں میں قیامت اس وقت مچی۔ جب پہلے دن وہ لال بھبھوکا چہرہ لیے گھر میں داخل ہوا اور غصے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتا، چیزیں پھینکنے لگا۔ نجانے وہ کس کا غصہ، کس پہ نکال رہا تھا۔ دعا کنول دبک کر بیٹھی رہی۔ اس کی غیرت پہ کیسے کیسے تازیانے پڑ رہے تھے، دعا کنول کو اندازہ تھا۔ پہلے وہ عافیہ آپی کی باتوں اور واویلا کو معمولی سمجھ رہا تھا مگر جب خود بھی باہر کی دنیا کا سامنا کرنا پڑا تو اسے سمجھ آئی کہ عافیہ آپی کا رونا پیٹنا غلط نہیں تھا۔ پھر یہ روز کا تماشا بن گیا۔ محسن کا مزاج کڑوے کریلے کی طرح ہو گیا۔ دعا اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح رہنے لگی تھی۔ یہ اعصاب شکن جنگ ایسے ہی کچھ مہینے چلتی رہی پھر ایک دن عافیہ آپی اپنے دونوں بچوں سمیت سامان باندھ کر چلی آئیں اور محسن کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

"محسن تم نے آج تک اپنی پسند اور مرضی کی ہے۔ یہ سوچے بنا کہ تمہاری وجہ سے مجھے کتنا سہنا اور برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اس حادثے کے بعد سے

میرے سسرال والوں نے مختلف سوال کر کے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ ہنستے ہیں مجھ پہ' باتیں کرتے ہیں۔ عجیب و غریب سوال کرتے ہیں اسی لیے میں سب کچھ چھوڑ کر چلی آئی ہوں اب اور برداشت نہیں ہوتا ہے۔"

محسن نے سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ بہن کا سر تھپکا تھا پھر دو' تین دن دونوں بہن بھائی کمرہ بند کر کے میٹنگ کرتے رہتے۔ جیسے کسی فیصلہ پہ پہنچنا چاہ رہے ہوں۔ دعا بھی اس صورت حال سے تنگ آچکی تھی۔ قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی اسے سزا دی جا رہی تھی۔ وہ بھی اندر ہی اندر خود کو مضبوط کرتی کسی فیصلے پہ پہنچ رہی تھی۔ پھر وہ گھڑی آہی پہنچی۔ دعا سیاہ کالی رات میں جب آسمان پہ کوئی تارہ' دور دور تک نظر نہیں آرہا تھا۔ خاموشی سے صحن میں کھڑی تھی۔ جب محسن اس کے پاس آیا۔ کافی دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔

"کنول!" کتنے عرصے بعد دعا کنول نے اپنا نام اس کے منہ سے سنا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی تھی۔

"میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔" محسن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو دعا نے بھی اسی سنجیدگی سے کہا تھا۔

"ایک فیصلہ میں نے بھی کر لیا ہے مگر پہلے آپ کا سننا چاہوں گی۔" دعا کے کہنے پہ محسن چونکا پھر دوبارہ گویا ہوا۔

"میں نے ہمیشہ تمہارا ساتھ دیا ہے۔ حتیٰ کہ تمہاری کمی اور بیماری کے باوجود' تمہیں مکمل سپورٹ کیا' تمہاری اس میسجز والی غلطی تک کو اگنور کرنے کے لیے دل کو سمجھاتا رہا۔ پھر وہ حادثہ۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہی مگر میں تھک گیا ہوں لوگوں سے لڑتے' ان کو سنتے ہوئے۔ لوگ اس حادثے کو لے کر عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں سوال اٹھاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ سب نارمل بھی ہو جائے مگر اب مجھ میں مزید حوصلہ نہیں ہے خود سے لڑنے کا۔ اسی لیے میں عافیہ آپی کی بات مانتے ہوئے بہت جلد دوسری شادی کر رہا ہوں۔ میں اپنی محبت کرنے والی بہن کو مزید دکھ نہیں دے سکتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ مگر تمہیں کچھ عرصے کے لیے منظر عام سے ہٹنا ہو گا۔ تاکہ اس واقعے پہ وقت کی گرد پڑ جائے۔"

محسن نے عافیہ آپی سے طے کیا ہوا لائحہ عمل اسے بتایا تو دعا کنول نے گہری سانس لی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں آپ کے فیصلے کی قدر کرتی ہوں کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود آپ نے میرا سوچا' مگر۔۔۔" دعا نے کچھ لمحوں کا توقف کیا۔ محسن نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"میں بھی مزید آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی ہوں۔ میں نے اپنی خطاؤں اور ناکردہ جرم کی سزا پالی ہے۔ مزید کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔ آپ کے حوصلے اور ظرف کو آزمانے سے بہتر ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے آپ کی زندگی سے چلی جاؤں! مجھے طلاق چاہیے محسن۔۔۔!"

دعا کنول کے چہرے پہ آنسوؤں بہہ رہے تھے اور آخری لائن کہتے ہوئے اس کے لب کپکپائے تھے۔ محسن نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ جو رخ موڑ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اسے لگا تھا کہ دعا کنول روئے گی' چلائے گی' منتیں کرے گی کہ مجھے کبھی مت چھوڑنا! مگر دعا کے فیصلے نے اسے دھچکا پہنچایا تھا۔ کافی دیر چپ رہنے کے بعد' وہ یہ کہتے ہوئے پلٹ گیا۔

"جیسے تمہاری مرضی!" اس کی جان خود چھٹ رہی تھی دعا سے تو وہ مزید کیا کہتا۔ اس کے جاتے ہی دعا وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ یہ فیصلہ کرتے وقت وہ پل صراط پہ سے گزری تھی۔ مگر وہ سمجھ چکی تھی کہ سامنے والے کا ظرف اور حوصلہ اس کے لیے ختم ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

شہریار حیرت سے اسے سن رہا تھا۔ جس کے چہرے

پہ آنسوؤں کی لکیریں واضح تھیں۔

"اور میں آج تک یہ ہی سمجھتا رہا کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ تمہاری بربادی میں میرا ہاتھ ہے۔ او مائی گاڈ!"

شہریار نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیری تھیں۔

"محسن کے کچھ بھی بتانے سے پہلے عافیہ آپی آپ کو میری مدد کرتے اور روز ہسپتال کے چکر لگاتے دیکھ کر بہت کچھ سمجھ گئی تھیں۔ باقی تفصیل محسن نے انہیں دے دی تھیں۔ آپ کا طعنہ اور حوالہ بھی میرے لیے تھا مگر اس حادثے کا نام پہلے لیا جاتا تھا۔" دعا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"شمائلہ آپی کو مجھ سے پہلا اختلاف یہ ہی ہوا تھا کہ میں محسن سے علیحدگی کا فیصلہ بدل لوں۔ میں چاہے محسن کے گھر میں جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارتی' انہیں اس سے غرض نہیں تھی بس وہ خوفزدہ تھیں کہ میری ذمہ داری مستقل ان کے سر نہ پڑ جائے۔ مجھے محسن کے رویے یا انداز میں بہتری کی ایک پرسینٹ بھی امید ہوتی تو شاید میں اپنا فیصلہ بدل بھی لیتی۔ مگر میں کوئی بہت صابر' یا عظیم عورت نہیں ہوں جو اپنے اوپر ہوئے ہر ظلم پہ عظمت کے مینار قائم کرتی رہتی۔ میں بہت معمولی برداشت اور صبر رکھنے والی عام سی عورت ہوں۔ جسے دکھ بھی ہوتا ہے' تکلیف بھی!

میں کیسے محسن کے ساتھ ایسی زندگی گزار لیتی جس میں میرے لیے' سوائے' نفرت' ذلت یا حقارت کے کچھ نہ ہوتا۔ محسن کی یہ انتہائی تھی کہ وہ فالتو سامان یا بوجھ کی طرح ہی سہی مگر مجھے گھر کے ایک کونے میں پھینکنا چاہ رہے تھے۔ مگر میں کوئی چیز نہیں تھی۔ جیتا جاگتا انسان ہوں میں نے اس گھر میں' محسن کے دل میں راج کیا میں کیسے وہاں نظروں سے گر کر' زندگی گزار لیتی۔ صرف سانس لینا ہی تو زندگی نہیں کہلاتا ہے! اس لیے میں نے محسن کو اس بوجھ اٹھانے کی زحمت اور مشقت سے آزاد کر دیا۔ نفرت سے ساتھ رہنے سے بہتر تھا کہ محبت سے جدا ہو جاتے اور آج پھر وہی دوراہا ہے' وہی فیصلہ کرنا ہے۔"

دعا نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ کیسا فیصلہ؟ کیسا دوراہا؟" شہریار نے چونکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"شہریار!" دعا نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

"میں دل سے آپ کی' آپ کی محبت کی قدر کرتی ہوں۔ یہ بھی سچ ہے کہ آپ نے اپنا کہا' پوری ایمانداری سے نبھایا ہے' مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے مگر آج وقت کا تقاضا اور ہے۔ آج میں آپ کو ہر عہد' ہر وعدے کی پاسداری سے آزاد کرتی ہوں میں نہیں چاہتی کہ آپ اندر ہی اندر گھلتے رہیں' احساس ندامت کا شکار رہیں۔ یہ اندر کی جنگ' اندر کی ہار بہت تکلیف دیتی ہے۔ زندگی کی خوشیوں پہ آپ کا بھی حق ہے اور آپ کے اپنوں کا بھی۔" شہریار نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ سرہلاتی مسکرا دی۔

"اس انا' ضد کی لڑائی کو ختم کر دیں اور اپنوں کو گلے سے لگالیں' اپنی امی کی بات مان لیں۔ پہلے ہی میری وجہ سے آپ نے بہت دل دکھایا ہے۔ جس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔"

دعا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر شہریار کے ہاتھ پہ گر رہے تھے۔

"ایسے مت کہو دعا! میں خود ذمہ دار ہوں اس سب کا۔" شہریار نے آج تھک کر اعتراف کیا تھا۔

"بہت زندگی گزر گئی ہے سود و زیاں کا حساب کرتے' خسارہ جمع کرتے' چلو اب محبت کو تقسیم کر کے دیکھتے ہیں۔"

دعا نے نرمی سے کہا تھا۔ شہریار کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے جھلملا اٹھی تھیں۔ آنکھیں بھلے جدا جدا تھیں مگر آنکھوں میں جھلملانے والے آنسو ایک دوسرے کے لیے تھے ایک دوسرے کی محبت اور خوشی کے لیے تھے۔ اس سے مکمل بھی کچھ اور ہوتا ہے محبت کے جہاں میں!

☆ ☆ ☆

"نماز پڑھ لی تم نے؟" راحت بیگم نے اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر نرمی سے پوچھا تھا۔

"جی امی! شہریار اور بچے قریبی مارکیٹ تک گئے ہیں۔ میں نے سوچا ابھی فری ٹائم ہے آپ کے ناخن کاٹ دوں۔"

دوپٹا نماز کے انداز میں لپیٹے وہ مصروف سے انداز میں بولی تھی۔ آج جمعہ تھا اور راحت بیگم باقاعدگی سے ناخن ضرور کٹواتی تھیں۔ ناخن کٹنے کے ساتھ ساتھ دونوں ہلکی پھلکی باتیں بھی کر رہی تھیں۔ جب حسب عادت شور مچاتے وہ تینوں اندر داخل ہوئے تھے۔ شہریار بچوں کے ساتھ بچہ ہی بن جاتا تھا۔

"بڑی ماما یہ دیکھیں میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔"

پانچ سال کے گول مٹول سے عادل نے دعا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔ عادل اور عباد جڑواں تھے۔ ان سے دو سال چھوٹی حریم تھی۔ تینوں بچے دعا سے بہت اٹیچڈ تھے۔ دعا نے اس کی ہتھیلی پہ دیکھا اس کی پسندیدہ چاکلیٹ تھی۔

"تھینک یو عادل!" دعا نے اس کا گال چوما تھا اس دوران وہ ہاتھ دھو کر آچکی تھی۔ اور اب دونوں بچوں سے باتیں کر رہی تھی۔ "اور عباد میرے لیے کیا لایا ہے؟"

دعا نے چاکلیٹ کھاتے عباد سے پوچھا تو وہ جھٹ سے بولا۔

"آپ کے لیے میں ہوں ناں!"

راحت بیگم اور دعا اس کی چالاکی پہ ہنس پڑیں۔ مگر شہریار نے ماں کی نظر بچا کر دعا کو آنکھ ماری تھی اور آہستگی سے بولا تھا۔

"یہ مجھ پہ گیا ہے!" دعا نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا مگر اس کے چہرے پہ حیا آمیز مسکراہٹ در آئی تھی۔ اتوار کو راحت بیگم کے ساتھ عادل اور عباد بھی واپس چلے گئے۔ مگر اگلے ویک اینڈ پہ پھر آنے کا وعدہ کر کے! دعا نے مسکراتے ہوئے سب کو رخصت کیا تھا اور کل صبح ذہنی بحالی کے سینٹر جانے کی تیاری کرنے لگی جہاں وہ پچھلے چار سالوں سے رضاکارانہ طور پر کچھ وقت گزارتی تھی۔ گزرتے وقت نے ثابت کیا تھا کہ کئی سال پہلے کیا ہوا اس کا فیصلہ کتنا درست ثابت ہوا تھا۔ شہریار کی عظمٰی کے ساتھ شادی روایتی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ ماں بہنوں نے اپنے سب ارمان پورے کیے تھے۔ شادی سے پہلے راحت بیگم سے ملنے دعا گئی تھی۔ راحت بیگم نے اس کا استقبال خاموشی سے کیا تھا۔ مگر جب دعا نے ان کے ہاتھ پکڑ کر نم دیدہ لہجے میں کہا تھا۔

"مجھے یہ سوچ کر معاف کر دیجیے گا کہ میں دنیا میں وقت اور حالات کا شکار' اکیلی اور تنہا عورت ہوں۔ جس کے سر پہ آپ جیسی دعا کرنے والی ماں کا سایہ بھی نہیں ہے۔"

راحت بیگم پہلے ہی بیماری اور گزرتی عمر کے ساتھ کمزور ہو چکی تھیں۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ اس دن دعا کو اپنی قربانی اور صبر کے بدلے اس کا جائز حق اور مقام مل گیا تھا۔

عظمٰی جس نے اتنے سال اپنی محبت کا جوگ پالا تھا۔ اس کے لیے شہریار کا ملنا ہی خوش قسمتی تھا۔ وہ اس کی محبت میں اتنی ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے کچھ اور سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ دعا کو وہ پہلے ہی شہریار کی زندگی کا حصہ مان چکی تھی۔ جو تکلیف اٹھانی تھی وہ اس نے اس وقت اٹھائی تھی جب شہریار نے اسے چھوڑ کر دعا سے شادی کی تھی۔ اب جبکہ وہ ملن کی آس کھونے لگی تھی اسے محبت کا وصل نصیب ہوا تو وہ ساری دنیا سے بے گانی اسی میں خوش رہنے لگی تھی۔ ان کی زندگی کو مکمل کرنے کے لیے تین خوب صورت بچے بھی تھے۔ شہریار نے مستقل مزاجی اور صبر کے ساتھ دعا کو اس کا جائز مقام دلایا تھا۔ اب سب اس کی اہمیت اور مقام کو جانتے تھے۔

شہریار کی پہلی بیوی وہ ہی تھی۔ راحت بیگم' دعا کے اصرار کرنے پہ اس کے گھر پہلے ملنے جاتی تھیں پھر کبھی

کبھار رہنے بھی لگی تھیں۔ دعا کی عادات اچھی تھیں یہ وہ پہلے بھی مانتی تھیں مگر جتنی عزت' احترام اور پیار دعا نے انہیں دیا تھا وہ ان کے لیے حیران کن تھا شہریار تینوں بچوں کو بھی ملوانے لاتا رہتا تھا۔ عظمیٰ سے دعا کا ملنا کم ہی ہوتا تھا مگر جب بھی ملیں' اچھے طریقے سے ملی تھیں۔ اب اکثر ہما بھی دعا کی طرف چکر لگا لیتی تھی۔

دعا نے محبت کو تقسیم کیا تو بدلے میں اسے بہت سی محبتیں ملی تھیں۔ اسے مضبوط زمین ملی تھی۔ رشتوں کا مان اور پیار ملا تھا۔ اس نے گزرتے وقت کے ساتھ جانا تھا کہ محبت کو پائیدار کرنا ہے تو محبت کو نفی نہیں' بلکہ سب میں بانٹنا پڑتا ہے۔ صرف دو لوگ اپنی بنیادوں سے الگ ہو کر محبت کا جہاں آباد نہیں کر سکتے ہیں۔ جیسے کہ شہریار گزرتے وقت کے ساتھ مزید اس کا دیوانہ ہوا تھا۔ وہ دل سے دعا کا احسان مند تھا۔ اگر دعا اسے پیچھے سے پش نہ کرتی تو وہ ساری زندگی گومگو کی کیفیت میں کھڑا گزار دیتا۔ آج اگر اس کی زندگی مکمل تھی تو اس کی وجہ صرف اور صرف دعا کنول تھی! وہ اس کی زندگی میں دعا کی طرح ہی تھی مکمل اور پرسکون کر دینے والی۔ اپنا بنا لینے والی۔

☼ ☼ ☼

دعا نے ذہنی بحالی کے سنٹر میں کام کرتیں مختلف خواتین کی طرف دیکھا۔ اس ادارے میں ذہنی و جسمانی معذور خواتین کو ان کی ذہنی استعداد کے مطابق ہنر سکھایا جاتا تھا۔ دعا نے اپنے وقت کو دو چیزوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک علم سیکھنا اور دوسرا علم کو بانٹنا!

وہ صبح کے وقت قرآن و حدیث کی کلاس لیتی تھی۔ پھر اس سنٹر میں دوپہر تک وقت گزارتی تھی۔ اس کے بعد کا وقت اس کا اپنے گھر کے لیے ہوتا تھا۔ جس کو سجانے' سنوارنے اور شہریار کا انتظار کرنے میں گزر جاتا تھا۔ دعا اپنی قسمت پہ راضی ہونا سیکھ گئی تھی۔ زندگی صرف سب کچھ پانے کا حاصل کرنے کا نام نہیں ہے! زندگی میں دینے کی عادت بھی ڈالنی چاہیے۔ ذہنی معذور کے ادارے میں وقت گزار کر اسے اندازہ ہوتا تھا کہ اولاد کا ہونا بھی آزمائش ہے اور نہ ہونا بھی۔ جن کے بچے پیدائشی ذہنی معذور تھے ان والدین کی اذیت کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔ زندگی میں صرف اپنی محرومی پہ رونا' یا چلانا ہی سب کچھ نہیں تھا۔ زندگی کو بامقصد گزارنا اصل بات تھی۔

دعا نے اپنے دکھ' اپنے درد کو رب کی رضا سمجھ کر قبول کیا تھا۔ اسے رب کی حکمت اور مصلحت پہ کوئی شک نہیں رہا تھا۔ اس نے درد میں اپنی بقا' اپنی حیات ڈھونڈ لی تھی! کبھی کبھی شہریار بہت حیران ہوتا تھا اور کہتا تھا۔

''دعا تم بہت بہادر اور صبر والی ہو۔'' دعا نفی میں سر ہلا کر کہتی تھی۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں بہت عام سی عورت ہوں جو صرف اپنی حیات کے راستے آسان کر رہی ہے۔ جو رشتوں کی اہمیت کو جانتی ہے اور انہیں کو نبھانے کی کوشش کرتی ہے۔''

''تم نہیں سمجھو گی کبھی بھی کہ تم میرے لیے کتنی خاص ہو۔ میرا لحہ سکوں' حصہ جاں ہو!''

شہریار جذب کے عالم میں کہتا تو اس کے کندھے پہ سر رکھ کر دعا آنکھیں موند لیتی اور دھیرے سے کہتی!

''آپ بھی کبھی نہیں سمجھیں گے کہ بعض درد زندگی کی نوید ہوتے ہیں۔ ان کے بطن سے نئی زندگی جنم لیتی ہے۔ جو ابدی اور پائیدار ہوتی ہے اور میرے لیے وہ زندگی میرے رب کی رضا میں راضی رہنا ہے اور یہ بھی ممکن نہ ہوتا اگر آپ کا ساتھ نہ ملتا۔ جس نے درد سے لڑنا نہیں' اس میں جینا سکھایا' محبت کو تقسیم کرنا سکھایا ہے!''

دونوں ایک دوسرے کی محبت زمین میں پہ سفر کرتے ہوئے آسمان کے چمکتے اور ابدی ستارے بن رہے تھے اور یہ ہی اصل محبت کی معراج ہے۔

☼ ☼

سے رکھنی ہی پڑی۔ وہ دوسری عورتوں کے برعکس جو شوہر اور بچوں کے آفس' اسکول روانہ ہو جانے کے بعد دوبارہ سو جاتی تھیں' پھرتی سے اپنے دن بھر کے کام نمٹا لیتی تھی اور شام کو فریش ہو کر ثوبان اور بچوں کو ٹائم دیا کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایمان نے بائیک روکی اور سامان کے بھرے ہوئے شاپرز اٹھا کر اندر لے آیا۔

"شمائلہ آنٹی' چیک کرلیں' میں سب سامان لے آیا ہوں۔"

"آئی ایمان۔" وہ تیزی سے کچن سے برآمد ہوئی تھی' اس کا حلیہ بے حال ہو رہا تھا' پسینے میں بھیگی' کپڑے جسم سے چپکے ہوئے دوپٹا ندارد' جھک کر سامان چیک کرنے لگی تو ایمان سٹپٹا کر پیچھے ہوا تھا۔

"میں اب چلتا ہوں۔"

"نہیں' نہیں' ایسے کیسے چلتا ہوں' بیٹھو تو' میں نے تمہارے لیے فریزر میں کولڈ ڈرنک رکھی ہے' ایک سنٹ میں لے کر آئی۔"

وہ سب چھوڑ چھاڑ کچن کی طرف لپکی تھی۔

ایمان کے خشک ہوتے حلق نے اسے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی کولڈ ڈرنک نے اس کی پیاس بجھا دی تھی۔ شمائلہ اپنا گلاس لیے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔

"بہت شکریہ ایمان' تم نہ ہوتے تو میرا کیا بنتا؟"

"ڈونٹ مینشن آنٹی" وہ مسکرا کر کہتا' اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو تو سہی' سارا دن اکیلی بور ہوتی رہتی ہوں' دو چار منٹس تو اور بیٹھ جاؤ۔" اس نے بازو سے پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھا دیا تھا۔

"مجھے نوٹس بنانے ہیں تو دیر ہو جائے گی۔"

"چلے جانا' کچھ دیر تو بیٹھو۔"

☼ ☼ ☼

"اتنی دیر کر دی ایمان نے' ایسا کیا لینے چلا گیا؟"

سمیرا خود میں ہی الجھ رہی تھی' کچھ دیر اور انتظار کرنے کے بعد وہ اسے فون کرنے کے لیے اٹھنے ہی لگی تھی کہ وہ آگیا۔

"اتنی دیر ایمان' ایسا کون سا سامان لینے کے لیے چلے گئے تھے؟"

"مما' ساری گروسری منگوائی ہے آنٹی نے' اتنی دیر تو لگنی ہی تھی۔"

"اچھا' آئندہ خیال رکھنا اور تھوڑا تھوڑا کر کے دو تین دن میں لا دیا کرو' یوں تو بہت دیر ہو جاتی ہے۔"

"میں ایک ہی دفعہ جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کون بار بار جائے' میری روٹین ڈسٹرب ہوتی ہے۔"

"اچھا' جاؤ اپنا کام کرو۔" وہ خود بھی کچن میں آگئی تھی۔ ایمان بھی صحیح کہہ رہا تھا۔ روز' روز کے جانے سے اس کا اپنا بہت سا ٹائم ضائع ہوتا تھا اور وہ اپنی اسٹڈیز میں بہت سینسیئر تھا' ہمیشہ پوزیشن لیتا تھا یہ تو وہ سمیرا کی وجہ سے شمائلہ کو منع نہیں کر پاتا تھا ورنہ وہ واقعی ڈسٹرب ہوتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یار' یہ کیا پکایا ہے؟" ڈونگے کا ڈھکن اٹھاتے ہی ثوبان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ مونگ' مسور کی دال۔

"کیوں سمجھ میں نہیں آیا' کیا پکایا ہے؟" سمیرا کی شریر آواز کچن سے آئی تھی۔

"کچھ زیادہ ہی سمجھ میں آگیا ہے' میرا خیال ہے ڈائٹنگ پر لا رہی ہو ہمیں۔"

"ہاں تو یہ ضروری بھی' اوور ویٹ ہو رہے ہیں آج کل۔" وہ ٹرے ہاتھ میں لیے کچن سے برآمد ہوئی تھی' باپ' بچوں کے چہرے دیکھ کر اسے ہنسی آرہی تھی۔

"کافی چربی چڑھ گئی ہے۔ اب اسے زائل بھی ہونا چاہیے۔"

"اتنی محنت کرتے ہیں۔ چربی ویسے ہی زائل ہو چکی ہے۔" ثوبان ٹرے کی طرف متوجہ ہوا' جہاں سے وہ شامی کباب' رائتہ اور سلاد ٹیبل پر باری' باری رکھ

رہی تھی۔

"یہ سب دال کے ساتھ ہی نہیں رکھ سکتی تھیں' خوامخواہ کتنا ہی خون جلادیا۔" اس نے سمیرا کو گھورا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"ایکسکیوزمی سر' سوسوری۔ بندی کو تلافی کے لیے معذرت خواہ ہے' کباب فرائی ہونے اور ساتھ سلاد بنانے میں دیر ہوگئی۔"

"تو مما آپ مجھے بلا لیتیں" نمرہ نے جلدی سے کہا۔

"نہیں بیٹا آپ اسٹڈی میں بزی تھیں' خیر ہے اتنا تو ہو ہی جاتا ہے' چلو کھانا شروع کرو۔"

"مما میری دوست ہانیہ نے کہا ہے' وہ سنڈے کو ہمارے گھر آئے گی۔" نمرہ نے بڑی خوشی سے اطلاع دی۔

"ہاں بیٹا ضرور' کس ٹائم آئے گی' میں اچھی سی ریفرشمنٹ تیار کردوں گی۔"

"شام میں ہی آئے گی۔"

"بابا آپ سنڈے کو ہمیں کہیں آؤٹنگ پر لے کر چلیں۔" نریمان ٹھنکا۔ ثوبان نے کندھے اچکائے۔

"اب اس کی فرینڈ آرہی ہے تو میں کیا پروگرام بنا سکتا ہوں۔"

"تو اس کی فرینڈ آرہی ہے نا' ہم کیوں باؤنڈ ہو کر بیٹھیں۔" وہ چہک کر بولا تو سمیرا نے سرزنش کی۔

"اونہوں! نریمان' تم اپنے بابا کے ساتھ کوئی پروگرام بنالو' دوسروں کو اپنے پروگرام انجوائے کرنے دو۔"

"اوکے بابا' میں' آپ اور نمرہ آپی پھپھو کے گھر چلے چلیں گے' مما اور نمرہ بیٹھی رہیں گھر۔"

"اور ایمان؟" ثوبان نے ایمان کو مخاطب کیا جو بہت خاموشی سے بیٹھا تھا۔ اس نے کھانے سے بھی بہت جلد ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

"جی بابا؟"

"آپ کہیں نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں بابا' مجھے اپنا اسائنمنٹ بنانا ہے۔"

"کھانا کیوں چھوڑ دیا' کیا پسند نہیں آیا؟"

"بس مما' بھوک نہیں ہے۔" وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"اسے کیا ہوا ہے' چپ چاپ سا بھی ہے؟" ثوبان نے مستفسرانہ نگاہوں سے سمیرا کو دیکھا۔

"چپ چپ تو پچھلے کچھ دنوں سے ہی ہے' روز سوچتی ہوں' پوچھوں گی۔"

"تو پوچھا کیوں نہیں؟" ثوبان کا لہجہ اس بار کڑا تھا۔

"تو آپ پوچھ لیں' آپ کا کوئی فرض نہیں بنتا؟" اسے بھی غصہ آگیا' ثوبان کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کر ایمان کے پیچھے چلا گیا۔ وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے فوراً" جرنل بند کر دیا۔

"بابا' آپ.... آیئے۔" وہ گھبرا سا گیا تھا' ثوبان بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"آؤ' میرے پاس بیٹھو۔" وہ اسے لیے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

"کیا بات ہے' آپ پزل ہو رہے ہو؟"

"نہیں بابا' ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" وہ مزید گھبرا گیا تھا' ثوبان کو سچ مچ گہری تشویش ہوئی تھی' کچھ تو تھا جسے وہ چھپانا بھی چاہ رہا تھا اور چھپا بھی نہیں پا رہا تھا۔

"آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

"بس بھوک ہی نہیں تھی؟"

"بھوک کیوں نہیں تھی؟"

اس کی گہری کھوجتی نظروں سے ایمان مزید گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ ثوبان نے اسے بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے ساتھ لگایا تھا۔

"کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتاؤ بیٹا' اپنے بابا کو تو سب کچھ بتا دینا چاہیے نا' کیونکہ وہ آپ سے بہت بڑے ہوتے ہیں اور آپ سے زیادہ جانتے ہیں تو ایسا تو ہو سکتا ہے نا کہ آپ کے لیے ایک چیز بہت بڑا مسئلہ بنی ہوئی ہو اور بابا کے لیے سرے سے وہ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو اور اگر وہ مسئلہ ہو بھی تو ان کے پاس اس کا پراپر سلوشن موجود ہو۔"

"نہیں بابا' کوئی پرابلم نہیں ہے۔" ساتھ ہی اس

نے کاپی کے اوپر ہاتھ رکھ کر اسے چھپانا چاہا' ثوبان نے ہاتھ بڑھا کر وہ کاپی کھینچ لی تھی۔

"وہ بابا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔" وہ روکنا چاہتا تھا مگر ثوبان کے سامنے وہی صفحہ کھلا ہوا تھا۔

"مجھے شمائلہ آنٹی بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ میں ان کے گھر نہیں جانا چاہتا' وہ گندی باتیں کرتی ہیں' وہ کہتی ہیں' میں نے مما' بابا کو کچھ بتایا تو وہ مما کو میرے بارے میں غلط بتا دیں گی' مجھے ڈر لگتا ہے۔" آگے شاید ثوبان کے آنے پر ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ ثوبان سناٹے میں رہ گیا تھا۔ اس کی سوچنے' سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو گئی تھیں۔

"بابا! میرا کوئی قصور نہیں' میں نے کچھ نہیں کیا' وہ غلط۔۔۔" ایمان کی حد درجہ گھبرائی آواز نے اس کے سناٹے کو توڑا تھا۔ اس نے بے اختیار اسے ساتھ لگا لیا تھا۔

"آپ اتنا کیوں گھبرا رہے ہو بیٹا' آپ کیا سمجھتے ہو' آپ کے متعلق کوئی کچھ بھی بتائے گا' ہم مان لیں گے' میں یا آپ کی مما' آپ کے متعلق کسی بھی غلط بات کو فوراً" مان لیں گے۔ آپ کو ایسا لگا بھی کیسے' ہم اپنی اولاد کے خلاف کوئی بات سن بھی نہیں سکتے کجا اعتبار کرنا۔ مجھے تو بلکہ اس بات پر آپ سے ناراض ہو جانا چاہیے کہ آپ نے خود یہ بات ہمیں کیوں نہیں بتائی؟"

وہ ہلکے پھلکے انداز میں اسے ریلیکس کرنا چاہ رہا تھا۔ ورنہ اس کے اپنے دماغ میں تو آندھیاں چل رہی تھیں پھر اس نے بہلا پھسلا کر اس سے بہت سی باتیں اگلوائی تھیں' وہ بھی باپ سے شیئر کر کے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا' وہ اسے ڈھیروں' دلاسے دے کر' پر سکون ہو جانے کی ہدایت کر کے اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اسی پل سمیرا چائے لیے اندر داخل ہوئی تھی۔ ثوبان کو اس وقت چائے کی واقعی بہت طلب محسوس ہو رہی تھی' سو گرم کپ منہ سے لگا لیا تھا۔

"کیا ہوا' ایمان نے کچھ بتایا آپ کو؟"

وہ جواب دیے بغیر چائے پیتا رہا' سمیرا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا ثوبان' کیا کوئی سیریس بات ہے؟"

"بہت ہی زیادہ سیریس' تم سن پاؤ گی؟"

"کیا مطلب؟" اسے تو کرنٹ لگا تھا۔

ثوبان نے مختصراً" اسے جو کچھ بتایا تھا' اسے سن کر وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔

"ہر وقت بیٹیوں کی فکر میں ہلکان رہنے کے بجائے تھوڑی سی فکر بیٹے کی بھی کر لی ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ آتی' وہ عورت نجانے اسے کیسے کیسے اکساتی اور ورغلاتی رہی ہے' کیسے کیسے ڈراتی بھی رہی ہے۔"

"اس کی اتنی جرات' میں اس کا وہ حشر کروں گی۔۔۔"

"تم کچھ بھی نہیں کرو گی۔" ثوبان نے سختی سے اسے ٹوکا تھا۔

"وہ سارا الزام ایمان پر رکھ دے گی' وہ کوئی بچی عمر کی بچی نہیں ہے کہ تم اس پر چڑھ دوڑو گی اور وہ ڈر کر دبک جائے گی' یہ تحمل سے سوچ سمجھ کر حل کرنے والا مسئلہ ہے تم ایک کام کرو' اس کے شوہر کا نمبر مجھے لا دو۔"

"میں لعنت بھیجتی ہوں اس کی شکل پر' میں اب اسے کبھی دیکھنا نہیں چاہتی۔" وہ شدید اشتعال کی لپیٹ میں تھی۔

"اسی لیے کہا ہے تحمل سے' آرام سے' اپنا غصہ اتر جانے دو' اور ایمان کا وہاں جانا بالکل بند کر دو بلکہ کچھ دنوں کے لیے میں اسے نعمان کے ہاں بھجوا دیتا ہوں۔ تم مجھے نمبر لا دو۔ اس کے بعد میں تمہیں اگلا پلان بتاؤں گا۔" تیسرے دن وہ بڑی ہمت کر کے اس کی طرف آئی تھی۔ وہ حسب معمول خوش دلی سے ملی تھی۔

"بیٹھیں باجی اور بتائیں کیا لیں گی؟"

"چائے پلوا دو' خود بنانے لگی تھی' پھر سوچا دیں تمہارے ساتھ ہی پی لوں گی۔"

"ضرور' ابھی لائی۔" وہ مسکراتی ہوئی اٹھی تھی۔

"ایک منٹ' مجھے اپنا فون دو گی' مجھے اسی سے بات

کرنی ہے اور میرے فون میں کریڈٹ نہیں ہے۔"
اس نے اپنا فون سامنے کیا' شمائلہ اندر سے اپنا فون لے آئی۔ سمیرا نے اپنے فون سے نمبر دیکھ کر شمائلہ کے فون پر نمبر ملایا اور ای سے بات کی' شمائلہ اس دوران کچن میں جاچکی تھی۔ اس نے جلدی سے کال ختم کی اور فون بک کھولی A کے آپشن میں اسجد کا نمبر ڈھونڈ کر اپنے فون میں محفوظ کیا اور فون سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔
چائے پیتے ہی وہ اٹھ گئی تھی۔
"بیٹھیں نا باجی کچھ دیر اور....."
"نہیں اب چلوں گی۔" وہ باہر کی طرف بڑھی۔
"ایمان نہیں آیا' دو دن سے' مجھے اس سے کام تھا۔"
"ہاں وہ ثوبان کے ساتھ نعمان کی طرف گیا تو قاریہ اور نعمان نے اسے کچھ دن کے لیے روک لیا۔"
کتنی مشکل سے وہ مسکرائی تھی' یہ وہی جانتی تھی' شمائلہ کچھ بے چین سی نظر آئی تھی۔
"اوہ' میرے لیے بڑی پرابلم ہو جائے گی۔"
سمیرا نے گہری نگاہ اس پر ڈالی "واقعی" مگر اوپر سے کہا تو یہ کہ
"مجھے لسٹ بنا کر لادو' جو کچھ بھی منگوانا ہے میں ثوبان کے ساتھ جا کر لادوں گی۔"
شمائلہ کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا تھا "چلیں ایسا ہی کروں گی۔"
سمیرا نے بغور اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

ثوبان نے اسجد سے رابطہ کر کے اسے ہر بات بتائی تھی مگر ساتھ ہی ہر چیز کے مضمرات سے بھی آگاہ کیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق اسجد یہ سب سن کر بھڑک اٹھا تھا۔ ثوبان نے بہت نرمی اور ملائمت سے اسے ٹھنڈا کیا تھا۔ سمجھایا تھا کہ عورت بھی فطری تقاضوں سے مستثنیٰ نہیں ہے' اتنا لمبا عرصہ میاں کی جدائی میں وہ بھی بھٹک سکتی ہے۔ بہر حال ابھی وہ مکمل بھٹکی نہیں تھی' اس کے قدم بہکے ضرور تھے' وہ ان بہکے قدموں کو یہیں روک سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بیوی بچے وہاں بلوالے یا خود یہاں آجائے۔ ثوبان نے لگاتار تین دن اس سے رابطہ رکھا اور اسے سمجھاتا رہا' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اگلے ہفتے پاکستان آپہنچا' بیوی بچوں کے کاغذات بنوانے اور انہیں ساتھ لے جانے کے لیے۔

☼ ☼ ☼

"اگر اسجد بھائی انہیں یہاں سے نہ لے جاتے تو ہم یہاں کس طرح رہ سکتے تھے' ہمارا ایمان تو ایک جذباتی بھونچال میں پھنس جاتا' وہ عورت تو اسے اپنی عمر سے آگے کے تجربے سکھانے لگی تھی یہ تو پتا نہیں کون سی نیکی کام آگئی اور میرا بچہ بچ گیا۔" سمیرا نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ثوبان نرمی سے مسکرایا۔
"اللہ تعالیٰ کا لاکھ دفعہ شکر ہے کہ ہم بخیر و خوبی اس کرائسس سے گزر گئے۔ ہماری نیت نیک تھی ہم تو اس کے بھلے کے لیے اپنا بیٹا وہاں بھیجتے رہے اور وہ اس کا غلط استعمال کرنے لگی تھی۔"
"ہمارے اسلام کے واضح احکام ہیں' جوان لڑکے' لڑکی یا عورت کا تنہائی میں ساتھ بیٹھنا منع ہے' ہم اس کے اصولوں کے خلاف چل کر کیسے اپنے لیے اچھی امیدیں لگاتے ہیں' یہی ایمان دروازہ بجا کر باہر سے بھی سامان دے سکتا تھا نا' یہی صحیح اسلامی طریقہ بھی ہے' لیکن ہم ٹھوکر کھا کر سنبھلنے والے لوگ ہیں اور صد شکر کہ بڑے نقصان سے محفوظ رہے ہیں۔"
"یہ تو خیر آپ نے بڑے تحمل سے معاملے کو سلجھایا ہے ورنہ تو پتا نہیں میں تو کیا کر دیتی....."
"ہم جتنا چیختے' چلاتے' دنیا کو سناتے' شمائلہ کی بدنامی تو ہوتی ہی لیکن ہمارا بیٹا بھی بہت بدنام ہوتا۔ ابھی وہ جوانی کی پہلی سیڑھی چڑھا ہے' اسے بلندی پر جانے کے لیے بلند کردار اور ہماری رہنمائی کی بہت ضرورت ہے۔ اس طرح کے کرائسس کا شکار ہونے کے بعد تو اس کی صلاحیتیں تباہ ہو جاتیں' اس کا خود پر

"سے اعتماد ہی ختم ہو جاتا' میں نے یہ سب شائلہ کے لیے نہیں بلکہ ایمان کے لیے کیا ہے' مجھے اپنے بیٹے کو اس بدنامی سے' اس بھٹکے ہوئے رستے پر چلنے سے بچانے کے لیے ہر قدم سوچ کر اٹھانا تھا' شائلہ نے ٹھیک سوچا تھا کہ کام بھی ہو جائے گا اور یہ کم عمر لڑکا کسی کو بتا بھی نہیں پائے گا' کچھ عرصے میں اگر وہ خدانخواستہ گمراہ ہو جاتا تو وہ خود کسی کو پتا نہ چلنے دیتا۔"

سمیرا نے جھرجھری لی تھی۔

"توبہ کریں۔"

"صحیح بتا رہا ہوں۔ اس گمراہی میں جو چل پڑا' اسے منزل کہیں نہیں ملتی' وہ بھٹکتا ہی رہتا ہے۔"

"اگر وہ یہاں سے نہ جاتی تو....."

"تو ہم چلے جاتے' میں نے ہر آپشن پہ سوچ بچار کی تھی۔ اب تم بھی سوچ لو کہ بیٹیوں پر بے جا سختی اور بیٹے کو یوں کھلے عام ہر جگہ جانے کی اجازت دے دینا' نارمل رویہ نہیں ہے' اسے بدلو' بیٹوں کے آنے جانے کو بھی نوٹس کیا کرو مگر سختی سے نہیں پیار سے' محبت سے' بیٹیوں کو بھی اعتماد میں لے کر اچھے' برے حالات کا بتا کر سمجھایا کرو اور انہیں ان کی دوستوں کے ساتھ ملنے ملانے کی اجازت دے دیا کرو' تربیت اچھی کرو گی تو ان شاء اللہ رزلٹ بھی اچھا ہی آئے گا' ایمان کو دیکھ لو اس عورت کے ہر طرح سے اکسانے کے باوجود وہ نہیں بھٹکا' آگے بھی ان شاء اللہ اچھی امید رکھو اور صحیح اسلامی طرز طریق سے ان کی تربیت کرو۔"

"ان شاء اللہ۔" وہ اٹھتے ہوئی بھرپور انداز میں مسکرائی تھی۔

ایک عزم صمیم' ایک نئی امید کے ساتھ کہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں' ہم نے اپنے بچوں کو اچھا برا سمجھانا ہے' پھر اللہ کے سپرد کر دینا ہے' وہی انہیں ان بھیڑیوں سے محفوظ و مامون رکھے جو شیطانی جال بچھائے خوش رنگ ترغیبات سے اپنی جانب کھینچتے تو ہیں' پر ہماری دعائیں' ہماری نیکیاں' ہمارے بچوں کو بچا لاتی ہیں۔

سویرا فلک

"ازدواجی زندگی کے اسرار و رموز یونہی پیاز کی پرتوں کی طرح ہوتے ہیں ڈیئر۔ جو پرت در پرت ہی کھلتے ہیں۔" کافی کے مگ گھونٹ گھونٹ خالی کرتے ہوئے اس کے کانوں میں مسلسل گونجتے اس جملے نے اسے یہ ماننے پر مجبور کر دیا تھا کہ زندگی کے نشیب و فراز سے کشید کیا گیا علم، جسے لوگ تجربہ کہتے ہیں، نہ کوئی استاد سکھا سکتا ہے۔ نہ ہی کسی کتاب سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس وقت تو اس نے کیسے ہنسی میں اڑا دیا تھا اس بات کو۔

"توبہ ہے بھئی۔ کوکنگ کی کلاسز لیتے لیتے آپ کی تو گفتگو ہی اشیائے خورد و نوش کا مرکب بن گئی ہے' وہ جیسے ایک لطیفہ نہیں ہے کہ ایک ڈاکٹر کی شادی ہوئی تو اس نے اپنی دلہن سے کہا منہ کھولیے نبض چیک کرائیے۔۔۔ ہاں جی نیکسٹ۔" تب رمل بھی اس کے ساتھ ہنسنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"ہاں تو سچ ہی ہے بندے کا پروفیشن اس کی نجی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔"

اور آج یہ اپنی ہی کہی اس پر مزاح بات کا نہ لطف لے پا رہی تھی اور نہ ہنس پا رہی تھی۔ کیونکہ ٹھٹھرا دینے والی سردی میں وہ خود کو اونی شال میں لپیٹے ٹیرس کے ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے سیاہ تارکول سے بنی سنسان سڑک کو تکے جا رہی تھی۔ جہاں پندرہ بیس منٹ کے وقفے سے کوئی اکا دکا گاڑی گزرتی تو اسے زندگی کے رواں دواں ہونے کا احساس ہوتا۔ ورنہ رگ و جاں کو جامد کر دینے والی یخ بستہ ہوائیں اس کے جسم کے ساتھ ساتھ اب اس کے اعصاب بھی شل کرنے لگی تھیں۔ دل و دماغ میں اٹھتے بے شمار خدشوں اور واہموں نے دل و دماغ کو گویا سن کرنا شروع کر دیا تھا۔

"یا اللہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔" لمحہ بھر کو خیال لپکتا۔ پھر فوراً" ہی خود کو سرزنش کرتی۔

"اللہ نہ کرے۔ اچھا اچھا سوچنا چاہیے۔۔۔۔" مگر پھر دوسرے ہی پل نیا خیال دل کو دہلا دیتا "کہیں کوئی چکر وغیرہ تو۔۔۔۔"

"اوہ میرے خدا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے دکھتے سر کو تھام لیا۔ پلکیں نم ہو گئیں۔

"رحم کر دے میرے مالک۔"

اب تو بھوک کے مارے پیٹ میں اٹھتے وبال نے بھی اسے نڈھال کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ خود کو بار بار تسلیاں دیے جا رہی تھی۔

"بس تھوڑی دیر اور۔۔۔۔" مگر کلائی میں بندھی گھڑی کی مسلسل آگے بڑھتی سوئیاں اسے بار بار مایوسی کے دلدل میں دھکیل رہی تھیں۔ ہارن کی آواز نے جیسے ایندھن کا کام کیا اور اس کے تھکے ہوئے وجود میں نئی توانائی دوڑ گئی وہ لپک کر دروازے کی جانب بھاگی پھر کسی خیال کے تحت واپس پلٹ کر اپنے بیڈ روم میں آئی اور جلدی جلدی اپنے سنورے ہوئے بالوں کی آوارہ لٹوں کو ہاتھوں سے واپس جمایا۔ برگنڈی لپ اسٹک کا ایک اور کوٹ لگایا۔ اتنے میں ڈور بیل بجی تو وہ دوبارہ بھاگتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف آئی اور پھر ایک گہرا سانس لے کر دروازہ کھول دیا۔

"السلام علیکم۔" اس نے مسکراتے ہوئے اشعر کے ہاتھ سے بیگ لیا اور خود ایک جانب ہو گئی۔

"وعلیکم السلام۔" اشعر نے بنا اس کی جانب دیکھے

دھیرے سے سلام کا جواب دیا اور اپنا تھکا ہارا وجود لا کر لاؤنج میں رکھے صوفہ کم بیڈ پر لا کر گرا دیا۔ پھر گلے اور کانوں کے گرد لپٹا سیاہ مفلر اتار کر صوفے کے سرہانے ڈالا۔ دستانے اتار کر صوفے کی سیٹ پر رکھے اور گردن جھکا کر شوز اتارنے لگا تو مفلر اور دستانے اٹھاتے ہوئے تحریم کی مسکراہٹ ماند پڑ گئی۔ وہ جس کے لیے اتنے دل اور اہتمام سے تیار ہوئی تھی اس نے تحریم پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا یہ وہی اشعر تھا جو اس کے سادہ سے حلیے پر بھی تعریفوں کے پل باندھتا نہیں تھکتا تھا۔ ناقدری کے احساس نے تحریم کے دل کو دکھ سے بھر دیا۔ مگر پھر ایک بار یہ سوچ کر اپنی ہمتوں کو یکجا کیا کہ شاید اشعر اس وقت تھکا ہوا ہے اور شاید اسے بھوک بھی لگ رہی ہو۔ اسی سوچ کے ساتھ اس نے سر جھٹک کر کسی بھی منفی خیال کو دل میں

براجمان ہونے سے روکا اور کچن کی طرف چلی آئی۔ کھانا گرم کرنے کے لیے مائیکروویو میں رکھا اور ٹیبل پر پلیٹیں لگانا شروع کر دیں اتنے میں اشعر بھی فریش ہو کر ٹیبل پر آبیٹھا۔ تحریم نے مائیکروویو سے کھانا نکال کر سرونگ باؤل میں ڈالا اور ٹیبل پر رکھ کر خود بھی اشعر کے سامنے والی کرسی پر آبیٹھی۔

"آج یہ سوچ کر چائنیز مینو رکھا کہ ایک تو سردی زیادہ ہے اور مجھے لگا کہ شاید آج فرائیڈے ہے تو آپ جلدی آجائیں۔ مگر آپ آج بھی لیٹ ہو گئے۔ چائنیز ڈشز کا مزہ تو فریش کھانے میں ہی ہے مگر خیر بھوک لگے تو سب ہی اچھا لگتا ہے۔ مجھے بھی اتنی بھوک لگ رہی تھی مگر آپ کے بغیر کھایا نہیں جاتا۔ اسی لیے آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔" تحریم نے چائنیز رائس اس کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اپنی روداد بھی بیان کرنا چاہی اس امید پر کہ شاید وہ کہے کہ "آئی ایم سوری تمہیں میری وجہ سے انتظار کرنا پڑا یا پھر یہ کہ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" کوئی بھی ایسا جملہ جو تحریم کی دل جوئی کر دے مگر وہ یوں خاموش بیٹھا صبح کے باسی اخبار میں گم تھا جیسے وہ دیواروں سے باتیں کر رہی ہو۔ تحریم کا دل چاہا کہ وہ اشعر کے ہاتھوں سے اخبار لے کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور چیخ چیخ کر اس سے کہے اور پوچھے کہ "کیا یہ باسی اخبار تمہاری اس تحریم سے بڑھ کر ہے جس کے بنا تم جی نہیں سکتے تھے۔" مگر جب الفاظ کے بے وقعت ہو جانے کا ڈر ہو تو خاموشی میں ہی عافیت ہوتی ہے سو وہ خاموش رہی۔ پھر منچورین کی ڈش اس کی طرف بڑھاتے ہوئے گفتگو جاری رکھنے کی غرض سے بولی۔

"امی کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ چکر لگالو۔ میں بھی یہی سوچ رہی تھی کل صبح سے ہی چلی جاؤں۔ آپ آفس جاتے ہوئے چھوڑ دیجئے گا اور واپسی میں لے لیجئے گا۔ اکیلی سارا دن ویسے بھی بور ہی ہو جاتی ہوں۔ ٹھیک ہے نا....؟"

تحریم نے بہت امید بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا کہ اب تو شاید وہ بول ہی پڑے کہ "مت جاؤ.... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" مگر وہ ہنوز اخبار پر نظریں جمائے چائنیز رائس کھانے میں مگن تھا اور ایسا بے نیاز بیٹھا تھا کہ جیسے وہ کمرے میں تنہا ہو۔ تحریم کو اس کی یہ ہٹ دھرمی سخت کھلی مگر اس نے اپنے اندر عود آنے والے غصے کو بڑے صبر کے ساتھ پیا اور بہت تحمل سے گویا ہوئی۔

"اشعر میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔ بتائیں نا....؟"

"کیا مصیبت ہے انسان سکون سے کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ جب تم نے سارے پروگرام طے کر ہی لیے ہیں تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے ویسے بھی گھر میں تمہارا دل لگتا ہی کب ہے۔ سارا دن تھکے ہارے آؤ تو یہ کھانے کو ملتا ہے۔ کچے چاول۔ اوپر سے تمہاری بک بک...." وہ چیخ چیخ کر اٹھ کھڑا ہوا اور تحریم حق دق ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اور وہ اس کے بہتے آنسوؤں کی یکسر پروا نہ کرتے ہوئے پیر پٹختا ہوا بیڈ روم میں چلا گیا اور دروازہ بند ہونے کی زوردار آواز نے تحریم کے آنسوؤں کی رفتار اور تیز کر دی۔

☆ ☆ ☆

وہ سارے موسم محبتوں کے
میری متاع حیات ہیں، وہ پرانے لمحے
تمہاری یادیں، میرا اثاثہ
وہ ساری باتیں
تمہارا لہجہ
گئے ہوئے ماہ و سال سارے

وہ عہد رفتہ
ابھی بھی مٹھی میں قید ہیں
وہ سبھی ستارے
محبتوں کے وہ استعارے
وہ سب اشارے
کہ میں نے اب بھی
جدائیوں کے طویل زرد موسموں میں بھی
ان میٹھی تلخ ساری یادوں کو

اپنے دامن میں چین رکھا ہے
تو کیا ہوا ہے
جو تم نے سب کچھ بھلا دیا ہے

وہ کتنی ہی دیر بستر پر چپ چاپ لیٹی رہی۔ آنسو تھے کہ ابل ابل کر اس کی آنکھوں سے بہے چلے جا رہے تھے مگر وہ ضبط کی لگامیں تھامے سسکیوں کی آواز کو سینے میں ہی دبائے ہوئے تھی اور وہ جس کے لیے اس کا وجود ماتم کدہ بنا ہوا تھا' انجان بے حس بنا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا اور جب اسے لگا کہ اب دل سے ابھرتی درد کی لہریں حلق کے راستے باہر آجائیں گی تو وہ اٹھ کر لاؤنج میں چلی آئی۔ اور صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ تو آدھا سویا آدھا جاگا دماغ اسے بھٹکاتا ہوا یادوں کے بیاباں میں لے گیا۔ جہاں اس کی اور اشعر کی محبت کی داستانیں رقم تھیں۔ جہاں ہر سوان دونوں کی بھرپور چاہت کے نغمے گونجتے تھے۔ اس وقت زندگی قوس قزح کے رنگوں سے تعبیر تھی اور اسے اشعر کی محبت کے سنگ گزارے پل یوں سرمست رکھتے جیسے موسم بہار میں ہوا کی اٹکھیلیوں پر خوش رنگ و خوش گلو گل جھومتے ہیں۔

اشعر بہت اچھا گٹار بجاتا تھا۔ تحریم تقریباً" ہر ملاقات پر خصوصی فرمائش کر کے اس سے مختلف دھنیں سنتی تھی۔ اس کی آواز بھی بہت دل سوز تھی۔ وہ بخوشی تحریم کی فرمائش پوری کرتا تھا اور خاص کر ایک گیت اسے یہ کہہ کر ضرور سناتا تھا کہ یہ میرے دل کی آواز ہے تحریم۔ یوں سمجھ لو کہ یہ بول شاعر نے نہیں میں نے لکھے ہیں۔

پل پل دل کے پاس تم رہتی ہو
جیون میٹھی پیاس یہ کہتی ہو
ہر شام آنکھوں میں تیرا آنچل لہرائے
ہر رات یادوں کی بارات لے آئے
میں سانس لیتا ہوں' تیری خوشبو آتی ہے
اک مہکا مہکا سا پیغام لاتی ہے
میرے دل کی دھڑکن بھی تیرے گیت گاتی ہے

پل پل دل کے پاس تم رہتی ہو

اور تحریم اس کی آواز کے ساتھ اس کی آنکھوں میں موجزن محبت بھرے جذبے کو دیکھ کر گویا بے خودسی ہو جاتی۔ اس کو خود پر ناز ہونے لگتا ہے کہ کوئی اسے اتنا چاہتا ہے پھر وہ اشعر سے سوال کرتی۔

"اشعر کیا تم سچ مچ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو؟ کہیں یہ سب دھوکا تو نہیں ہے؟ کہیں میں کسی سراب کے پیچھے تو نہیں بھاگ رہی نا...؟" تب اشعر اس کی نرم و نازک ہتھیلی پر اپنی مضبوط گرم ہتھیلی رکھ کر کہتا تھا۔

"پاگل لڑکی! کیا میری محبت' میرے جذبے اتنے کھوٹے ہیں کہ تمہیں ان کی صداقت پر یقین ہی نہیں آتا۔ میں تو خود اپنی اس پاکیزہ محبت پر شادی نامی ملن کی مہر ثبت کرنا چاہتا ہوں مگر تم ہی مجھے روکے ہوئے ہو۔" یہ حقیقت تھی کہ تحریم نے اپنی پڑھائی مکمل ہونے سے پہلے رشتہ لانے سے منع کر رکھا تھا۔ وہ ماس کمیونی کیشن میں ماسٹرز کر رہی تھی اور یہ اس کا جنون تھا۔ ورنہ اب اشعر کو یونیورسٹی پاس آؤٹ کرنے کے بعد ملنے میں مشکل بھی درپیش آرہی تھی کیونکہ اشعر اس سے ایک سال سینئر تھا اور اب وہ باقاعدہ ایک چینل میں جاب کر رہا تھا۔ اور وہاں کی ٹف اور شفٹوں کی ڈیوٹیوں کے باعث اب ملاقات کے لیے وہ وقت نکالنا جو تحریم کو سوٹ کرے اس کے لیے مشکل بھی ہوتا جا رہا تھا۔ دوسرے اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ ملاقاتیں انہیں بدنام نہ کردیں اور اشعر کی یہی سوچ تحریم کے دل کو ڈھارس دیتی' اس کے دل میں اشعر کی محبت گہری اور صادق ہوتی چلی گئی کہ وہ اس کی عزت کرتا ہے اس کی بدنامی اور رسوائی سے ڈرتا ہے تو اس کی محبت بھی یقیناً" خالص اور کھوٹی نہ ہوگی۔

جب جذبے صادق ہوں تو امر ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ سو اللہ اللہ کر کے تحریم کا فائنل ایئر بھی مکمل ہوا تو اشعر نے تحریم کے اوکے کرنے پر اپنے گھر والوں کو بھجوا دیا۔ شروعات میں دونوں کو ہی روایتی' رسم و رواج اور روک ٹوک کا سامنا کرنا پڑا تاہم جلد ہی دونوں نے یہ

صبر آزما مرحلہ بھی طے کر لیا اور دونوں گھرانوں کے بڑوں نے یہی طے کیا کہ دونوں ماشاء اللہ سمجھ دار ہیں اور ایک درست راستے کا انتخاب کر کے اپنی اپنی منزل پانا چاہ رہے ہیں تو انہیں بھٹکنے سے بچانے کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ دونوں کے دل کی خواہش پوری کر دی جائے۔ دونوں ہی پڑھی لکھی اور معزز فیملیز سے تعلق رکھتے تھے۔ اشعر چھ فٹ کے نکلتے قد کے ساتھ کسرتی بدن کا مالک تھا۔ گندمی رنگت کے ساتھ ہلکے بھورے گھنگھریالے گھنے بال اور فرنچ داڑھی کے ساتھ وہ بہت اسمارٹ لگتا تھا۔

ساتھ ہی ویل مینرڈ' اعلا تعلیم یافتہ اور اچھی جاب کا حامل تھا۔ تو تحریم کے گھر والوں کو داماد کے روپ میں خاصا معقول لگا۔ سرو قد' نازک اندام اور صبیح چہرے پر کھڑے نقوش کی مالک تحریم کو دیکھ کر' اشعر کے گھر والے بھی اس کی پسند کی داد دیے بنا نہ رہ سکے۔ آخر کار دونوں کی دفاؤں کو منزل مراد مل ہی گئی۔

اشعر کے بڑے بھائی اسجد اور ان کی بیوی آسیہ نے دونوں کو شمالی علاقہ جات کے ہنی مون ٹکٹس بطور شادی کا تحفہ دیے تو دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا۔ موج مستی اور خوشی کے رنگوں سے سجا یہ وقت کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا اور اشعر کی چھٹیاں ختم ہونے کا وقت آگیا تو دونوں واپس لوٹ آئے' ان کے آتے ہی اسجد بھائی اور آسیہ بھابی نے دبئی واپس جانے کے لیے پر تول لیے۔

"چلو بھئی تحریم۔ اب ہمیں اجازت دو۔ اسجد کی چھٹیاں بھی ختم ہونے کو ہیں۔ ہم لوگ بھی بس خاص طور پر اشعر کی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ اب تم اپنا گھر سنبھالو۔" آسیہ بھابھی نے اس کے رخسار چومتے ہوئے کہا تو تحریم کا لہجہ گلوگیر ہوگیا۔

"تھینکس بھابھی۔ آپ نے بالکل بہنوں جیسا پیار دیا۔"

"اچھا جی۔ جٹھانی دیورانی نے ابھی سے گٹھ جوڑ کر لیا اور نند کو بھول گئی۔ وہ بھی ایسی معصوم نند۔" اشعر کی چھوٹی اور اکلوتی بہن رمشا بولی جو خود بھی شادی بھی شرکت کے لیے لاہور سے کراچی آئی تھی اور اپنا بھی سوٹ کیس لیے روانگی کی تیاری کیے کھڑی تھی۔

"ارے بھئی کیا کریں بیچاریاں۔ نند نام اور رشتہ ایسا ہے سنا نہیں تم نے نند از گند۔" رمشا کا شوہر علی ہنستے ہوئے بولا تو تحریم جلدی سے رمشا کی طرف آئی اور اسے گلے لگا کر علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"علی بھائی۔ میری نند بالکل ایسی نہیں۔ رمشا آئی ایم سو لکی کہ میرے سسرالی رشتے اتنے کیئرنگ اور لوونگ ہیں کہ یقین کرو لگتا ہی نہیں کہ میں یہاں دیورانی اور اور بھابھی بن کر آئی ہوں۔ سچ آپ لوگوں کی محبتوں نے تو مقروض کر لیا مجھے۔"

"بس پھر تیار رہنا کبھی بھی یہ قرض چکتا کرنا پڑ سکتا ہے۔" اسجد بھائی بھی ہنستے ہوئے بولے تو تحریم مسکرا دی۔

"ضرور۔ جب آپ لوگ چاہیں۔"

"بھائی فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔ چلیں راستے میں ٹریفک بھی جام ہوتا ہے۔ معلوم تو ہے آپ کو کراچی کا حال۔" اشعر جو اندر تیار ہو رہا ہے لاؤنج میں آتے ہی بولا۔

"اوہ ہاں واقعی۔ چلو بھئی اجازت دو۔" اسجد بھائی کھڑے ہوئے اور سوٹ کیس اٹھا لیا۔ تحریم بھی سب کے ساتھ دروازے پر چلی آئی اور سب کو مسکراہٹوں اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

☆ ☆ ☆

"تم بے وجہ اتنی ڈپریسڈ ہو رہی ہو۔ شادی سے پہلے اور بعد کی لائف میں تھوڑا تو فرق ہوتا ہی ہے اور ابھی تو بچے بھی نہیں ہوئے اس کے بعد تو اور بھی بدلاؤ آئے گا۔" رمل پچھلے پندرہ منٹ سے تحریم کو مسلسل سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تحریم اشعر کے روز بروز بدلتے رویے سے از حد پریشان اور دلبرداشتہ تھی۔ اسی لیے رمل کو فون کیا۔

"مگر ابھی تو سال بھر بھی نہیں ہوا اور اشعر کا یہ بدلتا روپ ..." اب تحریم باقاعدہ سسکنے لگی تو رمل چڑ سی

گئی۔

"توبہ ہے تحریم۔ تم کب بڑی ہوگی۔ دیکھو شادی کے بعد مرد عورت پریکٹیکل لائف میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان پر ذمہ داریوں کا بوجھ پڑ جاتا ہے۔ جیسے اشعر کو اب لازمی طور فکر معاش بھی لاحق ہو گئی ہے۔ تم کو بھی اب گھریلو ذمہ داریوں کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔"

"تو کیا شادی کے بعد محبت ختم ہو جاتی ہے؟ کیا اب اشعر کے دل میں میری کوئی جگہ نہیں؟ کیا اس کی زندگی میں میری کوئی اہمیت نہیں۔ کیا شادی کے بعد مرد بیوی کے روپ میں نوکرانی چاہیے ہوتی ہے؟"

تحریم ابھی بھی اپنے من کی کہے جا رہی تھی۔

"تحریم شادی کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ وہ اب ہر وقت محبت نام کی مالا جپتا رہے۔ تمہاری لو میرج ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب تم ساری عمر اس سے ایسے ہی طوفانی محبت اور بات بے بات اظہار محبت کی توقع رکھو پلیز حقیقت پسند بنو۔ یوں بے فضول سوچوں کا روگ پال کر تم اپنا ہر طرح سے نقصان کرو گی۔ گھر کا سکون اور تم دونوں کی صحت تباہ ہو جائے گی۔ تم دیکھو محبت اپنی جگہ، مگر جب دو لوگ ایک ساتھ رہنا شروع کرتے ہیں تو عادت واطوار اور شخصیت کی پرتیں کھل کر سامنے آتی ہیں جنہیں قبول کرنا ہی پڑتا ہے تاکہ شادی نامی بندھن قائم رہ سکے۔

میری جان شادی تو ہو گئی اب اس بندھن کو مضبوط کرنے کی کوشش کرو۔ اس کی پسند اور خواہش کے مطابق چلنے کی کوشش کرو۔ اس کا خیال رکھو اور میری ایک بات گرہ میں باندھ لو تحریم مرد کو عورت کے مہندی والے ہاتھ بھی اسی وقت اچھے لگتے ہیں جب وہ گھرداری میں مصروف ہوں۔ اب وہ تمہارا محبوب نہیں شوہر ہے اور تم اس کی محبوبہ نہیں بیوی ہو۔ سو چند اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو کہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔۔۔ اوہو شاید عباد اٹھ گیا۔ چلو میں بات کرتی ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔" بیٹے کے رونے کی آواز سن کر رملہ نے تیزی سے بات ختم کی اور لائن ڈسکنیکٹ کر دی اور تحریم موبائل کی تاریک ہوتی ہوئی اسکرین کو دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں مبتلا ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

جاتے دسمبر کے دن تھے۔ فضا میں شدید خنکی تھی۔ سرد ہوائیں بند دریچوں کو پار کرتے ہوئے جسم میں گھسی جا رہی تھیں۔ گو بستر سے نکلنے کا دل نہیں کرتا تھا اور کہر کے باعث صبح کا اجالا صبح کے ساڑھے چھ بھی صحیح طور پر اُمڈ کر نہیں آیا تھا۔ تاہم اشعر کے لیٹ ہو جانے کے ڈر سے وہ خود کو سحر خیزی کا عادی بنا رہی تھی۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ایک تو وہ نماز فجر ادا کرنے لگی دوسرا اب اس کے سارے کام صبح ہی نمٹ جاتے تھے۔ اس وقت بھی وہ بند کھڑکی کے شفاف شیشوں کے اس پار صبح کی تیزی سے پھیلتی ہوئی سپیدی کو دیکھنے میں مگن تھی۔ سبز پرنٹڈ اسکارف کو اس نے چہرے کے گرد سختی سے لپیٹ رکھا تھا۔ ٹھنڈ کی شدت کے باعث اس کا گلابی چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ اور سبز و سرخ کے اس حسین امتزاج نے اسے سرخ گلاب کی طرح دلنشین بنا دیا تھا کہ چہرے پر روشنی پڑنے کے باعث 'نیند سے جاگا اشعر اسے چند لمحوں مبہوت ہو تا دیکھتا رہ گیا۔ صبح کا دھندلکا اور تحریم کا چہرہ اسے ایک سا ہی لگا۔ پھر یکدم سات بجے کا اعلان کرتے الارم نے جیسے دونوں کو چونکا دیا۔'

"تحریم چونک کر مڑی تو اسے خود کو دیکھتا پا کر جانے کیوں گھبرا گئی۔ اتنی شدید سردی میں بھی اس کی ہتھیلیاں بھیگ سی گئیں۔

"اوہ آپ اٹھ گئے۔" اس کی آواز میں واضح کپکپاہٹ تھی۔

"ہاں بس خود ہی آنکھ کھل گئی۔ تم ناشتا بنا دو۔ میں تیار ہوتا ہوں۔" اشعر نے نظریں چرا کر کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر کچن میں چلی آئی۔ آج کتنے دنوں بعد تحریم نے اشعر کی آنکھوں میں اسی الوہی محبت کی چمک دیکھی تھی جس کو دیکھنے کو وہ ترس کر رہ گئی تھی۔ ذرا سی

توجہ نے جیسے اس میں نئی توانائی بھر دی تھی۔ بہت دنوں بعد اس نے اپنے موڈ میں خوشگوار تبدیلی محسوس کی۔

"آج فرنچ ٹوسٹ بنالیتی ہوں۔ اشعر روز ایک جیسا ناشتا کھا کر اکتا جاتے ہیں کچھ چینج ہو جائے گا۔" ذہن میں آئے خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اس نے جلدی سے دودھ انڈا اور چینی کے آمیزے کو پھینٹا اور فرائی پین چولھے پر رکھ دیا۔ پھر تیل ڈال کر آمیزے میں توس ڈپ کرکے فرائی کرنے لگی۔ ساتھ ہی کافی کے لیے دودھ رکھ دیا۔ اتنے میں اشعر کی چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی تو وہ تیزی سے کمرے کی طرف بھاگی۔

"کیا ہوا؟" اس نے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا ہونا رہ گیا۔ میری اسکائی بلو شرٹ کہاں ہے؟" اشعر وارڈ روب کے پٹ کھولے اس کے تمام خانوں میں نظریں دوڑاتا ہوا چلا رہا تھا۔

"یہیں رکھی ہے۔" تحریم نے آگے بڑھ کر بری طرح ٹھنسے ہوئے کپڑوں میں شرٹ کھینچ کر باہر نکالی تو اشعر نے شرٹ جھپٹ لی اور کھول کر تحریم کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

"ایسا لگ رہا ہے مٹکے میں سے نکالی ہے۔ تم سے یہ نہیں ہوتا کہ الماری سیٹ کر لو یا کپڑے استری کر کے لٹکا دو۔"

"میں نے گرین والی شرٹ کی تھی۔ لائیں یہ کر دوں ابھی۔" تحریم نے ہاتھ آگے بڑھا کر شرٹ لینی چاہیے تو اشعر نے شرٹ لہرا کر بیڈ پر پھینک دی۔

"تو ٹوٹے بٹن کے ساتھ۔ آج میری پریزنٹیشن ہے۔ بلو ہی شرٹ پہن کر جانی تھی اور تم جو ہفتوں استری اور بٹن جوڑنے کا کام نہیں کر سکیں۔ اب کیا کرو گی۔ جانے عورتیں کیا کیا کرتی ہیں۔ بڑے بڑے سسرال نمٹاتی ہیں۔ تمہارے اوپر نہ ساس سسر ہیں نہ نندوں اور دیوروں کی ذمہ داریاں۔ پھر بھی کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ بلکہ کام تو ہوتا ہی نہیں میڈم سے انہی چکروں میں لیٹ ہو جاتا ہوں۔ اب کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہوں ناشتا نکالو جا کر۔" وہ شرٹ پہن کر بال بنانے لگا تو تحریم نمکین پانی کو حلق سے اتارتی ہوئی کچن میں آئی تو کچن کی حالت دیکھ کر سر پکڑ لیا۔ وہ جلدی میں چولھے کی آنچ کم کیے بنا ہی کچن سے نکل گئی تھی۔ نتیجے میں آدھے توس جل کر خاک ہو چکے تھے۔ دودھ ابل کر چولھے پر پھیل چکا تھا اوپر سے ستم یہ کہ جلنے کی بو سونگھ کر اشعر سر پر پہنچ چکا تھا۔

"خوب... جانے ابھی اور کیا کیا نظارے دیکھنے کو ملیں گے تمہارے پھوہڑپن کے باعث۔" اشعر کی آنکھوں اور لہجے میں طنز کی شدید کاٹ تھی۔ تحریم نے خفت زدہ چہرے کے ساتھ ہونٹ بھینچتے ہوئے پہلے سے تلے ہوئے توس ٹرے میں رکھے اور پھٹی ہوئی کافی میں پتیلی کا بچا ہوا دودھ ڈالا کہ ٹرے اس کی طرف بڑھائی۔

"آپ کا ناشتا۔"

"اشعر نے ٹرے اس کے ہاتھ سے لے کر دہیں سلیب پر رکھی۔ توس کا بائٹ لیا تو توس ٹھنڈے بخ ہو چکے تھے۔ وہ سخت بد مزہ ہوا۔

"ایک تو روز وہی بریڈ۔ ایک گھنٹے میں ہی بھوک لگنے لگتی ہے۔ اوپر سے ٹھنڈے۔ کل سے میں ڈبل روٹی وغیرہ نہیں لاؤں گا۔ پراٹھے بناؤ۔" زندگی عذاب ہو گئی میری تم سے شادی کر کے۔" وہ آدھی کافی بڑے بڑے گھونٹ چڑھا کر پی گیا اور آدھی پٹخ کر فریج پر رکھی بائیک کی چابیاں اٹھا کر آفس کے لیے نکل گیا اور تحریم کو لگا جیسے اس کے جسم سے روح نکل رہی ہو۔ وہ بھلا کب عادی تھی اس کے اس لہجے کی۔ میٹھے بولوں اور نرم لہجے میں اسے مخاطب کرنے والا 'اسے اپنی زندگی' اپنی جان کہنے والا یہ وہی اشعر تھا جو آج اسے کہہ گیا تھا کہ تحریم کی وجہ سے اس کی زندگی عذاب ہو گئی ہے۔

وہ پورا دن اوندھے منہ بستر پر پڑی رہی۔ سسکتی رہی۔ سر تھا کہ پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے دراز سے ٹول کر پین کلر نکالی اور پانی کے ساتھ حلق سے اتار کر پھر آنکھیں موندلیں۔ تو جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور جب دوبارہ کھلی تو عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ سر ابھی

بھی بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے دکھتے سر کو انگلیوں کی پوروں سے سہلایا اور بالوں کو سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھوئے اور وضو کر کے باہر آ گئی۔ نماز ادا کی اور نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو لبوں سے لفظ نکلنے سے پہلے آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ سجدے میں گر کر چپ چاپ آنسو بہاتی رہی اور یہی تو رب کی شان ہے کہ وہ بن کہے دلوں کا حال جان لیتا ہے' درگزر کر دیتا ہے کہ اسے پچھتاوے کے آنسو بے انتہا پسند ہیں اور پھر بن مانگے عطا کر دیتا ہے۔ تحریم بھی چند لمحوں بعد پرسکون ہو گئی۔ طبیعت کو مزید فریش کرنے کی غرض سے اسے چائے کی طلب ہوئی تو اس نے جائے نماز لپیٹ کر الماری کے اوپر رکھی اور خود کمرے سے باہر نکلی تو اشعر کو لاؤنج میں ٹی وی دیکھتا پا کر چونک گئی۔

"لیٹ نائٹ گھر آنے والا آج مغرب سے پہلے کیسے آ گیا۔" تحریم دل ہی دل میں سوچنے لگی اشعر کو دروازہ کھلنے پر اس کی آمد کا احساس ہوا تو وہ جو صوفے پر نیم دراز تھا۔ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"میں آج چھٹی لے کر تین بجے ہی آفس سے آ گیا تھا۔ کچھ تھکاوٹ ہو رہی تھی۔ آیا تو تم سو رہی تھیں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تو ٹی وی دیکھنے بیٹھ گیا۔ سوچا اب اکیلا کیا چائے پیوں۔ اب تو طلب اور بھی بڑھ گئی ہے۔ شام ہو رہی ہے نا۔ ایسا کرتا ہوں آج کافی میں بناتا ہوں اور تم بتانا کہ کیسی بنی ہے۔ ٹھیک ہے ناں....؟"

وہ بغور اس کی جانب دیکھتا ہوا نارمل لہجے میں بول رہا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو تحریم نے جواباً" اس کی طرف دیکھنے کی بجائے نظریں مستقل زمین میں گاڑے رکھیں تو وہ اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔ اسے شانوں سے تھام کر صوفے پر لا بٹھایا اور خود اس کے زانو پکڑ کر بیٹھ گیا۔

تحریم کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں متورم ہو کر اور بھی دلکش لگنے لگی تھیں۔

"ناراض ہو ناں....؟" وہ ہاتھ تھامے پوچھ رہا تھا۔

تحریم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو وہ اور بے قرار ہو گیا۔ کچھ بھی تھا مگر تحریم اس کی چاہت تھی۔

"نہیں نا.... پلیز یار.... آئی ایم سوری۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ آفس میں کام کا لوڈ بہت بڑھ گیا ہے۔ نئے جی ایم آئے ہیں۔ چینل کی ریٹنگ گر رہی ہے۔ کئی لوگوں کو نکالا جا رہا ہے۔ مالکان اپنا غصہ اسٹاف پر ہی تو نکالتے ہیں۔ آج کل نوکری ملنا آسان تو نہیں۔ بس اسی پریشانی کے عالم میں ایسے بی ہیو کر گیا۔ پلیز معاف کر دو۔" اشعر نے اب باقاعدہ ہاتھ جوڑ لیے تو وہ اس کے ہاتھوں کو تھام کر ان پر ہی اپنا ماتھا ٹکا کر سسک پڑی۔

"غلطی میری بھی ہے۔ بٹ بلیو می۔ میں جان بوجھ کر یہ سب نہیں کرتی۔"

"آئی نو۔ تم کوشش کرتی ہو۔ چلو چھوڑو۔ ابھی ان باتوں کو رہنے دو۔ ایسے ہم لوگ اور ڈپریسڈ ہو جائیں گے۔ ایسا کرو میں کافی بناتا ہوں اور میں آتے ہوئے تمہاری پسند کے قیمے کے سموسے لایا تھا جلدی سے مائیکرو ویو میں گرم کر لو۔ بھوک بھی لگ رہی ہے۔" اشعر نے اس کے نم رخسار اپنی ہتھیلیوں سے خشک کیے تو وہ بھی مسکرا دی۔ پھر اشعر اٹھ کر کافی بنانے کچن کی طرف گیا تو تحریم نے شاپر سے سموسے نکال کر پلیٹ میں رکھے اور پھر مائیکرو ویو میں گرم کرنے رکھ دیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دونوں گرما گرم کافی اور سموسے کے مزے لے رہے تھے۔ اتنے میں ڈور بیل بجی تو تحریم نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اشعر ٹی وی میں مگن تھا۔ تحریم واپس آئی تو صائمہ اس کے ہمراہ تھی۔ وہ تحریم کی پرانی یونیورسٹی فیلو تھی اور خاصی باتونی تھی۔ ابھی بھی حسب عادت داخل ہوتے ہی شروع ہو گئی۔

"السلام علیکم اشعر بھائی۔ کیسے ہیں آپ؟"

"وعلیکم السلام۔ جی میں ٹھیک ٹھاک۔ آپ سنائیں۔" اشعر نے متانت سے جواب دیا۔

"چلیں جی آپ دونوں دوستیں باتیں کریں۔ تحریم میں ذرا ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ایک دو گھنٹے میں

واپس آجاؤں گا۔" اشعر نے چابیاں جیب میں ڈالیں اور باہر چلا گیا اور تحریم صائمہ کے ساتھ خوشگوار باتوں میں مصروف ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

تقریباً" رات آٹھ بجے اشعر واپس آگیا۔ تحریم بکھرا ہوا لاؤنج سمیٹ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اشعر کو بے ترتیبی بالکل پسند نہیں۔

"صائمہ کب گئی۔" اشعر نے تحریم کو مصروف دیکھ کر پوچھا۔

"بس ابھی آدھا گھنٹا پہلے۔ آپ کو پتا ہے کتنی باتونی ہے۔ یہ تو اس کے ہزبینڈ کا بار بار فون آرہا تھا تو نکلی۔"

"اچھا سنو آج کھانے میں کیا بنایا ہے۔ سچ پوچھو تو آج نہاری کھانے کا بڑا دل کر رہا ہے بلکہ رمشا کے ہاتھ کی نہاری بھی بڑی یاد آرہی ہے۔ بہت شاندار نہاری بنائی ہے وہ۔ کسی دن ریسپی معلوم کرنا اس سے اور تم بھی ٹرائی کرنا اور فی الحال جو بھی ہے فٹافٹ گرم کر کے لے آؤ۔ میرے تو پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔" اشعر نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو تحریم نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا؟" اشعر نے پوچھا۔

"وہ اشعر.... میں نے آج کھانا تو بنایا ہی نہیں صائمہ آگئی تو باتوں میں لگ گئی۔ اب مہمان کے ساتھ بیٹھنا تو پڑتا ہے آپ ایسا کریں کہ نہاری کا موڈ ہے تو وہی لے آئیں میں پھر کسی دن رمشا سے پوچھ کر بنالوں گی۔" تحریم نے آہستگی سے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اسے مشورہ دیا تو اشعر کے چہرے سے نرمی اچانک غائب ہو گئی۔

"کیا مطلب .... آج پھر کھانا نہیں۔ ابھی پرسوں ہی تو میں باہر سے کھانا لایا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ مشین لگا کر تھکن ہو گئی تو کھانا نہیں بنا سکیں۔

تحریم! میں باہر کے کھانے روز روز افورڈ نہیں کر سکتا اور نہ ہی یہ ہماری صحت کے لیے اچھا ہے۔ انڈے تو ہوں گے فریج میں۔ میں کل ہی آدھا درجن لایا تھا۔ آملیٹ بناؤ اور پراٹھے بھی میں جب تک آفس کی کچھ ضروری فائلز چیک کرلوں اور پلیز تم سارا دن گھر پر ہوتی ہو تو کم از کم کھانا تو بنا لیا کرو۔ ہم دو ہی تو بندے ہیں۔ عورتیں تو پورا پورا سسرال نمٹاتی ہیں۔ اور ایک تم ہو تم سے ڈسٹنگ ہوتی ہے۔ نہ الماریوں کی سیٹنگ اور نہ کھانا پکانا۔ مگر تم سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے تمہیں خود جو اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں۔ بلاوجہ میں ہی دیوار پر ٹکریں مارتا رہتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر منہ بنا کر بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا اور تحریم یہ سوچتے ہوئے فریج سے آٹا اور انڈے نکالنے لگی کہ یہ وہی اشعر ہے جو شادی سے پہلے اور شادی کے شروع میں خود کھانا کھلانے باہر لے کر جاتا تھا۔ یہ وہی اشعر ہے جو اس کے ہاتھوں کی تعریفوں اور اس کے سراپے کی نزاکتوں کی تعریفیں کرتا نہ تھکتا تھا اور آج اسے نوکرانی بنانے پر تلا ہوا ہے۔ ایک بار پھر اپنی ناقدری اور اشعر کی بیگانگی نے اس کی آنکھیں نم کر دیں جنہیں وہ بے دردی سے پونچھتے ہوئے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"آج سردی روز سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ سرد ہوائیں گویا جسم میں چبھے جا رہی تھیں۔ خود تحریم کو بھی سردی نے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اشعر کو ناشتا دے کر وہ خود لحاف میں دبک کر بیٹھ گئی تھی ساتھ میں ٹی وی آن کر لیا۔ کوکنگ شو میں ہری مرچوں والے قیمے کی ترکیب بتائی جا رہی تھی۔ تحریم نے بغور ترکیب دیکھی پھر اسے خیال آیا کہ قیمہ جلدی بھی بن جائے گا۔ فریزر سے قیمہ نکال کر لائی اور پیاز کاٹ کر براؤن کیا۔ پھر مسالے اور کٹے ٹماٹر ڈال کر بھونا اور پھر قیمہ شامل کر کے تھوڑا پانی ڈال کر رکھ دیا۔ اتنے میں موبائل بجا تو وہ چائے کا کپ اٹھا کر لاؤنج میں ہی آبیٹھی۔

"السلام علیکم۔ جی کیا حال ہیں۔" تحریم نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا تو صائمہ اس کی بیٹھی ہوئی آواز سن کر چونک گئی۔

"وعلیکم السلام۔ کیا ہوا ڈیر طبیعت ٹھیک نہیں لگ

رہی تمہاری۔" صائمہ کے لہجے میں فکر تھی۔
"ہاں بس سردی کا شکار ہوں۔" تحریم نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا۔
"تو پھر تم آرام کرو۔ بعد میں بات کریں گے۔" صائمہ نے کال ڈراپ کرنا چاہی۔ "ارے نہیں یار۔ کون سا آرام۔ کہاں کا آرام شادی ہو گئی۔ بس آرام ختم کھانا بنا رہی ہوں۔"
"ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ عیش تو بس میکے کے ہی ہوتے ہیں۔ مگر طبیعت خراب ہے تو کھانا باہر سے منگوا لیتا تھا۔ دو ہی تو بندے ہو۔" صائمہ نے حسب عادت مشورے سے نوازا۔
"اشعر بھی یہی کہتا کہ دو ہی بندے تو ہیں کھانا گھر میں بناؤ۔ میں کھانا افورڈ نہیں کر سکتا روز روز باہر کا۔" تحریم نے فوراً" دل کا بوجھ ہلکا کیا۔
"لو یہ کیا بات ہوئی۔ اشعر بھائی کی اچھی خاصی تنخواہ ہے اور ابھی کون سا بچے ہیں کہ اخراجات کی بھرمار ہو گئی ہو۔" صائمہ یونہی تحریم کی طرف داری کر رہی تھی۔
"مگر اشعر کہتے ہیں کہ آج بچاؤں گا تو کل کام آئے گا۔ اور یہ کہ صحت پہ بھی منفی اثر پڑتا ہے بازاری کھانوں سے۔" تحریم بیٹ بھی ہلکا کر رہی تھی۔
"اچھا اور جو ابھی تمہاری صحت خراب ہے۔ تمہیں آرام کی ضرورت نہیں کیا' یہ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں ہم عورتیں انسان نہیں مشین ہیں کام کرتے رہیں بس اور بس بیمار ہونے کی تو ہمیں اجازت ہی نہیں کہ دوا دارو یہ خرچہ الگ اور جو کہیں تیمارداری کرنی پڑ جائے تو ماتھے کے بل گنتے رہ جاؤ بس۔"
صائمہ' تحریم سے بھرپور ہمدردی کر رہی تھی۔ کیونکہ اگر وہ تحریم کی ہاں میں ہاں نہ ملاتی تو اس کا وقت کیسے گزرتا۔ آخر پیکیج بھی تو حلال کرنا ہوتا ہے۔ اب جو اگر وہ صحیح اور غلط کا فرق بتانے بیٹھ جاتی تو تحریم 'صائمہ کا وعظ یونہی گھنٹوں تھوڑی سنا کرتی۔ ویسے بھی انسانی فطرت ہے جو ہماری نظر سے دنیا کو دیکھے 'وہی [illegible] سے عزیز اور قریب لگتا ہے۔ تحریم کو بھی صائمہ کی دوستی اسی لیے خوب بھاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم امی۔ کیسی ہیں آپ؟" رمل اسکائپ پر آن لائن ہوئی تو امی کھل اٹھیں۔
"ٹھیک ہوں بیٹی تم کہاں ہو۔ اتنے دنوں بعد آن لائن آئیں۔"
"بس امی۔ عباد کے ہاف ایرلی پیپرز ہو رہے تھے۔ آپ کو تو پتا ہے او لیولز کی پڑھائی کتنی ٹف ہوتی ہے۔ اور پھر بچوں کے ساتھ جب تک خود نہ لگو۔ کہاں بیٹھتے ہیں پڑھنے۔" آپ بتائیں کچھ کمزور لگ رہی ہیں؟ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟" رمل نے بغور ماں کے چہرے کو دیکھتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا۔
"کیا کروں بیٹا ماں ہوں نا اولاد کی طرف ہی دھیان رہتا ہے۔ دن بھی مہینے لگتے ہیں۔ میں ٹھیک ہوں بس۔ تحریم کی پریشانی کھائے جاتی ہے۔ رمل بیٹا اب تم ہی اسے سمجھاؤ۔ ابھی تو چھ ماہ بھی نہیں ہوئے نہ سسرال کا جھنجھٹ ہے نہ فی الوقت بچوں کا بکھیڑا۔ ایسے میں بھی اس سے گھر سنبھالا نہیں جاتا۔ وہ تو اشعر شریف بچہ ہے نہیں تو آ کر براہ راست شکایت کرے تو کیسی شرمندگی اٹھانا پڑے گی مگر یہ لڑکی ہے کہ نہ اپنی غلطی مانتی ہے نہ کچھ سمجھتی ہے۔" امی کے لہجے میں غصے کی جھلک تھی۔
"ارے امی یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تھوڑی ہے کہ آپ پریشان ہو جائیں۔ آہستہ آہستہ سب سیٹ ہو جائے گا۔ آپ کو پتا ہے وہ ہم سب کی لاڈلی رہی ہے۔ گھر کے کام کہاں کیے ہیں اس نے۔ پھر شروع میں ایڈجسٹ ہونے میں وقت لگتا ہے۔"
"ہاں بیٹا بس کچھ میری کوتاہی بھی تھی کہ چھوٹی ہے کہہ کر کہہ کر اسے کام کی عادت ہی نہ ڈالی۔ شاید اسی لیے اب یہ سب اسے بوجھ لگ رہا ہے۔ سچ ہی تو ہے ماؤں کا حد درجہ لاڈ پیار ہی اولاد کے بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔" امی نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔
"میری پیاری امی۔ ایسے مت کہیں۔ آپ کا پیار

محبت تو ہمارے لیے قیمتی ترین اثاثہ ہے۔ کچھ مزاج کی بھی بات ہوتی ہے۔ اب دیکھیں کہ آپ نے مجھ سے بھی کب کوئی کام کروایا۔ مگر آپ کا پتا ہے کہ مجھے کوکنگ اور گھر سجانے کا کیسا جنون تھا۔ سو زبردستی آپ کے ساتھ کچن میں کھڑے ہو کر کوکنگ پروگرامز دیکھ دیکھ کر ہی سب سیکھ لیا تھا۔" رمل نے دھیرج سے کہا۔

"ہاں بیٹا تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر شادی کے بعد خود کو بدلنا پڑتا ہے۔ ذمہ دار بننا پڑتا ہے۔ ورنہ عورت کی لاپروائی گھر کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے۔" امی کے لہجے میں ہنوز تشویش تھی۔

"آپ پلیز پریشان نہ ہوں امی۔ بلاوجہ ٹینشن سے آپ کا بی پی ہائی ہو جائے گا۔ پھر ابو کو کون سنبھالے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں بات کروں گی تحریم سے۔" رمل نے ماں کی ڈھارس بندھائی تو امی کو کچھ حوصلہ ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ وہ تمہاری بات سنتی بھی ہے۔ اچھا بتاؤ میرا گڈا کہاں ہے۔"

"وہ سو رہا ہے امی۔ آج صبح پارک لے گئی تھی خوب کھیلا تو تھک کر سو گیا۔ اٹھے گا تو بات کرواؤں گی۔ اچھا امی اب میں چلتی ہوں۔ عباد کے لیے پزا بنانا ہے۔ آج اس نے فرمائش کی تھی۔" رمل نے کہا تو امی نے بھی بہت ساری دعائیں دے کر اسے خدا حافظ کہہ دیا۔

☆ ☆ ☆

"ارے یار اشعر؟ کدھر ہے بھائی۔ تو تو شادی کے بعد بیوی کو ہی پیارا ہو گیا۔" اشعر میٹرو میں سودا خرید رہا تھا کہ اس کا پرانا دوست معیز پیچھے سے آواز دیتا چلا آیا وہ اس کا کالج اور یونیورسٹی فیلو تھا۔ وہ خود بھی اسے دیکھ کر خوشی سے چونکا پھر گلے لگ گیا۔

"ارے میرے یار۔ واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز۔ میں تو یہیں ہوں۔ تو سنا انٹرن شپ کے بعد تو غائب ہی ہو گیا۔ نمبر بھی بند جانے لگا تھا۔"

"بس یار۔ ایک بہت اچھی جاب آفر ہو گئی تھی اسلام آباد میں۔ تو وہیں تھا۔ آج کل بہن کی شادی پر آیا ہوں اور موبائل چوری ہو گیا تھا تو پرانے کانٹیکٹس کے نمبرز بھی مس ہو گئے۔ تو سنا کہاں ہے۔ کیسی چل رہی ہے زندگی؟" معیز نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"میں بھی ادھر پرائیویٹ چینل میں ہوں اور باقی زندگی بھی ٹھیک ہی چل رہی ہے۔" اشعر نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو معیز چونک گیا۔

"ایسا کرتے ہیں۔ تو اپنی خریداری مکمل کر۔ کافی پیتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر سکون سے بات کرتے ہیں۔"

"اوکے۔ خریداری بس ہو ہی چکی ہے۔ بل پے کر دیں۔ پھر چلتے ہیں۔" اشعر نے کہتے ہوئے ٹرالی گھسیٹی۔ کاؤنٹر پر پیمنٹ کر کے منٹ کی پھر دونوں کیفے ٹیریا میں آ بیٹھے۔ اشعر نے کافی آرڈر کی تو معیز نے سینڈوچز بھی منگوا لیے۔ تھوڑی دیر میں آرڈر ان کی ٹیبل پر موجود تھا۔ معیز نے سینڈوچز کی ٹرے اشعر کی طرف بڑھائی اور خود بھی ایک بائٹ لے کر بات دوبارہ شروع کی۔

"اب بتا۔ یار تیری تو پسند کی شادی تھی۔ پھر یہ اداسی کیوں؟"

"مت پوچھ بھائی۔ میں تو پھنس گیا ہوں شادی کر کے۔ بہت پریشان ہوں۔ ایسا لگتا ہے دن رات کا سکون چھن گیا ہے۔" اشعر نے قدرے افسردگی سے کہا۔

"مگر کیوں؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ تیری اور تحریم بھابھی کی تو لو میرج تھی ناں۔۔۔؟" معیز نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں یار تھی۔ مگر انسان کے اصل اوصاف تو جب ہی سامنے آتے ہیں جب میاں بیوی ساتھ رہ کر پریکٹیکل لائف کا آغاز کرتے ہیں۔ تحریم بہت لاپروا ہے۔ اس نے شادی کے اصل مفہوم سمجھے ہی نہیں۔ وہ سمجھتی ہے شادی بس گھومنے پھرنے 'ہوٹلنگ کرنے کا نام ہے۔ بطور بیوی اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں

اگر اسے احساس دلانے کی کوشش بھی کروں تو وہ مجھے روایتی ' جابر ' رعونت پسند شوہر کے خطابات سے نوازنے لگتی ہے۔ ہمارے درمیان بہت لڑائی جھگڑے رہنے لگے ہیں۔ تو ہی بتا؟ بندہ گھر کس لیے آتا ہے سکون کے لیے۔ مگر بکھرا ہوا گھر ' کچا پکا کھانا... میرا تو دل اچاٹ کر دیا ہے اس عورت نے۔" اب اشعر کے لہجے میں غصے کی جھلک بھی تھی۔ جس سے معیز کو صورت حال گمبھیر ہونے کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ اس لیے اس نے نرمی سے اشعر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تیری بات سولہ آنے درست ہے۔ مگر یار تجھے ان کو تھوڑا ٹائم دینا چاہیے۔ دیکھ ہر بندے کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ کچھ لوگ معاملہ فہم ہوتے ہیں ' کچھ حساس کچھ کم کھرے۔ تم غصے کے بجائے پیار محبت اور توجہ سے چلو تو نتائج تمہارے مطلوبہ ہوں ورنہ غصہ معاملات کو مزید الجھا دے گا۔ آہستہ آہستہ ان کو اعتماد میں لے کر اپنی پسند سے آگاہ کرو۔ سب کچھ ایک دم اچھا ہو جانے کی توقع مت رکھو ان شاء اللہ سب سیٹ ہو جائے گا۔"

"معلوم نہیں یار۔ مجھے تو کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ مجھے اس کی نیچر کمپرومائزنگ نہیں لگتی اور عجیب احمقانہ اور بچکانہ قسم کی سوچیں ہیں اس کی۔ اب یہی دیکھ وہ سمجھتی ہے کہ اسے بیوی نہیں نوکرانی بنا کر لایا ہوں۔" اشعر کے لہجے میں تاسف تھا۔

"اشعر یار دراصل اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں۔ ہم مردوں کا... مطلب ہے ہم میں سے کچھ مرد ایسا رویہ ہی اپناتے ہیں تو مردوں کی بے چاری پوری قوم ہی بدنام ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تم کو سمجھا رہا ہوں کہ پیار اور نرمی سے اپنا مدعا سمجھاؤ۔ انہیں یقین دلاؤ کہ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ذمے داری کا احساس ضرور دلاؤ مگر لاپروائی کے طعنے مت دو۔" معیز نے رسانیت سے کہا اور سینڈوچ ختم کر کے کافی کے سپ لینے لگا۔ اسی لمحے اس کے موبائل کی بیل بجی تو وہ ایکس کیوز کرتا ہوا کیفے سے باہر چلا گیا اشعر کافی پیتے ہوئے معیز کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"امی امی پلیز مت روئیں۔ سنبھالیں اپنے آپ کو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" تحریم ہاتھ میں فون لیے روئے جا رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ اشعر آفس جانے کے لیے تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہ نہا کر باہر آیا تو روتی ہوئی تحریم کو دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف آیا۔

"کیا ہوا تحریم۔ کیوں رو رہی ہو۔ آنٹی انکل تو ٹھیک ہیں۔" وہ روتی بلکتی تحریم کو دیکھ کر بری طرح گھبرا گیا۔

"وہ... وہ رمل..." تحریم کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا رمل کو...؟" اس نے تحریم کو شانوں سے تھاما۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

"رمل کے ہاتھ کا فریکچر ہو گیا ہے۔ اس کی کولیگ کا فون آیا تھا۔ امی کے پاس وہ جب سے روئے جا رہی ہیں۔"

"اوہ۔ چلو تم تیار ہو جاؤ۔ میں بھی ذرا تیار ہو کر آتا ہوں۔ امی کے پاس چلتے ہیں۔ میں وہیں سے آفس نکل جاؤں گا۔ اور یہ فون ادھر دو۔" اس نے تحریم کے ہاتھوں سے موبائل لے لیا۔

"آنٹی آپ فکر نہیں کریں۔ ہم دونوں بس ابھی پہنچتے ہیں آپ کے پاس۔ پلیز ڈونٹ وری اینڈ ٹیک کیئر یور سیلف۔" اس نے تحریم کی امی کو تسلی دے کر خدا حافظ کہا اور تحریم کو نرمی سے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے بال سنوارتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

"میری جان پلیز خود کو سنبھالو۔ ورنہ آنٹی انکل کو کون دیکھے گا۔ اور تم فکر نہیں کرو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم بھی بس چل رہے ہیں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر ذرا فریش ہو جاؤ۔ باہر اچھا نہیں لگے گا۔ میں بس یہ چائے ختم کر لوں۔" اس نے ٹیبل پر رکھی چائے کی طرف اشارہ کیا اور تحریم کو تیار ہونے کا اشارہ کیا تو وہ چند لمحوں نم آنکھوں سے اشعر کا کیئرنگ روپ

دیکھتی رہی پھر دیر ہونے کے خیال سے اثبات میں سر ہلاتی ہوئی بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ امی کا گھر ویسے بھی زیادہ دور نہیں تھا کچھ اشعر نے بھی اسپیڈ تیز رکھی تو وہ محض دس منٹ میں ہی امی کے گھر پہنچ گئے۔ امی تحریم کو دیکھتے ہی اس کی جانب لپکیں۔

"تحریم..... میری رمل....."

"سب ٹھیک ہو جائے گا امی۔ ابو کہاں ہیں ؟" تحریم نے ماں کو بچوں کی طرح گلے لگالیا۔

"تمہارے ابو سو رہے ہیں بیٹا۔ تمہیں پتا ہے کہ نیند کی دوائیں لیتے ہیں" انہوں نے اپنے رخساروں کی نمی ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے کہا بیٹی اور داماد کو دیکھ کر ان کا دل کچھ شانت ہوا تھا۔ اپنے تو بہر حال اپنے ہوتے ہیں۔

"آپ ابھی انہیں کچھ نہ بتائیں آنٹی۔ ویسے ہی وہ ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ رمل کو یہاں بلوالیں۔" اشعر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"بیٹا اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں یہی کرتی۔ چھوٹے بچے کا ساتھ ہے پھر فریکچر ہے کہنی کی ہڈی ٹوٹی ہے۔ وہ کہاں بتا رہی تھی اس کی کولیگ نے فون کر دیا۔ پھر تمہیں مالی حالات کا بھی خوب اندازہ ہے۔ آج کل جہاز کے ٹکٹ کتنے مہنگے ہیں اور میں تمہارے انکل کو ایسی حالات میں چھوڑ کر کیسے جاؤں۔ میری تو کچھ سمجھ نہیں آرہا کیا کروں۔" امی کی آواز پھر بھرانے لگی۔

"آنٹی! ایسا کرتے ہیں۔ میں تحریم کو وہاں بھجوا دیتا ہوں۔ بہن سے اچھی کیئر کون کرے گا۔ آپ کی تو خود حالت سفر والی نہیں ورنہ تحریم ابو کے پاس رہ جاتی۔ پھر مجھے پندرہ بیس دن بعد آفیشل ٹور کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہی ہے۔ کچھ دن ٹھہرنا ہی پڑے گا۔ تو واپسی پر تحریم کو لے آؤں گا۔ اور اگر رمل بہتر ہوئی تو اسے بھی ساتھ ہی لے آئیں گے۔ آپ بھی مل لیجئے گا۔" اشعر جلدی جلدی پروگرام سیٹ کر رہا تھا۔ تحریم حیرت سے اسے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے اتنا کیئرنگ ہوتا دیکھ رہی تھی۔ امی نے تو بڑھ کر ماتھا ہی چوم لیا۔

"اللہ نے بیٹا نہیں دیا مگر تم جیسا داماد دے کر بیٹے کی کمی پوری کردی۔"

"آنٹی ایسی باتیں مت کریں۔ آڑے وقت میں اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔ اور میں آپ کا بیٹا ہی تو ہوں۔ بس آپ دعاؤں میں یاد رکھیں۔ اور تحریم ہم ابھی گھر چلتے ہیں۔ تم پیکنگ کر لینا میں اتنے میں ٹرین کے ٹکٹ بک کروالوں گا تاکہ تم جلد از جلد پہنچ سکو۔ ٹھیک ہے آنٹی۔ اللہ حافظ۔" وہ تحریم سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو امی نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"خوش رہو بیٹا۔"

گھر واپس پہنچتے ہی اشعر محض پانی کا ایک گلاس پی کر نکلنے لگا تھا کہ تحریم نے اسے روکا۔

"تھینک یو فار سپورٹنگ از۔"

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟ میں اجنبی ہوں کیا؟ یار اپنے ہوتے کس لیے ہیں اور پھر میاں بیوی کا تو سکھ بھی سانجھا اور دکھ بھی۔" اشعر نے نرمی سے اس کے گال تھپتھپائے تو اسے لگا کہ اس کی روح تک سرشار ہو گئی ہے۔ وہ بہت دنوں بعد کھل کر مسکرا دی۔

"ناؤ ہری اپ۔ تیاری کرو۔" اشعر نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اشعر بائیک کی چابیاں اٹھا کر باہر نکل گیا تو وہ بیڈ روم میں آکر جانے کی تیاریوں میں جت گئی۔

☼ ☼ ☼

رمل شادی ہو کر اسلام آباد گئی تھی۔ اس کا شوہر عمار بحریہ کالج اسلام آباد میں لیکچرار تھا۔ رمل اور عمار کی شادی کے فقط سال بھر بعد ہی عباد ان کی زندگی کو مکمل کرنے دنیا میں آگیا تھا۔ رمل حساس اور خوابوں سے پیار کرنے والی لڑکی تھی۔ جبکہ عمار ایک اصول پسند اور خاموش مزاج شخص تھا۔ وہ رمل کی ضرورتوں کا خیال رکھتا تھا تاہم محبت کے باقاعدہ اظہار کے معاملے میں بہت سے شوہروں کی طرح کنجوس تھا۔ تاہم زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ عباد میں مصروف ہو کر رمل نے عمار کی خشک طبیعت سے بھی سمجھوتہ کر لیا تھا۔

چار برس کی عمر میں عباد کی اسکولنگ شروع ہوئی تو

رمل کی ذمہ داریوں میں گویا یک بیک اضافہ ہو گیا۔ اور زندگی ایک لگے بندھے روٹین کے تحت چلنے لگی اور جب انسان کے دن رات ایک جیسے گزرنے لگیں تو وہ اکتانے لگتا ہے اسے مزید چلتے رہنے اور سبک رفتاری سے چلتے رہنے کے لیے تبدیلی اور تفریح کا ایندھن درکار ہوتا ہے۔ رمل کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا۔ اس پر بے زاری طاری رہنے لگی۔ تب رمل کو اپنی زندگی میں موجود خلا کا زیادہ احساس ہونے لگا۔ گھر میں رہنے والی عورت کو اپنا شوہر ہی اپنا ہمدم اور دوست کی صورت میں نظر آتا ہے مگر دوستی یاری بھی محبت کی طرح یک طرفہ نہیں ہو سکتی' اگر ہو تو راحت کے بجائے رنج پہنچاتی ہے۔ عمار میں اپنا دوست تلاشنے کی سعی کرتے ہوئے رمل اگر کبھی بھولے سے بھی اس کی عدم توجہ کا شکوہ کرتی تو وہ ہر بار اسے ایک ہی جواب دے کر خاموش کروا دیتا۔

"رمل کیا محبت کے اظہار کے لیے ہر وقت آئی لو یو کی مالا جپنا ضروری ہے؟ کیا میں تمہارا خیال نہیں رکھتا؟ تمہاری ضرورتیں پوری نہیں کرتا؟ کیا یہ سب محبت کا احساس دلانے کو کافی نہیں؟"

اور رمل چاہ کر بھی اسے یہ نہ کہہ پاتی کہ کیا ہے عمار اگر آپ میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر' ننگے پاؤں شبنمی گھاس پر چلتے ہوئے یہ کہہ دیں کہ تم میرا جیون ہو اور کبھی سر شام مہکتے ہوئے گجرے کلائیوں میں ڈال کر یہ اقرار کریں کہ تم نے میری زندگی کو بھی ان پھولوں کی طرح مہکا دیا ہے اور ازدواجی زندگی میں خاصے کی چیز تو یہی ہے کہ مرد عورت کی فطرت کو نہیں جان پاتا اور عورت مرد کے مزاج کے پہلو ہی تلاشتی رہتی ہے۔

رمل کے دل کی چاہ اس کے دل کا ملال بن کر بڑھتی رہی مگر وہ جتنی شدت سے محبت کا اظہار سننے کی منتظر تھی اتنی ہی خود ایسا کرنے سے گریزاں تھی کیونکہ اسے لگتا تھا کہ عمار اسے نفس پرست نہ سمجھے۔ سو وہ خاموش رہتی اور زندگی کی گزرتی گھڑیوں کا حساب لگاتی رہتی کہ کتنی محبت میں گزری اور کتنی اس کی طلب میں اور یہی مشرقی بیویوں کا المیہ ہی کہ شوہر کی محبت کی سود و زیاں کا حساب لگانے میں وہ اتنی محو ہو جاتی ہیں کہ خود محبت کرنا ہی بھول جاتی ہیں۔

رمل کو عمار ایک روبوٹ کی مانند لگنے لگا تھا جو اللہ کی طرف سے اس کی دیکھ ریکھ کے لیے بھیجا گیا ہو اور جو شے اللہ کی طرف سے آتی ہے' اسے اللہ کی طرف تو لوٹ کر جانا ہوتا ہے۔ سو عمار کا بھی بلاوا آ گیا۔ عباد پانچ سال کا تھا تو ایک دن کالج سے واپسی پر عمار کی کار کو ٹرک نے ایسی ٹکر ماری کہ وہ اس حادثے میں جانبر نہ ہو سکا۔ رمل کو لگا کہ اس کی دنیا ہی پلٹ ہو گئی ہے۔ جیسے پوری کائنات گھوم گئی ہو۔ پلٹ گئی ہو۔ جب شریک حیات یوں بیچ سفر میں چھوڑ جائے تو یونہی لگتا ہے کہ زندگی میں آکسیجن کی کمی ہو گئی ہے اور آکسیجن نہ ہو یا کم ہو تو سانس لینا محال ہوتا جاتا ہے۔ مگر کیا کیسے وقت گھاؤ دیتا ہے تو مرہم بھی لگا ہی دیتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور سب کے احساس دلانے پر اس نے عباد کی خاطر خود کو سنبھال لیا۔ مگر کراچی آنے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنی عمر عماد کی یادوں سے سجے اسی شہر میں گزارنا چاہتی تھی۔

وہ بہت اچھی کوکنگ کرتی تھی۔ عمار کی ایک کولیگ جو لڑکیوں کا ووکیشنل سینٹر چلاتی تھیں اس کی اس خوبی سے واقف تھیں۔ انہوں نے رمل کو اس فیلڈ میں آنے کا مشورہ دیا اور اپنے ہی سینٹر میں جاب آفر کر دی۔ اپنی محنت اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر رمل دو سال میں ہی کافی سیٹ ہو گئی تھی۔

عباد اب آٹھ سال کا ہو گیا تھا۔ ایک دن بد قسمتی سے جاب پر جاتے ہوئے اس کا بھی ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ہاتھ فریکچر ہو گیا مگر اس بار قدرت کو شاید عباد پر رحم آ گیا کہ اس کی جان بچ گئی۔ گو کہ وہ دوری کے باعث اور امی ابو کو پریشان نہ کرنے کی غرض سے میکے میں اطلاع دینے سے کترا رہی تھی تاہم سارہ نے جو اس کی پرانی پڑوسی تھی' اس کی ناراضی کے باوجود میکے میں اطلاع کر دی کیونکہ عباد ابھی بہت چھوٹا تھا اسے تو خود دیکھ بھال کی ضرورت تھی ایسے میں وہ ماں کو کیسے دیکھ سکتا تھا اور پھر امی نے اسے فون کر کے خوب ڈانٹ

پلائی۔

"رمل اب ہم غیر ہوگئے ہیں یا تم زیادہ بڑی اور خود مختار ہوگئی ہو۔"

"مگرامی ...." رمل نے صفائی دینی چاہی اور انہیں آنے سے روکنا چاہا تو ان کا غصہ اور بڑھ گیا۔

"بند کرو فون۔ بہت کرلی تم نے من مانیاں۔ اس لیے کہا تھا عمار کے بعد اکیلی نہ رہو وہاں۔ چھوٹے بچے کا ساتھ ہے۔ اب تمہاری ایک نہیں چلے گی۔ آرہی ہوں میں۔" انہوں نے مزید کچھ کہے سنے بغیر فون بند کردیا۔ مگر بعد میں خود ہی پریشان ہوگئیں کہ اب کیا کریں گی۔ شوہر کو بھی ان کی دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ ایسے میں تحریم کا ہی خیال آیا تو اسے فون ملایا مگر تحریم ماں کو روتا دیکھ کر خود ہی رونے لگ گئی۔ ایسے میں اشعر نے ہی دونوں کو دلاسا اور تسلی دی اور آگے کا لائحہ عمل ترتیب دینے کی ترغیب دی۔

☼ ☼ ☼

تحریم دوسرے ہی دن اسلام آباد پہنچ گئی۔ سارہ اور اس کے ہزبینڈ نے اسے ریسیو کرکے رمل کے گھر پہنچایا۔ ننھا عباد، خالہ کو دیکھ کر گلے سے لپٹ گیا۔ وہ اس کی شادی پر کراچی آیا تھا اور اب پھر پانچ ماہ بعد اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے نہال ہوگیا ورنہ گھر میں تو صرف ماں تھی اور وہ۔ کمزور سی رمل کو دیکھ کر تحریم کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ بہن نے اتنی سی عمر میں کتنے درد سہ لیے تھے۔ فقط بائیس برس کی تھی رمل شادی کے وقت۔ تحریم رمل کے گلے لگ کر سسک پڑی تو رمل کی پلکیں بھی بھیگ گئیں مگر پھر دونوں نے خود پر عباد کی سہمی ہوئی نظریں محسوس کیں تو دونوں ہنس پڑیں کہ مبادا معصوم ذہن غلط اثر نہ لے لے۔

"لو بھئی آپ کی آنی تو خود رونے دھونے میں لگ گئیں مما کا خیال کیا رکھیں گی۔"

"جی نہیں پتا ہے عباد اصل میں آپ کی مما نے مجھے چپکے سے چٹکی کاٹی کہ میں صرف آپ کے لیے شامی کباب کیوں لائی ہوں؟" تحریم نے کبابوں سے بھرا ایئرٹائٹ باکس عباد کی طرف مسکراتے ہوئے بڑھایا تو وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"واؤ نانو کے یمی والے کباب۔"

"آپی تمہارا بیٹا بھی تمہاری طرح ہی چٹورا ہے۔ کیسے مزے سے مرچوں والے کباب سی سی کرکے کھا رہا ہے۔ بیٹا مما کو بھی تو چکھاؤ۔" تحریم نے کہا تو عباد فوراً بولا۔

"آنی اب میں اتنا بیڈ بھی نہیں کہ سارے خود ہی کھا جاؤں۔" اس کی اس ادا پر تحریم اور رمل دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس دیں۔ اپنوں کا ساتھ پا کر روحیں یونہی گنگنانے لگتی ہیں کہ بات بے بات لب مسکرانے لگتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

سردیوں کی چمکیلی دھوپ تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ تحریم ناشتے کے برتن سمیٹ کر دونوں کو لے کر لان میں لے آئی۔ ڈاکٹر نے رمل کو وٹامن ڈی کی کمی بتائی تھی اور ہدایت کی تھی کہ وہ روزانہ پابندی سے کچھ وقت دھوپ میں ضرور گزارے۔ سردیوں کی دھوپ تو یوں بھی جسم میں توانائی سی ہی بھر دیتی ہے۔ عباد نے سامنے سے سارہ کے بیٹے کو بلالیا۔ دونوں ہم عمر بھی تھے اور اسکول فیلو بھی۔ دونوں مل کر کرکٹ کھیلنے لگے اور تحریم رمل کے ساتھ واک کرنے لگی۔ پھر جب رمل تھکنے لگی تو دونوں آکر لان میں رکھی چیئرز پر بیٹھ گئے۔ تحریم نے ٹیبل پر رکھی موسمبیوں کو چھیل کر پھانکیں رمل کے سامنے رکھیں اور کھانے کا اشارہ کرکے عباد کے لیے کینو چھیلنے لگی۔

"توبہ ہے تحریم۔ تم تو کھلا کھلا کر موٹا کردو گی مجھے۔ ابھی تو ناشتا کیا ہے۔" رمل نے منہ بنایا۔ آلو کا پراٹھا ابھی تک اس کے حلق میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ تحریم نے عباد کی فرمائش پر آلو کے پراٹھے بنائے تھے۔

"آپ نہیں ہوتیں موٹی۔ کتنی ایکٹو ہیں ابھی بھی۔ ایک ہاتھ سے بھی کتنے کام کرلیتی ہیں استری کرنا۔

قبلہ درست کروا پنا ورنہ بھٹک جاؤ گی۔ تمہیں پتا ہے کہ طلاق اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ عمل ہے صرف بدکاری کی صورت میں اس کے رائج کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ نہ تم بدکار ہو۔ نہ وہ۔ دونوں اپنی سمتیں درست کرو۔ بیٹھو بات کرو تب بھی معاملہ نہ سلجھے تو بڑوں کو بٹھاؤ۔ یہ ہے درست اور صحیح طریقہ یوں من مانی کرنے سے من چاہی منزل حاصل نہیں ہوتی۔" رمل نے سخت الفاظ میں اسے نصیحت کی تو وہ روہانسی ہو گئی۔ اسے لگا کہ رمل اسے سمجھ نہیں رہی۔

"تو کیا محبت لا یعنی شے ہے۔ میاں بیوی کے درمیان محبت کا کوئی وجود نہیں ہونا چاہیے۔ پہلے تو آئی لو یو کہتے اس کی زبان نہ تھکتی اور اب اسی زبان سے طعنے دیتا ہے مجھے۔ صائمہ ٹھیک کہتی ہے بالکل۔ بیوی نہیں نوکرانی چاہیے ہوتی ہے ایسے مردوں کو بلکہ کٹھ پتلی اپنے اشاروں پر ناچنے والی۔"

"بیوقوف ہو تم اور وہ تمہاری دوست بھی شوہر کو سنوری ہوئی بیوی اسی وقت اچھی لگتی ہے جب وہ اس کا گھر بھی سنوارے۔ تم نے خود بتایا تھا ناکہ دوسروں کے سامنے تعریفیں کرتا ہے تمہاری۔ بیماری میں خیال رکھتا ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دیتا۔ یہی خیال اور یہی عزت محبت کا اصل اظہار ہیں۔ میری جان عقل کرو۔ ناشکری مت کرو۔ کہیں پچھتانا نہ پڑے میری طرح۔" رمل کی آنکھوں میں خود آنسو اتر آئے تو تحریم چپ چاپ اسے تکنے لگی۔ اس کے آخری الفاظ تحریم کی روح کو جیسے چیر گئے تھے۔ وہ گم صم کھڑی مضمحل سی رمل کو دیکھ رہی تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے دونوں کو چونکا دیا۔ عباد نے سارہ کی آواز سن کر دروازہ کھول دیا تو دونوں نے جلدی سے اپنے گیلے رخسار صاف کر ڈالے۔ سارہ نے آکر دونوں سے ہاتھ ملایا۔

"کیسی ہو رمل۔ ویسے بتانے کی ضرورت نہیں۔ لکنگ فریش ماشاء اللہ۔" سارہ نے محبت سے اس کے گال سہلائے تو وہ مسکرا کر تحریم کو دیکھنے لگی۔

"سب میری بہن کا کمال ہے۔ بہت خیال رکھتی ہے میرا۔"

"یہ تو ہے بڑی کیئرنگ ہے تمہاری بہن اور ویسے بھی تنہائی بٹ جائے تو بھی انسان جی اٹھتا ہے۔ کیوں تحریم؟" سارہ نے اپنی بات کی تائید چاہی۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔" تحریم نے سارہ کا اشارہ سمجھتے ہوئے رمل کی جانب دیکھا تو رمل نے نظریں چراتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"چلو اب تم لوگ جلدی نکلو۔ دیر ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے دن گزرے گا۔ ٹھنڈ بڑھ جائے گی۔ سردیوں میں دن تو ویسے ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔"

"اوہ یس سارہ آپی۔ آپ پانچ منٹ رکیں۔ میں چینج کر کے آتی ہوں۔" تحریم سے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سارہ کو مارکیٹ جانے کے لیے بلایا تھا کیونکہ وہ اسلام آباد کے راستوں سے انجان تھی۔ وہ اندر گئی تو سارہ اور رمل بچوں کے اسکول کی باتوں میں لگ گئیں۔

☼ ☼ ☼

ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں اتوار کے باعث بہت زیادہ رش تھا۔ آج ابر چھایا ہوا تھا اور بارش کے آثار لگ رہے تھے۔ اس لیے کافی ہاؤس میں بھی کافی رش تھا۔ سارہ اور تحریم بھی شاپنگ کر کے کیفے ٹیریا میں آ بیٹھیں۔

"پھر تم نے بات کی؟" سارہ نے کافی کا آرڈر دے کر تحریم کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کی تھی۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں آپ کو پتا ہے وہ چڑ جاتی ہیں اس ٹاپک سے۔" تحریم نے گرمائش حاصل کرنے کے لیے ہتھیلیوں کو مسلتے ہوئے کہا۔

"پھر۔۔۔؟" سارہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"پھر کچھ نہیں۔ انہوں نے وہی جواب دیا جو وہ ہمیشہ سے دیتی آئی ہیں میری فکر مت کرو۔ آئی ایم اوکے اور یہ کہ اب عباد ہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ امی تو خود بہت فکر مند رہتی ہیں آپی کے لیے۔" تحریم کے لہجے میں بہن کے لیے فکر تھی۔

کپڑے تہ کرنا۔ ویسے آپس کی بات ہے۔ اتنی سگھڑ اور پھرتیلی تو نہ تھیں آپ۔" تحریم نے شرارت سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

"بس ڈیئر جب مرد اور عورت پریکٹیکل لائف میں داخل ہو جاتے ہیں۔ تو بہت چینج کرنا پڑتا ہے خود کو ایک دوسرے کے لیے۔ تب ہی زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔"

"اف آپی تم تو سچ مچ کی ٹیچر بن گئی ہو۔ فلسفہ بھی بولنے لگی ہو۔" تحریم نے کینو کی پھانک پر چاٹ مسالا چھڑک کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ فلسفہ نہیں میری جان۔ زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ تم اشعر کو فون نہیں کرتیں۔ بیویاں تو بڑی خبر رکھتی ہیں میاں کی۔" رمل نے تحریم کے چہرے کو کھوجتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" تحریم نے انتہائی قطعیت سے جواب دیا تو رمل حیران رہ گئی۔

"نہیں سے کیا مراد ہے تمہاری۔ تحریم سب ٹھیک تو ہے تمہاری اور اشعر کی لائف میں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ وہ کرلیتا ہے فون تو بس خیریت پتا چل جاتی ہے۔" تحریم کا لہجہ ہنوز قطعی تھا۔

"وہ کرلیتا ہے تو تمہیں تو پھر اور بھی خیال سے چلنا چاہیے احساس دلانا چاہیے کہ تم بھی اسے یاد کرتی ہو۔" رمل نے رسان سے کہا۔

"آپی وہ مجھے یاد نہیں کرتا۔ بلکہ گھر کی ماسی کو یاد کرتا ہے۔ ظاہر ہے اب اسے کھانے پینے اور کپڑوں وغیرہ کی مشکل ہو رہی ہوگی۔" تحریم نے یوں کہا جیسے اسے رمل کی لاعلمی پر حیرت ہو اور رمل کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ لے اسے تحریم سے اس قدر بچکانہ رویے کی امید ہرگز نہ تھی۔

"ڈونٹ بی چائلڈش تحریم۔ ابھی کیا کہا میں نے کہ شادی کے بعد عورت کو خود کو شوہر کی مرضی اور پسند کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔" اس بار رمل کے لہجے میں سختی تھی تو تحریم کے لہجے میں بھی ناگواریت بھر آئی۔

"اچھا تو کہاں لکھا ہے کہ عورت شوہر کے لیے کھانا پکائے، کپڑے دھوئے۔ کیا تم نے کبھی کوئی دینی پروگرام نہیں دیکھا۔ سارے علما یہی کہتے ہیں کہ عورت کا نان نفقہ مرد کے ذمے ہے۔ جبکہ عورت کے ذمے صرف بچوں کی پرورش ہے اور اس میں بھی عورت اس سے دودھ پلانے تک کی اجرت طلب کر سکتی ہے۔" تحریم کی سوچ اور لب و لہجہ رمل کو نہ صرف چونکا گیا بلکہ وہ تاسف میں بھی مبتلا ہو گئی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ سختی سے شاخ ٹوٹ جاتی ہے لہٰذا اس نے بہت نرمی سے کام لیتے ہوئے تحریم کو پھر سمجھانا شروع کیا۔

"تحریم میری بہن۔ یہی تو ہمارا سب سے بڑا مسئلہ بلکہ المیہ ہے کہ ہم قرآن و حدیث کی مروجہ باتوں میں سے صرف اپنے مطلب کے معنی اخذ کرتے ہیں۔ کوئی بات کیوں کہی گئی ہے اس کے پس منظر میں جائے بغیر نعوذ باللہ اپنے طور پر من پسند مفہوم تلاش کر لیتے ہیں۔ گویا جب دور جاہلیت میں عورتوں پر ظلم ستم ڈھایا جاتا، زندہ درگور کیا جاتا ان سے حیوانوں سا سلوک کیا جاتا تھا تو اللہ اور اس کے رسول نے ان آیتوں اور حدیثوں سے عورتوں کے اصل مقام، رتبے اور فضیلت کو واضح کیا۔ تم دلیل دیتے وقت یہ کیسے اور کیوں بھول گئیں کہ اسی قرآن اور اسی مذہب نے عورت کو شوہر کی تابعداری اور اطاعت کا حکم دیا اور جنت کی خوشخبری دی ان عورتوں کو جن سے ان کا شوہر راضی ہوا۔"

"مگر آپی اشعر کا رویہ بہت تکلیف دہ ہے۔ اس کی وہ محبت جس کا وہ دعوے دار تھا۔ اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ میں اب تھک رہی ہوں۔ آئی ایم فیڈ اپ اور اب مجھے نہیں لگتا کہ یہ سب مزید چل سکتا ہے۔" تحریم کی سوئی وہیں اٹکی دیکھ کر رمل کو پھر شدید غصہ آگیا۔

"شٹ اپ تحریم تمہیں کچھ پتا ہے تم کیا بول رہی ہو۔ ایسا سوچا بھی کیسے تم نے؟"

"کیوں یہ میرا حق ہے۔" تحریم دوبدو بولی۔

"اپنا حق مانگنے سے پہلے اپنا فرض ادا کرنا سیکھو۔

"رمل مجھے بہت عزیز ہو گئی ہے تحریم۔ شی از سو لونگ۔ تم اسے سمجھاؤ کہ زندگی ایسے تنہا نہیں گزرتی۔ آذر بھائی کو بھی ساتھی کی ضرورت ہے۔ آصفہ کے بعد گھر اور بچی کو اکیلے سنبھالنا..... یونو مرد کہاں چلا سکتے ہیں گھر اور پھر ان کی بیٹی اور عباد دونوں ہم عمر ہیں دونوں بچوں کی بھی تنہائی دور ہو جائے گی۔ سچ پوچھو مجھے بھی اپنے بھائی کا اکیلا پن بہت تکلیف پہنچاتا ہے۔ رمل نے آذر بھائی کو دیکھا ہوا ہے ملی ہوئی ان سے۔ پھر انکار کی کوئی وجہ..... کیا وجہ ہے آخر؟"

سارہ کی شدت سے خواہش تھی کہ رمل اس کے بھائی آذر کی شریک حیات بن جانے پر رضامند ہو جائے۔

ان کی بیوی چار سال پہلے ہیپاٹائٹس کے مرض میں مبتلا ہو کر انہیں داغ مفارقت دے گئی تھیں۔ ان کی بھی ایک سات سالہ بیٹی تھی جسے یقیناً" ماں کی ضرورت تھی۔ اور سارہ کے ساتھ آذر کی نگاہ انتخاب بھی رمل پر آکر ٹھہر گئی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل پارٹنر بھی ثابت ہو سکتی تھی مگر رمل جو کہ سارہ کی بہت اچھی دوست تھی اس معاملے پر اس کی ہمنوا نہیں بن پا رہی تھی مگر سارہ نے اپنی کوششیں ترک نہیں کی تھیں اور تحریم کی شکل میں ان کی امید اور کوششیں اور قوی ہو گئی تھیں۔

"بات آذر بھائی کی نہیں ہے سارہ آپی۔ وہ یہ اسٹیپ لینا ہی نہیں چاہتیں مگر آپ کے کہنے پر میں ان سے بات کروں گی کہ وہ اپنے طریقے سے آپی کو رضامند کرنے کی کوشش کریں۔"

تحریم نے رسانیت سے کہا تو سارہ مسکرا دی۔ اتنے میں کافی آگئی اور دونوں نے بڑھتی ہوئی سردی کے اثر کو زائل کرنے کے لیے جلدی جلدی کافی کے سپ لینا شروع کر دیے۔

☆ ☆ ☆

"تو پھر مانتا ہے ناں اپنا استاد۔" معیز نے فرضی کالر جھاڑتے ہوئے پوچھا وہ بہن کی شادی سے فارغ ہو کر واپس جا رہا تھا تو اشعر سے ملنے اس کے آفس ہی آ گیا۔

"ماننا پڑ گیا دوست۔ آخر تیرا چھ سالہ تجربہ ہے شادی شدہ زندگی کا اور ہم ٹھہرے ابھی طفل مکتب کے مکین۔" اشعر نے گردن جھکا کر کورنش بجا لاتے ہوئے کہا تو معیز ہنس دیا۔

"بات دراصل پتا ہے کیا ہے ڈیئر۔ یہ انسان کی خصلت ہے کہ جو شے اس کے پاس اس کی دسترس میں ہو۔ اسے اس کی قدر نہیں ہوتی۔ بس اب تو شکر منا۔ دوری وقتی ہے۔ محبت اور اعتماد سے ہاتھ تھام کر سب کچھ بھلا کر زندگی کو نئے ڈھب سے شروع کر ان شاء اللہ تم تحریم بھابھی کے اور وہ تمہارے دل میں جگہ بنا لیں گے کیونکہ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھ سے بجتی ہے چل اب اجازت دے۔ تیری بھابھی کے ساتھ پیکنگ بھی کروانی ہے۔" معیز نے اٹھتے ہوئے کہا تو اشعر نے اٹھ کر اسے مصافحہ کیا اور اسے رخصت کرنے کی غرض سے ساتھ چلتا ہوا بیرونی دروازے تک آگیا۔

"یار اب کہ جب بھی تو آ۔ بھابھی کو اور بچوں کو ضرور لانا۔ ساتھ کھانا کھائیں گے اس بار تو تو نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر جان چھڑا لی۔"

"بلیوی دوست۔ بہانہ نہیں واقعی شادی کی وجہ سے بہت مصروفیت تھی۔ اگلی بار ان شاء اللہ ضرور چکر لگائیں گے تو آنا نا۔ بھابھی کو لینے تو آئے گا ہی نا اسلام آباد۔" معیز نے الوداعی مصافحہ کیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"ضرور۔ پوری کوشش ہوگی۔" اشعر نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کیا تو معیز نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور اشعر واپس آفس کے اندر داخل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"تائی آپ جا رہی ہیں۔ نہیں جائیں پلیز۔ میں اداس ہو جاؤں گا۔" تحریم جانے کے لیے سامان پیک کر رہی تھی کہ عباد چلا آیا۔

"او میرا گڈا۔ تائی کی جان میں جا رہی ہوں بیٹا لیکن ہم اسکائپ پر روز بات کریں گے اور اب آپ کی باری

آپ اور مما اسکول کی چھٹیوں میں کراچی آنا۔ پھر ہم ہی سائڈ چلیں گے۔ اونٹ پر بھی بیٹھیں گے او کے۔" تحریم نے اسے آغوش میں بھر کر پیار کیا اور پھر گدگدی کی تو وہ کھلکھلا کر مسکرا دیا۔ اتنے میں سارہ کا بیٹا اسے بلانے آگیا تو وہ باہر چلا گیا۔ تحریم دوبارہ پیکنگ کرنے لگی تو کپڑے تہ کرتے ہوئے اسے اپنی ایک شرٹ کم لگی۔

"شاید آپی کی کپڑوں میں چلی گئی ہو۔" یہ خیال آتے ہی اس نے رمل کی وارڈ روب کھولی تو کپڑوں کے نچلے خانے میں اسے رمل کی شادی کی البم دکھائی دی وہ اتنے دنوں سے یہاں تھی مگر رمل کی دیکھ بھال میں مصروف ہو کر اسے تصویریں دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ یادوں کے دھارے میں بہتے ہوئے البم کا ڈبا کھولنے لگی تو اندر سے ایک چھوٹی سیاہ ڈائری برآمد ہوئی۔ تحریم نے بے دھیانی میں ڈائری کھول لی۔ اسے کیا پتا تھا کہ اس کے بعد اس کا دھیان کہیں اور لگے گا ہی نہیں۔ وہ رمل کی ڈائری تھی۔ شادی کے ابتدائی دن 'عمار کی عدم توجہ' رمل کی چاہ.... سب کچھ ان صفحات میں رقم تھا۔ وہ پڑھتی چلی گئی اسے لگا کہ وہ سب رمل نے نہیں خود اس نے لکھا ہو۔

پھر عمار کے انتقال اور عباد کے مستقبل کے فکر کے خیالات سے مزین چند صفحات پڑھنے کے بعد وہ آخری صفحہ پڑھنے لگی تو اسے لگا کہ اس کی سانسیں بند ہو جائیں گی۔ بظاہر چلتی پھرتی' ہنستی بولتی رمل اپنے اندر دکھ کا ساگر لیے جی رہی تھی یا زندگی گزار رہی تھی۔ تحریم آنسو پونچھتے پونچھتے لفظ لفظ پڑھتی چلی گئی۔ رمل نے عمار کو یوں مخاطب کیا تھا جیسے وہ سامنے ہو۔

"یہ کیا کیا عمار تم نے؟ کیوں چھوڑ گئے اس طرح؟ زندگی کا ہر ڈھنگ سکھایا تم نے؟ لیکن یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیسے اشکوں کو چھپانا ہے؟ کیسے روتے روتے ہنسنا ہے۔ میں کیسے لڑتی تھی تم سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیسے خفا ہو جاتی تھی بات بے بات... مجھے کیا خبر تھی کہ تم تنگ آکر اکیلے ہی چھوڑ جاؤ گے۔ کیا خبر تھی کہ تم بن زندگی میں صرف ماتم کرنا' بین کرنا رہ جائے گا۔ آجاؤ عمار میرا دل ترستا ہے کسی سے دل کی دو باتیں کرنے کو' ساتھ ہنسنے کو' ساتھ رونے کو.... تمہاری بانہوں میں چھپ کر ہر غم بھلانے کو.... آجاؤ ناں عمار...."

لفظ تھے کہ کرب میں ڈوبے ہوئے نشتر۔ تحریم کی روح تک تڑپنے لگی بہن کے دل کا حال جان کر۔ اس کی سسکیاں بندھنے لگیں۔ تب ہی اچانک رمل آگئی۔

"تحریم پیکنگ کرلی تو آجاؤ۔ کھانا تیار ہے۔" آج رمل نے ضد کرکے کوکنگ کی تھی تاکہ وہ اسے اپنے ہاتھ کا پکا کھانا کھلا سکے۔ مگر تحریم کی یوں ہچکیاں بندھے دیکھ کر وہ بری طرح چونک گئی۔

"ارے کیا ہوا....؟" پھر اچانک اس کی نظر ڈائری پر پڑی تو وہ لمحے میں سب سمجھ گئی پھر وہ وہاں سے تیزی سے باہر نکل گئی۔ تحریم نے ڈائری رکھی اور اس کے پیچھے لپکی۔ رمل لاؤنج میں رکھے ایکوریم کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"آپی رکیں پلیز۔ آئی ایم سوری۔ آئی نو کہ ایسے بنا اجازت کسی کی پرسنل چیز کو ہاتھ لگانا ایک غیر اخلاقی حرکت ہے۔" تحریم بھی اس کی پشت پر کھڑی ہو گئی۔

"تحریم کہتے ہیں جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ شاید اب تمہیں میرے پچھتاوے کا سبب سمجھ آ گیا ہو۔ ورنہ شاید میں ساری عمر بھی تمہیں سمجھانہ پاتی کہ ایک شوہر ہی سہاگن عورت کا سرمایہ حیات ہوتا ہے۔ اک بات کہوں تحریم شادی ہمیشہ سمجھوتہ ہی ہوتی ہے۔ ہم میں سے بہت سی عورتیں ایک نارمل شخص میں بھی کئی خامیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر رو پیٹتی ہیں کہ ان کی زندگی اجیرن ہے۔ اکثر مرد بھی ایسا کرتے ہیں۔ مگر جانے ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بشر خامیوں سے مبرا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں اگر شریک حیات عیاش ہو' شکی ہو' بدکردار ہو تو واقعی زندگی کانٹوں کی راہ گزر بن جاتی ہے۔ مرد باہر جا کر کماتا ہے عورت گھر میں رہ کر اپنا کام انجام دیتی ہے۔

یہ قانون چاہے کسی کا بھی بنایا ہوا ہو' اگر الٹ جائے یا فالو نہ کیا جائے تو گھر نامی ریاست کا نظام درہم

برہم ہونے لگتا ہے۔ جس طرح مرد کے لیے گھر اور باہر کی ذمہ داریاں ایک ساتھ پورا کرنا ممکن نہیں اسی طرح عورت کے لیے بھی امر مشکل ترین ہے کہ وہ گھر اور باہر دونوں کے جوکھم کو ایک ساتھ سنبھالے۔ یہ بحث ہی بے کار ہے کہ مرد سربراہ کیوں جیسے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پیغمبر صرف مرد کیوں۔ ایسے ہی یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ مجازی خدا شوہر کیوں؟ یہ اوپر والے کی مرضی ہے اور اس کی حکمت وہی جانے۔ ہمارا کام صرف اس کے کہے پر عمل کرنا ہے۔ مگر ہم بے عقل لوگ "کیوں" کی تکرار میں ہی لگے رہتے ہیں اس لیے ہی خوار رہتے ہیں۔" وہ مسلسل تیرتی مچھلیوں کو تکتے ہوئے بنا رکے کہتی چلی گئی کہ جیسے آج اس کے پاس یہ آخری موقع ہو۔ تحریم نے اپنا سر اس کے شانوں پر رکھ دیا۔ بعض اوقات خاموشی میں سارے اسرار اور جواب پوشیدہ ہوتے ہیں شاید اسی لیے خاموشی کو عافیت قرار دیا گیا اور آج تحریم کی خاموشی گواہی دے رہی تھی کہ وہ رمل کی باتیں سمجھ گئی ہے۔

"تم فریش ہو جاؤ۔ اشعر کا استقبال کرنا ہے ناں۔ میں کھانا لگانے کی تیاری کرتی ہوں۔" چند لمحوں بعد رمل نے مڑ کر اسے گلے لگایا اور شانہ تھپتھپا کر گویا سب ٹھیک ہونے کی نوید دی تو وہ آنسو پونچھتے ہوئے مسکرا دی۔

"آپی ایک بات میں بھی کہنا چاہتی ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں بولو۔" رمل نے بغور اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ جب تم تنہائی کے اصل مفہوم اور شدت سے اس حد تک آگاہ ہو چکی ہی تو پھر عمر بھر تنہا رہنے کی یہ ضد کیوں پال لی ہے تم نے۔ آذر بھائی سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ سارہ باجی کی فیملی کو بھی تم اچھی طرح جان چکی ہو۔ عباد کے لیے سوچو۔ بڑا ہو کر وہ بھی باپ کی کمی محسوس کرے گا اور پھر آذر بھائی کی بیٹی کو بھی ماں مل جائے گی۔ نیکی سمجھ کر ہی یہ قدم اٹھا لو آپی پلیز۔" تحریم نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ ڈالے۔

"اشعر آنے والا ہو گا۔ تم تیار ہو جاؤ۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی اور تحریم ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

رمل کچن میں کوکنگ کے آخری مراحل میں تھی کہ امی کا فون آگیا۔

"السلام علیکم امی کیسی ہیں آپ۔" رمل نے ایک ہاتھ سے کڑاہی بھونتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے موبائل سنبھالتے ہوئے کہا۔

"مجھے تم لوگ سکون سے رہنے دو گے تو ٹھیک رہوں گی ناں۔" امی کی غصیلی آواز نے رمل کو بری طرح چونکا دیا۔ اس نے چولہے کی آنچ کم کی اور مکمل طور پر فون کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"خیریت امی کیا ہوا؟ اب تو تحریم نے کچھ نہیں کیا۔ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔"

"خاک ٹھیک ہو رہا ہے اور تحریم نے نہیں کیا تو کیا ہوا اس کی جگہ تم نے سنبھال لی تاکہ ماں کو سکون نہ مل سکے۔"

"اللہ نہ کرے امی۔ کچھ بتائیں تو سہی۔ آخر ہوا کیا ہے؟ آپ کیوں اس قدر ناراض ہیں؟" رمل روہانسی ہونے لگی۔

"تم لوگ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کو پیدا کر کے اور پال پوس کر بڑا کرنے کے بعد میرا تم لوگوں پر سے حق ختم ہو گیا۔ کیونکہ اب تم لوگ بڑے ہو گئے۔ صحیح غلط ہم سے زیادہ سمجھنے لگے ہو۔" امی کے لہجے میں ہنوز ناراضی تھی۔ تحریم جھنجلا گئی۔

"امی خدا کے واسطے کھل کر بولیں۔ دیکھیں اشعر آنے والا ہے مجھے کھانے کی تیاری مکمل کرنی ہے۔ آپ میرے سر پر جوتے مار لیں۔ مگر سزا دینے سے پہلے مجھے میرا جرم تو بتا دیں۔"

اشعر کے آنے کا سن کر امی کچھ ٹھنڈی ہو گئیں۔ واقعی وقت کم تھا اور مقابلہ سخت تو اب کی بار وہ بنا کسی تمہید کے کھل کر اپنے مدعے پر آگئیں۔

"رمل تم نے اپنی بہت چلالی۔ اب میں تمہیں اس حال میں اس طرح اکیلے نہیں دیکھ سکتی۔ تم آذر کے لیے ہاں کردو۔ اور تحریم کے ساتھ چلی آؤ میں یہیں سے تمہاری رخصتی کروں گی۔"

"یا اللہ امی۔ آپ لوگ کیوں میرے پیچھے پڑ گئیں اور یہ ساری کاروائی اس تحریم کی بچی کی ہے۔ جس سے ذرا صبر نہ ہوا اور فوراً" آپ کو فون کر کے الف سے ے تک ساری کہانی سنادی۔" رمل نے یوں چبا چبا کر لفظ ادا کیے گویا وہ تحریم کو چبا رہی ہو۔

"اس نے جو کیا میری ہدایت کے مطابق کیا۔ اور میں نے تمہاری لن ترانیاں سننے کے لیے فون نہیں کیا ہے۔ اپنا فیصلہ سنانے کے لیے کیا ہے۔" امی کا لہجہ حتمی تھا رمل اور چڑ گئی۔

"مطلب' میرا میری زندگی پر کوئی حق نہیں۔"

"رمل یہ تمہاری ماں کا حکم ہے۔ سامان اٹھاؤ اور روانہ ہو جاؤ۔" امی اس کی قطعاً" نہیں سن رہی تھیں۔

"امی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہ رہی ہیں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"جو چاہو سو سمجھو۔ اب میں دیکھوں گی کہ میری اولاد فرماں بردار ہے یا نافرمان۔ اور جو نتیجہ نکلا اسے اپنی تربیت کا نتیجہ سمجھ کر قبول کرلوں گی۔" ان کی آواز بھرا گئی تو رمل تڑپ اٹھی۔

"پلیز امی۔ میں آپ کو تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ٹھیک ہے آپ جو کہیں گی' جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گی۔ مگر خدارا مجھ سے ناراض مت ہوں۔"

"میری بچی جیتی رہو۔ اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں عطا کرے۔ بس اب جلدی سے پیکنگ کرلو۔" اس نے کہا تو رمل ان کے جذباتی پن پر ہنس پڑی۔

"ابھی تو ایسے ناراض تھیں کہ میرا دم نکلنے جا رہا تھا اور اب ایسے دعائیں دے رہی ہیں کہ لگ ہی نہیں رہا کہ خفا بھی تھیں اور میری پیاری اور بھولی امی جان! یہ اتنا آسان تو نہیں۔ میں جاب کرتی ہوں وہاں بھی طریقے سے انفارم کرنا ہو گا۔ مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دیں۔ پھر میں آپ کے قدموں میں ہوں گی۔"

"ماں ہوں نا بیٹا۔ ماں کا یہ غصہ یونہی وقتی ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے بس یاد رکھنا۔ جتنی جلدی ممکن ہو آجانا۔ تمہاری اماں تمہارا انتظار کر رہی ہے بیٹا۔ تاکہ تمہیں محفوظ ہاتھوں میں سونپ کر میرا دل بھی چین سے رہ سکے۔" امی کا لہجہ محبت سے چور تھا۔ رمل کی آنکھیں نم ہونے لگیں تو اس نے ماں سے اجازت چاہی اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆ ☆ ☆

رمل کے اصرار پر تحریم بہت اہتمام سے تیار ہوئی۔ فیروزی اور شاکنگ پنک ریشم کے دھاگے کی کڑھائی والا جارجٹ کا سوٹ پہن کر لائٹ سا میک اپ کیا اور بالوں کو آئرن کر کے پشت پر پھیلا دیا۔ رمل کی نازک سی جیولری پہنی اور پرفیوم کا اسپرے کر کے لاؤنج میں چلی آئی جہاں اشعر' رمل سے باتوں میں مصروف تھا۔ اتنے عرصے بعد اپنے لیے سجی سنوری تحریم کو دیکھ کر ایسا حیران اور اس کے روپ میں ایسا مبہوت ہوا کہ بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا ہی چلا گیا اور وہ خود پر اشعر کی وارفتہ نگاہیں پڑتے دیکھ حیا سے سرخ ٹماٹر ہو گئی۔ رمل نے تحریم کو یوں جھینپتا دیکھا تو کھنکار کر اس کا ارتکاز توڑا تو وہ اس بری طرح چونکا کہ رمل اور تحریم دونوں کی ہنسی نکل گئیں اور وہ خجل ہو کر سر کھجانے لگا۔ آخر کار رمل کو دونوں کی حالت پر رحم آگیا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"چلو میں ذرا کچن دیکھ لوں۔ تم لوگ باتیں کرو۔"

"آپی میں بھی آپ کی مدد کرا دیتی ہوں۔" رمل نے فرار چاہا۔

"ہرگز نہیں۔ تم آج مہمان ہو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔" رمل نے اسے گھورا تو وہ چاروناچار اشعر کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی لیکن نظریں فرش پر گاڑ دیں۔ رمل کچن کی جانب چلی گئی تو چند لمحے خاموش

رہنے کے بعد اشعر نے اسے مخاطب کیا۔
"سنو!"
"جی۔" تحریم نے نظریں اٹھا کر دھیمے سے کہا۔
"اتنے اچھے موسم میں 'روٹھنا نہیں اچھا' 'ہار جیت کی باتیں' 'کل پہ اٹھا رکھیں' 'آؤ آج دوستی کرلیں۔" اشعر نے یوں نظم پڑھی جیسے وہ باتیں کر رہا ہو۔ اس کے اس انداز پر نہ چاہتے ہوئے بھی تحریم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اسی اثنا میں عباد بھاگتا ہوا آگیا۔
"آنی اور انکل مما آپ لوگوں کو کھانے کی ٹیبل پر بلا رہی ہیں۔" کھانا بہت ہی پرتکلف ماحول میں کھایا گیا۔ رمل نے سارہ اور اس کے ہزبینڈ کو بھی کھانے پر انوائٹ کرلیا تھا تاکہ وہ بھی تحریم کو الوداع کہہ سکے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ پھر اشعر نے رخصت کی اجازت چاہی تو رمل تحریم کے گلے لگ کر رو پڑی۔ تحریم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"آپی پلیز اپنا بہت خیال رکھیے گا۔"
"تم فکر نہ کرو تحریم۔ اب یہ مکمل طور پر ہماری ذمہ داری ہے۔" سارہ نے شرارت سے ایک آنکھ دبا کر تو رمل بلش کرگئی اور باقی سب کے حلق سے قہقہے بلند ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

وہ لوگ کراچی واپس پہنچے تو رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اشعر نے گاڑی کا رخ گھر کے بجائے دوسرے راستے پر کرلیا تو تحریم چونکی ضرور مگر خاموش رہی۔ چائنا ٹاؤن پہنچ کر اشعر نے سوپ آڈر کیا۔
"میں نے سوچا کہ سردی کافی ہوگئی ہے تو ذرا سوپ انجوائے کیا جائے۔" اشعر نے کہا تو تحریم جواب میں پھیکی سی ہنسی ہنس دی اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تب اشعر نے بھی اپنے آپ کو ارد گرد کے ماحول میں گم کرلیا۔ جب روابط ختم ہو جائیں تو یونہی اجنبیت کی دیواریں کھڑی ہو جایا کرتی ہیں۔ سوپ ختم کرکے اشعر نے مینو کارڈ منگوایا تاکہ کھانا آڈر کرسکے اور پھر چوائس کرنے کے لیے تحریم کی طرف بڑھایا تو تحریم نے کہا۔
"رہنے دیں فضول خرچی ہو جائے گی۔"
"وہ تو ہے مگر اول تو یہ ہے کہ اتنی رات کو اور تھکے ہوئے جا کر کیا پکائیں گے اور کھائیں۔ دوسرا اتنے دنوں بعد تمہارے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے تو کچھ اسپیشل ہونا چاہیے نا۔" اشعر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو اس نے چند لمحے حیرت سے اشعر کو دیکھا پھر آہستگی سے کارڈ تھام لیا۔
"چکن چاؤمن اور فرائیڈ پرانز۔ اب آپ دیکھ لیجئے۔" تحریم نے کارڈ لوٹاتے ہوئے کہا تو اشعر نے ویٹر کو آواز دے کر تحریم کی پسندیدہ ڈشز کے ساتھ چکن شاشلک اور سنگاپورین رائس کا بھی آڈر دے دیا۔ ہفتے کے بیچ کے دن تھے تو رش کم تھا۔ چند ہی منٹوں میں کھانا سرو ہوگیا۔ کھانے کے دوران اشعر نے رمل کی شادی کی تیاریوں کا ٹاپک چھیڑ دیا تو حسب توقع تحریم بھی پرجوش ہوگئی اور دونوں کے درمیان چھایا جمود دم توڑ گیا۔ کھانے کے بعد واپسی پر اشعر نے سگنل پر کھڑے لڑکے سے گجرے خرید کر تحریم کو پہنانا چاہے تو اس نے ہاتھ کھینچ لیے۔ اشعر نے اچنبھے سے تحریم کو دیکھا تو وہ دھیمے سے مسکرا کر بولی۔
"ٹھنڈے ٹھنڈے گجروں سے سردی لگے گی نا۔"
"نہیں لگے گی۔" اشعر نے اس کی شرارت سمجھتے ہوئے اس کے ہاتھ تھامے اور گجرے پہنا کر کلائیوں تک آتی سویٹر کی آستینوں پر چڑھا دیے۔ پھر دونوں ہی ایک دوسری کو دیکھ کر مسکرا دیے۔ گھر پہنچ کر اشعر نے تحریم کو فلیٹ کی چابیاں تھماتے ہوئے کہا۔
"تم اوپر آجاؤ۔ میں ذرا انڈا دودھ لے آؤں۔"
تحریم سرہلاتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ گھر آکر وہ بیڈ روم کی طرف آئی اور دروازہ کھول کر بند کمرے کی مہک دور کرنے کی غرض سے سردی کے باوجود پنکھا چلا دیا اور خود بیڈ پر آکر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے نیم دراز ہوئی ہی تھی کہ بری طرح چونک کر اٹھ بیٹھی۔ سرخ گلاب کی کومل پتیوں نے اسے اور اس کے کمرے کو اپنی مہک سے بھگو دیا تھا۔ اسی اثنا میں ایک کارڈ بھی اڑتا ہوا بیڈ پر آگرا۔ اس نے تیزی سے لپک

کر کارڈ اٹھالیا۔ سرخ گلاب اور سفید للی کے حسین امتزاج سے سجا کارڈ ویلکم بیک" کے پیغام سے سجا ہوا تھا۔ اس نے نم ہوتی پلکوں سے کارڈ کھولا۔ اشعر کی خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔

تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں، میرے دل سے بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اداس ہوں، مجھے کوئی شام ادھار دو
مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک سکیں میرے خال و خد
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو، میرے سارے زنگ اتار دو

اشعر نے ہمیشہ کی طرح شاعری میں اپنے دل کی ساری باتیں اس سے کہہ ڈالی تھیں۔ لوگ موسیقی کو روح کی غذا کہتے ہیں جبکہ دراصل یہ شاعری ہی ہوتی ہے، کلام ہی ہوتا ہے جو لفظوں کی صورت میں دل کا حال بیان کر کے روح کو پرسکون کرتا ہے۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں کارڈ کو تکے جا رہی تھی کہ اشعر آ گیا۔ تحریم اسے دیکھ کر کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔

"یہ..... سب....." نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا گئی۔ اشعر نے اس کا چہرہ دونوں ہتھیلیوں کے پیالے میں بھرلیا۔

"یہ سب تمہارے..... اور صرف تمہارے لیے۔ کیونکہ تم میری جان ہو۔ میری زندگی ہو۔ تمہاری چند دن کی دوری نے مجھے یہ اچھی طرح باور کرا دیا کہ میں تمہارے اور تمہاری محبت کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ تم نہیں تو میرا گھر گھر نہیں بلکہ زندگی کا جیسے کوئی مقصد نہیں۔ دیر میں سہی مگر میں اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہو گیا ہوں تحریم! کہ تم میری جان حیات ہو۔" وہ مخمور لہجے میں بول رہا تھا اور اس کی لو دیتی آنکھیں اس کے جذبات کی مکمل عکاسی کر رہی تھیں۔ وہ نظریں چرانے لگیں تو اشعر نے اس کی چہرے پر اپنی گرفت ہلکے سے مضبوط کرتے ہوئے رخ اپنی طرف کر کے کہا۔

"پلیز یہ لفاظی نہیں۔ میرے دل کی آواز ہے۔ بس تھوڑی دیر ہو گئی۔ اس کے لیے معاف کر دو۔" اشعر نے چہرہ چھوڑ کر اپنے کان پکڑ لیے تو وہ جھلملاتی پلکیں لیے ہنس پڑی۔

"اتنا ترسایا..... پہلے کیوں نہیں کہا؟"

"یار سمجھا کرو۔ آخر کو میں ایک مشرقی شوہر ہوں۔" اشعر نے آنکھیں پٹا پٹا کر کہا تو تحریم نے مکا بنا کر اسے گھورا۔ جواباً" اشعر نے اپنی باہیں وا کر دیں تو وہ "فاؤل" کہہ کر اس کی آغوش میں سما گئی اور اسے جانا بھی کہاں تھا۔ یہی تو اس کی منزل تھی۔

"آئی ایم سوری۔" اشعر نے سرگوشی کی تو وہ بھی دھیمے سے بولی۔ "می ٹو۔" پھر دونوں ہی ہنس پڑے اور پردے کی اوٹ سے جھانکتی چاندنی ان کی محبت کی گواہی بن کر کمرے میں ہی براجمان ہو گئی۔ جذبے صادق ہوں تو راستے یونہی بن جاتے ہیں۔

نایاب جیلانی

تیسری قسط

اسے گیندے کے پھولوں سے سجی لڑکیوں والے نقش جھولے پہ بٹھادیا گیا تھا۔ اس کے ارد گرد کزنز کا جھرمٹ تھا اور ڈھولک کی تھاپ پہ اب بھی شادمانی کے گیت گائے جارہے تھے۔ اسے رسم کے لیے باہر لایا گیا تھا۔ اور اس وقت گیندے اور گلاب کے پھولوں سے سجی فریحہ دیکھنے والوں کو بھی گیندے کا کوئی پھول ہی لگ رہی تھی۔

لیکن اس وقت فریحہ کے چہرے پہ کوئی وہم 'وسوسہ یا خدشہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک الوہی مسکان نے اس کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ وہ دھیما دھیما مسکراتی بہت سوں کو انتہائی خوب صورت لگ رہی تھی۔

عاشر نے اس کے کئی پوز کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرلیے تھے۔

جب رسم شروع ہونے لگی تو فریحہ کی امی نے تائی سے کہا۔

"ابھی تک عون نہیں آیا؟"

"آتا ہی ہوگا۔ رستے میں ہے۔ کہہ رہا تھا کہ فرض ادا کرنے گیا ہوں۔ بڑا ضروری فرض تھا۔ آنے والی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے۔" جواب قریب کھڑے عاشر نے دیا تھا۔ تائی اور فریحہ کی امی مطمئن ہوگئی تھیں۔ پھر وہ کیمرہ اٹھا کر اسٹیج پہ چڑھ آیا۔ فریحہ کی ابہام اور وسوسے بھی دور کرنے تھے۔ اسے دیکھ کر فریحہ نے اپنی پچویشن کی پروا کیے بغیر جھٹ سے شکوہ کیا۔

"دیکھ لو' تمہارا بھائی آج بھی نہیں پہنچا۔"

"دس منٹ میں پہنچنے والا ہے۔ تم خاطر جمع رکھو۔" اس نے قریب سے کیمرہ فوکس کیا اور کھٹ کھٹ دو تین تصویریں بنالی تھیں۔

"میرا بھائی تمہارے سارے شکوے دور کردے گا۔" عاشر نے شرارتاً" کہا۔

"رہنے دو' کیا میں اسے جانتی نہیں۔۔۔" فریحہ خفا ہوئی۔

"تم جانتی ہی تو نہیں۔" وہ ایک اور تصویر بناتا ہوا بولا تھا۔ "اور تم تو منہ بند رکھو۔۔۔ سارے دانت نظر آرہے ہیں۔" اس نے فریحہ کو بے ساختہ ڈپٹا۔ معاً" پنڈال میں عون آتا دکھائی دیا تھا۔ اسے دیکھ کر لڑکوں اور لڑکیوں نے ہوٹنگ شروع کردی تھی۔

وہ مسکراتا ہوا اسٹیج کی طرف ہی آرہا تھا۔ عاشر نے اسے رستے میں جالیا۔

"جا ذرا اپنی شکل بدل کے آ۔ یہ بو والے کپڑے چینج کر حد ہے گندا سندا اٹھ کے چلا آیا۔"

"شیروں کے منہ دھلے ہوئے ہوتے ہیں۔" کسی نے عون کا کندھا تھپکا تھا۔

"آج گندا رہے گا تو کل روپ بھی چڑھے گا۔ تازہ شیو شوف بنا کر۔" ثنا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"اس پہ تو ابھی بھی روپ ہے ماشاءاللہ۔ رف اینڈ ٹف حلیے میں بھی۔" عون کی خالہ نے قربان ہوتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"تو پھر اسٹیج پہ جانے دیں۔" عون نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ گویا تیار شیار ہونے کا موڈ نہیں تھا۔

"ہرگز نہیں۔" کائنات اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں طلوع ہوئی تھی یوں کے پورے اسٹیج کا

گھیراؤ کرلیا تھا۔ عون ہکا بکا رہ گیا۔
"یہ کیا؟"
"اسٹیج پہ چڑھنے کا ٹیکس دیں؟" اس نے ہتھیلی پھیلا رکھی تھی۔
کائنات کے برابر ثنا اور مریم بھی تن کے کھڑی ہو گئیں۔ یک نہ شد' تین تین شد... وہ تو چکرا گیا تھا۔ ان کے جھرمٹ نے پیچھے موجود فریحہ کو چھپا دیا تھا۔ اس نے گردن اچکا کر پیچھے دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ پھر بھی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ فریحہ دبا دبا سا مسکرا رہی ہے۔
"نکالو بھی... یہ ٹیکس تو ادا کرنا ہو گا۔ قومی خزانہ آج کل خالی ہے۔" ثنا نے اس کا کندھا ہلایا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا تھا۔
"میں کیوں دوں؟ کیا قاسم اور عاصم نے دیا تھا؟" وہ

چڑ کر بولا تھا۔

"ہماری دفعہ یہ رسم ایجاد نہیں ہوئی تھی۔" مریم نے تنک کر کہا۔

"میری دفعہ کیوں ہوئی ہے؟" عون نے ٹیکس دینے پہ صاف کنجوسی دکھائی تھی۔

"اب تو ہر دفعہ ہو گی۔ عاشر کی باری میں مزید نئی رسومات سامنے لائیں گے۔ یاسر اور عامر کی دفعہ کچھ اور رسمیں انٹروڈیوس کروائیں گے۔" ثنا نے اپنی طویل کاروباری پرافٹ ایبل پلاننگ ان کے گوش و گزار کی تھی... پوری پنڈال میں ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔

"یہ فاؤل ہے... فاؤل ہے۔" لڑکوں نے خوب احتجاج کیا تھا۔ عون کو جان چھڑوانی مشکل لگ رہی تھی۔ پھر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کس طرح سے پیچھا چھڑوائے؟ وہ سوچتا رہا تھا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کروایا۔

"اوکے' اوکے... میں شاور لے لوں' چینج کر آؤں... پھر ٹیکس کی رقم طے کریں گے بولو منظور؟" اس نے کائنات اور بھابھیوں سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پیچھا چھڑوا لیا تھا۔ پھر بالوں میں ہاتھ پھیرتا پنڈال سے باہر نکلا... معاً" آندھی و طوفان کی طرح آتے قاسم نے اس کا بازو دبوچا تھا اور پھر ایک جھٹکے سے عون کو کھینچتا پنڈال سے دور بہت دور لے آیا۔

عون اس افتاد پہ اچانک بوکھلا گیا تھا۔ قاسم کے تیور انتہائی خطرناک تھے اور عاصم کے تاثرات بھی کم و بیش ایسے ہی تھے۔

عون کو کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ نجانے کیا ہوا تھا؟ اس کی چھٹی حس کوئی مثبت الارم نہیں دے رہی تھی۔

اس نے بڑے دونوں بھائیوں سے وجہ جاننے کی کوشش میں لب کشائی کی تھی یوں کہ وہ دونوں کسی بپھرے شیر کی طرح بڑے خوفناک انداز میں غرائے تھے۔

"تم نے اچھا نہیں کیا عون! اپنے باپ دادا کی عزت کو خاک میں ملا کر بالکل اچھا نہیں کیا... تم نے ہمیں کسی قابل نہیں چھوڑا... تم نے ابو کا سر ہمیشہ کے لیے جھکا دیا ہے... تم نے ابو کو پورے خاندان' برادری' رشتے داروں' عزیزوں اور احباب کے سامنے ذلیل کر دیا ہے تم نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔" قاسم کے آگ بھرے یہ الفاظ عون کے دماغ کو دہکتے الاؤ' جلتی بھٹی اور شعلوں کے سپرد کر گئے تھے۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ آخر عون نے کیا کیا تھا؟ اس سے کون سا گناہ سرزد ہوا تھا؟ اسے کچھ بتایا نہ گیا۔ وہ سارے رستے پوچھتا رہا۔ چیختا رہا۔ غراتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے ایک بند کمرے نما ہال میں پہنچا دیا گیا وہاں ابو بھی تھے۔ چاچا بھی تھے۔ اس کے بھائی بھی تھے۔ ابو اور چاچا خون رنگ زخمی نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ ان آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ دھول' مٹی' ریت' غصہ' دکھ' ملال' غم۔

جانے ان سب کو کیا ہوا تھا۔ وہ تو چینج کرنے کی غرض سے پنڈال کی رونق سے باہر نکلا تھا۔ قاسم اور عاصم اسے گاڑی میں بیٹھا کر اس عمارت میں لے آئے تھے اور وہ دونوں بھی غم و غصے سے بے حال تھے۔

وہ عمارت کی پچھلی طرف سے انٹر ہوئے تھے۔ عون گھبراہٹ' غصے' اشتعال میں دیکھ نہیں سکا تھا۔ یہ عمارت کس چیز کی تھی؟

اور اب اس ہال نما کمرے میں چند اجنبی چہرے بھی دکھائی دیے تھے۔

اس کا دل کہہ رہا تھا کچھ انہونا ہونے والا ہے؟ آخر کیا ہونے والا تھا؟ عون کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد عون پہ ایک نفرت انگیز نگاہ ڈال کر ابو نے کسی باریش آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مولوی صاحب! بسم اللہ کیجیے۔"

ابو کی آواز میں دکھ تھا۔ شکستگی تھی' غصہ تھا اور سب سے بڑھ کر عون کے لیے شدید نفرت تھی۔ عون کا دم جیسے گھٹنے لگا۔ ابو کا اشارہ پاتے ہی مولوی نے خطبہ

بلند آواز میں پڑھا تھا۔ پھر کچھ رسمی کارروائی ہوئی تھی۔ رجسٹر پہ دستخط لیے گئے تھے۔ یہ کوئی ایجاب و قبول کی رسم تھی؟ یہ کسی کے نکاح کی رسم تھی؟ آخر یہ سب کیا تھا؟ کیوں تھا؟ کس لیے تھا؟

عون نے ابو کی زہر بھری گھوریوں سے خائف ہو کر غائب دماغی سے سائن کر دیے تھے۔ پھر ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی نے ابو اور چاچا کو گلے لگا کر مبارک باد دی تھی۔

یہ مبارک کس سلسلے کی کڑی تھی؟ یہ نکاح کس کا تھا؟ عون کا دماغ بند ہونے لگا۔ شعور کھونے لگا۔ عقل گم گئی۔ فہم مر گیا۔

اسے کچھ دیر بعد اسی سوٹڈ بوٹڈ آدمی نے گلے لگایا تھا۔ وہ آدمی کون تھا؟ وہ عون سے کیوں مل رہا تھا؟ بہت دیر بعد اس کے حواس ٹھکانے آئے تھے۔ بہت دیر بعد اس کی عقل نے کام کرنا شروع کیا تھا۔ بہت دیر بعد عون عباس کو پتا چلا تھا کہ یہ نکاح کی کارروائی ہو رہی تھی۔ اس کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ فریحہ سے نہیں، ماہ رو سرفراز سے اور یہ عمارت کسی ہوٹل کا کمرہ نہیں تھا بلکہ ایک نامور ہسپتال کی بلڈنگ تھی۔

اور جب تک اس کی عقل، شعور اور فہم نے کام کرنا شروع کیا تھا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی.... اتنی دیر کہ عون عباس منجمد ہو کر پتھر کا بت بن گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ماہ رو کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے بچا تھا۔

اس وقت وہ سکون آور دواؤں کے زیر اثر تھی۔ اگر لمحہ بھر کی تاخیر کے بعد اسے ہسپتال لایا جاتا تو تب تک ماہ رو کو برین ہیمبرج بھی ہو سکتا تھا۔

یہ تو ماہم تھی جو نوکروں کی مدد سے بروقت ماہ رو کو ہسپتال لے آئی تھی۔ انتہائی ذمہ دار ڈاکٹرز کی فوری ٹریٹمنٹ نے ماہ رو کو کسی بھی انتہائی تکلیف سے بچا لیا تھا۔

اسے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی ہوش آ گیا تھا۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد ایک قیامت سرفراز احمد کی منتظر تھی۔ وہ عالم غشی میں بھی "عباس عباس" پکارتی رہی تھی۔ وہ ہوش میں آ کر بھی چیخ چیخ کر روتی رہی تھی۔

"عباس! تم کہاں ہوں۔ تم رکتے کیوں نہیں؟ میں تمہارے پیچھے بھاگ بھاگ کر مر جاؤں گی۔ عباس! رک جاؤ۔ عباس! لوٹ آؤ.... دیکھو میں بری نہیں.... میں بری نہیں۔" وہ پچھلے ایک گھنٹے سے چلا رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ سرفراز احمد کے دل پہ جیسے قیامت بیت گئی تھی۔ وہ تڑپتی ماہ رو کو سینے سے لگا کر رو پڑے تھے۔ ابھی اس کی حالت کو دیکھ کر ڈاکٹر واحدی نے بھی سرفراز احمد سے عباس کے متعلق پوچھا تھا۔ سرفراز احمد خود انجان تھے۔ بھلا کیا بتاتے؟ ان سے اکلوتی بیٹی کا رونا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ صدمے سے ان کا دل پھٹ رہا تھا۔ وہ خود زندگی میں پہلی مرتبہ ماہ رو کو اس طرح تڑپتا دیکھ رہے تھے۔ ان کی جیسے جان نکل رہی تھی۔ یہ کون تھا جس نے ان کی شہزادی کو اس حال تک پہنچایا تھا۔ وہ زمین کے اوپر تھی، زندہ تھی لیکن چند ہی گھنٹوں میں ژولیدہ حال ہو چکی تھی۔ وہ ڈاکٹر واحدی کے بتانے پر خود بھی شاکڈ رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر واحد نے تنہائی میں انہیں بہت کچھ بتایا تھا۔ "آپ کی بیٹی عباس نامی کسی

جوان سے اٹیچ منٹ رکھتی ہے۔ یہ کوئی شدید صدمہ یا ٹارچر کیے جانے کا اثر ہے۔ آپ ماہ رو کو اعتماد میں لے کر اس مسئلے کا حل کریں۔" ڈاکٹر واحدی کے بتانے پر وہ نظر چرا گئے تھے۔ اور اس وقت ماہ رو کا تڑپ تڑپ کر رونا سرفراز احمد کے لیے کسی آزمائش سے کم نہیں تھا۔ وہ ان کے کندھے سے سر ٹکا رہی تھی۔ اس حال میں کہ ماہ رو کے آنسوؤں سے ان کا شانہ تر ہو چکا تھا۔

"ڈیڈی! بتائیں مجھے' میں بری لڑکی ہوں؟ میں اچھی لڑکی نہیں ہوں؟ اگر میں بری لڑکی ہوں تو آپ نے مجھے اچھا کیوں نہیں بنایا؟ ڈیڈی وہ کہتا ہے میں بری ہوں.... ڈیڈی! اسے جا کر بتا میں بری نہیں ہوں۔ میں گندی نہیں ہوں۔ اگر میں بری ہوں تو اس کے لیے اچھی بن جاؤں گی۔ ڈیڈی! میں اچھی ہو جاؤں گی۔ پلیز' عباس کو لا دیں۔ عباس کو واپس لا دیں۔" ماہ رو چیخ چیخ کر ایک مرتبہ پھر خرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ یوں کہ سرفراز احمد بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔ انہیں کچھ کچھ معاملہ سمجھ میں آ گیا تھا۔ انہیں ماہ رو کی حالت زار کا سبب سمجھ میں آ گیا تھا۔ ماہ رو اس قدر آگے تک پہنچ گئی تھی اور انہیں خبر ہی نہیں ہو سکی۔ وہ کیسے باپ تھے؟ انہیں علم نہیں ہو سکا' اور ان کی بیٹی اتنے بڑے بڑے کربناک فیز سے گزر گئی۔ ان کا ملال کم نہیں ہو رہا تھا۔ پچھتاوا کم نہیں ہو رہا تھا۔

ماہ رو کی حالت کچھ سنبھلی تو انہوں نے ماہم کو بلا لیا تھا۔ تب شازمہ بھی موجود تھی۔ ماہم نے شازمہ کی موجودگی میں کچھ کھل کر نہیں بتایا تھا۔ پھر بھی اس کی ڈھکی چھپی باتوں کو سرفراز احمد سمجھ گئے تھے۔ ان کی بیٹی ان حالوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ کیسی کیسی اذیتوں سے گزر گئی تھی۔ انہیں ملال گھیرے ہوئے تھا۔ انہیں پچھتاوے گھیرے ہوئے تھے۔ ماہ رو کا اقرار محبت انکشافات کا مرحلہ بھی تھا۔ انہیں لگ رہا تھا' ماہ رو کی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ کوئی کمی رہ گئی تھی۔ ورنہ یوں تو نہ ہوتا۔ آج انہیں شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ ماہ رو کی اپنی ماں ہوتی تو شاید ایسی صورت حال میں اسے نفسیاتی اور جذباتی سہارا دیتی۔ اس کا دکھ بٹاتی۔ اسے سمجھاتی اس تکلیف میں اسے اکیلے پن کا احساس نہ ہونے دیتی۔

شازمہ سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ ماہ رو کا آزار کم کرتی؟ شاید کبھی نہیں۔

سرفراز احمد شدید پریشان تھے اور اتنا انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ماہ رو سمجھنے سمجھانے والے فیز سے آگے نکل چکی تھی۔ وہ عباس سے محبت میں بہت آگے تک جا چکی تھی۔ جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔

پھر انہیں اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے کوئی سدباب تو کرنا ہی تھا۔ وہ کوئی مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے باپ تو نہیں تھے۔ اتنی سی بات پر بیٹی کو معتوب ٹھہرا دیتے.... وہ تو اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے آخری حد تک بھی جا سکتے تھے۔ انہیں ماہ رو کی خوشی ڈھونڈنی تھی۔ انہیں عباس تک پہنچنا تھا۔ عون عباس تک جانا تھا اور سرفراز احمد کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں تھا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

لیکن ہوا کچھ اس طرح سے۔

سرفراز احمد ابھی اپنے ذرائع الرٹ کر ہی رہے تھے جب شازمہ نے وہ کام کر دکھایا' جوان کے گمان میں خاصا کٹھن اور مشکل ترین تھے۔

وہ جو سوچ رہے تھے کہ انہیں خود اپنی بیٹی کا پرپوزل لے کر رحمان اور فرقان صاحب کے پاس جانا ہو گا.... شاید ان کی منت بھی کرنا پڑے۔ شاید انہیں مجبور بھی کرنا پڑے۔ شاید بیٹی کا باپ ہو کر التجا بھی کرنا پڑے۔ سرفراز احمد اس وقت دم بخود رہ گئے تھے جب خود بخود عون عباس کا باپ' اس کا چاچا اور اس کے بھائی شرمندہ حالت میں' انتہائی شرمسار' افسردہ' رنجیدہ اور سر جھکائے سرفراز احمد سے معافی مانگنے پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف سرفراز احمد سے معافی مانگی تھی بلکہ بڑی عاجزی کے عالم میں سر جھکا کر اپنے بیٹے کی غلطی اور گناہ تسلیم کرتے ہوئے ماہ رو کا رشتہ طلب کیا اور فوری نکاح پہ اصرار بھی کیا۔

یہ سب انتہائی اچانک ردعمل کے طور پر ہوا تھا۔

کیا عباس نے خود رشتہ بھیج دیا تھا۔ جب اسے ماہ رو کی تکلیف اور ہسپتال میں ایڈمٹ ہونے کا پتا چلا؟
سرفراز احمد نے کسی بھی بات پہ غور نہیں کیا تھا ان کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ جس خوشی کو وہ خود عون عباس کے گھر سے ڈھونڈ کر لاتے وہ خود بخود چل کر ان کی دہلیز پر آگئی تھی۔ یہ ان کی خوش نصیبی نہیں تو کیا تھا؟
یوں عون کے والد اور چاچا کے اصرار پہ فوری طور پر ہسپتال میں ہی نکاح کی کاروائی عمل میں لائی گئی تھی۔ رخصتی کے لیے اگلا دن مقرر ہو گیا۔ سرفراز احمد کو ماہ رو کی خرابی طبیعت کی وجہ سے اعتراض تو تھا ہی مگر شازمہ کے حامی بھر لینے کے بعد وہ خاموش ہو گئے تھے۔

یوں ماہ رو اگلے ہی دن بیاہ کر، پور پور سجا کر عون عباس کے گھر میں ہمیشہ کے لیے کسی سہانے خواب کی مانند اتر آئی تھی۔ ایسا خواب جو ایک ہی چھناکے میں ٹوٹ گیا تھا۔ اس بھیانک انداز میں کہ ماہ رو کراہ بھی نہیں سکی تھی۔

☆ ☆ ☆

نکاح کے بعد فوری رد عمل کے طور پر اس کا اپنے ہی گھر والوں پہ پھٹ پڑنا فطرت کا عین تقاضا تھا۔
جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اور جو کچھ کیا گیا تھا وہ کسی گہری سازش کا نتیجہ تھا۔
پہلے تو اسے نکاح کے دو گھنٹے بعد بھی یقین نہیں آیا تھا کہ ماہ رو سرفراز اس گھر میں، اس کی خواب گاہ میں ہمیشہ کے لیے آگئی تھی۔ وہی ماہ رو جس سے عون عباس کو شدید قسم کی نفرت ہو گئی تھی۔ اسی ماہ رو سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھڑوانے کی خاطر وہ کسی بدنصیب گھڑی میں اس کے گھر چلا گیا تھا۔ محض اسے آئینہ دکھانے۔ صرف اسے ذلیل کرنے اور بتانے کہ کم از کم آئندہ زندگی میں وہ اسے تنگ نہ کرے۔ وہ تو ماہ رو کے باپ کو اس کے کرتوت بتانے آیا تھا۔ مگر خود بری طرح سے پھنس گیا تھا۔
اور اسے بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ یہ گیم کس نے کھیلی تھی؟ یہ چال کس نے چلی تھی؟ وہ بھی اسی انداز میں کہ عون کا پورا گھرانہ اس کے خلاف ہو گیا تھا۔ ہر آنکھ میں اس کے لیے ملامت تھی۔ ہر آنکھ میں اس کے لیے غصہ تھا۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصوروار بن چکا تھا۔ ان سب نے عون کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا اور خود ہی سزا بھی سنا دی تھی۔
آج اپنے ہی گھر میں داخل ہوتے ہوئے عون کو اپنا آپ اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ایسے لگتا، ہر آنکھ اسی کے تعاقب میں ہے۔ جیسے اس نے بہت بڑا گناہ کر لیا تھا۔ جیسے اس نے بہت بڑا جرم کر دیا تھا۔
حالانکہ فریحہ سے اس کی شادی کو روکنے والے بھی اس کے گھر والے تھے۔ ماہ رو کو یہاں اس گھر میں لانے والے بھی یہی گھر والے تھے پھر ان کی ناراضی، غصہ، نفرت کا مطلب کیا تھا؟
وہ جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا۔ لیکن اسے نہ الجھنے کا اتنا وقت ملا تھا اور نہ سوچنے کا اتنا وقت ملا تھا۔ اس لیے کہ نکاح کے فوراً" بعد عون پہ بڑے بھیانک انکشافات ہوئے تھے۔
وہ سب کی نفرت غصے اور ملامت کی وجہ جان گیا تھا۔ وہ اپنے والدین کو حق پہ سمجھتے ہوئے ہر الزام سے بری کر چکا تھا۔
انہوں نے جو کیا تھا ٹھیک ہی کیا تھا۔ انہوں نے جو سنا تھا جیسا سنا تھا اسی پہ عمل کرنا تھا۔ اسی کو سچ ماننا تھا۔ اس کے غیرت مند ماں باپ کی طرح کوئی اور بھی ہوتا تو یہی کرتا اسے یہی کرنا تھا۔ ازالے کے طور پر وہ لوگ یہی کر سکتے تھے۔ اپنی عزت، ناموس اور وقار کو بچانے کے لیے اپنے تئیں عون کے ماں باپ نے بڑا بروقت فیصلہ کیا تھا۔
مگر چالبازوں کو تو ان کی سزا ملنی چاہیے نا؟
نکاح کے فوراً" بعد جب وہ کسی بپھرے طوفان کی طرح ہال کمرے میں موجود اپنے والدین اور بھائیوں پہ گرج رہا تھا۔
"آپ نے کچھ دیر پہلے جو میرے ساتھ کیا ہے۔

میں پوچھ سکتا ہوں؟ یہ سب کیا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ آپ نے میری زندگی کو کیوں تماشا بنایا؟" وہ نفرت اور آگ کا طوفان بنا ہوا تھا۔ وہ اس پوری رات لڑتا اور جھگڑتا رہا تھا۔ وہ اگلے دن تک بھی چیختا رہا.... غصہ کرتا رہا.... زہر اگلتا رہا۔

"یہ اس عورت کا منصوبہ ہے۔ اس نے مجھے چیٹ کیا۔ میں اسے کبھی کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔" وہ کف اڑاتا اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہا تھا۔

"آپ سب اس عورت کے ساتھ مل گئے تھے۔ کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا؟" عون شدت ضبط سے پھٹ پڑا تھا۔ "اور یہ اس کے والدین تھے۔ جو اس پہ ذرا بھی بھروسہ نہیں کرسکے تھے۔ بلکہ اس چالباز عورت کی چال میں آگئے تھے۔ کیا انہیں عون پہ اعتبار نہیں تھا؟

اور جب عون نے بھرے مجمع میں اپنے باپ سے سوال کرلیا تو انہوں نے ذرا بھی اس کے وقار کی لاج نہیں رکھی تھی۔ انہوں نے اسے منہ توڑ جواب دیا تھا۔ انہوں نے اس کے منہ پہ طمانچہ مار دیا تھا۔

"تماشا تو تم نے ہمارا بنا دیا ہے۔ شادی والے گھر کو ماتم کدہ بنا دیا ہے۔ تمہاری چاچی ہسپتال میں پڑی ہے۔ مہمان انگشت بداں ہیں۔ ہر آنکھ میں تجسس ہے، غصہ ہے، دلچسپی ہے۔ ہر زبان پہ قصے کہانیاں ہیں۔ جاؤ باہر نکل کر دیکھو اور زبان چلانے والوں کی زبانیں کاٹ آؤ۔ ہر کوئی تمہیں گناہ گار تسلیم کر رہا ہے۔ آخر کچھ تو تھا نا۔ جو بات یہاں تک اس نوبت تک آئی۔

پچھلے کچھ عرصے سے میں بھی تمہارے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا۔ پھر بھی دینی تربیت پہ ناز بہت تھا۔ جو اڑتے اڑتے قصے میرے کانوں تک پہنچ رہے ہیں۔ جھوٹے ہیں، بے بنیاد ہیں۔

ارے کوئی عزت دار شریف ماں باپ کی اولاد اتنا جھکتی نہیں۔ التجائیں نہیں کرتی اور وہ شریف آدمی کس قدر بے بس تھا۔ اور وہ عورت جس کی بیٹی کو اس کے گھر جا کر تم نے برباد کیا ہے اس عورت کا کیا قصور تھا جو روتی ہوئی میرے پاس آئی تھی۔ آخر کچھ تو تم نے ان لوگوں کے ساتھ کیا تھا۔ ان کی بیٹی کو کس انتہا تک پہنچا آئے کہ وہ ہسپتال میں زندگی موت کی کشمکش میں جا پڑی۔

تم پر قہر ٹوٹ پڑے۔ ذرا غیرت نہ آئی۔ ایک دن بعد تمہاری شادی کے شادیانے بجنے تھے اور تم نے اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر میرے سر میں خاک ڈلوادی۔ میری عزت کو دھجی دھجی بکھیر دیا۔ مجھے ذلیل و خوار کردیا۔ ساری دنیا کے سامنے سب سے بڑی بات میرے اکلوتے بھائی کے سامنے، اس کی اکلوتی بیٹی کے سامنے۔

آخ تھو، نفرت ہے مجھے تم سے۔ کاش میرے بس میں ہوتا تو تمہیں اپنی اولاد ماننے سے انکار کردیتا۔ تمہیں گھر بدر کردیتا۔ اپنے وجود اور کاروبار سے الگ کر دیتا۔

لیکن اس تمہاری ماں کی وجہ سے بے بس ہوں۔ یہ عورت مجھے کسی بھی انتہائی فیصلے تک نہ جانے دیتی۔ میں سبے بس ہوں اور تمہیں اس گھر میں رکھنے پہ مجبور ہوں۔

اس لیے کہ جس عزت دار، شریف آدمی کی بیٹی کے سر پہ چادر ڈال کر ایک دعوے کے تحت یہاں لایا ہوں۔ اب اس عہد سے پھر نہیں سکتا۔ اس عہد کو زندگی بھر نبھاؤں گا۔ اس کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر لایا ہوں اور تمہارے حصے کے گناہوں کی معافی مانگ کر آیا ہوں۔ اس لیے کہ میرے اپنے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔ میں کسی شریف آدمی کی بیٹی کو اپنی اولاد کے ہاتھوں برباد ہوتے اور اجڑتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔" ابو کا جاہ و جلال اور غصہ بحرِہند میں کسی طوفان سے کم نہیں تھا۔ اور عون تو ایسے بدک کر پیچھے ہٹا تھا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔

یہاں تو الزام در الزام کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ نہ کوئی اس سے وضاحت لے رہا تھا۔ نہ کوئی بات سن رہا تھا۔ نہ کسی کو عون کی وضاحتوں میں دلچسپی تھی۔ وہ اپنی صفائی کس کے سامنے پیش کرتا۔

اس کا پورا گھرانہ اس کے خلاف ہو چکا تھا۔ اور ابو تو صفائی میں ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کر رہے تھے۔ عون کو لگا تھا اس کے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔ کوئی نس تو ضرور پھٹ جائے گی۔ اس کی لہو رنگ آنکھوں میں شرارے پھوٹ رہے تھے۔ اس قدر بے اعتباری؟ اس قدر بد اعتمادی؟ صرف ایک دو ٹکے کی بے حیا عورت کی وجہ سے۔ جس نے رد دھو کر جانے کون سا ڈرامہ رچا کر اس کے والدین کو اپنے ہی بیٹے سے متنفر کر دیا تھا۔

عون کا دل چاہ رہا تھا ہر چیز کو آگ لگا دے۔ اس ماہ رو نای خون آشام بلا کو آگ لگا دے۔

"اور صد شکر کہ میری بیٹی فریحہ کی زندگی برباد ہونے سے بچ گئی۔ بروقت تمہارے کرتوت ہمارے سامنے آ گئے۔ بہت جلد تمہارا گھناؤنا روپ کھل گیا۔ اگر یہ سب بعد میں پتا چلتا تو کیا ہوتا۔ کس قدر برا ہوتا... اور تم نے اس بچی کو برباد کر کے اچھا نہیں کیا۔ میں اسی لیے ازالے کے طور پر تمہاری سزا بنا کر اسے یہاں لایا ہوں..." ابو ٹھونک بجا کر اعلان کر رہے تھے۔ بہت ساری آنکھوں میں ابو کے اس نیک عمل پہ ستائش بھری ہو گی۔ وہ اپنی عزت اچھالنے کی بجائے بڑی فہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں بیٹے کے عیبوں پہ پردہ ڈال کر اس ستم زدہ لڑکی کو بہو بنا کر گھر لے آئے تھے۔

یہ ان کی دور اندیشی اور دانش مندی ہی تو تھی۔

"برباد تو مجھے کیا ہے اس نے۔ میرے ہی گھر والوں کے سامنے مجھے ذلیل کیا ہے۔ میں اس سے انتقام لوں گا اور ضرور ہی لوں گا۔" غصے کی انتہا پہ عون کے اشتعال کا رخ کسی اور سمت نکل گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پھر سے خون بھر گیا تھا۔ ابو اس کے ارادے جان کر گرج دار لہجے میں پورے قد سے کھڑے ہو کر غرائے تھے۔

"خبردار' جو تم نے اس بچی کے ساتھ کوئی زیادتی کر کے میرا مزید تماشا لگوایا۔ خبردار' جو تم نے مزید میری عزت کا جنازہ نکلوایا... میں اس کے باپ کے ساتھ عہد باندھ کے آیا ہوں... مجھے اور ذلیل کیا تو کھڑے کھڑے گولی سے اڑا دوں گا۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اپنے اونچے پورے بیٹے کا گریبان چاک کر ڈالیں۔ ان قدموں کو کاٹ ڈالیں جن سے چل کر وہ سرفراز احمد کے گھر کی دہلیز پار کر کے گیا تھا۔

وہ باپ کے فیصلہ کن گرج دار لہجے اور بھیانک دھمکیوں پہ روہانسا ہو گیا تھا۔

"ابو! آپ میرا یقین کریں۔ میں نے کچھ برا نہیں کیا۔ میرا کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں... یہ سب جھوٹ ہے سازش ہے۔ میرے خلاف منصوبہ بنایا گیا ہے۔ میں تو فریحہ کے ساتھ شادی پہ خوش تھا۔ میں تو فریحہ..." عون نے شدت ضبط کے ساتھ آنکھیں دباتے بمشکل اپنے الفاظ منہ سے ادا کیے تھے۔ ابو نے اسے نفرت انگیز لہجے میں بے ساختہ روک دیا تھا۔ انہوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے چلا کر کہا۔

"میری بچی فریحہ کا اپنی گندی زبان سے نام بھی مت لو۔ سنا تم نے' آئندہ میں تمہارے منہ سے فریحہ کا ذکر بھی نہ سنوں۔ یہ تو میرا بھائی ہے۔ جس نے میری بے بسی کو سمجھا میرا ساتھ دیا۔ ہر قدم پہ میرے ساتھ رہا۔ تمہارے عیب دھونے بھی میرے ساتھ گیا۔ اس آدمی سے معافی مانگی۔ میں تو عمر بھر اپنے بھائی کا احسان مند رہوں گا۔" ابو گرجتے گرجتے آخر میں آبدیدہ ہو گئے تھے۔ پھر دوبارہ سے فارم میں آ گئے۔

اس کی امی جو چپکے چپکے رو رہی تھیں ایک دم عون کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

"بس بھی کریں' بہت ہو گیا۔ اپنی جذباتیت اور غصے کا پتا نہیں میرے بیٹے کی جان کا وبال بن گئے ہیں۔ اس کی غلطی کیا ہے؟ جرم کیا ہے؟ میرا بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی کی ضرور چال ہو گی۔" امی جو اتنے گھنٹوں سے خاموش تھیں۔ اچانک اس کے سامنے ڈھال بن گئی تھیں۔ امی کے اٹھتے ہی عاصم اور قاسم بھی کچھ جز بز سے ہوئے۔ شاید وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ اس یوم حساب کا خاتمہ ہو۔ عدالت برخاست کی جائے۔ جو ہونا تھا۔ وہ ہو گیا تھا۔ جو ذلت اٹھانا پڑی تھی۔ وہ اٹھالی

تھی۔ اب باقی کیا بچتا تھا؟ ادھر عاشر بھی بے قرار سا کھڑا ہو گیا۔

"ابو! آپ عون کو ایک موقع ضرور دیں۔ آپ اس کی بات تو سن لیں۔ کیا پتا' واقعی ہی کوئی سازش ہو۔ ہمارا عون ایسا تو نہیں۔ کیا آپ اپنی تربیت کو بھول گئے ہیں؟"

عاشر کے نرم انداز پہ ابو بھی کچھ نرم ضرور پڑے تھے تاہم یہ نرمی عون کے لیے ہرگز نہیں تھی۔ یہ نرمی صرف اور صرف اس شریف آدمی کی بیٹی کے لیے تھی جسے عون نے برباد کیا تھا۔ اور جس کے باپ نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنی بیٹی کے لیے خوشیوں کی بھیک مانگی تھی۔

"میری بیٹی بہت نادان ہے۔ نا سمجھ ہے۔ اس کی غلطیوں پہ درگزر کیجیے گا۔ اسے آپ سب کے پیار کی ضرورت ہے۔ میری بیٹی نے پیار کے معاملے میں بہت محرومی دیکھی ہے۔" وہ بار بار بھیگی آواز میں اپنی بیٹی کے لیے خوشیوں کی بھیک مانگ رہے تھے۔ اور آخری دم تک اپنی بیٹی کی نادانی' کم فہمی' جذباتیت اور کچھ کچھ خود سری کی بات بھی کرتے رہے تھے۔ اس وقت عون کے ابو کو عون پہ بہت غصہ تھا۔ وہ کسی بھی بات کو سن نہیں سکتے تھے تاہم ماہ رو کو خوش رکھنے کا عہد ضرور دے کر آئے تھے۔ اور اب اس عہد کو زبردستی نبھا کر دم لینے والے تھے۔ اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔

انہوں نے ببانگ دہل اعلان کر دیا تھا۔ کوئی بھی ماہ رو کو اس گھر میں تکلیف دینے کی کوشش نہیں کرے گا اور جسے وہ سنا رہے تھے وہ پیروں کی ٹھوکروں سے ایک ایک چیز اڑاتا' ہذیان بکتا نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ماہم نے کھڑکی سے پردے سمیٹ کر اے سی کی کولنگ کو کم کیا۔ پھر وہ بیڈ پہ آڑھی ترچھی لیٹی ماہ رو کو زبردستی اٹھا کر غرائی تھی۔

"اٹھ جاؤ ماہ رو! وہ لوگ آ بھی چکے۔ اور ابھی تمہارا اشنان بھی باقی ہے۔" اسے ہسپتال سے آئے سات گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے جب حواس باختہ سی ماہم اس کے روم میں بھاگی بھاگی چلی آئی تھی۔ اس کا چہرہ جوش کے عالم میں سرخ تھا۔ حواس باختہ تھے' آنکھیں چمک رہی تھیں۔ رنگت گلابی تھی۔

اس نے نیند میں دھت سوئی ماہ رو کو جھنجوڑ کر اٹھا دیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ماہ رو دوبارہ تکیے میں گم ہو گئی تھی۔ ماہم اسے جگا جگا کر تھک چکی تب اسے ٹھنڈے پانی کا خیال آیا تھا۔ وہ کیسے اپنا پرانا حربہ بھول گئی تھی؟ ماہ رو کے پیروں پہ پانی ڈالتے ہی اس کی نیند کو بھگا دینے کا قدرتی ٹوٹکا تھا۔

پیر گیلے ہوتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی جیسے اس وقت اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ نیند میں گم... مندی مندی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی۔

ماہم نے اسے ڈپٹ کر کہا۔

"ماہ رو! اٹھ جاؤ' وہ لوگ آ بھی چکے۔ تم نے تیار بھی ہونا ہے۔ یہ نہ ہو تمہیں چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔" ماہم نے اسے دھمکایا تھا۔ تب وہ ایک مرتبہ پھر تکیے پہ سر گرا کر بے انتہا ہنسنے لگی تھی۔ ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔ اس کی ہنسی کے گھنگھرو پورے روم کی فضا کو کھنکھنانے پہ مجبور کر رہے تھے۔

یوں لگ رہا تھا وہ اتنے گھنٹوں کی گھٹن' حبس اور غبار کو ہنسی کی صورت میں ہمیشہ کے لیے باہر نکال دینا چاہتی ہے... اپنے من کو شانت کر لینا چاہتی ہے۔ آخر دل کی مراد جو بر آئی تھی۔

ماہم نے زبردستی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر آواز دبانے کی کوشش کی تھی۔

"باقی اپنی سسرال جا کر ہنسی کے سر بکھیر لینا۔ ابھی فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔" ماہم نے اسے کھینچ کر بیڈ سے اتارا تھا۔ تب وہ لمبی سی انگڑائی لے کر ہنستی ہوئے بڑے دلفریب لہجے میں بولی تھی۔

"پہلے مجھے یقین دلا دو ماہم! کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟ یہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر میری زندگی میں کیا کیا نہیں ہو چکا؟ میری ذات بدل گئی' نام بدل گیا'

زیست بدل گئی اور میں خود بھی بدل گئی۔ مجھے یقین کیوں نہیں آرہا ماہم! کہ خوابوں کی تعبیریں یوں بھی مل جاتی ہیں؟ محبتیں یوں مل جاتی ہیں عشق تکمیل کے مراحل تک بھی پہنچتا ہے؟ محبت کو وصل کی شب بھی نصیب ہوتی ہے؟

"مجھے یقین نہیں آرہا ماہم! بالکل نہیں آرہا... چوبیس گھنٹے پہلے ایک قیامت میری ہستی کو ہلا گئی تھی۔ وہ قیامت جسے میں دوبارہ سوچنا بھی نہیں چاہتی... وہ لمحے جنہیں میں ہمیشہ کے لیے بھول جانا چاہتی ہوں۔ وہ اذیت جو اسی وقت اپنا اثر کھو گئی تھی جب میرے نام کے ساتھ عباس کا نام جڑ گیا تھا۔ لیکن ماہم! مجھے یقین کیوں نہیں آرہا؟ یہ ممکن کیسے ہوا؟ عباس جیسا آتش فشاں 'گل و گلزار' کیسے بنا؟ اس نے اقرار کس طرح سے کیا؟ ہمارا نکاح کیسے ہوا؟ وہ کس طرح سے مان گیا؟ محض چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر سب کچھ میری چاہت 'خواہش اور تمنا کے مطابق کس طرح سے ہوا یہ..." وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بڑی گہری باتیں کر رہی تھیں۔ کیونکہ جب سے نکاح ہوا تھا تب سے اس کا ذہن ان سوالوں کی یلغار میں خاصا گھٹ رہا تھا۔ وہ ماہم کے ساتھ سب کچھ شیئر کرکے خود کو پرسکون کرنا چاہتی تھی۔

"بی بی! تم آم کھاؤ... اب پیڑ کیوں گنتی ہو۔" ماہم کا انداز مزاحیہ قسم کا تھا۔ وہ اس کا گال کھینچتے ہوئے بولی تھی۔

"عباس پہ کیوپڈ کا تیر چل گیا ہو گا' اس وقت شرارے تو اگل گیا تھا۔ بعد میں جا کر احساس ہو گیا ہو گا۔ وہ کیوں ماہ رو کا دل توڑ آیا۔" ماہم نے مسکرا کر اس کے وہم دور کرنا چاہے تھے۔

"رئیلی؟" اس کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں۔ ماہم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر یوں ہوا کہ اسی رات بارہ بجے تک وہ اپنے ابا' چاچا اور بھائیوں کے ساتھ دوبارہ تمہارا دل جوڑنے ہسپتال پہنچ گیا۔" دل جوڑنے سے مراد نکاح تھا۔ ماہم اپنے انداز میں ہی گفتگو کرتی تھی اور بہت اچھی گفتگو کرتی تھی۔

"اس کے گھر والے اتنا اچانک مان گئے؟ مجھے یقین نہیں آتا۔" اس نے بے تابی سے کہا تھا۔ تب ماہم نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"او۔۔ سلی گرل! مان گئے تھے تبھی کل نکاح کر گئے اور آج وہ سب نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ تمہیں رخصت کروانے آئے ہیں۔" ماہم نے اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔ ماہ رو کا دل جیسے دھک دھک کرنے لگا۔ دل کی لے کچھ بدل گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بار حیا سے جھک گئیں۔ دھڑکنوں میں غضب کا طلاطم برپا ہو گیا تھا۔ ماہم اس دلفریب منظر سے لطف اندوز ہوتی مسکرا کر بولی۔

"میں تو چاہتی تھی تمہاری شادی دھوم دھام سے ہو۔ مگر وہ لوگ سادگی پہ زور دے رہے تھے۔ پھر شازمہ آنٹی نے بھی کہا۔ جیسے وہ لوگ مناسب سمجھیں۔"

"ممی نے؟" ماہ رو کچھ چونک گئی تھی۔

"ہوں۔" ماہم نے بتایا۔ بلکہ مزید بھی بتایا۔

"نو ڈاؤٹ' ان دنوں میں شازمہ آنٹی نے تمہاری رئیل مدر جیسا رول پلے کیا ہے۔ اللہ ان کی ابیلٹی بڑھائے۔ اس تمام سیٹ اپ کو جو اس قدر اپ سیٹ ہو چکا تھا۔ اسے اپنے پوائنٹ آف ویو یا میتھڈ سے شازمہ آنٹی نے اپنی فل سٹرینتھ اور' ابیلٹی اور انرجی کے ساتھ ہینڈل کیا۔" ماہم کے لہجے میں ستائش بھری تھی۔ اور وہ پہلی مرتبہ شازمہ کی تعریف کر رہی تھی۔

"اس نکاح کے بعد آج رخصتی میں ہر قسم کی فنڈنگ پلاننگ شازمہ آنٹی کی تھی۔ اور ان کے پریکٹیکل نالج کی وجہ سے آج یہ خوب صورت وقت تمہارا نصیب بنا ہے۔ اور تم ہمیشہ کے لیے عباس کی ہونے جا رہی ہو۔" ماہم نے اس کی حیران آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا۔ ماہ رو کا تحیر بڑھتا چلا گیا۔ بڑھتا چلا گیا۔

"گو کہ یقین نہیں آتا... بٹ مان لیتی ہوں۔" وہ

شرارتاً" مسکرائی تھی۔ "اب سارا کریڈٹ ممی کو دینا پڑے گا۔ محبت میں ہماری خواری تو بھاڑ میں گئی۔"

"تم جا کر اسے پوری حکایت سنا دینا۔" ماہم نے مشورہ دیا تھا۔ پھر اسے واش روم کی طرف دھکیلا۔

"ہری اپ، ابھی بیوٹیشن پہنچ جائے گی۔ یہ بھی کریڈٹ تمہاری ممی کو جاتا ہے۔ صبح سویرے برائیڈل ڈریس، جیولری، شوز اور تمہاری کافی شاپنگ کرلائی ہیں۔ وہ لوگ تو سادگی سے ہی چاہتے تھے پھر بھی آنٹی نے کافی اہتمام کرلیا۔" ماہم ممی سے کچھ زیادہ ہی متاثر لگ رہی تھی۔

پھر جب ماہ رو فریش ہو کر نہا کے باہر نکلی تب تک بیوٹیشن بھی پہنچ گئی تھی۔ مزید اسے ماہم سے کوئی بھی بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ حالانکہ وہ عباس کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔

پھر جب بیوٹیشن اس کے حسن کو چار چاند لگا کر چلی گئی اور ماہم اس کے حسن، خوب صورتی اور روپ کے جلووں کو دیکھ کر مصنوعی بے ہوش ہوگئی تھی تب ماہ رو نے اس کا بازو دبوچتے ہوئے زوردار قسم کی چٹکی کاٹ کر کہا۔ کیونکہ یہ کلبلاتا سوال اس کی جان لینے کے درپے تھا۔ ماہم نے سب کچھ بتایا تھا لیکن عباس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔

"یہ ایکٹنگ چھوڑو، مجھے اتنا بتادو..... عباس کیسا لگ رہا ہے؟" ماہ رو کے اس سوال پہ ماہم کی بے ہوشی خود بخود ٹوٹ گئی تھی۔ وہ پٹ سے آنکھیں کھول کر اٹھی۔ پھر اس نے بڑی حیران آنکھوں سے دیکھتی ماہ رو کی حسین آنکھوں میں اور بھی حیرانگی بھر دی تھی۔

"عباس تو نہیں آیا۔ اس کی ای، ابو بھائی اور ایک بھابھی ضرور ہیں۔" اور ابھی ماہم مزید عباس کے نہ آنے پہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے روشنی ڈالنا چاہتی تھی جب اچانک دروازہ کھلا تھا اور ڈیڈی، شازمہ، عون کی امی اندر داخل ہوگئے تھے۔ تب سارے سوال، جواب، جواز اور وہم بھول کر ماہ رو ڈیڈی کی کھلی بانہوں میں سما گئی تھی۔

وہ آج اپنے ڈیڈی سے رخصت ہو رہی تھی گو کہ ڈیڈی نے اس کے ساتھ بہت کم وقت گزارا تھا۔ بہت کم اپنی محبت سے نوازا تھا پھر بھی اس نازک گھڑی میں اس کا دل بھر بھر آیا۔

اس کے آنسو آنکھوں سے اتنی خاموشی سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکی۔ عون کی بھابھی نے اسے چادر اوڑھادی تھی۔

پھر وہ ڈیڈی کے بازوؤں کی زنجیر میں سر ٹکا کر روتی رہی۔ اور ڈیڈی کا ہاتھ اس کے سر پہ کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا تھا۔

ڈیڈی نے ماہ رو کی پیشانی چومی تھی۔ تو یوں لگا، تپتے صحرا میں ٹھنڈی میٹھی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔

اور جب وہ اپنے عالیشان بنگلے کی سیڑھی سے جو دبیز ایرانی قالین سے مزین تھی۔ سہج سہج اتر رہی تھی۔ تو اسے اندازا نہیں تھا۔ وہ کہاں اتر رہی ہے؟ وہ بلندی سے پستی میں اتر رہی ہے۔ وہ آسمان سے پاتال کی طرف آرہی ہے۔ اور لاؤنج سے گزرتے ہوئے اسے اچانک عون عباس کے نقش پا کا خیال آگیا تھا۔

اسی فرش پہ عون کے پیروں کی دھمک پڑی تھی جس نے ماہ رو کے دل کی دھرتی کو ہلا دیا تھا۔ ابھی دو دن پہلے وہ اسے دھتکار گیا تھا۔ وہ اسے دھتکار تا آرہا تھا۔ اور گلاب کی نم شفاف ملائم اور حسین پتیوں پہ چلتے ہوئے ماہ رو سرفراز کو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ نرم پتیاں نہیں، آبلہ پائی کے سفر کا ایک ٹریلر تھا۔

کیونکہ ماہ رو سرفراز کے راہ گزر کی مسافتوں کا ابھی اختتام نہیں ہوا تھا۔ ابھی یک طرفہ محبت کا یہ سفر تمام نہیں ہوا تھا۔

مجھے منزلوں سے عزیز تر ہیں تیری راہ گزر کی مسافتیں
کہ لکھی ہیں میرے نصیب میں ابھی عمر بھر کی مسافتیں
اسی ایک پل کی تلاش میں، جسے لوگ کہتے ہیں زندگی
تیری راہ گزر میں بکھر گئیں، میری عمر بھر کی مسافتیں

یہ اماوس کی گہری اور کالی رات تھی۔ کسی بھی ذی شعور کو خوف اور بھیانک خوف میں مبتلا کرنے والی۔ گہری' کالی اور سیاہ رات۔ جس کی پیشانی پہ کوئی ایک جگنو یا ستارہ نہیں چمکتا تھا۔ اسے پتا تو تھا' اماوس کالی اور خوف ناک بھی ہوتی ہے اور اماوس سیاہ نصیب بھی ہوتی ہے۔ اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ اماوس بد نصیبوں کی زندگی میں "کالی رات" بن کر اترتی ہے شب برات بن کر نہیں اترتی۔ اور وہ جانتی تھی کہ اماوس مسطر سے جس کی زندگی کے گرد سیاہ حاشیہ لگا دیتے پھر کبھی کوئی بدنصیب ان کے حصار سے نکل نہیں پاتا تھا۔ اس کی زندگی پھر اماوس کے دائرے میں' ہمیشہ رہتی ہے۔ نہ بڑھتی نہ گھٹتی بس عمر بھر کے لیے ٹھہر جاتی۔ دراصل اماوس فریحہ کی طرح محبت کے ماروں اور نصیب سے ہاروں کی قسمت میں خود بخود دبے قدموں چلے آتی تھی۔ جیسے سندر روپ چاند کا برج عقرب میں جانے کا وقت جو بڑا منحوس مانا جاتا تھا۔ اور فریحہ کو لگتا تھا اس کی زندگی کا چاند بھی قمر در عقرب میں عمر بھر کے لیے داخل ہو گیا ہے۔

فریحہ کو آج اماوس بھری رات میں "ودان ون نائٹ" کا مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔ ان الفاظ کا فریحہ کی زندگی پہ اتنا گہرا' بھیانک اور اچانک اثر پڑے گا۔ یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ کیا کسی کے ساتھ "راتوں رات" یہ حادثہ ہوا تھا؟ جو فریحہ کے دل اور اس کی زندگی پہ گزرا؟۔ وہ مایوں کے پیلے جوڑے سے میت کے سفید جوڑے تک آ گئی۔ راتوں رات میں' صرف ایک رات میں۔ یہی رحمان منزل جہاں روشنیاں جگ جگ کر رہی تھیں۔ ڈھولک کی تھاپ گونج رہی تھی۔ قبرستان کے سناٹوں سے بڑھ کر خاموش ہو چکی تھی۔ شادی کے سارے رنگ اتر چکے تھے۔ اور فریحہ کا مایوں و مہندی کا جوڑا اونچے پلنگ کے عین اوپر گول مول سا انتہائی خستہ حالت میں نوحہ کناں تھا۔ کانچ کی زرد اور ہری چوڑیوں کا ڈھیر کرچی کرچی فرش پہ پڑا اپنی اس ناقدری پہ رنجیدہ خاطر تھا۔ یہ تو مہندی مایوں کا جوڑا اور چوڑیاں ہی تھیں جنہیں اپنی ناقدری کا الگ سے ہی صدمہ اٹھانا پڑا تھا۔ یہاں تو جیتے جاگتے انسان تک "بے مول" اور "بے قیمت" ہو چکے تھے۔

فریحہ اپنی اس ذلت' توہین اور ناقدری کا رونا کسے دکھاتی؟ وہ اپنے ٹوٹے دل کے کانچ اٹھا اٹھا کر کس کی ہتھیلی پہ رکھتی؟ اس کے وہ تایا جو اپنی "ناموس" عزت اور خاندانی حشمت کو بچانے کی خاطر فریحہ کے دل کا سودا کر آئے تھے۔ اس کی خوشی اور محبوب کو کسی اور کی جھولی میں ڈال آئے تھے۔ کیا اس کے جان سے پیارے تایا نے اچھا کیا تھا؟ وہ رات کی سیاہی سے پوچھ پوچھ کر تھک رہی تھی۔ رو رو کر نڈھال ہو رہی تھی۔ ٹوٹے خوابوں کے کانچ اٹھا اٹھا کر زخمی ہو رہی تھی۔ کیا وہ اماوس کی طرح بدنصیب تھی جو اس کے نصیب کا ستارہ گردش کرتا کرتا کسی اور کے نصیب کی پیشانی پہ جگمگانے لگا تھا۔ اور وہ ماہ رو سرفراز' آسمان کا چمکتا چاند' اپنے تمام تر کروفر اور غرور کے ساتھ اس کی ذات کا مکمل افتخار چھین کر بڑی شان' بڑی آن اور بڑی مہمان بن کر اسی رحمان منزل میں جلوہ افروز ہو چکی تھی۔ اس شبستان میں جسے فریحہ کے لیے پور پور سجایا گیا تھا۔ وہ خوب صورت خواب گاہ' جو فریحہ کے لیے خاص الخاص تیار کی گئی تھی اس پہ کس ہوشیاری کے ساتھ ماہ رو سرفراز نے قبضہ جما لیا تھا۔ کوئی ایسا قابض بھی ہوتا ہے؟ کوئی ایسا بھی سنگ دل ہوتا ہے؟ اور فریحہ نہ بول سکی تھی' نہ چیخ سکی تھی' نہ احتجاج کر سکی تھی۔ جبکہ ماہ رو سرفراز نے بڑی اعلا پائے کی سازشوں' منصوبوں اور چالوں کے ساتھ واویلا مچا کر عمر بھر کے لیے عون عباس کو اپنے دام میں کر لیا تھا۔ اور اس نے کتنی بڑی چال چلی تھی۔ ان ہی کے ہاتھوں ان ہی کا قتل عام کر دیا تھا۔ اور خود بے گناہ بھی رہی اور مظلوم بھی۔ نہ پھانسی ہوئی نہ دار پہ چڑھی۔ جس طرح وہ فریحہ سے اس کی زندگی اس کی خوشی زبردستی چھین چکی تھی۔ اسی طرح فریحہ جانتی تھی کہ اپنے حسن جہاں سوز کے ہتھیاروں سے ایک نہ ایک دن عون عباس کو بھی پسپا کر دے گی۔ کیوں کہ ماہ رو سرفراز کے پاس اداؤں کے' حسن کے'

چالوں کے تمام تر داؤ محفوظ پڑے تھے۔ وہ جو چاہتی، استعمال میں لے آتی۔

اور ابھی جب چند گھنٹے پہلے وہ دلہن کا حسین روپ سجا کر اپنی ساس کے جلو میں رحمان منزل کی راہداریوں میں سے گزر رہی تھی۔ تب پہلے سے گھر میں موجود عون عباس، بڑے ہال کے بند دروازوں کے اندرونی طرف اپنے باپ پہ اسی شدت کے ساتھ چلا رہا تھا جس شدت کے ساتھ وہ اس زبردستی کے نکاح کی رسم کے بعد چلایا تھا۔ غم و غصے سے بے حال تھا اور اس کے زہر میں بجھے الفاظ فریحہ کے جلتے بلتے دل پہ کسی پھوار کی مانند برس رہے تھے۔

"آپ نے اپنی ضد پوری کر تو لی ہے ابو! اسے بھگتنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ عون عباس کو جیتنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ یہ ماہ رو سرفراز کی بھول ہے کہ شاطرانہ چالوں سے انسان خریدے جاسکتے ہیں اور شاید خریدے جا بھی سکتے ہیں، لیکن عون عباس کو خریدنا اتنا سہل نہیں ہوگا۔" اس کے شعلوں میں لتھڑے الفاظ بڑے ہال کی کھڑکیوں سے باہر تک اس تکون کمرے میں بھی پہنچ رہے تھے جو فریحہ فرقان کی خواب گاہ میں شمار ہوتا تھا اور اس وقت کھڑکی کے پٹ کو ہاتھ میں پکڑے اس کی جلتی روح پہ سکون کی چھینٹیں گر رہی تھیں۔

"میں اس سازش کو "بو" پالوں گا اور اس کہانی کو زمین سے بھی اکھاڑ کر باہر لے آؤں گا جسے آپ کو سنا کر بے وقوف بنایا گیا تھا اور آپ آنکھیں بند کر کے اس پہ ایمان لے آئے۔" عون کی زخمی پھنکار میں اس شیر کی غراہٹ تھی جو اپنے شکار کی تلاش میں بو سونگھتا پھر رہا تھا۔ فریحہ نے کھڑکی کا پٹ اور بھی مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

"آپ نے اسے میرے سر پر مسلط کیا ہے۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" وہ ابھی تک غرا رہا تھا۔

"دیکھو، دیکھو۔۔۔ اس کے انداز؟ سب کچھ کر کرا کے معصوم بن رہا ہے جیسے اس کا کوئی گناہ نہ ہو۔ ارے میں تو تمہارے عیبوں پہ پردہ ڈال کر اسے گھر لے آیا ہوں۔ اپنی اور تمہاری بھی نام نہاد عزت بچالی ہے۔ ورنہ جو تم نے جرم کیا تھا اس کی کہیں معافی نہیں تھی۔" تایا رحمان بھی غرا اٹھے تھے۔ آخر عون کے باپ تھے۔ کیسے خاموش رہتے۔ باپ بیٹا ویسے بھی سیر اور سوا سیر کی واضح مثال تھے۔

"میں نے کیا جرم کیا تھا؟" وہ ایک مرتبہ پھر بھپھر اٹھا۔

"یہ جرم نہیں تھا۔ ایک شریف آدمی کے گھر پہ اس کی غیر موجودگی میں دھاوا بولنا۔ اس کی بیٹی کو زدوکوب کرنا۔ جس کی وجہ سے وہ اسپتال میں جا پڑی تھی اور اس معصوم کی عزت۔۔۔" آخر میں ان کا لہجہ کانپ سا گیا تھا۔ پورے وجود میں تھرتھراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ غم و غصے سے بے حال کانپ رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا اپنے ہی لخت جگر کو گولی سے اڑا دیں۔ وہ تو اسے منہ ہی نہیں لگانا چاہ رہے تھے۔ یہ تو عون تھا جو خود بخود اسی دلدل میں کنکریاں پھینک کر اپنے ہی اوپر گندی چھینٹیں ڈلوا رہا تھا۔ دراصل وہ اس ذلت کو بھول ہی نہیں پا رہا تھا جو اس نے پورے خاندان دوستوں، رشتے داروں اور مہمانوں کے سامنے جھیلی تھی۔

"کھاؤ قسم! تم سرفراز احمد کے گھر نہیں گئے تھے؟" وہ لہو رنگ آنکھوں سے اسے گھور کر پوچھ رہے تھے یہ ایسا مقام تھا جس پہ عون جھوٹا پڑ سکتا تھا اور انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر میری بات سن لیتے تو ان عذابوں میں نہ پڑتے۔ میں اس لیے نہیں گیا تھا وہاں۔۔۔ میں تو۔۔۔" اس کی وضاحت کا گلا تایا رحمان نے ایک ہی دہاڑ میں گھونٹ دیا تھا۔

"تم گئے تھے یا نہیں؟ مجھے ہاں یا نہ میں جواب دو۔" وہ غضب ناک انداز میں چلائے تھے۔ فریحہ نے اپنے دل پہ ہاتھ جا رکھا۔ جانے عون کیا جواب دے گا؟ اگر اس نے ہاں بول دیا تو؟

"آپ نہیں سمجھ رہے ابو! کچھ نہیں سمجھ رہے۔

وہ میرے پیچھے خود پڑی تھی۔ آپ کچھ نہیں جانتے" مجھے موقع تو دیں۔ کم از کم ایک موقع تو دیں۔۔۔ میں آپ کو ساری بات بتادوں گا۔ میں تو۔۔۔" وہ جو دو ٹوک گفتگو کر کے مقابل کو دوسرا موقع ہی نہیں دیتا تھا بولنے کا لمحہ بھر کے لیے ہکلا گیا۔ کیونکہ تایا رحمان ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ کر چلا اٹھے تھے۔

"میں تم سے کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔ تم کچھ اور بکواس کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ تم سیٹھ سرفراز کے گھر گئے تھے یا نہیں؟" ان کی رگیں مارے طیش کے پھول کر نیلی ہو گئی تھیں۔

"میں اسے روکنے کے لیے۔ اسے منع کرنے کے لیے اور اس کے باپ کو اس کے تمام کرتوت بتانے کے لیے گیا تھا۔ میرا مقصد کچھ اور نہیں تھا۔ باخدا' میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ بہت آوارہ مزاج لڑکی۔۔۔" عون نے مارے طیش کے انتہائی فحش گالی بکی تھی جسے سن کر تایا رحمان گرج اٹھے تھے۔

"اپنا منہ بند رکھو ذلیل آدمی! خبردار' جو تم نے اسے اب دوبارہ گالی دی۔ وہ کل کیا تھی؟ میں نہیں جانتا' لیکن آج وہ میرے خاندان کی عزت ہے اور مجھے اپنی عزت کی حفاظت کرنا آتی ہے۔ اور رہی تمہاری بکواس تو۔۔۔ اس کی میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ کیونکہ تم اب ہر قسم کی جھوٹی کہانی سنا کر اپنی "میں" کو برقرار رکھو گے اور اپنا دفاع کرنے کی کوشش کرو گے۔ تم میرے باپ نہیں۔ میں تمہارا باپ ہوں اور سب جانتا ہوں جو کچھ ہوا یا جو کچھ تم نے کیا تم میں ایسی غیرت ہوتی تو بار بار اس شرم ناک قصے کو دوبارہ مت چھیڑتے جس پہ میں نے مٹی ڈال دی تھی یا جس ذلالت کو سیٹھ سرفراز نے دفن کر دیا تھا اس کو اکھاڑنے سے پہلے دس مرتبہ سوچتے کیونکہ ہر دفعہ تمہارا ہی شرم ناک کارنامہ کھل کے سامنے آتا تھا اور میں تو منہ چھپاتا پھرتا اب تک اگر سیٹھ سرفراز میری التجا پہ کان نہ دھرتے۔" وہ آنکھیں اور کان بند کر کے اپنی بات پہ زور دیتے تھے۔ اپنی بات منواتے تھے۔ اپنی ضد پر قائم رہتے تھے اور اپنی ہی بات کو ہی حقیقت اور سچ تسلیم کرتے۔ باقی سب ان کے سامنے جھوٹ' بکواس اور چربہ تھا۔

"یہ تو سیٹھ سرفراز کی مہربانی جو انہوں نے اپنی بیٹی کا نکاح تم جیسے کمینے کے ساتھ کر دیا تھا۔ ورنہ تمہیں تو اس تمام بدنامی کے بعد کوئی شریف خاندان اپنی بیٹی کا رشتہ نہ دیتا۔" انہوں نے نفرت انگیز لہجے میں اس کی دکھتی رگ پہ پھر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ ایک دم ہی بھڑک اٹھا۔

"میں مر نہیں رہا تھا سیٹھ سرفراز کی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے بلکہ وہ خود مر رہی تھی مجھ پہ۔" عون زہر خند ہوا تھا پھر اس نے دروازے کے پاس رکھی میز کو زوردار ٹھوکر ماری اور کمرے سے بکتا جھکتا نکل گیا تھا جبکہ تایا رحمان مارے غیض کے ہال میں ٹہلنے لگے۔ فریحہ نے آوازوں کو ختم ہوتا محسوس کر کے کھڑکی بند کر دی تھی اور اس کی پشت سے ٹیک لگا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اسے تایا رحمان کی باتیں رہ رہ کر رلانے پہ مجبور کرتیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ عون نے جو کچھ کیا تھا اس کے نتائج میں وہ شریفوں کی فہرست سے نکل چکا تھا اور اسے کوئی ڈھنگ کا رشتہ بھی نہیں مل سکتا تھا' لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے ان کے اپنے ہی بھائی کی بیٹی اسے ہر الزام سے بری سمجھتی تھی۔ اس سے شادی کی خواہش مند تھی اور اس رشتے کے ٹوٹنے کی وجہ سے اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر مر رہی تھی۔

اگر عون برا تھا یا اس نے کچھ برا کیا تھا تو پھر سیٹھ سرفراز نے اپنی بیٹی کیوں اس کے ساتھ بیاہی تھی؟ کوئی بھی اس پہلو پہ نہیں سوچتا تھا۔ اور عون بقول ان سب کے یہ کچھ غیر اخلاقی کام کر بھی چکا تھا تو ان سب کو کیا تکلیف تھی؟ اور ان سب نے مل کر فریحہ کو تختہ مشق کیوں بنایا؟۔ وہ عون کی اس کے ساتھ شادی ہو جانے دیتے۔ انہوں نے یہ شادی کیوں ختم کی تھی؟ آخر کیوں؟ کسی کو بھی فریحہ پہ رحم نہیں آیا تھا اور کوئی جانتا یا نہ جانتا' فریحہ تو جانتی تھی۔ اسی وقت سے جانتی تھی جب ماہ رو نے رحمان بلازہ میں عون کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی تھی۔ پھر بارہا فریحہ نے محسوس کیا تھا۔ وہ اس

گھر میں عون کے لیے آئی تھی۔ اس کے گھر والوں سے عون کے لیے گھلتی ملتی تھی۔ وہ اپنا سکہ پہلے سے ہی جمانا چاہتی تھی اور اس کے گھر والوں کو اپنے حسن اور دولت کے جال میں قید کر کے مٹھی میں کرنا چاہتی تھی۔ یہاں تک تو اس کی چالیں کامیاب ہو چکی تھیں۔ پھر آگے عون تک رسائی کا مسئلہ تھا۔ اس کی زندگی میں داخل ہونے کے لیے پری پلاننگ کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اتنا تو ماہ رو بھی جان گئی ہوگی کہ بہت آسانی کے ساتھ وہ عون عباس جیسے مضبوط قلعے کو فتح نہیں کر سکتی۔ پھر اس نے پوری منصوبہ سازی کے بعد عون کے باپ تک رسائی حاصل کی ہوگی۔ انہیں جھوٹ موٹ کے قصے سنا کر رام کر لیا ہوگا اور یقیناً "ماہ رو ایسا کر سکتی تھی۔ اس کے لیے یہ سب دائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ تھوڑا مشکل تھوڑا آسان۔ سو ماہ رو نے اپنا شکار حاصل کر لیا تھا۔ اس کے من کی مراد بر آ گئی تھی۔ اسے وصل کی شب نصیب ہو گئی تھی اور آج وہ ماہ رو سرفراز فریحہ کے حصے کی زمین پر اپنے خوابوں کا شیش محل بنا رہی تھی۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک ماہ رو کو معاف نہیں کر سکتی تھی اور آج ماہ رو کس قدر شانت ہو گئی۔ کیونکہ اس نے عمر بھر کے لیے تمام تر دکھ، کرب، ذلت، بے چینی، آنسو اور اضطراب فریحہ کی جھولی میں ڈال دیا تھا، لیکن کیا وہ فریحہ کے سپنوں کی سرزمین پہ اپنے لیے محبت کی کوئی فصل کاشت کر پائے گی؟ کیا وہ فریحہ کے آنسوؤں اور بددعاؤں کی زیر سایہ خوش گوار ازدواجی زندگی گزار پائے گی؟ اور کیا وہ حقیقت میں عون عباس کی محبت حاصل کر پائے گی؟ شاید کبھی نہیں۔ کسی حال میں بھی نہیں۔ آخری سانس تک نہیں کیونکہ بیچ میں فریحہ فرقان کھڑی تھی۔ وہ ان دونوں کے درمیان ایک خلیج بن کر تن کے کھڑی تھی۔ وہ کبھی ان دونوں کو ایک نہیں ہونے دے گی۔ وہ یعنی فریحہ فرقان عمر بھر کے لیے ان دونوں کے بیچ اماوس کی رات بن کر کھڑی رہے گی۔ وہ ساری زندگی عون عباس کے لیے ایک "گلٹ" کی صورت مجسم زندہ رہے گی۔ اسے احساس دلانے کے لیے۔

اسے کبھی حقیقی معنوں میں خوش نہ ہونے دینے کے لیے تاکہ وہ بھی زندگی کی آخری سانس تک جلے۔ زندگی کی آخری سانس تک سلگتا رہے۔ اگر فریحہ فرقان اپنی زندگی عون عباس کے نام پہ قربان کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی تو پھر عون عباس کو بھی ساری عمر ماہ رو سرفراز کے ساتھ خوش نہیں رہنا تھا کسی صورت نہیں رہنا تھا۔ پھر ماہ رو سرفراز کو بھی فریحہ فرقان کی طرح جلنا اور سلگنا تھا۔ پھر ماہ رو سرفراز کو بھی اس کی طرح تنہا زندگی گزارنا تھا۔ پھر ماہ رو سرفراز بھی سہاگ رکھتے ہوئے "بیوہ" جیسی زندگی گزارے گی۔ فریحہ کا سایہ کبھی اسے خوش نہیں رہنے دے گا کیونکہ فریحہ کا سایہ "اماوس" کا سایہ تھا۔

☆ ☆ ☆

سناٹا آج بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ آج بھی اس روز کی طرح پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا حالانکہ آج تو عون کی منکوحہ کو گھر میں بیاہ کر لے آئے تھے۔ پھر بھی سکوت تھا کہ دلوں کو عجیب سے کرب میں چکر پھیریاں دے رہا تھا۔ ہر طرف بے سکونی سی بے سکونی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان کا اپنا دل چین سے خالی تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ ان کی بیٹی کا دل بھی چین سے خالی تھا۔

اور کیا یہ فریحہ تھی؟ ان کی پڑھی لکھی فرمانبردار سنجیدہ مزاج نیک فطرت بیٹی۔ وہ تو اس وقت کوئی بدحال عمر رسیدہ عورت لگ رہی تھی۔ کوئی سودائی لگ رہی تھی۔ ان کے دل پہ جیسے گھونسا پڑا تھا۔ انہوں نے بے ساختہ فریحہ کو اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ اور وہ جو اس طرح تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ ماں کے سینے سے لگتے ہی بالکل ساکت ہو گئی۔ جیسے بجلی کے بٹن کو دبا دینے سے آواز بند ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی کسی چابی کی گڑیا کی طرح خاموش اور ساکت ہو چکی تھی۔

"فریحہ! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟" وہ ماں تھیں ان کا دل تڑپ گیا تھا۔ فریحہ نے آواز کی سمت گردن اٹھا کر خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر پھٹی پھٹی آواز میں بمشکل بولی۔

"تو کیسی حالت بناؤں؟
جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے۔ کیا میں خوشی کے شادیانے بجاؤں؟ اس کی امی کا دل پھٹنے لگا۔ آنکھیں بہنے لگیں۔ زبان سے عون کے لیے تنفر کا زہر گرنے لگا۔

"دنیا ایک عون پر ختم نہیں ہوجاتی۔ وہ کمینہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا۔" انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر عون کو برا بھلا کہنا شروع کیا تھا۔ ورنہ عون کو اب بھی دل کوئی الزام دینے پہ راضی نہیں تھا۔ ان کے گزشتہ سارے خدشات وہمے' وسوسے ماہ رو کی طرف سے تھے۔ انہیں لگتا تھا۔ ماہ رو کسی "چال" میں ہے۔ وہ عون کو ہتھیانا چاہتی ہے۔ ان کا دل ٹھیک ہی وسوسے سے پال رہا تھا۔ وہ سارے خدشے بے بنیاد نہیں تھے ان کے سارے وہموں کا جواب آج ماہ رو کا دلہنوں جیسا روپ تھا۔ تو وہ ان کے خدشات پہ مہر لگا کر آج حوروں سا روپ لیے ان کے دلوں پہ سانپ دوڑانے آگئی تھی۔ تو ماہ رو سرفراز ان کے عون کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا کر آگئی تھی۔

دل اس حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کا عون ایسا کمزور نہیں تھا جو کوئی بھی ماہ رو اسے کسی چال کے ساتھ "جیت" جاتی۔ عون نام کی سلطنت کو اپنے نام کروالینا کوئی اتنا سہل نہیں تھا۔

اور اس وقت فریحہ کو تسلی دیتے ہوئے' اس کے جلتے دل کو پرسکون کرتے ہوئے وہ یہی باتیں اسے سمجھا رہی تھیں۔

"دیکھ لینا' وہ دو دن بھی نہیں ٹکے گی۔ جینا حرام ہوجائے گا اس کا یہاں۔ عون کے ساتھ نباہ کرنا ایسی نازک اندام مہارانیوں کے بس کی بات نہیں۔ تم دیکھتی رہنا۔ جس طرح سے آئی ہے۔ ویسے ہی منٹوں میں چلی جائے گی۔"

"نہیں امی! یہ خونی بلا نہیں جائے گی۔ یہ عون کو اپنی اداؤں کے جال میں پھانس لے گی۔ اس کے پاس حسن جیسا باکمال ہتھیار ہے۔" فریحہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے اذیت سے کہا تھا۔

"عون ایسا کچا نہیں۔ تو بھائی جی نے اسے بے بس کردیا تھا۔ وہ تو کبھی نہ مانتا۔ بھائی جی اور تمہارے ابا کو جانے کیا کیا بتا کر ان کے دماغ سن کردیے تھے۔ وہ کچھ سنتے ہی نہیں تھے۔ کہتے یا عون کو مار ڈالیں گے یا خود کو۔ ورنہ نکاح کی حامی بھرے۔" انہوں نے پھر سے زخم ادھیڑ دینے والا ذکر چھیڑ لیا تھا۔

"جو ہونا تھا۔ وہ ہوگیا۔ ماہ رو کی پلاننگ تو کامیاب ہوگئی۔ وہ عون کو پانا چاہتی تھی بس پالیا۔" فریحہ کے دل پر آرے سے چل پڑے تھے۔

"زندگی کا اختتام تو نہیں ہوگیا نا۔ تمہارا دل توڑنے والوں کو سزا ضرور ملے گی۔ تم دیکھ لینا۔ عملی زندگی میں آکر کیسے عشق کا بھوت اترتا ہے۔ ایسی منحوس آئی ہے جس نے ہمارے گھر کی خوشیوں کو تباہ کردیا ہے۔" فریحہ کی امی نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"میرا دل اسی لیے گھبراتا تھا۔ یہ خدشے بے بنیاد نہیں تھے امی! دیکھا نا۔ ماہ رو نے میرا دل اجاڑ دیا۔ مجھے برباد کردیا۔ اور خود عون پر قبضہ جما کر بیٹھ گئی۔" فریحہ ایک مرتبہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"میں تو کہتی تھی۔ اس چڑیل سے دور رہو۔ اس کے سائے سے بھی دور رہا کرو۔ اس نے پشت میں خنجر گھونپ دیا نا۔" فریحہ کی امی کو نجانے کیا کچھ نہیں یاد آگیا تھا۔

"میں نے تو نمبر بھی بند کردیا تھا۔ تعلق بھی توڑ لیا تھا۔ پھر بھی میری بدقسمتی بن کر سامنے آگئی۔" فریحہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی۔ یہ رونا تو اب اس کے ہمیشہ ہمیشہ ساتھ ہی تھا۔

☆ ☆ ☆

رات تیسرے پہر میں داخل ہورہی تھی۔
کھڑکی کے باہر لٹکی بیلوں سے موتیے اور چنبیلی کی خوشبو آرہی تھی۔ انتہائی معطر' خوب صورت اور حسین روح میں اتر جانے والی مہک نے پورے روم کو مہکا دیا تھا۔

رات کی رانی کا سحر سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ اور اس وقت ماہ رو جہازی سائز بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے آنے والے سندر وقت کی آہٹوں کو سن رہی تھی۔ وہ حسین گھڑی جس کا انتظار دل میں میٹھا میٹھا درد جگاتا تھا۔ وہ ہی دلنشین ساعتیں جن کی آمد آمد کا چرچا پلکوں کو بار حیا سے جھکا رہا تھا۔

وہ جو اس کی جنوں خیز قسم کی محبت تھا۔ اس وقت محبوب بن کر آئے گا۔؟

اس وقت اتنے سحر انگیز ماحول میں دل کے اندر ہلکے ہلکے وسوسے بھی سر ابھار رہے تھے۔ جو باتیں اپنی ہی سرخوشی میں بہت پہلے اس نے نہیں سوچی تھیں وہ اس وقت بہت نازک صورت حال میں گھبرانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اس پہ دھیرے دھیرے کچھ خوف اور گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ عون کے بارے میں سوچتی دل اتھاہ گہرائیوں میں خود بخود ڈوبنے لگا تھا۔ عون کہاں تھا؟ اس کے گھر رخصتی کے وقت بھی موجود نہیں تھا۔ وہ کس طرح سے عون کے موڈ کا اندازہ کرتی؟ وہ کس طرح عون کے رویے سے اس کی کیفیت کو جانچتی۔

وہ گھر آکر بھی اسے نظر نہیں آیا تھا۔ کھانے کے وقت بھی اندر نہیں آیا۔

آخر کچھ تو تھا جو اس کے دل میں وہم جگا رہا تھا۔ پریشان کر رہا تھا۔ اور ماہم کہتی تھی۔ اس کی مرضی تھی تو تب ہی اچانک نکاح اور رخصتی ہو گئی۔

تب بھی ماہ رو کا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔ یہ نکاح اور رخصتی پھر گھر والوں کا سرد سا رویہ کچھ بھی نارمل نہیں لگ رہا تھا۔

یہ "مرضی" سے زیادہ زبردستی والی شادی لگ رہی تھی۔ لیکن عون کے گھر والوں کو کیا ضرورت تھی اس پر دباؤ ڈال کر ماہ رو سے شادی کرواتے؟ وہ خود ہی ہر خدشے کو اٹھاتی اور دوسرے ہی لمحے گرا دیتی۔ پھر بھی دل کو چین نہیں تھا۔ وہ کہاں تھا؟ کیوں نہیں آرہا تھا؟ وہ تھکن سے ٹوٹتے ہوئے انگ انگ کے ساتھ عون عباس کا انتظار کر رہی تھی۔

"معا" دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تو بے ساختہ وہ سمٹ کر چونک گئی تھی۔ ایسے ہی غیر ارادتا" اس کی نگاہ سنہرے گھڑیال پر پڑی تو اچانک ماہ رو چوکنا ہوئی تھی۔ گھڑیال پہ تین بجنے کا الارم گونج رہا تھا۔ اس نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو بمشکل کھولنے پر آمادہ کیا۔

سامنے ثنا ہی کھڑی تھی وہ ثنا جو کھانا بھی دے کر گئی تھی۔ اب نجانے کیوں آئی تھی؟ ماہ رو بمشکل سیدھی ہوئی۔ ثنا نے ایک نظر ماہ رو کے تھکے تھکے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور پھر جوں کی توں کارنر پہ رکھی ٹرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ کھانا پڑا پڑا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ماہ رو نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ثنا کو کچھ بے چینی سے ہوئی تھی۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا ماہ رو!"

"بھوک نہیں ثنا بھابھی!" اسے کچھ تو جواب دینا ہی تھا۔

"کیوں بھوک نہیں؟" ثنا نے کچھ تفکر سے کہا۔ کیونکہ گزشتہ رات وہ اسپتال میں رہ کر آئی تھی اس لیے ثنا کو کچھ پریشانی سی محسوس ہوئی تھی۔ کیا پتا' طبیعت خراب ہو۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے بے زاری دکھائی تھی۔ واقعی ہی کھانے کو دیکھ کر طبیعت اوب رہی تھی۔ اور خوشبو جیسے دماغ کو چڑھ رہی تھی۔

"لیکن کھانا دل میں نہیں جاتا۔ معدے میں جاتا ہے۔" ثنا نے ماحول پر چھائی کثافت کو کم کرنے کی ہلکی سی کوشش کی تھی۔ تب ایک مرتبہ تو ماہ رو کا دل چاہا تھا ثنا سے دل میں اٹھتے سوالوں کے جواب پوچھ لے۔

لیکن اس کے سارے سوال اندر ہی اندر دم توڑ گئے تھے۔ وہ کچھ بھی نہیں پوچھ پائی تھی۔

"تو پھر میں دودھ لے آتی ہوں۔ کچھ معدے میں تو جائے گا نا۔" ثنا کی آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔ ماہ رو نے فورا" نفی میں سر ہلایا تھا۔

"پلیز بھابھی! دودھ نہیں۔ میرے سر میں آل ریڈی (پہلے ہی) درد ہے۔ میں ٹھنڈا دودھ نہیں لوں گی۔"

"تو پھر چائے لے آتی ہوں۔" ثنا نے نرمی سے

کہا۔ تب سے لے کر اب تک ثنا ہی ماہ رو کے کمرے میں کئی مرتبہ جھانک کر اس کا احوال پوچھ رہی تھی۔ کسی اور نے آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ شاید مریم سو چکی تھی۔ اس کے بیٹے کی طبیعت بھی نہیں ٹھیک تھی۔ اور کائنات بھی نجانے کہاں غائب تھی۔ وہ تو دکھائی بھی نہیں دی۔ ماہ رو کو خاصا دھچکا لگا تھا۔ "کیا کائنات بھی اس کے آنے پر خوش نہیں تھی۔"

پھر اس کی سہیلی فریحہ بھی نظر نہیں آئی۔ کم از کم فریحہ تو آتی۔ گوکہ اس کی شادی بہت اچانک ہوئی تھی وہ فریحہ کو اعتماد میں بھی نہیں لے سکی تھی پھر بھی فریحہ کو آنا تو چاہیے تھا۔ وہ رخصتی کے وقت بھی ماہ رو کے گھر نہیں آئی تھی' اس کی امی بھی نہیں تھیں۔ کیا یہ لوگ گھر میں موجود تھے؟ اگر تھے تو پھر دکھائی کیوں نہیں دیے۔

"بھابھی فریحہ کہاں ہے؟" ماہ رو نے بڑے آرام سے ثنا کو مخاطب کرکے فریحہ کی غیر موجودگی کے متعلق پوچھ لیا تھا۔ یوں کہ ثنا کا عجیب ہی انداز میں منہ کھل گیا۔ اور شدید حیرت تھی اس کی آنکھوں میں۔ کیا یہ ماہ رو مذاق کے موڈ میں تھی؟ یا پھر فریحہ پہ طنز کر رہی تھی؟ یا فریحہ کو جلانا مقصود تھا؟ ظاہر ہے فریحہ کی جگہ اس کی سیج پر قبضہ جما کر بیٹھی تھی اور فریحہ کے متعلق استفسار کر رہی تھی۔ کیسی حیران کن بات تھی۔

"اس وقت تو فریحہ سو چکی ہوگی۔" ثنا نے ذرا مبہم سا جواب دیا تھا۔

"لیکن دوپہر' سہ پہر' شام اور رات کو بھی وہ نظر نہیں آئی۔" اس نے پھر سے سوال داغا تھا۔ "کیا تب بھی سو رہی تھی؟" وہ عام لہجے میں لاپروائی سے بولی۔ ثنا جیسے تعجب میں گم ہوگئی تھی۔ کیا ماہ رو واقعی ہی انجان تھی؟ وہ اس کا چہرہ کھوجتی رہی تھی۔ کچھ سوچتی رہی تھی۔ یہ کس طرح سے ممکن تھا کہ ماہ رو انجان رہتی؟ کیا اسے عون نے نہیں بتایا؟ اور عون نے بھلا کیوں نہیں بتایا ہوگا۔ ایک طے ہوئی شادی اچانک ٹوٹی تھی۔ اور ماہ رو کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ اور ماہ رو اس طرح انجان پن اور بھول پن سے پوچھ رہی تھی جیسے کچھ اتا پتا ہی نہ ہو۔ ثنا دل ہی دل میں ماہ رو کی لاجواب ایکٹنگ کی قائل ہوگئی۔

"میں تو سوچ رہی تھی فریحہ سے لمبی گپ لگاؤں گی۔ اور اسے یہ بھی بتاؤں گی اس قدر اچانک یہ سب کیسے ہوا۔ فریحہ تو مجھ سے ناراض ہوگی۔ میں نے اسے کچھ بتایا جو نہیں۔ ایکچوئیلی! فریحہ سے رابطہ نہیں ہوسکا۔" ماہ رو نے مزید اپنی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

"فریحہ کیسے آسکتی ہے؟ وہ تو ابھی تک سوگ میں ہے۔ سوگوار ہے بے چاری۔ اس کے ساتھ کیا کچھ کم ہوا ہے؟ اسے تو سنبھلنے میں بڑا وقت لگے گا۔" ثنا نے اچانک بول کر اسے سوچوں کے گہرے سمندر سے نکال لیا تھا۔ گوکہ ثنا کا لہجہ طنزیہ نہیں تھا۔ نہ وہ طنز کر رہی تھی۔ نہ اس کے الفاظ ایسے تھے جو برے لگتے۔ ثنا نے خاصے محتاط لفظوں کا چناؤ کیا تھا۔ کیونکہ ماہ رو کے ساتھ اس کا رشتہ بہت نازک ہوچکا تھا۔ وہ ایسا کچھ نہیں بولنا چاہتی تھی جو ماہ رو کو برا لگتا۔ یا پھر وہ عون کو پہلی ہی رات شکایتاً "بتا دیتی۔ اور ثنا کا امپریشن نئی نئی امیر ترین دیورانی پہ برا پڑتا۔ بہرحال فریحہ سے لاکھ ہمدردی سہی' وہ اپنی سسرال میں کھڑی تھی اور خاصے اکھڑ مزاج دیور کی ناراضی مول نہیں لے سکتی تھی۔

"اس کی سوگواریت یا پریشانی کی وجہ کیا ہے؟" اب کہ ماہ رو نے خاصی سنجیدگی بھرے تفکر سے پوچھا تھا۔

عون اپنی شادی توڑ کر' مہندی کے پنڈال سے سیدھا نکاح کرکے واپس لوٹا تھا اور یہ محترمہ جانتی تک نہیں تھیں کہ فریحہ کے ساتھ کیا ہوا؟ حد ہی حد تھی۔

"فریحہ کی شادی ٹوٹی ہے۔ اس کے خواب ٹوٹے ہیں۔ جس بارات کا اسے انتظار تھا وہ آئی نہیں۔ تو کیا وہ شادیانے بجائے؟" بالآخر ثنا نے دھیمی مگر طنزیہ آواز میں ماہ رو کے سارے طبق روشن کردیے تھے وہ دلہناپے کا روپ بھلا کر ایسی ہکا بکا ہوئی کہ اپنی جگہ سے پوری کی پوری اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیونکہ شاک ہی ایسا تھا۔

"فریحہ کی شادی ٹوٹ گئی؟ کیا اس کی شادی ہو رہی

تھی؟اور مجھے بتایا بھی نہیں۔ انوائٹ تک نہیں کیا۔ ہماری یک جان دو قالب والی دوستی نہ سہی۔ تاہم فرینڈ شپ تو ضرور تھی اس نے مجھے اطلاع بھی نہیں دی۔" پہلی مرتبہ ماہ رو کی آواز میں کچھ خفگی اور شاک والی کیفیت نمایاں ہوئی تھی۔ اسے شدید دکھ ہوا۔ کیا فریحہ نے اسے اپنی خوشی میں بلانے کے قابل بھی نہیں سمجھا تھا؟افسوس ہی افسوس تھا۔ اور ادھر ثنا خود بھی انتہائی تعجب کے عالم میں اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے ماہ رو کی حیرت' شاک اور خفگی اب کی دفعہ کوئی اداکاری نہیں لگی تھی۔ تو کیا ماہ رو واقعی ہی انجان تھی؟ لیکن وہ انجان کیسے ہو سکتی تھی؟

ثنا کا دماغ تو اس گورکھ دھندے میں الجھ کر بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ کیونکہ دکھلاوا کم از کم اس قدر شفاف نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوتا ہے جو چونکا دیتا ہے۔ اور ایسا دقیق ڈھکوسلہ کرنا آسان بھی نہیں۔ ثنا کو ماہ رو کے انجان پن پہ یقین آگیا تھا۔

"فریحہ کی شادی کیوں ٹوٹی کیا ہوا تھا؟" ماہ رو کے اگلے سوال نے ثنا کا دماغ پھر سے گھما ڈالا تھا۔ اس کا منہ پھر سے تعجب بھرے انداز میں کھل گیا تھا۔ گو کہ اسے امید تھی ماہ رو اگلا سوال یہی کرے گی پھر بھی۔ اور ابھی ماہ رو کو جواب دینا چاہتی ہی تھی جب دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا تھا۔ ثنا گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کی سیاہی سپیدہ صبح میں نہیں ڈھل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا رات بھی آج ٹھہری گئی ہے۔

یوں ہی بے سبب زندگی کی سویرے پہ شام غالب آگئی تھی۔ ہر طرف ویرانی' سیاہی اور اندھیرا تھا جو ڈھلتا ہی نہیں تھا زندگی میں اچانک موڑ آتے ہیں۔ پھر بھی ذہن و دل انہیں قبول کرلیتا ہے۔ ہر حادثے کے بعد کی صورت حال کو بھی قبول کرلیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ موڑ اور حادثے اس طرح بھی آتے ہیں جو برسوں ذہن و دل کی تختی سے مٹ نہیں سکتے۔ کھرچنا چاہو تب بھی نہیں۔ بھلانا چاہو تو تب بھی نہیں۔

عون عباس کی زندگی میں بھی اچانک ایک موڑ آیا تھا۔ جو زوردار حادثے کا سبب بنا تھا۔ اور اس حادثے میں عون عباس کا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ اس نے بہت کچھ کھو دیا تھا۔ عموماً" حادثے بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ جو زندگی کی قید تک سے آزاد کر ڈالتے ہیں۔ لیکن عون کی زندگی کا حادثہ بس یہاں تک محدود نہیں تھا۔ وہ اس حادثے میں زندگی کی حد تک بچ گیا تھا۔ لیکن باقی سب اس کا لٹ چکا تھا۔ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ کے اعتبار کو کھویا تھا۔ اپنے بھائیوں کے اعتماد کو کھویا تھا۔ اپنے وقار' عزت' انا اور کردار کو کھویا تھا۔

اس نے بڑی گہری ضرب کھائی تھی۔ بڑی ذلت اٹھائی تھی۔ ہر آنکھ کی نفرت برداشت کی تھی۔ اپنوں کی بیگانگی کا مزہ چکھا تھا۔ جب وہ لوگ اسے بے یقین نگاہ سے دیکھتے تو عون کا دل چاہتا وہ ہر چیز کو تہس نہس کردے۔ جب وہ لوگ بے اعتباری کا مظاہرہ کرتے' اس پہ یقین نہ کرتے' اسے جھوٹا' ڈھونگی' اور منافق سمجھتے اس پہ کبھی اعتبار نہ کرنے کا اعلان کرتے تب پورے کا پورا عون عباس کنگال ہو جاتا تھا۔ تو اس کا دل چاہتا ہر شے کو ٹھوکروں سے اڑا دے۔ تباہ کردے۔

کوئی دو گھڑی اس کے پاس کھڑا رہنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ ہر سو ذلت ہی ذلت تھی۔ اور اس ذلت کا سبب صرف ایک ذات تھی۔ جو اس کی سزا بن کر نہیں بلکہ انتقام بن کر اس گھر میں آئی تھی۔

وہ غیض کے عالم میں اٹھتا' چلتا' گرتا اور پھر سر تھام کر دہاڑنے لگتا۔ یہ اس کے انتہائی ڈپریسڈ (پریشان) ہونے کو ظاہر کرتا تھا۔ معاً" دروازے کی چرچراہٹ کے ساتھ ہی لکڑی کے بھاری پاٹ کھلے اور بند ہوئے تھے۔ عون نے لہو رنگ خونی آنکھوں کو اٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ کوئی دبے قدموں اس کی پشت کے قریب آگیا۔ وہ آنے والے کی گہری افسردہ سانسوں سے ہی سمجھ گیا تھا کہ کون اس کے پیچھے کھڑا ہے؟

تائی نے دل میں اٹھتی اذیت کی لہر کو دبا کر ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پہ رکھا تھا۔ پھر وہ اس کے قریب ہی دیوان پہ بیٹھ گئی تھیں۔

ماں کو دیکھ کر سیدھا ہونا ہی پڑا تھا۔

"عون! تم نے کھانا نہیں کھایا۔ نہ کل شام نہ صبح نہ دوپہر۔ اور ابھی دیکھو' اگلی سویر بھی آرہی ہے۔ بیٹا! یہ دودھ تو پی لو۔" تائی کی آواز میں سابقہ کسی بات کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ بس چاہتی تھیں کہ کم از کم ان کے سامنے عون ٹھیک رویہ رکھے۔

"جب موڈ ہوا کھالوں گا۔ کس کو تکلیف نہیں دوں گا۔"

"عون! میری جان! ادھر دیکھو؟ میرا کیا قصور ہے؟ مجھ سے کیوں ناراض ہو؟" تائی نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا سرخ کرب اذیت کے تاثرات سے سجا چہرہ تھام کر اذیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ تب عون کچھ بے چین ہو گیا تھا۔

"میں نے کب آپ سے کچھ کہا۔ جو میرے ساتھ ان لوگوں نے کیا۔ اس میں آپ کا قصور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ دکھ مجھے اس بات کا نہیں ہے۔ کہ ماہ رو نے اپنے مقام سے گر کر ابو وغیرہ کو ورغلایا اور مجھے سارے زمانے میں بدنام کردیا۔ تکلیف مجھے ابو کی بے اعتباری کی ہے۔ کیا ابو مجھے نہیں جانتے تھے؟ میں نے کب ان کا سر جھکایا تھا؟

اگر ماضی میں میرا کوئی شرمناک قصہ ابو تک پہنچا ہوتا تب تو وہ اعتبار ہی کرلیتے۔ کہ میں ایسا ویسا ہوں۔ اور مجھ سے ہر برے فعل کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن جب میرا ماضی شفاف تھا تو حال اچانک اتنا برا اور بدنما کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ جسے گنگا میں نہائی سمجھ کر آپ بیاہ لائے ہیں۔ اس پہ بھی مجھے افسوس نہیں۔ کیونکہ وہ اپنے مقام سے گرا ہوا ہر کام کرسکتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی سوسائٹی میں فیشن ہے۔ لیکن میں اس کی چالبازیوں اور گندے لائف اسٹائل کے چنگل میں نہیں آؤں گا۔ میں اس عورت کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں اس عورت سے بڑا سخت قسم کا انتقام لوں گا۔ ابو نے اسے عزت دار طریقے سے گھر لاکر مجھے سزا نہیں دی۔ بلکہ مجھے میرا انتقام پورا کرنے کا بہترین موقع فراہم کیا ہے۔

میں اسے ایسی سزا دوں گا۔ کہ عمر بھر یاد کرے گی۔ جو کچھ میں نے کھویا ہے۔ اس عورت کو بھی کھونا پڑے گا۔" اس کے دھیمے سلگتے لہجے میں زخمی سانپ سی پھنکار تھی۔ تائی کا دل جیسے دھک سے رہ گیا تھا۔

"عون! تو پاگل ہو چکا ہے؟ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں' بہو' بیٹیوں اور بیویوں کی قدر' عزت کی جاتی ہے۔ اور تم...." ان کا دل پھڑپھڑانے لگا تھا۔ عون کے ارادے تو انتہائی خطرناک لگ رہے تھے۔ آخر وہ ماہ رو کے ساتھ کیا کرنے والا تھا؟

"نہیں عون! ہرگز نہیں۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ جو ہو گیا اسے بھول جاؤ یا بھلانے کی کوشش کرو۔ تم اپنے باپ کو جانتے تو ہو۔ اس لڑکی کے ساتھ کچھ برا کیا تو پھر سے گھر میں جنگ کا طبل بج جائے گا۔"

کیا خبر' اندر اپنے کمرے میں جاتا تو کچھ مزاج میں تبدیلی آجاتی؟ ماہ رو کو دیکھ کر شاید حواسوں پہ چڑھی گرمی اتر جاتی۔ چاہے وہ کسی بھی سازش کے ذریعے آئی تھی۔ اب آتو چکی تھی۔ ان کی بہو تھی۔ گھر کی عزت تھی۔ انہوں نے ماہ رو کے لیے اپنے دل میں تھوڑی جگہ بنالی تھی اور انہیں لگتا تھا ماہ رو کی موہنی صورت دیکھ کر عون بھی پگھل جائے گا آج نہ سہی کل تک اس کا غصہ اتر جائے گا۔ لیکن فی الحال انہیں عون کو بہلا پھسلا کر ماہ رو کے پاس بھیجنا تھا۔ وہ بے چاری تھکی ہاری جانے کب سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ تائی خود بھی ایک ماں تھیں' ان کا جلدی دل پسیج گیا تھا اور وہ چاہتی تھیں عون اپنے کمرے میں جائے۔ آرام کرے۔ ٹھنڈے دل سے سوچے۔ جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے کیا خبر' اسی میں بہتری ہو۔ وہ ہمیشہ مثبت رخ پہ سوچتی تھیں۔ اسی لیے مطمئن رہتی تھیں جو کچھ ہوا تھا وہ واقعی ناقابل قبول تھا۔ دل و دماغ کو ہی نہیں زندگی کو بھی جھنجھوڑ چکا تھا' لیکن اب گزرے برے وقت پہ رونے اور ماتم کرنے سے بہتر تھا آنے

والے وقت کو اچھا بنالیا جاتا' لیکن یہ باتیں عون کو سمجھانا انتہائی کٹھن تھا۔

"عون اٹھو' اپنے کمرے میں جاؤ۔ دیکھو بیٹا! جو گھر میں گنے چنے مہمان رہ گئے ہیں انہیں باتیں بنانے کا موقع مت دو۔ وہ کیا سوچیں گے فریحہ کو ٹھکرا کر اپنی من پسند دلہن ڈنکے کی چوٹ پہ لایا ہے اور اسے بھی دیکھنا گوارا نہیں کر رہا کیا اسی میں خرابی ہے؟ ایسے فضول تبصروں سے بچنے کے لیے ضروری ہے۔ اپنے کمرے میں جاکر آرام کرو۔ دیکھو' دلہن سے اچھی طرح بات کرلینا۔ بیٹا! میری مجبوری سمجھو۔ اب میں مزید ماہ رو کی وجہ سے تم دونوں باپ بیٹے میں دوریاں نہیں دیکھ سکتی۔ اور وہ ماہ رو کے لیے بہت حساس ہو رہے ہیں۔" تائی نے نگاہ چرا کر جیسے التجا کی تھی۔

"ظاہر ہے' ان کے بیٹے نے ماہ رو کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس کو بے عزت کیا ہے۔ اغوا کرنے کے لیے اس کے گھر دھاوا بولا ہے۔ وہ ان کی نظروں میں معصوم ہے۔ مظلوم ہے۔ وہ کیوں نا حساس ہوں گے۔" اس نے مارے غصے اور تنفر کے دودھ کا گلاس اٹھا کر دیوار سے دے مارا تھا۔ پھر تن فن کرتا ہال کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جارحانہ قدموں کی دھمک اس کمرے کی طرف جاتی سنائی دی تھی جس کمرے میں ڈنکے کی چوٹ پہ آئی ماہ رو جلوہ افروز تھی۔ تائی نے خوف کے مارے پھڑپھڑاتے دل پہ ہاتھ رکھ کر بے ساختہ ماہ رو کی سلامتی کے لیے دعائے خیر کی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر وقت کے بجتے گھنگروں پہ بالآخر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ صحرا میں باد صبا چل پڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے کا گھٹن بھرا سماں ٹوٹ گیا تھا جس کا اختتام ہو گیا تھا۔ وہ دیوان عام سے نکل پڑا تھا۔ اس کے قدموں کا رخ ماہ رو کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ اسے تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کا دل ایک ایک قدم پہ اعلان یار کر رہا تھا۔ اس کی مشک بار پلکوں پہ حیا کا بوجھ پڑا اور وہ جھک کر گلاب رخساروں کو سلام پیش کرنے لگیں وہ قریب آرہا تھا۔ قریب آرہا تھا۔ قریب آچکا تھا۔ دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ اس کے قدموں کی چاپ' ماہ رو کا دل سن رہا تھا۔ اس کے ایک ایک قدم کو ماہ رو کا دل گن رہا تھا۔ پھر جب وہ نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا تب لمحہ بھر کے لیے ماہ رو کا دل رک سا گیا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تربتر تھیں وہ کیسے پیش آئے گا؟ وہ کیا کرے گا؟ اور ماہ رو کو اپنے گھر میں ایک ہی رات کے اندر ڈھیر ساری بے زاری اور نفرت کے باوجود لے کر آنے کی کیا توجیہہ پیش کرے گا؟ کیا اس کا دل پلٹ گیا۔ وہ اچانک دل کی زمین پہ اگ آنے والی محبت کا حرف حرف سنائے گا۔ ماہ رو سرفراز نے اندھا دھند چلتے ہوئے' بے خیالی اور عالم جنون میں محبت کی ایک فصل کاشت کی تھی۔ آج اس فصل اور گلشن کا حقیقی مالک آگیا تھا۔ اپنے پیار کی برسات میں غنچہ غنچہ بھگونے۔ اس کا جھکا سر پھر اٹھ نہ سکا۔ کیونکہ عون عباس اس کے سر پہ کھڑا تھا۔ ماہ رو کو کچھ عجیب سا لگا۔ وہ کھڑا کیوں تھا۔ مقابل بیٹھ جاتا۔ اس کا خاموش ہونا بھی عجیب لگ رہا تھا۔ وہ خاموش کیوں تھا؟ ماہ رو کا خوش رنگ دھنک اوڑھ کے لہراتا دل کچھ گھبرا سا گیا۔ وہ ابھی تک اس کے سر پہ کھڑا تھا۔ کسی ننگی تلوار کی مانند۔ آخر کیوں؟ ماہ رو کو خود ہی اس عجیب طرح کے فسوں کو توڑ کر گردن کچھ اٹھانا پڑی تھی۔ اور پھر اس کی سحر طراز آنکھیں جیسے عون عباس کے چہرے پہ جم گئی تھیں۔ اس چہرے پہ کیا کچھ نہیں تھا۔ غصہ حقارت' نفرت' کراہت' گھن..... اور یہ ماہ رو تھی جسے کبھی تاثرات پڑھنے' چہرے کھوجنے ہرگز نہیں آئے تھے۔ وہ تو سمجھ ہی نہ پائی کہ آنکھوں اور چہروں کی کہانیاں کیا ہوتی ہیں؟ چہرے کتابیں کیسے بن جاتے ہیں؟ اور لوگ ان کتابوں کو حفظ کیسے کرلیتے ہیں؟ لیکن آج عون عباس کے تاثرات کو دیکھ کر اسے چہرے پڑھنے کے فن کا پتا چل گیا تھا۔ اسے سمجھ آگئی تھی کہ چہرے کس طرح سے پڑھے جاتے ہیں۔ اور یہ عون عباس کا چہرہ تھا۔ اور یہ ماہ رو کے محبوب کا چہرہ تھا۔ غیظ و غضب کے رنگوں سے سجا' شدید نفرت کے

تاثرات سے برہم' زہریلے تیوروں سے اٹا۔ اور ماہ رو کا دل ڈوب گیا تھا۔ اس نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اب وہ ساکت جامد نہیں تھا وہ اب بول رہا تھا۔ اور کیا وہ بول رہا تھا؟ اور وہ نہ ہی بولتا تو اچھا تھا۔

"اور یالا آخر تم نے اپنا باکمال عشق پالیا۔ یہی کہا تھا نا تم نے۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے دیوانگی کی حد تک اور تم نے یہ بھی کہا تھا۔ میں اسے ثابت کروں گی۔۔۔ کہا تھا نا۔۔۔ اب بولتی کیوں نہیں ہو۔۔۔ وہ لمبی زبان کہاں بھول آئی؟۔۔" وہ کسی وحشی جانور کی طرح ماہ رو پہ جھپٹ پڑا تھا۔ انتہائی تکلیف و اذیت کی لہر نے ماہ رو کو یک دم چلانے پہ مجبور کردیا تھا۔ ورنہ اس کے تیور دیکھ کر ہی اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ جو بھی بکواس کرے گا۔ ماہ رو اس کا جواب نہیں دے گی۔ وہ خوف وہراس کے عالم میں ٹھٹھر گئی تھی۔ عون کا رویہ اس کے گمان کی آخری حد پہ بھی کہیں نہیں تھا۔ اس کے تصور میں بھی کہیں نہیں تھا۔ ایسا بہیمانہ استقبال؟ ماہ رو کا دل سینے کی سرحد توڑ کر چلایا۔ وہ اسے اپنی چاہ سے یہاں لاکر اتنا ذلیل کر رہا تھا؟ آخر کیوں؟ وہ اسے اذیت دے رہا تھا آخر کیوں؟

"چلاؤ مت' میری بات کا جواب دو۔ اور اپنا کہا پورا کرو۔۔۔ اپنے عشق کو ثابت کرو۔" وہ اس کے کان کی لوؤں پاس غرایا تھا۔ شدت درد کی وجہ سے ماہ رو کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ بے آواز رونے لگی۔

"اور کہو نا۔۔۔ تم نے ثابت کردیا اور واقعی ثابت کردیا۔ بڑی ڈینجرس پلاننگ تھی تمہاری۔ بڑے بڑے سورماؤں کے تجربوں اور عقل کو سلب کردیا تم نے۔ بڑے زہریلے ناگ سے ڈسوایا تم نے۔ کسی کو دوسرا سانس نہ لینے دیا۔ کچھ اور تک نہ سوچنے دیا۔ میں تمہاری شاطرانہ ذہنیت کی داد دیتا ہوں اور آج یہ داد و تحسین کی رات ہے۔ اور میں تمہیں اپنے ہی انداز میں تحسین پیش کروں گا۔ پھر تم سرپرائزڈ رہ جاؤگی۔" اس نے ماہ رو کے گال میں پنجے گاڑ کر جھٹکا دیا تو وہ ایک ہی وار میں کراؤن سے جا لگی تھی۔ اس کا سر بری طرح سے چکرا گیا تھا۔

"چھوڑو مجھے! وحشی آدمی! تم پاگل ہوچکے ہو۔" ماہ رو کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ اس نے درد کی شدت سے چلا کر کہا تھا۔ اس کی تکلیف کو محسوس کرکے عون کچھ اور شیر ہوا تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا ماہ رو تکلیف سے روئے' چلائے۔۔۔ ہاتھ جوڑے' پیروں میں گرے۔

"ہاں۔۔۔ پاگل تو میں ہوچکا ہوں' مگر تمہاری محبت میں نہیں۔۔۔ تمہاری نفرت میں پاگل ہوچکا ہوں۔ اور تم اس پاگل کا' پاگل پن آہستہ آہستہ دیکھتی رہوگی۔ پھر عادی ہوجاؤگی۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"اور میں تمہیں طلاق کبھی نہیں دوں گا۔" اس نے ادھورا جملہ مکمل کردیا تھا۔ ماہ رو گھٹنے پہ سر رکھے اپنی سسکیاں دبانے لگی۔

"میں طلاق لینے کے لیے آئی بھی نہیں تھی۔ میں تو تمہارے لیے آئی تھی' لیکن تم وہ نہیں۔۔۔ تم تو کوئی اور ہو۔" اس کا دل اونچی آواز میں کرلا تا رہا۔ عون عباس سابقہ انداز میں دھاڑتا رہا۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ ہمیشہ کے لیے باندھ کر سزا دوں گا۔" اس نے بڑے کروفر کے ساتھ فیصلہ سنادیا تھا۔

"یہی تو میں پوچھنا چاہتی ہوں۔ کیسی سزا دوگے؟ کیوں دوگے؟ میرا جرم کیا ہے؟ میرا گناہ کیا ہے؟" اس کی سسکاریاں کمرے کی خاموش فضا میں گونجتی رہی تھیں۔ ماہ رو روتی رہی تھی اور بڑے زخمی انداز میں پوچھ رہی تھی۔ عون اس کے معصومانہ سوال پہ پھٹ پڑا تھا۔

"اس سادگی پہ کون نہ مرجائے۔ مجرم اپنے جرم سے خود بھی آگاہ نہیں۔ اپنا گناہ مجھ سے پوچھتی ہو؟ ذرا اپنے آپ سے تو پوچھو' اپنے ضمیر سے پوچھو۔ کیا تمہیں یہاں ہونا چاہیے تھا؟ کیا تم نے کسی اور کی جگہ نہیں لی؟ کیا تم نے کسی اور کے ارمانوں کا خون نہیں کیا۔ کیا تم نے کسی کا دل برباد نہیں کیا؟۔ میں اپنے ساتھ کیے تمہارے ہر جرم کو نظرانداز کر بھی دوں؟

تمہارے حسن کی تابناکیوں سے وقتی طور پر بہل بھی جاؤں تو اپنے اس ضمیر کا کیا کروں؟ جو مجھے ابھی تک چین لینے نہیں دے رہا۔ مجھے پل صراط پہ کھڑا کیے ہوئے ہے۔ میرے اندر آگ لگا رکھی ہے۔ میرے اندر زہر بھر رکھا ہے۔ اس ذلت کو بھول بھی جاؤں جو مجھے تمہارے توسط سے ملی ہے تو اس فریحہ کا کیا کروں؟ جس کی آہیں میرا دل پھاڑتی ہیں جس کے چہرے کی زردی' جس کی آنکھوں کی ویرانی' جس کی بے رنگ کلائیاں میرا رستہ روکتی ہیں۔۔۔ بتاؤ' مجھے اس دوراہے پہ کیوں لائی ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ بتاؤ' میری زندگی میں کیوں آئی ہوں؟" وہ زخمی شیر کی طرح ایک مرتبہ پھر بپھر گیا تھا۔ یوں کہ ماہ رو کی آنکھیں بھی پھٹ گئی تھیں۔ یہ عون عباس کیا کہہ رہا تھا؟ یہ عون عباس کیا کہنا چاہتا تھا؟۔

ماہ رو نے کیا کیا تھا؟ کس کا دل اجاڑا تھا؟ کس کو برباد کیا تھا۔ کس کی آنکھوں میں ویرانی بھری تھی؟ کیا فریحہ؟ مگر یہاں فریحہ کا کیا ذکر؟ فریحہ کیوں؟ اور یہ عون فریحہ کا نام کیوں لے رہا تھا؟ اور پھر خوف و ہراس کی آخری حد سے پھسلتے ہوئے اچانک ماہ رو کی نگاہ سے سیاہ پردہ کھسک گیا۔ اسے شاکی باتیں یاد آگئی تھیں۔ اسے گھر والوں کی اذیت' خاموشی اور دکھ کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی یہ گھر جو شادی والا نہیں۔۔۔ مگر والا لگ رہا تھا۔ یہاں لوگ تھے' مہمان بھی تھے' مگر بجھے بجھے۔ یہاں نئی دلہن آئی تھی' مگر وہ حقیقی جوش' ولولہ اور نئی دلہن کی آمد سے ہونے والی چہل پہل اور رونق مفقود تھی۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے نظر چراتا پھر رہا تھا اور ماہ رو نے اس گھر کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے خود بھی ابٹن' مہندی' بیلے' گیندے کی خوشبو محسوس کی تھی۔ تو کیا اس گھر میں کل کسی کی مہندی تھی؟ گزرے ہوئے کل؟ جب وہ اسپتال میں بے ہوش پڑی تھی؟ ماہ رو کا سوچ کی انتہا۔ جیسے سانس رکنے لگا تھا۔ دل بند ہونے لگا تھا۔ جان نکلنے لگی تھی۔ کیا فریحہ کی عون کے ساتھ شادی ہو رہی تھی؟ جو مہندی کی [illegible] تھی؟ فریحہ کی شادی کیوں ٹوٹی؟ بارات

کیوں نہیں آئی؟ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کا سوال عون عباس کی آنکھوں میں سم قاتل بھر رہا تھا۔

"اور آج وہ اکیلی ہے۔ اپنی ذات کی بت کدے میں تنہا بیٹھی نصیب کی اس ستم رسیدگی پر آنسو بہا رہی ہے اور میں یہاں شب زفاف سجا کر بیٹھ جاؤں؟ یہ تم ہو سکتی ہو خود غرض' خود پسند' تنگ دل اور کمینی۔ اور یہ تم ہو سکتی ہو شاطرانہ چالیں چلانے والی' کسی اور کے حق کو چھیننے والی۔ اپنا آپ طشتری میں رکھ کر پیش کرنے والی۔ میرے نزدیک تم جیسی عورتوں اور طوائفوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی تمہاری طرح نفس پرست عورتیں ہوتی ہیں۔" اس نے ماہ رو کے بالوں کو زوردار جھٹکا دے کر ایک مرتبہ پھر باتوں سے خنجر چلائے تھے یوں کہ اس دفعہ ماہ رو بھی خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ جب بات کردار پہ آئی تو ماہ رو بھی پوری جان سے چلا اٹھی تھی۔

"جسٹ شٹ اپ' تم کون ہوتے ہو' مجھے طوائف بولنے والے۔ مجھے کریکٹرلیس کہنے والے۔۔۔ کیا تم عورتوں کے کریکٹر سرٹیفکیٹ پاس کرتے ہو؟ تم نے میرے ساتھ اتنا روڈ اینڈ رش بی ہیویئر (مغرورانہ اور فضول رویہ) روا رکھا۔ میں خاموش رہی۔ تم نے مجھے تاچر کیا میں چپ رہی۔ تم بلاوجہ مجھے "برا" کہتے جا رہے ہو۔۔۔ اب کریکٹر کو گندا کہنا شروع کر دیا۔ کیا میری تھانوں میں تصویریں لگی ہیں؟ یا میں نے فحاشی کے اڈے بنا رکھے تھے؟" وہ بھی ماہ رو سرفراز تھی۔ جب بولنے پہ آئی تو رکی نہیں تھی۔ بولتی چلی گئی تھی۔

"اور تم فریحہ کے کس ملال' غم' الم اور رنج میں ہو؟ میں نے فریحہ کے ساتھ کیا کیا؟ اگر فریحہ کی شادی تمہارے ساتھ نہیں ہو سکی تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں نے تو نہیں رکوائی؟" وہ بھی دلہناپے کا روپ بھلا کر پھٹی پھٹی آواز میں روتے ہوئے غرائی تھی۔ پھر اب کون سی دلہن اور کون سا دلہناپا؟ ماہ رو کا دل چاہ رہا تھا۔ اپنا یہ حسین روپ خود بگاڑ ڈالے۔ اس زرتار لباس کو آگ میں جھونک آئے۔ وہ اس کے ایک ایک لفظ کو سنتا رہا۔ تو لتا رہا۔۔۔ پھر غضب ناک ہو کر چیخ پڑا۔

"واہ ری بے خبری؟ واہ ری چالاکی؟ تم نے نہیں رکوائی؟ اس معصومیت پہ ساری دنیا نہ مرجائے۔ بہت زہریلی ناگن ہو؟ جب تمہارا باپ سارے زمانے میں پرسے لیتا پھر رہا تھا اپنی بیٹی کی عزت لٹنے پہ ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا اور میرے باپ کے سامنے صف ماتم بچھا رکھی تھی۔ میرے باپ کو ساہوکاروں کے بازار سے گھسیٹ کر اسپتال لے گیا تھا اور وہاں جو اس نے ماتم کیا۔ رونا ڈالا۔ پورے عالم میں اپنا اور ہمارا تماشا لگوایا اس سارے ڈراپ سین کے بعد تم کیا سمجھتی ہو مجھ جیسے بدکردار اغوا کار اور غنڈے سے چاچا اپنی بیٹی بیاہ سکتے تھے؟ یہ شادی تکمیل تک پہنچ سکتی تھی؟ قطعی نہیں۔ پھر یوں ہوا۔ تمہاری تمناؤں کے عین مطابق شادی والا گھر مرگ میں بدل گیا۔ یوں لگا' میرا ہی جنازہ اٹھ گیا ہو۔ ہر طرف رونا' آہیں' چیخیں' بکواس' طنز باتیں اور میرے باپ کا وہ جلال... جو مجھے کبھی بھولتا ہی نہیں۔ کبھی بھولے گا بھی نہیں۔ زندگی کی آخری سانس تک یاد رہے گا۔ وہ بے اعتباری' جو انہوں نے مجھ پہ کی' وہ طمانچے جو انہوں نے مجھے مارے۔ میں تو ابھی وہ پہلا طمانچہ نہیں بھول سکا تھا جو پلازہ کے دفتر میں مجھے میرے باپ نے مارا تھا۔ اس وقت جب تم اپنی سوکالڈ محبت کا ماتم کر کے گئیں ۔ اور میں نے تمہیں دفتر سے نکال دیا تھا۔ تب میرے باپ نے تمہیں دیکھ لیا۔ اور یہ تمہاری ہی خوش نصیبی تھی کہ میرے باپ نے تمہیں خود دیکھ لیا۔ انہیں کسی اور ثبوت کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے میں نے تمہارے ساتھ کچھ غلط کیا ہے۔ پھر وہ دوسرا طمانچہ جو میرے منہ پہ بھرے مجمع میں پڑا تھا۔ کیا اس طمانچے کی گونج میں بھلا سکتا ہوں؟ اس ذلت' اس توہین اور اس بے عزتی کو بھول سکتا ہوں.... ہرگز نہیں... اور یہ طمانچے اسی بے عزتی کے بدلے میں تمہیں بطور رونمائی پیش کر رہا ہوں کیونکہ رونمائی کا تحفہ دینا ہمارے معاشرے کا پرانا رواج ہے۔ ہر دلہن کو اس کی حیثیت کے مطابق تحفہ دیا جاتا ہے۔ چونکہ تمہاری حیثیت اور قابلیت کی کیٹگری میں آتی ہو۔ سو تمہیں بالی' چوڑی' کنگنوں کے بدلے میں طمانچے کا تحفہ دیا جا رہا ہے تاکہ تم عمر بھر نہ بھلا سکو۔ ہمیشہ یاد رکھ سکو۔" عون نے ایک ہی سانس میں اندر کا سارا غبار' ساری بھڑاس نکال لینے کے بعد ایک بھرپور تھپڑ اس کے منہ پہ دے مارا اور وہ درد و کرب کی اذیت کو سہتی بلند آواز میں نہیں گھٹ گھٹ کر دیوانہ وار رو رہی تھی۔

اور عون عباس اندر تک سے سارے زہر' آگ' تنفر کو اکھاڑ کر کل تک کے لیے روح تک سرشار اور ٹھنڈا ہو چکنے کے بعد بڑے ہی کروفر کے ساتھ زمین پر اپنے پیروں کی دھمک دیتا باہر نکل گیا تھا۔ اور ماہ رو اپنی قسمت کے اس ظالمانہ موڑ پر انگشت بدنداں تھی۔ اس نے جو چاہا تھا جیسا چاہا تھا ویسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اور شاید فریحہ کی ساری بددعائیں فیض یاب ہو چکی تھیں۔ اگر رونا فریحہ کے نصیب میں لکھا جا چکا تھا تو سرشار اور خوش ماہ رو بھی نہیں تھی۔ اگر فریحہ برباد ہوئی تھی تو آباد ماہ رو بھی نہیں ہو سکی تھی۔ اگر عون عباس فریحہ کو نہیں مل سکا تھا تو ماہ رو بھی خالی ہاتھ' خالی دل بیٹھی تھی۔ اور اس نے کہا تھا وہ ساہوکار کا بیٹا ہے۔ ناپ تول میں پورا پورا حساب رکھے گا۔ برابری کی چوٹ پر ضرب مارے گا اور اس نے اپنا کہا پورا کر دکھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہر گزرنے والی رات گزر ہی جاتی ہے۔ چاہے اچھی ہو یا بری۔ یہ اور بات ہے کہ ہر زخم بھول بھی جائے مندمل بھی ہو جائے تب بھی رویے کبھی نہیں بھولتے۔ رویوں کے زخم ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ سو' رات گزرنے کے ساتھ وقت' لمحے' ساعتیں بھی بدل گئی تھیں۔ اگلا دن بھی چمک کر طلوع ہو گیا تھا کھڑکی کے پار سے سنہرے صبح بھی دریچے کی درزوں سے چھن چھن کر آتی کمرے کو روشنی سے بھر رہی تھی۔ ماہ رو نے تھکی تھکی سوجی آنکھوں کو بمشکل کھول کر گھڑیال دیکھا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اٹیچ باتھ روم میں

گھس گئی تھی۔ باتھ روم کی طرف آتے ہوئے اس نے کمرے کی کسی بھی طرف نگاہ نہیں ڈالی تھی۔ اسے بس جلد از جلد فریش کردینے والے باتھ کی طلب تھی۔ اسے تازہ دم ہونا تھا۔ رات بھر کی گھٹن اور حبس کو باہر نکالنا تھا۔ سب سے بڑی بات عون کی گزشتہ رات ہونے والی ہر قسم کی بات اور بکواس کو بھلانا تھا۔ اور یہ ماہ رو کا آخری فیصلہ تھا۔ وہ رات کی کہانی کو رات میں ختم کرچکی تھی۔ جو رات کو ہوا تھا۔ وہ سویرے نہیں ہوسکتا تھا۔ ماہ رو ایسا موقع فراہم بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ اس لیے کہ ماہ رو نے پیچھے ساری کشتیاں جلاڈالی تھیں۔ اسے مڑکر نہیں جانا تھا۔ عون عباس کی زندگی سے نہیں جانا تھا۔ وہ زندہ حالت میں یہاں آئی تھی اور مرکر یہاں سے جائے گی۔ ایک بات تو طے تھی وہ اسی گھر میں رہے گی اور عمر بھر رہے گی۔ جو کچھ رات میں ہوا تھا۔ وہ اچھا تو کہیں سے نہیں تھا۔ وہ تو بڑا ہی برا اور بدنما تھا۔ پھر بھی ماہ رو اپنے ستم گر کے ایک ایک ستم کو بھلا دینے کا پکا فیصلہ کرچکی تھی۔ وہ پوری رات سوچتی رہی تھی۔ اس نے ہر پہلو کو سوچا تھا جو کچھ ہوا تھا اس میں بے شمار چیزیں ابہام زدہ تھیں۔ ڈھکی چھپی تھیں اور بہت زیادہ بدگمانیوں اور غلط فہمیوں میں اٹی تھیں۔ عون نے جو کہا تھا بہت بڑی غلط فہمی کی بنیاد پہ کہا تھا۔ اسے شدید مس گائیڈ کیا گیا تھا۔ ڈیڈی نے ایسا کوئی الزام عون پہ نہیں رکھا تھا۔ کیا وہ خود اپنی بیٹی کو بدنام کرتے؟ ہرگز نہیں۔ عون کو یقینی طور پر کسی نے بھڑکا رکھا تھا۔ اس کے کان بھر رکھے تھے اور ماہ رو کے خلاف کر رکھا تھا۔

وہ گزشتہ شب عون کی کسی غلط فہمی' الزام یا بہتان کو غلط ثابت نہیں کرسکتی تھی۔ اپنی طرف سے کوئی بھی صفائی پیش نہیں کرسکتی تھی۔ وہ تب نہ کوئی صفائی لیتا نہ وضاحت سنتا اور نہ ہی کسی دلیل کو تسلیم کرتا۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ یقینی طور پہ اس کا غصہ' دکھ' جلال سب کچھ اپنی جگہ درست تھا۔ اس وقت ٹھنڈے تازہ پانی سے فریش ہوکر وہ بلا کی تازہ دم اور ترو تازہ ہوچکی تھی۔ گیلے بالوں کو تولیے میں لپیٹ کر وہ واش روم سے باہر آتے ہوئے رات کے ایک ایک منظر کو دانستہ بھلا کر نکلی تھی۔

وہ ساری اذیت کو بھلا کر پرسکون تھی۔ اسے پرسکون ہی رہنا تھا۔ کیونکہ وہ عون عباس سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کی محبت میں یہاں تک آئی تھی۔ اسے صرف محبت تھی اور عون عباس سے تھی۔ وہ برا تھا یا اچھا؟ اس سے محبت کرتا تھا یا نفرت؟ کوئی بھی سوال اسے اپنے مقصد سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ کوئی بھی رکاوٹ اسے عون عباس سے دور نہیں کرسکتی تھی۔ اور اب ماہ رو سرفراز کو اگلا لائحہ عمل بھی سوچنا تھا۔ اس گھر میں کس طرح اپنی جگہ بنانی تھی اور کس طرح اپنا قیام مضبوط کرنا تھا اس پہ بھی نظر ڈالنی تھی۔ سب سے بڑی بات جو باہر لوگوں کے ذہنوں میں اس کے متعلق عون کی من چاہی بیوی کا امیج بنا ہوا تھا۔ اسے آخری سانس تک برقرار رکھنا تھا۔ اور ماہ رو سرفراز کو ایک من چاہی' جان عزیز بیبی اینڈ بی لوڈ (سہاگ بھری) بیوی کا سوانگ بھی بھرنا تھا۔ وہ عون کے اردگرد بسنے والوں کو بتا دے گی۔ امیرزادیاں محبت کرتی اور نبھاتی ہیں' جوائنٹ فیملی کا حصہ بھی بن سکتی ہیں اور امیرزادیاں ہر رنگ میں' ہر سانچے میں بھی ڈھل سکتی ہیں اور جو لوگ آج باتیں بنارہے تھے اور اس شادی کو "دو روزہ" شادی کا ٹائٹل دے رہے تھے ایک دن خود ہی اپنی زبانوں کو بند کرلیں گے۔ ماہ رو عون عباس سے عشق کرکے آئی تھی اور عشق نبھا کر رہے گی۔ چاہے کچھ بھی ہوجاتا۔ جند چلی جاتی یا جان نکل جاتی۔ اگر عون عباس قول کا پکا' نفرت میں سچا تھا تو ماہ رو بھی ضد میں پکی اور عشق میں سچی تھی۔

☆ ☆ ☆

اور وہ ایک ہی رات کے بعد نئی ماہ رو کے روپ میں ڈھل کر منظر عام پہ آگئی تھی۔ یوں کہ اس کے کھلے کھلے حسین' شگفتہ اور دلفریب روپ کو دیکھ کر جو واقعی سمجھ رہے تھے کہ عون' ماہ رو کو طوفانی محبت سے بے

بس ہو کر اپنی شادی توڑ کے بیاہ لایا ہے۔ ان کے یقین پہ جیسے مہر لگ گئی تھی۔

"میں نا کہتی تھی۔ آج کل کے لڑکوں کا کیا بھروسا؟ گھر میں ماں باپ نے رشتہ پکا کیا اور وہ باہر آنکھیں لڑا آیا۔" کسی رشتے کی خالہ' مامی نے دوسری کے کان میں گھس کر دل کا "سارا" باہر نکالا تھا۔ دوسری والی دو من کی گردن ہلا کر رہ گئی تھی۔

"ارے ایسے دودھیا لشکارے مارتے حسن کے سامنے اپنی فریحہ کا دیا کیسے جل پڑتا۔ اس کی لو تو اس بجلیاں گراتے روپ سروپ کے سامنے ایک ہی پھونک میں بجھ گئی ہوگی۔" ایک اور مامی نے بھی اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا۔

"دیکھو' فاخرہ بیٹے کی صفائیاں دیتی نہ تھک رہی تھی۔ میرا بچہ ایسا نہیں۔ نہ دل کا کچا ہے نہ قول کا۔ یہ بس تقدیر کا کوئی ہیر پھیر تھا جو سارا کچھ الٹ پلٹ گیا ہے۔" پہلی والی بی جمالو ٹائپ عورت نے عون کی امی کے لہجے کی نقل اتاری تھی۔

"ارے اس ہیرے کے سامنے کوئی تانبا کس طرح سے ٹھہرتا؟ عون کی تو سدھ بدھ بھلا دی ہوگی۔"

"اور دیکھو' لڑکی میں بھی حیا نہیں۔ گیلے بال کمر اور گلے میں ڈالے' دوپٹا ندارد.... کیسے گھر میں گھوم رہی تھی۔" ایک آنٹی نے جیسے کلیجے پیٹ لیے تھے۔

"اتنی حیادار ہوتی تو اس انداز میں آتی؟ جانے اندر ہی اندر کیا معاملہ ہو؟ کیا خبر' عزت بچانے کے لیے یا چند ماہ بعد بنا شادی کے دادا دادی بننے کے خوف سے اسے اٹھا لائے ہوں۔" کسی مامی نے ٹھٹھا لگایا تھا۔ باقی سب کو بھی اس بات میں بڑا ہی لطف آیا۔

"ٹکے گی نہیں... دیکھ لینا... عیاش امیرزادی ہے... آج اس ڈالی پہ تو کل کسی اور ڈالی پہ... رنگ رنگ کے مردوں کا سواد پڑا ہو تو گھر نہیں بنا کرتے۔" بی جمالو صاحبہ نے پھر سے گل افشانی کی تھی۔

"تم عون کو نہیں دیکھتی۔ کیا بیبا اور معصوم بنا کرتا تھا اور کرتوت شیطانوں سے بدتر... اپنے ہی چاچا کی عزت خاک آلود کر ڈالی... کیا بھروسا اس اولاد کا... پکڑ کے ماں باپ کو کسی قابل نہیں چھوڑا۔ منہ چھپاتے پھرتے ہیں بے چارے...." کسی نے چھالیہ کتر کر پان بنایا۔ گلوری منہ میں ڈالی اور عزت داروں کی پگڑیوں میں تھوک دیا۔ "اور تم نے حاجی قیصر کی بیٹی کا سنا جو...." اب نیا قصہ چھڑ گیا تھا۔ اس معاشرے کا یہی دستور تھا۔ یہی روش تھی اور اس معاشرے کے لوگ بھی یہی تھے۔ چار دن ایک قصے کو مرچ لگا کر دور دور تک اچھالتے پھر کسی نئی کہانی کے پیچھے چل نکلتے۔ نئے لوگ' نیا قصہ' نئی کہانی' نیا لطف' نیا مزہ.... وقت گزاری کے نئے انداز.... لیکن ایسے لوگ یہ تک نہیں جانتے تھے کہ جن لوگوں پہ یہ کیچڑ اچھالتے تھے ان پہ یہ سب بکواس کس کس انداز پہ اثر کرتی تھی؟ دیوان عام میں اسی کاؤچ پہ لیٹا عون زہر خند لہجے میں سوچتا رہا تھا کیونکہ وہ کسی کی زبان روکنے پہ قادر نہیں تھا اور نہ بندے بندے کو پکڑ کر اپنی صفائی دے سکتا تھا۔ وہ قسمت کی اس ستم ظریفی پر بس سلگ سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے قد آدم آئینے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لے کر خود پہ ایک بھرپور نگاہ ڈالی تھی۔ خوب صورت کاٹن کی ایمبرائیڈڈ شرٹ میں اس کی دودھیا رنگت بہت چمک رہی تھی۔ اس شرٹ کی سلیوز (آستینیں) برائے نام تھیں اور جو تھیں وہ انتہائی مہین تھیں چونکہ یہ ممی نے اس کی چوائس کو سامنے رکھ کر شاپنگ کی تھی' سو سارے لباس ایسے تھے کچھ کی تو سلیوز سرے سے تھی ہی نہیں۔ کچھ فراکس تھے' کچھ میکسیاں اور کچھ اسکرٹس۔ ان میں ٹراؤزرز اور ٹاپ بھی موجود تھے۔ وہ سلیکشن کے معاملے میں سوچتی رہ گئی تھی۔ اس گھر کے ماحول کو سامنے رکھ کر اسے بہت سمجھ سوچ کے ڈریسنگ کرنا ہوگی۔ امبرائیڈڈ ریڈ شرٹ کے ساتھ ریڈ ٹائٹس اور ریڈ ہی نفیس آرام دہ چپل پہن کر اس نے لمبے حسین ریشم ایسے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا پھر کمرے میں نگاہ ڈالی... پورا کمرہ صاف شفاف اور چمک رہا تھا جانے کس نے صفائی کی تھی؟ جب وہ باتھ

لے رہی تھی تب ہی کوئی صفائی کر گیا تھا۔ باتھ لینے کے بعد جب وہ باہر نکلی تب ہی اس کی نگاہ صوفے پہ پڑی تھی۔ اس وقت ماہ رو کو صوفے پر عون سویا دکھائی دیا تھا۔ وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ شاید وہ فجر کے بعد آیا تھا اسے اس کی امی نے بھیجا تھا یا پھر خود ہی مہمانوں کا خیال کر کے واپس آگیا تھا۔ جو بھی وجہ تھی کم از کم ماہ رو کو اس کی موجودگی کچھ ڈھارس پہنچا گئی تھی۔ اسے کسی کی سوالیہ نظر کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

وہ اس وقت بڑے لاپروا انداز میں آڑھا ترچھا پڑا سو رہا تھا۔ چونکہ صوفہ بھی جہازی سائز تھا سو اسے سونے میں دشواری نہیں ہوئی تھی پھر بھی اس کا ایک پیر اور دایاں بازو نیچے لٹک رہا تھا۔ ماہ رو کے من میں نہ جانے کیا آئی تھی۔ وہ عون کے قریب آگئی۔ کچھ دیر وہ بے خیالی میں عون کے پاس کھڑی رہی۔ وہ اس کے خوب صورت تیکھے کھڑے کھڑے مغرور نقوش کو دیکھتی رہی۔ اور بہت کچھ سوچتی رہی۔ ماہ رو نے اپنی ہی سوچ کو جھٹکا دیا اور ذرا سا جھک کر نیچے ہوئی۔ اس کوشش میں ماہ رو کے سارے ریشمی بال دائیں کندھے سے ہوتے ہوئے عون کے منہ پر آگرے تھے۔ نیم گیلی، مشک بار سی زلفوں کی ٹھنڈک اور خوشبو کی تاثیر نے عون کو آنکھیں کھولنے پہ مجبور کر دیا تھا اور وہ جو اس کا بازو پکڑ کر اوپر اٹھا رہی تھی لمحہ بھر کے لیے بوکھلا سی گئی۔ اسی بوکھلاہٹ میں وہ اچانک سیدھی ہوئی اور بازو تک ہوا میں چھوڑ دیا۔ جو کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دوبارہ اپنی جگہ پہ پہنچ گیا تھا۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ عون اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے حواس کچھ ٹھکانے آئے تو سارے تیر بھی کمان میں سیدھے کر لیے تھے۔ کچھ سنبھل کر وہ خجل سی ماہ رو سے طنزیہ انداز میں مخاطب ہوا۔

''رات کی تمام عزت افزائی بھول کر صبح سویرے ہی اداؤں کے تیر تیز کر لیے تم نے۔ ظاہر ہے کوئی اور تو تم میں، مجھے متاثر کرنے کے لیے خوبی ہے نہیں... ایک حسن کا جال ضرور ہے جس میں پھانسنے کی کوشش میں ہر حد کو آزما ڈالوگی۔'' ماہ رو اس کے کاٹ دار لفظوں کا ہروار سہہ کر کچھ خفیف سی ہو گئی تھی چونکہ رات کی نسبت وہ اتنا بھڑک نہیں رہا تھا۔ اس لیے ماہ رو کو کچھ ڈھارس سی ہوئی تھی۔

''تمہارا بازو لٹک رہا تھا... میں تو آرام سے اوپر اٹھا کر...'' ماہ رو نے صفائی دینی چاہی پر عون نے بیچ میں ہی اچک لیا تھا۔

''لٹک ہی رہا تھا... کٹ تو نہیں گیا تھا۔ جو تم فرسٹ ایڈ دینے بھاگی بھاگی چلی آئی۔ اوپر سے اپنی زلفوں کو آزاد چھوڑ کر ان کا بھی جادو آزمانا چاہا...'' وہ بھی کیسے کیسے فضول طنز کر رہا تھا۔ ماہ رو شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ اسے شرمندہ دیکھ کر، وہ بھی رہ نہیں سکا تھا۔

''عجیب حیرت کی بات ہے۔ لوگوں کو کسی بات پہ شرمندہ ہونا بھی آتا ہے۔'' وہ بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا کچھ لاپروائی سے بولا تھا۔ کل کی طرح آج صاحب بہادر زہر نہیں پھونک رہے تھے۔ شاید گرج برس کے بعد کچھ دیر تک مطلع صاف تھا۔ کسی بھی وقت غبار آلود ہونے کے امکانات تاہم ضرور تھے۔ پھر اسے ماہ رو کو سرتاپا دیکھنے کا بھی خیال آگیا اور دوسرے ہی لمحے مزاج یار کے موسمی حالات خراب ہوتے چلے گئے تھے۔ اس کی سوجی آنکھوں میں جو نیند کی کمی کا شکار لال بوٹی سی ہو رہی تھیں اس وقت ناگواری سے اور بھی لال ہو گئیں۔

''یہ تم نے کیا پہن رکھا ہے؟ کوئی شریفانہ لباس نہیں تھا؟ اور اس کی آستینیں کہاں ہیں؟ دوپٹا بھی نہیں۔ شیم آن یو۔ میرے گھر میں بزرگ مرد اور جوان بھائی موجود ہیں۔ مہمان بھی آجا رہے ہیں اور تم اشتہاری ماڈل بنی گھر کے اندر باہر گھومتی رہوگی... تمہیں سارے رولز ریگولیشنز (اصول وضوابط) سکھانے پڑیں گے۔ آج ہی کان کھول کر سن لو۔ ایسے بے ہودہ کپڑوں میں گھر سے باہر جانا تو دور اس کمرے سے باہر بھی نہیں نکلوگی۔ ورنہ میں تمہارا حشر کروں گا۔'' وہ خاصا گرج کے ناگواری بھرے لہجے میں بولا تھا۔ ماہ رو لب بھینچ کر رہ گئی تھی۔ بھلا اسے کیا

جواب دیتی اس کے سارے ڈریسز ایسے ہی تھے۔

"اور جاؤ کوئی دوپٹا امی سے لے کر پہنو۔" وہ مزید بھی اس کی درگت بناتا' لیکن بیڈ روم کے دروازے سے آتا شور سن کر لب بھینچتا واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا اور ماہ رو ایک مرتبہ پھر خود کو باور کروا رہی تھی کہ اسے عون سے محبت تھی اس کی خوبیوں یا کمزوریوں سے نہیں۔ اگر وہ اسے ٹوک رہا تھا۔ غصہ کر رہا تھا تو کرتا رہے۔ ماہ رو کو دل پہ نہیں لینا تھا۔ اور بس نہیں لینا تھا۔ اس نے سارے آنسو اندر ہی اندر پی لیے تھے۔ اور پھر بڑی بشاشت سے کھلے ڈور سے آتی ماہم کے گلے سے جا لگی تھی۔ ایک دم اس اجنبی ماحول میں کسی بہت اپنے کو پا کر اس کی کیا کیفیت تھی۔ وہ لفظوں میں بتا نہ پاتی۔ ماہم نے بھی چٹاچٹ اس کے رخسار چوم لیے تھے۔

"کہاں ہیں تمہارے سرتاج؟ اتنی کالز کی تھیں' مگر صاحب بہادر نے فون نہیں اٹھایا۔ بتانا تھا کہ ناشتا کرنے کا تکلف مت فرمائیں۔ ہم ناشتا لے کر آرہے تھے اور تم نے کچھ ٹھونس تو نہیں لیا؟" ماہم فل اسپیڈ سے بولتی بہت کھلکھلا رہی تھی۔

"سیل شاید سائلنٹ پہ تھا۔" ماہ رو کو بتانا پڑا۔

"اور تمہارا؟" اس نے خفگی سے پوچھا۔

"کلچ (بٹوہ) میں۔" اس نے جان کر چہرے کا رخ موڑ لیا تھا تاکہ ماہم اس کے چہرے سے کچھ کھوج نہ لے۔ کچھ اخذ نہ کرلے۔

"اور دولہا بھائی؟" ماہم نے شرارتاً پوچھا۔

"باتھ روم میں۔" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

"ویل' تم اپنے سرتاج کے ساتھ باہر آجاؤ۔ بڑے ہال میں تمہاری ساس ماں نے ناشتا چنوا دیا ہے۔ آج لائف میں پہلی مرتبہ دسترخوان پر بیٹھ کر ناشتا کرنا ہوگا۔ ہم سب کے معدے بھی خالی ہیں۔ دیر مت لگانا' جلدی آنا۔" ہنستی مسکراتی ماہم جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔ تب اس نے جیسے کھل کر سانس لیا تھا۔ صد شکر کہ اس کا دھیان ماہ رو کے چہرے پر نہیں پڑا تھا۔ ورنہ وہ کتنی ہی وضاحتیں دیتی تب بھی ماہم کو مطمئن نہیں کرسکتی تھی۔ معاً" عون بھی باہر نکل آیا تھا۔ ماہ رو کو اسے ماہم کے متعلق نہیں بتانا پڑا تھا۔ کیونکہ ثنا خود آکر اسے باہر آنے کا کہہ گئی تھی۔ ماہ رو کہتی تو شاید وہ مروت نبھانے کے لیے اور دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بھی نہ جاتا۔ تاہم اپنی بھابھی کا احترام اس پر لازم تھا۔ وہ انکار نہیں کرسکا۔

ماہ رو بھی اس کے انتظار میں رکی ہوئی تھی۔ جب وہ بال بنا کر' پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد باہر جانے لگا تب غیر ارداتاً" ماہ رو پہ نگاہ پڑی تو رک گیا۔ وہ خاصی تذبذب کا شکار کھڑی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

"آپ باہر چلیں گی یا کسی شاہی سواری" کو بلایا جائے؟" اس کا انداز کاٹ دار قسم کا طنزیہ تھا۔ ماہ رو جیسے کٹ کر رہ گئی تھی۔ پھر بھی اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔

"تمہارے گمان میں ہوگا میں تمہارا ہاتھ پکڑوں اور شہزادی صاحبہ کو سج سج چلاتا باہر لے جاؤں۔ لیکن اس بھول میں نہ رہنا۔ اس گھر میں ایسے بے شرمانا رواج نہیں ہیں۔" وہ زہر خند ہوا اور اب کی دفعہ جھڑک کر بولا۔ "چلو"۔

"میرے پاس دوپٹا نہیں۔ تم اپنی امی سے لادو۔" بالآخر اس نے باہر نہ جانے کی وجہ بتادی تھی۔ عون کی بھنویں تنی تھیں۔ پھر تھوڑا اچک کر نارمل ہوئیں۔ وہ اس کے تذبذب کو جان کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ "ڈرامہ باز۔"

☼ ☼ ☼

ہال کمرے میں لمبا سا دسترخوان دیکھ کر ماہ رو حیران رہ گئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک لوازمات سجے تھے اور کھانے والے ندارد۔

"اتنے بڑے دسترخوان پر بس ہم چار لوگ۔" ماہ رو نے بے ساختہ ماہم کے کان میں گھس کر کہا تھا۔ پھر بھی اندر آتی ثنا نے اس کی بات سن لی تھی۔

"چار کیوں؟ ماشاء اللہ سے۔ ابھی پوری پلٹن

آجاتی ہے۔ بے فکر رہو۔" ثنا کے کہنے کی دیر تھی۔ ناشتا لگنے کا طبل بجتے ہی گھر کے کونوں کھدروں سے ایک ایک فرد اور بچہ خود بخود نکل آیا تھا۔ کسی کو بھی جا کر بلانا نہیں پڑا تھا۔ مہمان بھی موجود تھے۔ میزبان بھی۔ تایا رحمان کے آتے ہی ماہ رو احتراماً" کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ عون کے ابو تھے انہوں نے آگے بڑھ کر ماہ رو کے سر پہ ہاتھ رکھا' پیار کیا اور مٹھی بھر پیسے بھی دیے۔ وہ پیسے لیتے ہوئے کچھ ہچکچا گئی تھی۔ تب مریم نے اس کا شانہ تھپکا۔ وہ بڑا سا انار کے جوس کا گلاس پکڑ کے گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔

"بزرگوں کا تبرک اور پیسہ کبھی نہ چھوڑو۔ جتنا ملے ہڑپ کر جاؤ۔" مریم کی بات پہ قہقہہ پڑا تھا۔ اس کے چھوٹے دیور یاسر نے بات کو آگے بڑھایا۔

"ہماری بزرگ تو آپ ہیں بھابھی! ذرا اپنا چھوڑا تبرک مجھے بھی دیں۔ فریش انار کے جوس میں کیا ذائقہ ہوتا ہے؟ آج اس کا اندازہ تو کروں۔" وہ مریم کے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر بولا تھا۔ وہ بے چاری ارے ارے کرتی رہ گئی تھی۔ یاسر نے ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھا لیا۔

"واہ۔ کیا لاجواب ٹیسٹ تھا۔ اسے کہتے ہیں خالص انار کا جوس۔" اس نے خالی گلاس ہوا میں لہرایا۔

"اور جو پہلے چڑھایا تھا وہ کیا تھا؟" عاشر نے اسے دھموکا جڑا۔

"وہ۔" اس نے "وہ" کو لمبا سا کھینچ کے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ "اس میں تو بھابھی نے چینی اور پانی ملا کر دیا تھا۔ یقین مانو' روزانہ ایسے ہی کرتی ہیں۔ خود خالص انار کا جوس پی پی کر انار وانار ہو چکی ہیں۔ ہمیں ملاوٹ شدہ دیتی ہیں۔ دیکھو' میری رنگت کیسی پھیکی پڑ گئی ہے۔" یاسر نے منہ لٹکا کر مریم پہ ایسا الزام رکھا کہ وہ تنک کر بول پڑی۔

"تم دیوروں سے یہی صلہ ملے گا' نا۔ پہلے ایک الزام دیتا تھا۔ بھابھی! مینگو شیک میں پانی ملا لائی ہو۔ آم کی جگہ کدو گرینڈ کر لائی ہو۔ چائے میں دودھ کی جگہ میٹھا سوڈا ڈالا ہے۔ یا سرف کے جھاگ میں پتی ڈال کر ابال لائی ہو۔ اگر انڈا فرائی کر کے سامنے رکھوں تو کہتا۔ بیچ میں سے آدھا خود اڑا گئی ہو۔ صد شکر کہ اس کی تو بیوی آ گئی۔ وہ جانے اور اس کا شوہر جانے۔ خود اٹھائے اپنے نخریلے شوہر کے نخرے۔ نہ کپڑا پسند کرتا ہے۔ نہ کھانا پکا ہوا۔ ہر چیز میں سو سو کیڑے۔" مریم تو خاصی تپی ہوئی بیٹھی تھی۔ لمحہ بھر میں شروع ہو گئی تھی معاً" عون بھی اپنی پکار سن کر آ گیا تھا۔ ماہ رو کا دل اسے دیکھ کر دھڑک اٹھا تھا۔ اس نے بے ساختہ گردن گھمائی تھی۔

"مریم بھابھی! خاطر جمع رکھیں۔ دیور کے ساتھ اب دیورانی کے نخرے بھی اٹھائیں گی۔ ہماری بنو کو تو انڈا ابالنا بھی نہیں آتا۔ باقی کاموں کی فہرست تو پھاڑ ہی دیں۔ چائے کے نام پہ اسے چائے پینے کا پتا ہے۔ کھانے کے نام پہ کھانا کھانے کا پتا ہے۔ اگر کھانے کا کہیں گے تو وہ آپ کو کھا کر دکھا دے گی۔ پکوانے کی بات نہ کرنا۔" ماہم اپنی سہیلی کو مشکل میں گرفتار دیکھ کر میدان میں کود پڑی تھی۔ سعدیہ' ہما اور باقی سب نے بھی قہقہہ لگایا تھا۔ ماہم آتے ہوئے یونی ورسٹی فیلوز کو بھی لے آئی تھی۔ سمیرا' فرح اور عمارہ بھی تھیں۔ سو خوب رونق لگ گئی۔

"نکمے پن کے دعوے دارو' ہمیں ٹرینڈ کرنے کے سارے گر آتے ہیں۔" عون نے ماہم کو جواب دیتے ہوئے ماہ رو پہ صاف طنز کیا تھا۔ وہ سمجھ کر لب بھینچ گئی تھی۔

"شرط یہ ہے کہ سکھانے والے آپ ہوں۔" ماہم نے برجستہ کہا۔

"یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔ ایسا سکھاؤں گا کہ عمر بھر بھلا نہ سکے گی۔" اس نے بظاہر مسکرا کر کہا تھا۔ لیکن ماہ رو کے دل پہ گھونسا پڑا۔ وہ محفل میں بھی کچوکے لگانے سے باز نہیں آ رہا تھا۔

"میرا دوسرا راؤنڈ اس کی ٹریننگ کے بعد لگے گا۔ میں بھی تو دیکھوں گی۔ آپ کا دعوا کہاں تک ٹھیک ثابت ہوا۔" ماہم نے جیسے اسے چیلنجنگ انداز میں

چھیڑا تھا۔
"ہم قول کے کچے نہیں، جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ اپنی سہیلی سے پوچھ سکتی ہو۔" عون نے مسکرا کر کہا۔ گو کہ اس کی باتیں سب انجوائے کر رہے تھے لیکن ماہ رو تو جانتی تھی کہ وہ بات بہ بات طنز کر رہا ہے۔
"کل سے ہماری نئی بھابھی کی کلاسز شروع ہو جائیں گی۔" یاسر نے ٹکڑا لگایا۔
"دیکھتے ہیں' ڈیلی ٹیسٹ' ویکلی کوئز' منتھلی رپورٹس اور فائنل ٹرم میں ماہ رو کتنے کتنے مارکس لیتی ہے۔" بھابھی ماہ رو کو چھیڑتے ہوئے بولی تھی۔
"بائی دا وے' اس ٹریننگ کی ڈیٹیلز (تفصیلات) بھی بتائی جائیں۔ پکوائی اور دھلائی سے لے کر کہاں تک اس کی لمٹ (حد) ہے؟" ماہم کو ہی اچانک اتنی اہم بات پوچھنے کا خیال آگیا تھا۔ کیونکہ اسے لگ رہا تھا۔ عون کچھ بھی مذاق میں نہیں کہہ رہا۔ وہ ہر بات ماہ رو کو لگا کر کر رہا تھا۔
"لامحدود۔" جواب بھی عون نے دیا۔ ماہم کو جیسے شاک لگا تھا۔ وہ ایک دم چلا اٹھی۔
"عون بھائی! خدا کا خوف کھائیں۔ آپ بیوی کو لے کر آئے ہیں یا ایک باورچن' دھوبن' سوئپر اور دغیرہ دغیرہ کو۔؟"
"چونکہ میرا میتھ بہت اچھا ہے۔ اور میں جوڑ توڑ' حساب کتاب میں کمال رکھتا ہوں۔ سو سارے پہلوؤں پہ غور کر کے لایا ہوں۔ مجھے لگا تھا' تھوڑی ٹریننگ کے بعد یہ کک میڈ' سوئپر کے عہدے تک پروموشن لے سکتی ہے۔" اس نے ایک مرتبہ پھر مسکراہٹ دبا کر کہا تھا۔ یوں کہ ہال کمرے میں چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ لگا۔ جبکہ ماہ رو نے بڑی زخمی نگاہ سے اسے دیکھا تھا۔
"یہ نہ ہو حساب میں اچھا ہونے کے دعوے کرتے کرتے آپ کا اپنا حساب ہو کر کورٹ مارشل ہو جائے۔" ماہم نے بھی لطیف سا طنز کیا تھا۔
"ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس کی کلف لگی گردن کچھ اور تن گئی تھی۔
"دوسروں میں تبدیلی لاتے لاتے آپ خود سراپا

بدل گئے تو۔" سمیرا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ اس کے لہجے میں واضح طنز تھا۔
"کبھی نہیں۔۔۔ بدلتے تو وہ ہیں جنہیں اپنی کمزوریوں کو چھپانا ہوتا ہے۔ وہ تبدیلی میں خود کو چھپا کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ تاکہ ان پہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ تاکہ انہیں۔ ریجیکٹ نہ کر دیا جائے۔ یہ لوگ ریجیکشن سے ڈرنے کے لیے خود میں بدلاؤ لاتے ہیں۔" عون نے گہرے کاٹ دار لہجے میں ماہ رو پہ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر کہا تھا۔ وہ امی کے کرینکل کریپ دوپٹے کو بمشکل سنبھالتی کچھ اپ سیٹ دکھائی دے رہی تھی۔ بار بار شانوں سے پھسلتا دوپٹا ٹھیک کرتی۔ دوپٹا لینے کی عادت جو نہیں تھی۔ عون کے چہرے پہ استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
"نیور مور۔" (کبھی نہیں) ماہم نے بے ساختہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "میں آپ سے ایگری (متفق) نہیں کرتی۔ یعنی اچھی تبدیلی کے عمل کو بھی آپ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔" یہ ماہم کا ہی جگرا تھا جس نے عون سے منہ پر اختلاف کر لیا تھا۔ مریم اور ثنا ہنسنے لگی تھیں۔
"ان فیکٹ' (دراصل) تم میرے پوائنٹ آف ویو کو نہیں سمجھ رہیں۔ ہر تبدیلی میں فرق ہوتا۔ کوئی تبدیلی اپنے لیے ہوتی ہے اور کوئی دکھاوے کے لیے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کچھ لوگ وقتی طور پہ خود کو تبدیل کر کے' خود کو دوسروں کی نظر میں

اچھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت بڑے ملمع ساز ہوتے ہیں۔" عون نے ایک مرتبہ پھر ماہ رو پہ اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کی توجہ ان کی باتوں کی طرف نہیں تھی۔ خیالوں میں گم ہونے کی وجہ سے اس کا دوپٹا دونوں شانوں سے پھسل کر گود میں جاگرا تھا اور اسے خیال تک نہیں تھا۔ عون نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ درپردہ وہ ماہ رو کو ہائپوکرائٹ کا لقب دیتے ہوئے اس وقت خود بہت بڑا ملمع ساز لگ رہا تھا۔ جس نے اپنی شخصیت کو پرت در پرت چھپا رکھا تھا۔ جب دل چاہتا۔ موقع یا حالات کی مناسبت سے پرت اتار کر ویسا ہی خود ظاہر کرتا۔ جیسے وہ اندر باہر سے ایک ہو۔

"اینی وے' آپ سب کا شکریہ۔ چونکہ ولیمہ تو ہے نہیں۔ سو' پھر کبھی ملاقات ہوگی۔" وہ جینز جھاڑتا۔ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یوں کہ ماہم چائے پیتے ہوئے اسے رکنے کا اشارہ کرتی چیخ پڑی تھی۔

"کہاں چل دیے؟ رکیے ذرا' ہم ماہ رو کو لینے آئے ہیں۔" ماہم بھی کھڑی ہوئی۔ "اپنی مسٹریس (منظور نظر) کو ہمارے ساتھ بھیجیں۔" اس کی پکار پہ عون نے بے ساختہ رکتے ہوئے اک نظر ماہ رو کے خاموش سراپے پہ ڈالی تھی۔

"وہ کس خوشی میں؟" اس کا انداز طنزیہ تھا۔ وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا رک سا گیا۔ ماہ رو بھی بے چین ہوگئی تھی۔

"یہ دستور زمانہ ہے جناب! ان فیکٹ' ماہ رو کے ڈیڈی بھی اداس ہوگئے ہیں۔" ماہم نے مسکرا کر بتایا۔

"محض ایک ہی رات میں؟" عون کا انداز سابقہ ہی تھا۔ دھیما اور طنز بھرا۔

"وہ اس کے بغیر کبھی رہے نہیں نا۔" ماہم نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ عون نے لمحہ بھر کے لیے ہونٹ سکیڑ لیے تھے۔ پھر بھنویں اچکا کر بولا۔

"تو ماہ رو کے بغیر رہنے کی عادت ڈالیں اب۔ ایسے تو نہیں چلے گا۔ ہر بڑے تہوار پہ ملنے جایا کرے گی۔ ڈیڈی صاحب کو بتا دینا۔" اس کا انداز اٹل سا تھا۔

"واٹ؟" ماہم ہکا بکا رہ گئی۔ "یہ تو فاؤل (غلط) ہے۔"

"یہ فاؤل نہیں' ہمارے گھر کا رواج ہے۔ یہاں کی بہوئیں ہر رواج اور اصول کو اپناتی ہیں۔ مریم اور ثنا سے پوچھ لو' یہ عید کے عید بھی نہیں جاتیں۔" اس نے مبالغے کی حد کردی تھی۔ ماہم کی چیخ و پکار پہ تائی کو مداخلت کرنا پڑی۔

"بکواس کر رہا ہے۔ کیوں نہیں جائے گی۔" انہوں نے عون کو ڈپٹ کر کہا۔ وہ لب بھینچ کر چپ ہو گیا تھا۔ پھر اس تاثر کو ختم کرتے ہوئے بولا۔

"آج تو امی کی سپورٹ مل گئی۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" وہ مسکراتے لہجے میں پوشیدہ وارننگ دیتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔ جبکہ ماہ رو بمشکل ہونٹ کاٹتی اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ اسے عون نے باتوں باتوں میں اچھی طرح سے جتا دیا تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر آئے دن ڈیڈی سے ملاقاتوں والا سسٹم نہیں چلے گا۔ وہ بھرے دل کے ساتھ ماہم کو اپنے روم میں لے کر جا رہی تھی۔ جب سمیرا کی اچانک آواز اس کے کان میں پڑی۔

"تھما! آؤ ہم ذرا فریحہ سے مل لیں۔ اس بے چاری کے ساتھ جو ہوا برا ہوا۔ ہم تو پرسہ بھی نہیں دے سکے۔ یہ تو ماہم مجھے گھسیٹ لائی تھی۔ ورنہ میں تو کبھی نہ آتی۔ فریحہ کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے۔ ویسے یار! لوگ بھی کیسے بخت آور ہوتے ہیں۔ جسے چاہتے ہیں پالیتے ہیں۔ چاہے کسی کی محبت ہو یا محبوب۔ ماہ رو نے تو دن دہاڑے فریحہ کے ارمانوں پر شب خون مارا اور ذرا بھی شرمندہ نہیں۔" اس کی یونی ورسٹی فیلو بڑے جلے کٹے لہجے میں تھما سے مخاطب تھی۔ یوں کہ اندر کی طرف جاتے جاتے ماہ رو کے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"فریحہ!" اس کے ہونٹ جیسے کپکپا اٹھے تھے۔ عون کے حوالے سے ایک بھولا ہوا قصہ اچانک یاد آگیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

ناولٹ
فائزہ افتخار
آٹھویں قسط

"کیا؟... طلاق؟" امی حق دق رہ گئیں۔
"اور یہ خناس یقیناً" تم نے بھرا ہو گا رضوان کے دماغ میں ورنہ یہ بات کرنے سے پہلے وہ مجھ سے مشورہ ضرور کرتے۔"
"ابو نے جو کیا ٹھیک کیا... لیکن میں سالار سے طلاق کا مطالبہ کرنے کے حق میں نہیں نہ اس کے فیصلے کا انتظار کر کے ہنی کا اور وقت ضائع کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی جانب سے خلع کا کیس کرنے کے لیے میں نے وکیل سے بات کر لی ہے۔" میری بات پہ امی سر پکڑ کے بیٹھ گئیں۔
"یا خدایا... ہمارے خاندان میں آج تک کسی کو طلاق نہیں ہوئی کجا کہ لڑکی خود اپنے منہ سے مانگے۔"
"کسی کو تو پہل کرنی ہے ناں۔" اب تک چپ بیٹھی تانیہ سے رہا نہ گیا اور وہ کہہ اٹھی... حالانکہ میں نے اسے سختی سے دخل نہ دینے کا کہا تھا۔
"چلیں ہانی ہی بارش کا پہلا قطرہ بنیں گی۔ اس فیلڈ میں آگے ہوتے والی ڈائی ورسز کے لیے۔" اس کی بے تکی بات امی کو مزید تپا گئی۔
"کیا فضول باتیں ہو رہی ہیں یہاں شادی والے گھر میں... کل سے شادی کی تقریبات شروع ہو جائیں گی اور تم لوگ یہ نحوست پھیلا رہے ہو۔"
"میں صرف ہنی کی زندگی سے نحوست دور کرنا چاہ رہا ہوں۔"
"دیکھو! سعد یہ میرے گھر کی پہلی خوشی ہے... میرے اکلوتے بیٹے کی شادی... میں کسی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتی۔ اب یہ طلاق کا لفظ کسی کے منہ سے نہ نکلے۔"
"مگر امی..."
"دیکھو... صرف ایک ہفتہ مانگ رہی ہے تمہاری ماں تم سے... بلکہ تین چار دن... جو ہو گا، تمہاری شادی کے بعد ہو گا پہلے نہیں اور یہ میرا فیصلہ بھی ہے اور میرا حکم بھی۔"
ان کے اس فیصلے کے پیچھے ان کا کون سا خوف تھا وہ میں بخوبی سمجھ رہا تھا مگر جتا نہ پایا چپ رہا۔ اور ان سے کچھ کہے بغیر وہ خلع کے کاغذات لیے ہنی کے پاس آ گیا۔
"تمہیں بس ان پہ سائن کرنے ہیں ہنی۔" وہ گھبرائی ہوئی تھی۔
"نہیں سعد... تائی امی کا کہنا ہے کہ..."
"ہنی پلیز... میں امی سے بحث نہیں کرنا چاہتا... مگر میں اس کام میں تاخیر بھی نہیں چاہتا... سالار ایک ذہنی مریض ہے وہ کبھی تمہیں آسانی سے آزاد نہیں کرے گا۔ تم نے خود بتایا ہے کہ وہ تمہیں تکلیف دے کر سکون محسوس کرتا ہے۔"
"کچھ دن کی تو بات ہی سعد۔ اگر تائی امی چاہتی ہیں کہ یہ سب شادی کے بعد ہو تو کیا حرج ہے۔"
"میں ان کا مقصد اور خوف بخوبی سمجھ رہا ہوں۔ انہیں شادی میں بدمزگی کا نہیں... کسی اور بات کا ڈر ہے۔" میری پھیکی مسکراہٹ پہ وہ چونکی۔
"کیسا ڈر؟"
"کچھ نہیں۔" میں ٹال گیا۔ اب اسے کیا کہتا۔
"تم بس ان پہ سائن کرو... میرا وکیل انہیں سالار تک پہنچا دے گا... اور وہ کون سا تیار بیٹھا ہو گا تمہیں آسانی سے رہا کرنے کے لیے کچھ وقت تو لگے گا امی کی بات بھی رہ جائے گی۔"
میرے تسلی دینے پہ بھی وہ تذبذب کا شکار ہی نظر آ رہی تھی۔
"ہنی کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں کبھی تمہارے ساتھ کچھ غلط کر سکتا ہوں۔ یا ہونے دے سکتا ہوں؟"
"نہیں۔" "تو بھروسا رکھو یہ تمہاری بہتری کے لیے ہی ہے۔ دل سے ہر طرح کا وسوسہ نکال کر مضبوط بن کے یہ فیصلہ کرو۔"
اس کے سامنے کاغذات رکھ کے میں باہر نکلا تو وہاں خالہ بتول، مہ پارہ پھوپھو اور دوسری مہمان رشتے دار خواتین کے ساتھ یہی معاملہ ڈسکس کر رہی تھیں۔
"عورت کی مضبوطی بس خلع اور طلاق کا فیصلہ لینے تک ہوتی ہے اس کے بعد وہ کچی ریت کی دیوار کی طرح ڈھے جاتی ہے۔" یہ خالہ بتول کا فلسفیانہ بیان

تھا۔

"لیکن خالہ۔ اس کا حق تو اللہ نے دیا ہے۔"

"اور اللہ نے ہی اسے ناپسند بھی فرمایا ہے۔" خالہ نے فوراً "اعتراض کرنے والی کو گھر کا۔

"اور پھر دنیا میں جوان گنت جھوٹے خدا ہم نے بنا رکھے ہیں' ان کو نہ بھولو۔۔۔ یہ دنیا کہاں جینے دیتی ہے اکیلی عورت کو۔"

"اکیلی کیوں خدانخواستہ؟" مہ پارہ پھوپھو تیز لہجے میں بولیں۔

"ہم سب ام ہانی کے ساتھ ہیں۔"

"کون سب؟" خالہ نے اسے طنزیہ نظروں سے گھورا۔

"اور کب تک' یہ سعد جو اچھل اچھل کے شور مچا رہا ہے طلاق کا۔۔۔ کل شادی کر کے اپنی آدھی انگریزنی بیوی کے ساتھ ولایت چلا جائے گا۔ تانکہ کے چہرے پہ میں ابھی سے خوف دیکھ رہی ہوں' چاچا جی دو پل کے مہمان۔۔۔ اور تم۔۔۔ تم کیا ساتھ دو گی؟ تم تو اپنے جوگی بھی نہیں۔ خود کے لیے کہہ سکی کچھ۔" پھوپھو افسردہ ہو کر سر جھکا کے رہ گئیں۔

"مگر پھوپھو۔۔۔ تو کیا وہ بے چاری پھر سے وہاں۔۔۔ یہ تو ظلم ہو گا۔"

"طلاق دلوانا ظلم پہ ظلم ہو گا۔۔۔ ساری عمر اس حویلی میں گھٹ کے رہ جائے گی۔ وہاں سالار کے سدھرنے کی امید تو ہے کی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کل کو بال بچہ ہونے کے بعد انسان بن جائے۔ یا کم از کم ام ہانی ہی اولاد میں بہل جائے۔۔۔ یہاں کیا رکھا ہے؟ یہاں غیروں کی لڑکی لانے کی روایت توڑ ہی گئی۔۔۔ مگر صدیوں بعد ابھی کئی صدیاں اور لگیں گی غیروں کو لڑکی دینے کے لیے۔"

میں ان کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے خالہ۔۔۔ خاندان میں کہاں کوئی جوڑ ہے ام ہانی کے لیے اور طلاق کے بعد تو بالکل بھی امید نہیں' ہائے۔۔۔ بے چاری۔"

بوجھل قدموں کے ساتھ میں وہاں سے جانے لگا۔

☆ ☆ ☆

"زیتون۔۔۔ حلیمہ کہاں ہو سب کی سب۔۔۔ بہت کام ہے آج۔۔۔ اور تم سب پتا نہیں کہاں منہ چھپا کے بیٹھی ہو' ہڈ حرام کہیں کی۔" مہ پارہ شور مچاتی پکارتی پھر رہی تھیں۔ سامنے سے آتی تانیہ پہ نظر گئی تو نئی فکر لاحق۔

"ارے۔۔۔ ارے تم کیوں یوں بے مہار گھوم رہی ہو۔ آج مایوں ہے تمہاری۔"

"وہ تو رات کو ہے پھوپھو۔"

"ہاں مگر تمہیں اب یوں کھلے سر اور منہ کے ساتھ یہاں وہاں نہیں پھرنا چاہیے۔ مایوں کی دلہن پردے میں بیٹھتی ہے۔"

"پردے میں؟"

تانیہ نے ہونق سی ہو کے کھڑکیوں سے لٹکتے بھاری پردوں کو دیکھا تو مہ پارہ سر پیٹ کے رہ گئیں۔

"یہ والے پردے نہیں بنو! دوسرا پردہ۔۔۔ مطلب اب کوئی تمہارا چہرہ نہ دیکھے نہ تم کسی کو نظر آؤ جب تک شادی نہیں ہو جاتی۔" اس نئے فرمان پہ وہ اور متوحش ہو گئی۔

"اوہ نو۔۔۔ مجھے تو ڈیڈ سے اتنی ضروری بات کرنی تھی۔ اب کیا ہو گا؟"

"ارے۔۔۔ ان سے تھوڑا ہی ہو گا پردہ۔۔۔ تم اپنے کمرے میں بلوا لو انہیں۔" تبھی اسلم ٹی شرٹ کے ساتھ برمودا پہنے وہاں آنکلے۔

"تانیہ۔۔۔ میسج کیا تھا تم نے۔۔۔ خیریت۔" ان کا حلیہ دیکھ کے مہ پارہ نے سٹ پٹا کے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے رخ پھیر لیا۔

"جی ڈیڈ۔۔۔ ایک بات کرنا تھی۔"

"یہ آپ کو کیا ہوا محترمہ؟" اسلم صاحب بیٹی کے بجائے منہ پھیر کے کھڑی مہ پارہ کی جانب متوجہ تھے۔

"کیا میرے حسن کی تاب نہیں لا سکیں آپ؟"

"آپ حویلی میں ایسے آدھے کپڑوں کے ساتھ نہ گھوما کریں اسلم صاحب۔۔۔ یہاں خواتین بھی ہوتی ہیں۔" انہوں نے ناگواری برملا جتا دی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ مجھے اسلم صاحب نہ کہا

کریں۔ سیم.... او نلی سیم.... اب کہیے پارہ جی۔"

"میرا نام پارہ نہیں.... مہ پارہ ہے۔"

"مگر آپ کا پارہ تو ہمیشہ ہائی رہتا ہے اور ویسے بھی مجھے مکمل نام پکارنے کی نہ عادت ہے.... نہ ہی پسند ہے۔"

"اور مجھے یہ پسند نہیں کہ کوئی میرا نام بگاڑے۔" وہ پیر پٹختی چلی گئیں تو اسلم صاحب کو بلاوجہ ہنستے دیکھ کے تانیہ کہنے لگی۔

"کیوں ستاتے ہیں آپ انہیں؟"

"اچھا لگتا ہے۔" وہ سادگی سے کہنے لگے۔

"اور جب یہ محترمہ چڑتی ہیں تو اور بھی اچھا لگتا ہے۔"

"یو نو ڈیڈ (آپ جانتے ہیں نا).... میری اور سعد کی پہلے بالکل بھی دوستی نہیں تھی۔ ہم میں اکثر جھگڑا رہتا تھا اور ہمیشہ میری ہی وجہ سے ہوتا تھا.... میں جان بوجھ کے اسے ستاتی تھی۔ وہ چڑ جاتا تھا.... اور مجھے احساس ہوا کہ اس کا چڑنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

تانیہ کی باتوں سے وہ جھینپ سے گئے اور تانیہ سوچتی اور کچھ کریدتی نظروں سے انہیں دیکھتی مزید کہہ گئی۔

"اور پھر.... سعد بھی اچھا لگنے لگا۔"

اب کے وہ باقاعدہ گھبرا گئے۔

"یہ تھی وہ ضروری بات؟"

"ارے نہیں نہیں.... وہ بھی کرتی ہوں آئیں تو سہی۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کے اپنے کمرے میں لے جانے لگی۔

☆ ☆ ☆

"ایک ضروری بات کرنی ہے تم سے۔"

ام ہانی دروازے کی جانب پشت کیے الماری سے کچھ نکال رہی تھی کہ نائلہ کی سنجیدہ اور سرد آواز پہ پلٹی۔

"جی...."

نائلہ کی نگاہوں میں بھی وہی سرد مہری سنجیدگی تھی

"کیا رضوان اور سعد نے تمہیں بتایا ہے کہ سالار کا جواب کیا ہے؟ وہ تمہیں طلاق دینے پہ آمادہ نہیں ہے۔"

"کسی کے بتائے بغیر بھی میں ان کا جواب جانتی ہوں۔"

"اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اب بھی صلح صفائی چاہتا ہے۔ نہ رشتہ توڑنا چاہتا ہے۔ نہ گھر' عموماً" یہ سوچ عورت کی ہوتی ہے۔ مگر وہ مرد ہو کے ایسا چاہ رہا ہے تو تم عورت ہو کے کیوں گھر توڑنے پہ تلی بیٹھی ہو۔ تمہیں اسے ایک موقع ضرور دینا چاہیے۔"

"ایک اور موقع؟" وہ خوف زدہ ہو گئی۔

"یعنی ایک بار پھر اس زنداں میں.... اس عقوبت خانے میں جانا.... نہیں تائی امی.... ایک بار قدم باہر نکالنے کے بعد میں پھر سے وہاں گئی تو وہ مجھے مار ہی ڈالیں گے۔ آپ نہیں جانتیں کہ وہ کتنے خطرناک انسان ہیں۔"

"اگر وہ اتنا ہی خطرناک انسان ہے تو تم نے اپنے اور اس کے جھگڑے میں میرے بیٹے کو کیوں ڈالا؟" نائلہ کی آواز غصے سے بلند ہو گئی۔

"خدانخواستہ اس نے سعد کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو؟ یا پھر خلع کے پیپرز ملتے ہی عین شادی والے دن یہاں آ کے کوئی ہنگامہ کیا تو کتنا تماشا بنے گا۔ دیکھو میں نے اسی لیے یہ معاملہ شادی تک التوا میں ڈالنے کے لیے کہا تھا کہ شادی خیریت سے ہو جائے' سعد تانیہ کو لے کر واپس چلا جائے تو تو میں خود سالار کو یہاں بلا کے فیصلہ کراتی ہوں۔ تمہاری مرضی نہیں ہے۔ گھر بسانے کی تو ٹھیک ہے.... مہ پارہ کی طرح تم بھی بیٹھی رہنا ساری عمر اس حویلی میں.... مگر سعد کی تانیہ سے شادی ہونے تک میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔"

☆ ☆ ☆

"سعد.... سعد۔" اپنی عادت کے عین مطابق وہ ایک ہنگامے کے ساتھ میرے کمرے میں داخل

ہوئی۔

"یار.... تم مجھے مرواؤ گی۔" میں اس کے وندناتے ہوئے اندر گھسنے پہ گھبرا اٹھا۔

"تم پھر سے میرے روم میں' نکلو باہر.... کم از کم آج کا دن تو احتیاط کر لو.... پھوپھو یا امی نے دیکھ لیا تو۔"

"مگر مجھے ابھی اس وقت تم نے ضروری بات کرنا ہے۔"

"کیسی بات؟"

"بیٹھو تو...." میرا ہاتھ تھام کے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے وہ پورے جوش و خروش سے بتانے لگی۔

"تمہیں یاد ہے سعد.... تم نے کیا کہا تھا کہ تمہیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس حویلی کی روایات مردوں کے لیے تو کمزور پڑ گئی ہیں مگر عورتوں کے لیے اب بھی ویسی کی ویسی ہیں۔"

"ہاں...." میں کچھ نہ سمجھا کہ عین مایوں والے دن یہ ذکر کیسا۔

"اور میں نے یہ کہا تھا کہ صرف ان کی حالت پہ افسوس کرنے سے کچھ نہیں ہو گا.... تمہیں ان کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔"

"ہاں.... یاد ہے اور تمہاری یہ بات واقعی میرے دل کو لگی تھی۔"

"تو بس اب عملی قدم اٹھانے کا وقت ہے۔"

"مطلب؟"

"ارے یار.... میں تمہاری پھوپھو کی شادی اپنے ڈیڈ سے کرانا چاہتی ہوں۔"

"تانیہ...." میں کرنٹ کھا کے اٹھا۔

"میں سیریس ہوں اور اپنی شادی کے ساتھ ساتھ ڈیڈ کی بھی شادی یہاں سے کروا کے ہی جاؤں گی۔"

"گھر والے کیسے مانیں گے۔ یہ کام کیسے ہو گا.... یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے تم بتاؤ تمہارا حوصلہ ہو گا اپنی ماں کی جگہ کسی اور کو دینے کا.... تم نے ہوش سنبھالنے سے اب تک اپنے ڈیڈ کو صرف اپنا دیکھا ہے.... کسی اور کا ہوتے دیکھ سکو گی۔"

"آف کورس.... کیوں نہیں' میرا دل اتنا چھوٹا نہیں ہے سعد کہ میں جس سے محبت کروں اسے اپنی مٹھی میں قید کر لوں.... محبت خوشی دینے کا نام ہے۔ اپنا کر کے رکھنے کا نام نہیں.... اگر ڈیڈ کو مہ پارہ پھوپھو کے ساتھ خوشی ملتی ہے تو میں شیئر کرنا تو دور کی بات.... میں پورے کا پورا نہیں کسی اور کو سونپ سکتی ہوں.... بہت خوشی سے.... میرے نزدیک یہی محبت ہے۔"

اس کی بات نے میرے دل کا بوجھ اور ذہن کی الجھن بہت حد تک دور کر دی۔

میں اس کی بات سے اپنی مرضی کے مطلب نکال کر خود کو مطمئن کرنے لگا۔

"اب قائم رہنا اپنی بات پہ کہ تمہارے نزدیک محبت اپنا بنا کے رکھنے کا نام نہیں ہے۔ جس سے محبت کرتے ہیں اس کو خوشی دینے کا نام ہے۔"

☼ ☼ ☼

"آپ کا واپسی کا ٹکٹ۔" سالار نے اماں کے سامنے ٹکٹ رکھتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

"تو تم مجھے اس لیے جلد از جلد بھیجنا چاہتے ہو کہ من مانی کر سکو.... واہ سالار اعظم اتنا لحاظ کہاں سے آ گیا تم میں ماں کے لیے کہ اس کے سامنے درندگی کرنے سے جھجکنے لگے۔" ان کے طنز کا سالار پہ مطلق اثر نہ ہوا۔

"میرے دل میں نہ کسی کے لیے لحاظ ہے نہ محبت.... یہ بات آپ جانتی ہیں.... میں صرف اس ذہنی اذیت سے بچنا چاہتا ہوں جو آپ کو سامنے پا کے مجھے ہوتی ہے بہتر ہو گا آپ جتنی جلدی ہو سکے اپنی بیٹی کے پاس چلی جائیں۔"

"تاکہ تم زور زبردستی ام ہانی کو یہاں واپس لا سکو اور پھر سے اس کا جینا حرام کر سکو۔"

"ایسا کرنے سے آپ مجھے روک نہیں سکتیں۔ چاہوں تو ابھی اسی وقت.... آپ کے ہوتے ہوئے بھی اسے یہاں لا سکتا ہوں۔"

"ایسا نہیں کر سکتے تم.... وہ لوگ بھی کوئی گرے

پڑے نہیں ہیں۔ اثر و رسوخ والے ہیں۔ جو ان کی لاعلمی میں ہوا' سو ہوا... اب وہ تمہیں اس تک نہیں پہنچنے دیں گے۔"

"آپ اپنے اندازے اپنے پاس رکھیں... میں جانتا ہوں ام ہانی کو... وہ بہت کمزور... بہت بزدل ہے اپنے قدموں پہ چل کے مجھ تک واپس آئے گی' مجھے زور زبردستی کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

وہ بڑے زعم سے بولا تھا... اور اماں اس کے ارادوں کی پختگی پہ اندر ہی اندر ہول کے ام ہانی کی سلامتی اور بہتری کی دعا کر کے رہ گئیں کہ اس سے زیادہ کچھ کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

ام ہانی' سالار کے دعوے کے مطابق بزدل تھی یا نہیں... مگر نائلہ اس وقت حقیقتاً "بہت بزدل ثابت ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے اندر کے خوف اور وسوسوں کو پچھاڑ نہیں پا رہی تھیں۔ بلکہ انہوں نے اس کے آگے ہتھیار ڈال کے خود کو بالکل پسپا کر دیا تھا اور اب یہ وسوسے' یہ اندیشے... یہ وہم' یہ شک سب ان کے سر پہ چڑھ کے راج کر رہے تھے۔

مایوں کی رسم کے دوران بھی وہ شکی نظروں سے کبھی ام ہانی کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھتیں۔ کبھی سعد کی اس پہ منڈلاتی نظروں کو... انہیں ام ہانی کی افسردگی ایک ڈرامہ ایک جال محسوس ہو رہی تھی۔ جس میں ان کا نادان بیٹا پھنستا چلا جا رہا تھا۔

سعد کے چہرے کا تناؤ انہیں کسی آنے والے خطرے کی علامت محسوس ہونے لگا... اور پھر جب ام ہانی سعد کی مسلسل کچھ کہتی نظروں سے گھبرا کے ڈھولک بجاتی لڑکیوں کے جھرمٹ سے اٹھ کے اندر جانے لگی تو اس میں بھی نائلہ کو کوئی چال محسوس ہوئی... اور جو انہوں نے سعد کو بھی کچھ ہی دیر بعد ام ہانی کے پیچھے جاتا دیکھا تو رہ نہ سکیں۔

☼ ☼ ☼

ام ہانی کے چہرے پہ کچھ تھا جو مجھے چین نہیں لینے دے رہا تھا... ایک دبا دبا سا خوف۔

ایک سراسیمگی... ایک الجھن...

بے دھیانی کے عالم میں وہ وہاں موجود ہو کے بھی موجود نہ لگ رہی تھی... خالی خالی نظریں... جامد تاثرات... اور پھر وہ اچانک ڈھولک بجاتی لڑکیوں میں سے اٹھ کے... مایوں کی اس تقریب کو چھوڑ کے اندر جانے لگی۔

چند لمحے بمشکل ہی میں خود کو روک پایا اور پھر میرا رخ بھی اسی جانب تھا۔

"سعد... تم رسم چھوڑ کے کہاں جا رہے ہو؟" امی گویا میری تاک میں تھیں فوراً" ہی میرے پیچھے...

"میں ذرا ہنی کو دیکھنے جا رہا تھا... پتا نہیں کہاں چلی گئی۔"

"وہ کہیں بھی ہو... تمہیں اس وقت یہاں ہونا چاہیے۔ تانیہ کے پاس۔" ان کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔

"میں وہیں جا رہا تھا۔ بس ذرا پہلے ہنی کو..."

"نہیں... پہلے ہانی نہیں سعد... پہلے تانیہ۔" میں چپ رہ گیا۔

"تمہیں پتا ہونا چاہیے سعد کہ تمہاری زندگی میں پہلا مقام کس کا ہے۔" وہ مجھے وارننگ دیتی نظروں سے گھور کے چلی گئیں... میں نے بے بسی سے ہانی کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور اپنے قدم موڑ لیے۔

رسم اب بھی تمام تر ہنگامے کے ساتھ جاری تھی... مگر میرا دل بجھا ہوا تھا... کبھی جو تانیہ مسکرا کے میری جانب دیکھ لیتی تھی... تو میں اس کی مسکراہٹ کا جواب تک نہ دے پاتا تھا۔

ہنگامے سرد ہوئے... مگر میرے اندر کی آگ سرد نہ ہوئی تھی۔ اکیلے ہی ٹیرس میں سرد ہواؤں کی زد میں ٹہلتے ہوئے میں اس ٹینشن کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب ہنی چلی آئی۔

"اتنی سردی میں یہاں کیا کر رہے ہو' وہ بھی اتنی رات کو؟" میں نے مڑ کے اسے دیکھا۔

''اگر کہوں.... تمہارا انتظار.... تو؟''
''یوں کیوں نہیں کہتے کہ تانیہ کا انتظار کر رہے ہو۔'' اس نے شوخ ہونا چاہا.... اگرچہ اس کی اداس آنکھیں اس شرارت کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔
''شاید میں غلط وقت پہ آگئی.... ہے ناں؟''
''نہیں ہنی.... تانیہ غلط وقت پہ آگئی۔'' میں نے بغور اسے دیکھا۔
''میری زندگی میں....''
''سعد....'' وہ گھبرا اٹھی۔
''ہنی.... میں نے سنا تھا مائیں اولاد کے دل کا حال جان لیتی ہیں.... بنا کہے' آج دیکھ بھی لیا۔ سالوں پہلے بھی انہوں نے میرے دل میں چھپی تمہاری محبت کو اس وقت محسوس کر لیا تھا۔ جب تم بھی نہیں جانتی تھی.... اور آج بھی انہیں علم ہو گیا.... جبکہ ابھی تک تو میں بھی یہ محسوس نہیں کر پایا تھا۔''
وہ اس قدر سراسیمہ ہوئی کہ مجھے ٹوک بھی نہ سکی۔ بس پلٹ کے جانے لگی۔
میں نے اس کے سامنے آ کے راستہ روک لیا۔
''ہاں ہنی.... ان کا ڈر ٹھیک ہے.... میں آج بھی وہیں کھڑا ہوں.... آج بھی میرے دل میں تمہارے علاوہ کوئی نہیں۔''
''تم جہاں بھی کھڑے ہو سعد اکیلے نہیں کھڑے۔ تانیہ تمہارے ساتھ کھڑی ہے مت کرو ایسی باتیں پرسوں تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ اس کے ساتھ۔''
''ہونے والی ہے.... ہوئی تو نہیں۔'' چند لمحے وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ پھر بولی تو اس کے لہجے میں سختی تھی۔
''لیکن میری تو ہو چکی ہے میں آج بھی سالار کی بیوی ہوں۔''
''مگر رہو گی نہیں۔'' میرے پاس بھی اس کی ہر بات کا جواب تھا۔
''تم ایک سائن کر دو تو خلع کا نوٹس اسے کل تک مل جائے گا۔ اس شخص نے تمہاری زندگی کے قیمتی [illegible] برباد کیے ہیں مگر میں اب تین دن بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تم کسی کی مت سننا ہنی.... سب تمہیں ڈرائیں گے کہ طلاق کے بعد تمہارا کیا ہو گا مگر تم ان باتوں پہ دھیان مت دینا.... میں ہوں ناں ہنی۔''
''اور تانیہ.... وہ بھی تو ہے ناں.... اس کے بارے میں کیا سوچا تم نے؟''
''وہ سمجھ دار ہے سمجھ جائے گی۔''
''اور تم سمجھ دار کب ہو گے سعد۔'' وہ زچ ہو اٹھی۔
''تم کیوں نہیں سمجھ لیتے کہ تمہاری ایسی باتوں سے میری پریشانی بجائے کم ہونے کے اور زیادہ ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے مستقبل کی کوئی فکر نہیں تھی لیکن اب یہ فکر ہے کہ تمہارے یہ خیالات اگر تانیہ نے جان لیے تو میں اس کا سامنا بھی کیسے کروں گی۔''
''میں جانتا ہوں تانیہ کو.... وہ بہت حساس' محبت کرنے والی اور محبت میں سب کچھ دینے کا حوصلہ رکھنے والی لڑکی ہے وہ بہت اچھی ہے ہنی۔''
''اتنی ہی اچھی ہے تو کیوں گنوار ہے ہو اسے۔''
''اور تم جو مجھے گنوا دو گی.... وہ؟'' میرے بے ساختہ سوال پہ اس کا جواب بھی اتنا ہی بے ساختہ تھا۔
''تم مجھے ملے ہی کب تھے سعد.... جو پایا نہ ہو.... اسے کھونے کا ڈر کیسا؟''
شاید اسے بھی احساس نہ ہوا کہ سادگی میں کہی بات سے وہ اپنے دل کے کتنے راز کھول گئی تھی.... وہ تو اتنا کہہ کر چلی گئی.... میں اس کے حزن میں ڈوبے لہجے اور نم آنکھوں سے افشا ہو جانے والے راز پہ سکتے میں چلا گیا تھا اور جب سکتہ ٹوٹا تو میرا وجود بے حد ہلکا پھلکا تھا۔
''ہانی.... تم بہت کچھ چھپا کے بھی سب بتا گئی ہو.... میں سب جان گیا ہوں ہنی.... تم بھی مجھے چاہتی ہو.... اب میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ تمہاری ناں کو ہاں میں بدل کے رہوں گا۔''
ایک نئے عزم کے ساتھ میری محبت جوان ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

''امی' ابا دروازہ کھولیں۔'' سخت ہیجان کے عالم

میں میں امی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا تا جا رہا تھا... مجھ سے صبح کا انتظار نہیں ہو پا رہا تھا۔

"سعد..." ان کی نیند سے بوجھل آنکھیں دروازہ کھولتے ہی حیرت سے بھر گئیں۔

"رات کے پونے تین بجے؟ سب ٹھیک تو ہے؟"

"امی... میں میں۔" میری سانس پھول رہی تھی۔

"جلدی بتاؤ سعد... کیا ہوا ہے' مجھے ہول اٹھ رہے ہیں۔"

"ہوا کچھ نہیں ہے امی... مگر ہو جائے گا۔ یہ ہونے سے روک دیں۔ پلیز امی... روک دیں۔"

"سعد... صاف صاف بات کرو۔"

"یہ... یہ شادی امی یہ شادی ہونے سے روک دیں۔" بالآخر میں نے کہہ ہی دیا۔

وہ حیران تو ہوئیں۔ مگر شاک میں نہیں تھیں شاید ذہنی طور پہ میری اس فرمائش کے لیے تیار تھیں۔

"پلیز امی... میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا... مگر بعد میں ابھی وقت بہت کم ہے آپ بس کچھ بھی کر کے یہ شادی رکوا دیں۔"

"تم مجھے کیا بتاؤ گے سعد... میں سب جانتی ہوں اور یاد رکھو یہ کرنا تو در کنار... میں ایسا ہونے بھی نہیں دوں گی۔"

"امی... پلیز میری ذہنی حالت ایسی نہیں ہے کہ میں ابھی اس رشتے میں بندھ سکوں؟"

"اور اگر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر یہ رشتہ نہ جڑا تو تمہاری ذہنی حالت ہمیشہ ایسی رہے گی۔ سعد... تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ مجھے لگا تھا اب تم میچور ہو گئے ہو... لڑکپن کی حماقتوں سے آگے نکل آئے ہو... اور تانیہ سے مل کے مجھے واقعی تمہارے باشعور اور سمجھ دار ہونے کا یقین آ گیا کہ کتنی اچھی اور محبت کرنے والی مخلص لڑکی کا انتخاب کیا ہے تم نے... لیکن اب لگ رہا ہے کہ تمہارے اندر کا بچہ ابھی ویسا کا ویسا ہی ہے... نہیں سعد ایسا سوچنا بھی مت۔"

"امی... میں تانیہ سے نہیں میں بنی سے۔"

"بس سعد۔"

انہوں نے بری طرح جھڑک کر رکھ دیا مجھے اور میں واقعی گنگ ہو گیا... ایسا لگا اب کچھ کہا تو وہ مجھ پر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کریں گی۔

"خاموشی سے واپس چلے جاؤ... تمہاری شادی میں دن نہیں گھنٹے باقی رہ گئے ہیں کیوں خود کو' تانیہ کو اور ہم سب کو ساری دنیا کی نظروں میں رسوا کرنا چاہتے ہو۔ خدا کا واسطہ ہے سعد... رحم کرو ہم سب پہ نکلو اس بچپنے سے۔"

انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور میں بے بسی سے گردن جھکائے واپس ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

تانیہ جتنی خوش شادی کی ان رسموں کے خیال سے ہی ہو رہی تھی۔ اب رات سے عجیب بے دلی کے عالم میں تھی۔ بلی اس کا مہندی کا لہنگا اسے دکھا رہی تھی۔

"دیکھیں ناں... رات کے فنکشن کا لہنگا کتنا خوب صورت ہے آپ کا... گہرا سبز رنگ بھی آپ پہ اتنا ہی جچے گا جتنا مایوں کا یہ زرد رنگ اٹھ رہا ہے۔"

"ہوں۔" بے دھیانی میں وہ فقط اتنا بولی۔

"ہائے اللہ... آج شام کو آپ کی مہندی اور کل شادی' سوچ سوچ کے آپ کو کچھ ہو رہا ہے ناں؟" بلی آنکھیں مٹکاتی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ مگر تانیہ کے لبوں پہ مسکراہٹ تک نہ آئی۔

"پتا نہیں۔"

"اب مجھ سے تو نہ چھپائیں اپنے دل کا حال کچھ کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ ہو رہا ہو گا۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں بلی۔" وہ بے بسی سے کہنے لگی۔

"مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا... دل' دماغ سب کچھ جیسے سن ہو گیا ہو۔"

"ہوتا ہے... ہوتا ہے۔" بلی تسلی دینے لگی۔

"بہت زیادہ خوشی میں انسان کی سوچنے سمجھنے کی

سب صلاحیتیں کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔"
"کیا محسوس ہونا بھی ختم ہو جاتا ہے۔" تانیہ کے اس سوال کا جواب ابھی بیلی ڈھونڈ رہی تھی کہ وہ پھر سے اسی بے بسی سے کہنے لگی۔
"پتا نہیں.... کیا بات ہے.... مگر کچھ ہے.... ایک خالی پن سا.... ایک.... ایک عجیب سا بوجھ.... خوشی کوشش کرنے سے بھی محسوس نہیں ہو رہی جبکہ کوئی دکھ بھی نہیں ہے۔" تانیہ کی ایسی باتوں سے بیلی گھبرا اٹھی۔
"توبہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ' کچھ اچھا کہیں ناں.... اچھا رکیں.... میں آپ کو مہندی کی ڈیزائن دکھاتی ہوں۔ آپ پسند کریں کون سا لگوانا ہے۔"
"نہیں.... مہندی میں صرف ہانی سے ہی لگواؤں گی.... میں نے وعدہ لیا تھا ان سے مگر وہ ہیں کہاں؟"

☼ ☼ ☼

"ہاجرہ.... مہندی کے تھال کہاں ہیں؟ ابٹن بنوائی؟" نائلہ ملازماؤں کو پکار رہی تھیں۔
"ہاجرہ۔"
"مجھے بتایئے تائی امی.... کوئی کام ہے تو میں کر دیتی ہوں۔" ام ہانی بڑھ کے بولی۔ مگر جواباً" نائلہ نے اسے اتنی سرد نظروں سے گھورا کہ اس کے قدم وہیں جم گئے۔
"تم کچھ کرنا ہی چاہتی ہو تو یہ کرو کہ جو کر رہی ہو وہ نہ کرو۔"
"جی؟" ہانی خاک نہ سمجھی۔
"کچھ تو خیال کرو ام ہانی۔" آخر کار نائلہ کو سارے لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے صاف صاف کہنا پڑا۔
"کسی بات کا تو احساس کر لو.... اتنا ہی سوچ لو کہ تانیہ کا کیا قصور ہے.... یہی احساس کر لو کہ ہم نے کتنے پیار سے تمہاری پرورش کی ہے.... ارے ہمارا نہیں تو اپنا سوچ لو کہ تمہاری اس حرکت کے بعد دنیا تمہیں کیا کہے گی.... ارے یہی شرم کر لو کہ شادی شدہ 'عورت ہو.... کسی کی عزت....

خدا کا خوف کرو ام ہانی.... کسی کی بیوی ہو کے.... کسی اور کے ہونے والے شوہر سے...."
اس سے زیادہ سننے کی اس میں تاب نہ تھی.... وہ بھاگتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھی اور اپنے کمرے میں آ کے ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔
سالار کے دیئے زخم تو بدن پہ نشان چھوڑتے تھے.... نائلہ کی کہی باتوں نے اس کی روح تک کو گھائل کر دیا تھا۔
"سعد.... تم نے مجھے تائی امی کی نظروں میں کتنا ہلکا کر دیا۔" اور یہ سوچ کے تو وہ لرز ہی اٹھی.... کہ خدا جانے اب یہ زہریلی باتیں اسے اور کس کس سے سننے کو ملیں گی۔
سیل فون کی گھنٹی پہ بنا نام دیکھے اس نے کان سے لگایا.... گمان تھا کہ سعد ہو گا اور وہ اس سے خوب گلے کرے گی کہ کیوں اس کی پہلے سے منتشر زندگی کو مزید ہیجان خیز بنا رہا ہے۔
"ہانی تم رو رہی ہو؟" سالار کی آواز پہ وہ چونکی۔
وہ چپ تھی مگر شاید اس کی کسی سسکی نے راز کھول دیا تھا۔ سہم کے اس نے فون کان سے ہٹا کے دیکھا.... اس پہ سالار کا نمبر جگمگا رہا تھا۔
"ام ہانی یہ تمہارے رونے کی آواز ہے؟" اپنی سسکیاں دبانے کے لیے ہانی نے سختی سے ہونٹوں پہ اپنی ہتھیلی جما دی۔
"ترس گیا تھا میں یہ سسکیاں سننے کے لیے۔ مر رہا ہوں میں تمہارے آنسو دیکھنے کے لیے تمہیں بھی رونا تب یاد آیا جب میں تمہارے پاس نہیں.... سنو ام ہانی' یہ آنسو مجھ سے دور ہونے کے غم کے ہیں تم نہیں سمجھ رہی ناداں ہو میں آجاؤں تمہیں لینے؟ دیکھو یہ آنسو صرف میرے سامنے بہاؤ ان پہ فقط میرا حق ہے۔"
وہ نجانے کیا کہتا جا رہا تھا.... ہانی نے گھبرا کے فون بند کر دیا۔ گھنٹی پھر بجنے لگی۔ سراسیمہ ہو کے اس نے فون تکیے کے نیچے چھپا دیا۔ اور پھر کچھ سوچنے لگی۔
اسے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔

آپ۔۔۔ پاپا۔۔۔ وقت کم تھا۔
آخر وہ اٹھی اور کمرے سے نکلنے لگی۔

☆ ☆ ☆

میں تقریباً" بھاگتے ہوئے کھنڈر کے عقبی حصے میں پہنچا تھا وہ ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے وہیں میری منتظر تھی۔

"ہنی۔۔۔" میرے پکارنے پہ وہ مڑی اور ہاتھ میں تھامے کاغذات میری جانب بڑھا دیے۔۔۔ میں مسکرا اٹھا۔۔۔ مگر جیسے ہی کاغذات الٹ پلٹ کے دیکھے۔ حیران رہ گیا۔

"تم نے ابھی تک ان پہ سائن نہیں کیے۔"

"ہاں۔۔۔! اور کروں گی بھی نہیں۔"

"مگر کیوں؟ کل تو تم مان گئی تھی۔"

"وہ کل تھا۔ یہ آج ہے۔۔۔ آج مجھے لگتا ہے یہ فیصلہ کرنے میں مجھے جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔"

میں سمجھ گیا۔ امی کا دباؤ ہو گا اس پہ۔۔۔

"تمہیں واقعی لگتا ہے یا یہ فیصلہ کرانے میں تمہیں مجبور کیا گیا ہے بولو ہنی! تم کیوں نہیں یہ رشتہ توڑنا چاہتی جس نے تمہیں اذیت کے سوا کچھ نہیں دیا کیا امی نے تم سے کچھ کہا؟"

"وہ کیوں کہیں گی مجھ سے کچھ؟"

"کیونکہ ان کو ڈر ہے کہ۔۔۔" میں کہتے کہتے رک گیا۔۔۔

"تو کیا ان کا یہ ڈر غلط ہے؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"ہنی تم مت سنو کسی کی۔۔۔ صرف اپنے بارے میں سوچو۔۔۔ یہ سوچو کہ زندگی، خوشیوں اور محبت پہ تمہارا بھی حق ہے۔۔۔ امی اور باقی سب کو تمہارے مستقبل کی فکر ہے۔۔۔ انہیں خدشہ ہے کہ تمہارا کیا ہو گا تو ان کی یہ فکر میں دور کروں گا۔ میں انہیں یقین دلاؤں گا کہ سالار سے الگ ہونے کے بعد بھی تم بے سہارا نہیں ہو گی۔ تمہارا آنے والا کل محفوظ ہو گا میرے ساتھ۔"

"بس کرو سعد۔۔۔ خدا کے لیے۔" وہ چلا اٹھی۔

"چپ ہو جاؤ۔۔۔ مجھے لگا تھا تم بڑے ہو گئے ہو سمجھ دار ہو گئے ہو۔۔۔ مگر تم تو اب بھی وہی ہو۔۔۔ اتنے ہی ضدی اتنے ہی نا سمجھ آج بھی تم کھیلنے کے لیے چاند مانگ رہے ہو۔"

"ہاں۔۔۔ میں چاند مانگ رہا ہوں۔۔۔ مگر کھیلنے کے لیے نہیں اپنی زندگی میں اجالے بھرنے کے لیے۔"

"مانگے کے چاند سے اجالے نہیں بھرے جاتے سعد۔۔۔ چاند تو خود کسی سے مانگی روشنی پہ جی رہا ہے۔ تانیہ ہے ناں۔۔۔ تمہاری زندگی کا روشن ستارہ۔۔۔ وہ کافی ہے تمہاری زندگی میں اجالے بھرنے کے لیے۔"

☆ ☆ ☆

تانیہ کے ہاتھوں میں سبز رنگ کا وہ کامدار لہنگا تھا جو اسے تیار ہونے کے لیے دیا گیا تھا۔۔۔ مہندی کی تقریب کے لیے۔۔۔ مگر وہ کسی خیال میں کھوئی پریشان سی لگ رہی تھی۔

کوئی ڈور تو تھی۔۔۔ جو الجھ گئی تھی۔۔۔ مگر سرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

"شاید سعد سے شیئر کرنے سے اس بے چینی کا کوئی حل نکل سکے۔" یہ خیال آتے ہی وہ لہنگے کو گود سے بیڈ پہ رکھتے ہوئے اٹھ کے کمرے سے جانے لگی۔

"سنو زیتون۔۔۔ سعد اپنے کمرے میں ہے؟"

"جی ان کو پیچھے کھنڈر والی طرف جاتے دیکھا تھا۔"

☆ ☆ ☆

"کبھی سوچا تم نے اس بارے میں سعد۔۔۔ تانیہ کے بارے میں؟" وہ مسلسل مجھ سے جرح کر رہی تھی۔

"میں تمہارے بارے میں کیوں نہ سوچوں۔۔۔ جس پہ آکے میری سوچ کی حد ختم ہو جاتی ہے۔"

"نہیں سعد۔۔۔ میرے بارے میں نہیں۔۔۔ تانیہ کے بارے میں سوچو کیونکہ تم میرے بارے میں کسی کو جواب دہ نہیں ہو۔ مگر تانیہ کے معاملے میں ہو۔"

اور اسے کیا مجھے بھی پتا نہ چلا کب تانیہ وہاں پہنچ چکی

سے آکے ہماری سب بحث سن رہی تھی۔

"کیا بتاؤ گے تم سب کو کہ جس لڑکی کو تم خود حویلی لائے تھے شادی کے لیے... اب صرف ایک دن پہلے پیچھے ہٹ رہے ہو اور وہ بھی میری خاطر؟ ایک شادی شدہ عورت کے لیے جو تم سے عمر میں بڑی بھی ہے۔"

"میں عمر کے اس فرق کو نہیں مانتا۔ میں تم سے چار پانچ سال چھوٹا ہوں مگر سالار تم سے تیرہ چودہ سال بڑا تھا... اس سے بھی تو کی تھی تم نے شادی... اور ویسے بھی عمر کے فرق کی حیثیت کیا ہے۔ تم تین سال پہلے جیسی تھیں۔ ویسی اب بھی ہو لیکن مجھے دیکھو میں بڑا ہو گیا ہوں... اب میں بڑا لگتا ہوں تم سے۔"

"ہاں اور اب ویسا ہی لگنے کی باری تمہاری ہے سعد... عمر اب تم پہ رک جائے گی... میں بڑی ہوتی چلی جاؤں گی... یہاں تک کہ تم پچھتاؤ گے۔ تنگ آجاؤ گے زمانے کی باتیں سنتے سنتے' نکال دو سعد یہ خیال دل سے... چھوڑ دو مجھ سے محبت کرنا۔"

اس کی بچکانہ سی فرمائش پہ میں بے بسی سے ہنس پڑا۔ ایک تکلیف دہ ہنسی۔

بھلا مانگا بھی تو کیا مانگا مجھ سے...

محبت کرنا چھوڑ دوں اس سے؟

"کیسے چھوڑ دوں ہنی... محبت کوئی خواب ہوتی تو دیکھنا چھوڑ دیتا... خواہش ہوتی تو کرنا چھوڑ دیتا... سانس ہو تم میری سانس لینا کیسے چھوڑ دوں... تمہیں نہیں لوں گا تو حرام مت مروں گا ہنی..."

"اور میری سانس...؟" وہ رو دی۔

"میری سانس رکنے لگتی ہے تمہارے اس پیار سے۔ دم گھٹتا ہے میرا... تم سمجھتے کیوں نہیں ہو سعد میں تمہاری شرٹ سے میچ کرتی ٹائی نہیں ہوں جسے تمہیں ہر حال میں اپنے گلے میں لٹکانا ہے... میں ایک جیتی جاگتی انسان ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑی اور میں نے اس کے پیروں میں اپنے الفاظ کی زنجیر پہنا دی۔

"تو مجھے بھی جیتا جاگتا کر دو ناں... میری بن جاؤ۔"

اس نے مڑ کے مجھے دیکھا۔ نہ جانے میرے الفاظ میں اتنا اثر تھا یا میرے لہجے میں اتنا درد... یا پھر میری آنکھوں کا وہ حسرت کہ مجھے ہنی کی آنکھیں نم ہوتی محسوس ہوئیں۔

اور اس پل میں بھی ذرا مڑ کے ستون کے ساتھ کھڑی تانیہ کو دیکھ لیتا۔ تو جان پاتا کہ میری کرلاتی محبت کی بے بسی صرف ہنی کو نہیں تانیہ کو بھی رلا رہی تھی۔

"محبت صرف پا لینے یا اس کا ہو جانے کا نام نہیں ہے سعد... یہ تو پارس ہے۔ جسے چھو جائے اسے سونا بنا دیتی ہے۔ تم سونا بن چکے ہو بس اگر اب مجھے پانے کی خواہش دل سے نکال دو گے تو کندن بھی بن جاؤ گے۔"

"مجھے نہ سونا بننا ہے نہ کندن... مجھے بس تمہارا بننا ہے اور یہ کم بخت پارس کس کے ہاتھ لگا ہے کیا؟" میں نے اس کا فلسفہ جھٹلا دیا۔

"سعد... میں جانتی ہوں... یہ ہمدردی نہیں ہے۔ یہ محبت ہے میں یہ بھی مان گئی ہوں کہ وہ جو تین سال پہلے ہوا تھا وہ بھی تمہارا جنون یا نا سمجھی نہیں تھی۔ لیکن یہ جذبے آب حیات کی طرح ہوتے ہیں انہیں بہا کے ضائع نہیں کرتے اپنے اندر اتار لیتے ہیں۔ امر ہو جانے کے لیے۔"

"میرا سوال اب بھی وہی ہے ہنی... پارس کی طرح کیا آب حیات بھی ملا ہے کسی کو اب تک؟ جن چیزوں کا وجود ہی نہیں ہے مجھے ان سے مت بہلاؤ مجھے نہیں بننا سونا... نہیں ہونا امر' مجھے تم چاہیے ہو... کیونکہ تمہارا وجود ہے... تمہیں پایا جا سکتا ہے اور میں ایک دن تمہیں پا کے رہوں گا۔"

وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی۔ پھر جیسے مجھے مزید سمجھانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا گئی۔

"میں تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے اپنے گلے میں بدنامی کا طوق نہیں ڈال سکتی... نہ تانیہ کی بد دعائیں لے سکتی ہوں۔ میرا جواب کل بھی نہ تھا۔ آج بھی نہ ہے۔"

"میں دور تک اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اور پلٹ کے جاتے ہوئے بھی تانیہ کو دیکھ نہ پایا۔

کمرے میں علی میرا مہندی کا کرتا ہینگر سے اتارتے ہوئے مجھے کہہ رہا تھا۔

"یہ دیکھ... آگیا تیرا رات پہننے والا کرتا... بڑا آفت لگے گا تو اس کرتے میں... کل تجھے دلہا بھی میں بناؤں گا۔"

"تم نہیں... میری قسمت بنائے گی۔" میں تھکے ہارے انداز میں خود کو بیڈ پر گرا بیٹھا۔

"وہ قسمت جو کبھی میری بنی ہی نہیں۔"

"سعد... یہ تم..."

وہ کہتے کہتے رک گیا... کیونکہ میں جیب میں بجتے فون کو نکال کے دیکھ رہا تھا تانیہ کا میسج تھا... میں گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

"بھابھی کا ہے؟" اس نے چھیڑا...

"دیکھ لے بھابھی نے کوئی محبت بھرا پیغام بھیجا ہو گا۔"

"اس کے محبت بھرے پیغاموں سے ہی تو ڈرتا ہوں میں۔"

میں نے فون پہ میسج پڑھنا چاہا اور کچھ حیرت میں پڑ گیا۔ اب بھلا اس وقت ملنے کی کیا تک ہو سکتی ہے؟ اور کون سی ضروری بات کرنا ہو گا اسے... ابھی اور اسی وقت؟"

میں سوچنے لگا کہ جاؤں ملنے... یا نہ جاؤں۔

☼ ☼ ☼

اور ادھر ام ہانی کانپتے ہاتھوں سے تکیے کے نیچے رکھا موبائل فون نکالنے کے بعد نمبر ملا رہی تھی۔

"سالار... میں... میں..." اس کی آواز بھی کپکپا رہی تھی۔

"میں واپس آنا چاہتی ہوں آپ کل ہی مجھے لینے آ سکتے ہیں پلیز۔"

☼ ☼ ☼

وہ وہاں کھڑی تھی۔

کھنڈر کی اس دیوار کے پاس... جس پہ جا بجا میرا اور بہنی کا نام لکھا تھا۔

میں پہلے ہی حیران تھا... مہندی کی رسم سے صرف ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے اس نے مجھے ملنے کے لیے یہاں کیوں بلایا؟ اور اب مزید حیران ہو رہا تھا۔

جینز پہ ہلکی آسمانی کرتی پہنے وہ اپنے مہندی کے کامدار لہنگے کا بھاری بڑا سا دوپٹا سر پہ لیے دیوار کی جانب رخ کیے کھڑی تھی۔

"کیوں بلایا ہے مجھے تانیہ؟"

"جو مجھے کہنا ہے وہ بات اس جگہ کے علاوہ کہیں ہو ہی نہیں سکتی سعد۔" اس کے چہرے پہ کچھ ایسا تھا کہ میں ٹھٹک گیا۔

کچھ تو تھا... غیر معمولی۔ یا ہو چکا... یا ہونے والا تھا۔

پھر وہ نظر اٹھا کے آسمان کی جانب دیکھنے لگی... اس کی نظروں کے تعاقب میں میں بھی آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" ٹوٹتے تارے یوں نظر نہیں آتے۔

"ہاں... وہ آسمان پہ ٹھہرتے ہی کب ہیں... بس چند لمحوں کے لیے نظر آتے ہیں... کتنی مختصر زندگی ہوتی ہے ان کی... خوابوں کی طرح پلک موندنے سے پلک کھولنے تک... مگر سعد اگر خوابوں کی زندگی اتنی ہی کم ہوتی ہے تو ہم ان میں اپنی پوری زندگی کیسے جی لیتے ہیں۔"

اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا میرے پاس... اس لیے فقط اتنا کہہ پایا۔

"اچھی لگ رہی ہو اس دوپٹے میں۔"

"تم بھی اچھے لگ رہے ہو..."

اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا... علی کے پرزور اصرار پہ میں نکلتے ہوئے اپنا مہندی کا کرتا پہن آیا تھا... ورنہ وہ کسی صورت میری جان بخشی پہ تیار نہیں تھا۔

"اور بھی اچھے لگتے اگر..." وہ میرے قریب آئی اور میرے کرتے کے گریبان کا اوپری بٹن بند کرتے کہنے لگی۔

"اگر... خوش ہوتے۔"

"میں خوش ہوں۔" میں جانتا تھا... میرا لہجہ کھوکھلا... بلکہ مردہ ہے اس لیے میں نے اپنی مسکراہٹ سے اس میں روح پھونکنے کی ناکام کوشش کی... کیونکہ میری یہ مسکراہٹ میرے لہجے سے بھی زیادہ مری ہوئی تھی۔

"مگر میں خوش نہیں ہوں سعد۔"

"کیوں؟" میں چونکا۔

"ہانی کی وجہ سے... تم بھی تو اس کی وجہ سے خوش نہیں ہو۔"

میں کچھ گڑبڑا سا گیا... کتنا زعم تھا مجھے کہ... سب بتا دوں گا میں تانیہ کو طے کرلوں گا یہ مرحلہ... مگر اب یہ مرحلہ آیا تو میں سر سے پیر تک جھنجھنا اٹھا۔

"غلط کیا ہے اس میں خوش ہونا ہی نہیں چاہیے... وہ دوست ہے تمہاری... اسے اس حال میں چھوڑ کے تم آگے کیسے بڑھ سکتے ہو؟"

"ہاں... مگر کوئی میری بات کو سمجھ ہی نہیں رہا... ہنی بھی نہیں... کوئی ساتھ نہیں دے رہا میرا تانیہ۔"

"لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں سعد۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں تانیہ... لیکن۔"

میں کہتے کہتے جھجک کر رکا اور وہ زور سے ہنس دی۔ بڑی ہی تلخ ہنسی تھی۔

"بات ہم دونوں نے ایک کی ہے... مگر لفظوں کی ترتیب مار دیتی ہے اور یہ "لیکن" یہ "لیکن" تو واقعی مار دیتا ہے۔"

"اور "شاید" بھی... یہ دونوں لفظ نہیں ہونے چاہییں تھے۔" میں نے آہ بھری۔

"مگر یہ ہیں سعد... کیا کریں۔ محبت کا کلمہ شروع "شاید" سے ہوتا ہے اور ختم "لیکن" پہ ہوتا ہے... تم سچ کہتے تھے سعد... مجھے تم سے محبت نہیں کرنی چاہیے تھی۔" اس کی آنکھوں میں کہتے کہتے آنسو آگئے۔

"سعد... یہ... یہ بہت ظالم چیز ہے... بہت ظالم... یہ محبت خبیث کچھ کھا کے مر کیوں نہیں جاتی۔" لبوں پہ مسکراہٹ... آنکھوں میں نمی...

میں خاموشی سے اسے دیکھتا گیا اور جان گیا کہ اب مجھے اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں اور پھر فضا میں بانسری کی آواز گونجی۔ تانیہ نے میرے نزدیک ہو کے سرگوشی کی۔

"سنو... آج مجھے بھی یہ بانسری سنائی دے رہی ہے اور میں جان گئی ہوں کہ یہ بانسری کیا کہتی ہے۔ میں سب جان گئی ہوں سعد۔"

"تمہیں یہ سب نہیں جاننا چاہیے تھا تانیہ۔" میں نے اس کا سرد ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔

"تمہیں یہ بانسری نہیں سنائی دینی چاہیے تھی... میں تمہیں یہ تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔"

"خود کو دینا چاہتے ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"اور ہانی؟ اسے دے سکتے ہو تکلیف؟"

"نہیں۔" میں بے بسی اور لاچاری کی آخری انتہا پہ تھا۔

"نہ تمہیں... نہ اسے... کسی کو بھی تکلیف نہیں دینا چاہتا مگر دے رہا ہوں... کیا کروں... میں بے بس ہوں۔"

"نہیں ہو سعد... تم بے بس نہیں ہو... تم کر سکتے ہو سب کچھ کر سکتے ہو... بس ہمت کی ضرورت ہے۔ یقین کرو... مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ ہانی سچ کہتی ہے... محبت پانے کا نہیں' دل میں اتارنے کا نام ہے' میں نے تمہیں دل میں اتار لیا ہے اور اس حقیقت کو بھی... کہ تم کل بھی اسے چاہتے تھے۔ آج بھی... جاؤ سعد... میرا مت سوچو۔"

"وہ نہیں مانے گی... کوئی بھی نہیں مانے گا... سب تمہارے جیسے اچھے نہیں ہوتے تانیہ۔"

"خدا مانے گا۔ وہ سب سے اچھا ہے... جاؤ... جو کر سکتے ہو... کرو... نہ کر سکو تو اللہ پہ چھوڑ دو... وہ کرے گا۔"

☆ ☆ ☆

اماں سالار کو دیکھتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش

کررہی تھیں کہ وہ آخری بار اتنا خوش کب نظر آیا تھا' مگر انہیں یاد ہی نہیں آرہا تھا۔ کتنا اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا وہ اس قدر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے۔ یہ سرشار سی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ کتنی اوپری اوپری لگ رہی تھی۔

"وہ واپس آنا چاہتی ہے۔ اسے مجھ سے محبت ہے۔ وہ میرے بغیر نہیں جی سکتی۔ اس نے خود مجھے بتایا ہے۔"

"یوں نہ کہو کہ وہ واپس آنا چاہتی ہے۔ یوں کہو کہ وہ پھر سے برباد ہونا چاہتی ہے۔ یوں نہ کہو کہ وہ تمہارے بغیر نہیں جینا چاہتی بلکہ یہ کہو کہ وہ جینا ہی نہیں چاہتی۔" اماں کے تلخ الفاظ نے اسے پھر سے طیش دلا دیا۔

"آپ ماں نہیں' دشمن ہیں میری... مجھے کبھی خوش نہیں دیکھنا چاہتیں۔"

اماں اس کا الزام صبر سے پی گئیں۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔ ماں کے لیے اولاد کی خوشی سے بڑھ کے کچھ نہیں ہوتا' لیکن اس وقت واقعی وہ اس کی خوشی سے ڈر گئی تھیں اور انہوں نے سچے دل سے دعا کی تھی۔ اس کی خوشی کی وجہ کے ختم ہونے کی۔

"میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں سالار... مگر اس سے بھی زیادہ شدت سے یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کسی اور کو خوش کرسکو۔ جو نہ تمہارے بس میں ہے' نہ ہی تمہارے خمیر میں ہے۔"

"میں اسے لینے جارہا ہوں اور اگر آپ کو مجھے خوش دیکھ کے یا اسے میرے ساتھ دیکھ کے اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے تو آپ ہمارے واپس آنے سے پہلے یہاں سے چلی جائیں۔"

"نہیں جاؤں گی۔" اماں نے بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔

"نہیں جاؤں گی... اسے تمہارے رحم و کرم پہ چھوڑ کے نہیں جاؤں گی... نہیں کرنے دوں گی اسے خودکشی۔"

☆☆☆

ثانیہ میرے ساتھ تھی' مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ آگے کے مرحلے مجھے ہی طے کرنے تھے۔ اور پہلے ہی مرحلے پہ میں منہ کی کھا چکا تھا۔

امی نے میرا ساتھ دینا تو دور کنار... انتہائی سخت الفاظ میں چیلنج کردیا تھا کہ وہ یہ کبھی نہیں ہونے دیں گی۔

مجھے کچھ نہ سوجھا تو میں بڑے دادا کے کمرے میں چلا آیا جانتا تھا۔ وہ بھی میری کوئی مدد نہیں کرسکیں گے' لیکن میں تو مہ پارہ پھوپھو کی طرح سہارا ڈھونڈنے آیا تھا ان کے پاس... جیسے وہ دل کا سب بوجھ ان کے سامنے ہلکا کرکے شانت ہوجاتی تھیں۔ میں بھی کرنا چاہتا تھا۔

"آگیا ایں... ھن یاد آیا اے وڈا دادا؟" بڑے دادا نے مجھے دیکھتے ہی طنز سے ہنکارا بھرا۔

"ہاں... بہت یاد آئی آپ کی۔" میں ان کے پائنتی بیٹھ گیا۔

وہ اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر ٹٹول کے ہاتھ مارتے شاید کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے ایک نظر دیکھا ان کے کانوں میں آلہ سماعت موجود نہیں تھا۔

"کی بول رہیا اے؟ میری کانو کی ٹوٹیاں تے دے کچھ سنائی تے دے میتوں؟" ان کے حکم کو نظرانداز کرتے ہوئے میں نے ان کے پیر تھام لیے۔

"نہیں بڑے دادا... میں بہت کچھ کہنا تو چاہتا ہوں' مگر نہیں چاہتا کہ آپ سنیں اور آپ کو احساس ہو کہ آپ کی گود میں کھیلنے والا اسعد ابھی بڑا نہیں ہوا۔ وہ آج بھی اتنا چھوٹا' اتنا بے بس ہے جتنا آپ کی گود میں تھا۔"

"کی؟" انہوں نے کان پہ ہاتھ رکھ کے سننے کی کوشش کی۔

"آپ جانتے ہیں نا بڑے دادا... مجھے جب بھی کچھ چاہیے ہوتا ہے' میں آپ کے پاس آتا ہوں۔ آج بھی مجھے آپ سے کچھ چاہیے بڑے دادا... مگر میں مانگ نہیں سکتا۔ صرف بتانا چاہتا ہوں۔" میں نے ان کی گود میں سر رکھ دیا اور ان کا استخوانی ہاتھ میرے سر پہ

شفقت سے ٹھہر گیا۔ دوسرا ہاتھ بدستور تکیے کے پاس کچھ ٹٹول رہا تھا۔

"میں ہنی کو چاہتا ہوں بڑے دادا.... ہاں بڑے دادا میں واقعی اسے چاہتا ہوں۔ اب تو مجھے ایمان ہے اس بات پہ.... بہت سال میں نے اس وہم میں گزار دیے کہ شاید.... شاید وہ محبت نہیں تھی۔ وقتی کشش تھی۔ کم عمری کی نادانی.... یا بچپن کی وابستگی یا.... یا پھر شاید.... شاید ایک رقابت۔ مسترد کیے جانے کا دکھ' مگر محبت نہیں تھی شاید۔ اور اب سالوں بعد اسے دیکھ کے دل پھر سے بہکا تو لگا نہیں.... اب بھی یہ محبت نہیں ہے۔ شاید ہمدردی ہے' مگر بڑے دادا سب شاید ہار گئے۔ یہ محبت ہی ہے.... خدا کی قسم.... یہ محبت ہے۔" میں سسکنے لگا۔ ان کا ہاتھ محبت سے میرے سر کو تھپک رہا تھا۔

"میں کیا کروں بڑے دادا.... میں بہت بے بس.... بہت مجبور ہوں.... میں اسے پانے کے بعد گنوانا نہیں چاہتا' لیکن اب کچھ بھی میرے ہاتھ میں نہیں ہے.... میں وقت کو روک نہیں سکتا۔" اچانک ان کا ہاتھ میرے سر سے پھسل کے نیچے آ گرا تو میں نے چونک کے سر اٹھایا۔

سب سے پہلا جھٹکا ان کے کانوں میں لگے آلہ سماعت کو دیکھ کے لگا جو نجانے کب وہ ڈھونڈ کے لگا چکے تھے اور میری سب باتیں سن چکے تھے۔

دوسرا جھٹکا ان کے بے جان جھولتے بازو اور پتھرائی آنکھوں کو دیکھ کے لگا۔

"بڑے دادا۔" میں نے انہیں کاندھوں سے پکڑ کے جھنجوڑنا چاہا اور زور سے چلا اٹھا۔

"بڑے دادا۔" مہ پارہ پھوپھو جو دلیہ لے کر اندر آ رہی تھیں ٹرے پھینک کر چلاتی ہوئی باہر نکلیں۔

"بھابھی.... بھابھی.... رضوان بھائی صاحب...."

باہر مہندی کی تقریب کا آغاز ہو چکا تھا۔ بلی ڈھولک سنبھال چکی تھی اور خالہ بتول نے اپنی بلغمی آواز میں کسی پرانے ٹپے کے سرا بھی نکالے ہی تھے کہ مہ پارہ پھوپھو روتی پیٹتی وہاں آ گئیں۔

"دادا جی ہمیں چھوڑ کے چلے گئے۔" سب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان کے پیچھے لپکے۔ صرف ایک امی تھیں جو سکتے کے عالم میں وہاں کی وہاں رہ گئیں۔ وہ سمجھ گئیں تھی کہ اب چاہ کے بھی وہ اپنے کہے الفاظ کو پورا نہیں کر سکتیں۔ کم از کم فی الحال تو نہیں۔ میں نے بڑے دادا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں بند کر کے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے تھے بڑے دادا.... آپ کبھی میری بات ٹال ہی نہیں سکتے۔" ایک کے بعد ایک' سب روتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے تھے اور میں بڑے دادا سے آخری دل کی بات کر رہا تھا۔

"آپ صحیح کہتے تھے آپ میری خوشی پوری کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں.... کچھ بھی۔"

"سعد.... یہ دادا جی۔" ابو نے صدمے سے چور انداز میں میرا شانہ دبایا۔

"ہائے ہائے۔ اپنے لاڈلے پوترے کے ویاہ پہ ہی چلے گئے۔" اب خالہ بتول کے بین شروع ہو گئے۔

"ہائے کوئی ان مرن جانیوں مراثنوں سے ڈھولک تو بند کرائے۔ اوئے کوئی یہ بتیاں تو اتروائے حویلی سے۔ اب کس بات کی رونقیں.... اب کدھر سے ہونی ہے شادی.... ویاہ والے گھر مرگ ہے۔" اور امی پھٹی پھٹی آنکھوں سے بڑے دادا کے مردہ وجود کو دیکھتی جا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ایک غیر متوقع بات کے بعد دوسری غیر متوقع بات میری منتظر تھی۔ بڑے دادا کے آخری سفر کی تیاریاں تھیں حویلی کے دالان کے وسط میں ان کی پھولوں سے ڈھکی میت رکھی تھی۔ فضا میں فاتحہ خوانی کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اندر سے کہیں کہیں دبی دبی سسکیوں کی آواز بھی گاہے بہ گاہے باہر آ جاتی تھیں۔ تب ہی سامنے سے آتی گاڑی کو دیکھ کے میں چونکا۔ وہ سالار ہی تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ اس کو یہاں بڑھتے دیکھ کے میں دری سے اٹھا اور اس کی جانب

جانے لگا۔ ابو گھبرا کے میرے پیچھے لپکے۔
"کیوں آئے ہو یہاں؟" میں نے شدید نفرت اور غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ جبکہ اس کا سکون اور ڈھٹائی دیدنی تھی۔
"آیا نہیں... بلوایا گیا ہوں۔"
"ابھی اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ ورنہ..." قریب تھا کہ میں اسے دھکے دیتا۔ ابو میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھ چکے تھے۔
"سعد... موقع کی نزاکت کا خیال رکھتے ہیں۔" پھر اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے سالار کو اندر آنے کی دعوت دی۔
"آیئے سالار۔" سالار ایک دل جلانے والی مسکراہٹ سے مجھے دیکھتا' ان کے پیچھے ہولیا۔ میرے اندر بے چینی سی بھری تھی۔
"کیوں آیا ہے وہ؟"
"کس لیے...؟"
"کس نے بلوایا ہے اسے؟ امی نے؟ مگر کیوں؟"
ان سب سوالوں کے جواب ان کے ساتھ ہی اندر جاچکے تھے' میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ ابو سے اب کون سی نئی چال چل رہا تھا' مگر تب ہی جنازہ اٹھانے کا وقت ہوگیا۔ تدفین اور نماز جنازہ کے دوران ظاہر ہے' میں ابو سے کچھ نہ پوچھ سکا۔ وہ بھی بالکل چپ تھے اور بے حد سنجیدہ بھی۔ قبر پہ مٹی ڈالنے کے بعد میں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے' جب میرے جیب میں رکھا فون وائبریٹ ہوا۔ دعا پڑھنے کے بعد میں نے فون نکال کے میسج چیک کیا۔ ثانیہ کا پیغام تھا۔
"سعد... وہ جارہی ہے۔ اسے روک لو... تم ہی ہو جو اسے روک سکتے ہو۔ میں اپنے حصے کا کام کرچکی ہوں۔ اب سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔" اور میں جان گیا... سالار کو کس نے بلایا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بیگ میں اپنا سامان رکھ رہی تھی جب میں ایک دھماکے سے دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا۔
"یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تم سالار کے ساتھ واپس جارہی ہو؟"
"ہاں وہ خود چل کے آیا ہے۔ بڑے دادا کے جنازے میں بھی شرکت کی اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تعلق جوڑنا چاہتا ہے۔" وہ سکون سے پیکنگ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"مگر تم تو نہیں چاہتیں... پھر کیوں جارہی ہو اس ذہنی مریض کے سامنے خود کو درندگی کے لیے پیش کرنے۔" میں تپ گیا... بھڑک اٹھا۔
"شوہر ہے وہ میرا اور تمہاری بھی تو شادی ہونے والی ہے۔ تمہیں یہ سوچنا چاہیے کہ گھر بنائے رکھنے کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔"
"فی الحال تو میں نے بڑے دادا سے یہ سیکھا ہے کہ جب کوئی کسی کے لیے کچھ کرنے پہ آئے تو کس حد تک جاسکتا ہے۔ میری مشکل آسان کرنے کے لیے وہ جان تک سے چلے گئے تم ان کا یہ احسان ضائع کرنا چاہتی ہو؟ دیکھو... اب اس حادثے کی وجہ سے یہ شادی التوا کا شکار ہوگئی ہے۔ میرے پاس اب بہت وقت ہے حالات سازگار کرنے کا... میں امی کو منالوں گا... ابو کو سمجھادوں گا۔ بس تم..."
"تم چاہتے کیا ہو سعد؟" وہ بھی غصے سے پھٹ پڑی۔
"میں سب کی نظروں سے گر جاؤں؟ ہر ایک مجھ پہ انگلی اٹھائے کہ میں نے اپنا گھر اس لیے خراب کیا کہ میں تم میں دلچسپی رکھتی تھی... میں نے شوہر کو تمہارے لیے چھوڑا؟... ابھی سب مجھ سے ہمدردی کررہے ہیں پھر نفرت کرنے لگیں گے اور ثانیہ... اس کی محبت کے جواب میں میں اسے یہ دوں؟"
"ثانیہ جان چکی ہے ہنی... اور وہ خود بھی اب ہم دونوں کے درمیان نہیں آنا چاہتی پھر تم کیوں جانا چاہتی ہو سالار کے پاس؟ کیوں؟"
"میں جانا چاہتی... بننا چاہتی دوبارہ برف کا ڈھیر... مگر تم مجھے ایسا کرنے پہ مجبور کررہے ہو۔" وہ سسک کے رو پڑی۔

"تمہاری ضد کی وجہ سے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ خدا کے لیے سعد... رحم کرو مجھ پہ... چلے جاؤ مجھ سے دور۔"

"ایک بات بتاؤ سعد۔" اس نے ہتھیلی سے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے لیے زیادہ ضروری کیا ہے؟ مجھے پانا... یا مجھے سالار جیسے شخص سے آزاد دیکھنا؟"

"میرے لیے سب سے زیادہ ضروری تمہاری خوشی ہے' مگر یہ مت کہنا کہ تمہاری خوشی سالار کے پاس لوٹنے میں ہے... میں تمہارا جھوٹ پکڑ سکتا ہوں۔"

"نہیں کہتی' مگر میری خوشی' تمہاری اور تانیہ کی شادی میں ہے۔ میری خوشی اس الزام سے بچنے میں ہے کہ میں یہ شادی ختم کرانے کا سبب بنی' میں سالار سے طلاق لوں گی... ہاں سعد... میں اپنی زندگی پورے حق سے جیوں گی۔ خدا کی دی گئی اس نعمت کو کسی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی۔ اپنی نئی راہ تلاش کروں گی' مگر تمہارے لیے نہیں سعد... نہ تمہارے ساتھ میں طلاق لوں گی' مگر تمہاری اور تانیہ کی شادی کے بعد... اب بتاؤ... پوری کرو گے میری خوشی۔" وہ سوال بن کے میرے سامنے کھڑی تھی۔ ایک مشکل سوال۔

"ہنی۔" میں اذیت سے کراہ اٹھا۔

"بہت محبت کرتے ہو نا مجھ سے؟" وہ مجھے اور میری محبت کو کسوٹی پہ پرکھ رہی تھی۔

"تو دو مجھے میری خوشی؟" اب میں اسے خالی ہاتھ کیسے لوٹاتا۔ بھلے مجھے خود عمر بھر خالی ہاتھ رہنا ہوتا۔

میں سر جھکائے پلٹ گیا۔ چپ چاپ... میری چپ اب بھی نہ ٹوٹی۔ جب وہ سالار کے ساتھ جا رہی تھی اور ساری حویلی اسے دعاؤں تلے رخصت کرنے باہر تک آئی۔ میں یونہی پتھرائی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ میری چپ تب بھی نہ ٹوٹی جب تانیہ مجھے آخری لمحے تک اسے روکنے کے لیے اکساتی رہی۔

"ام ہانی کے جانے سے کتنی اداسی ہو رہی ہے پوری حویلی میں۔" اسے رخصت کرنے کے بعد اندر آتے ہوئے مہ پارہ پھوپھو نے خالہ بتول سے کہا۔ میں امی کو دیکھنے لگا... واحد وہ تھیں جو اس کے جانے سے بے حد شانت نظر آ رہی تھیں۔

"سوگ کا ماحول تو ویسے بھی رہے گا ابھی کچھ دن۔" خالہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"آخر ایک جی کم ہوا ہے... موت والا گھر ہے۔"

"ہاں ماحول میں اداسی تو ہو جاتی ہے جب گھر میں کسی کی وفات ہوئی ہو۔" امی کے کہنے پہ میری چپ ٹوٹ گئی۔

"کسی ایک کی نہیں امی... اس گھر میں ایک موت نہیں ہوئی ہے' بہت سی ہوئی ہیں' کس کس کو روئیں گی آپ؟"

✲ ✲ ✲

"ہاں ہوں میں اس کی... مگر وہ عرصے سے اپنے دل میں میرے لیے کینہ پالے بیٹھا ہے اور نفرت بھی۔" نائلہ سعد کی بات سے اتنی دکھی ہوئیں کہ ان کے آنسو ہی نہ رک رہے تھے۔

"اولاد کے دل میں نفرت نہیں صرف گلہ ہوتا ہے اور پھر اولاد بھی سعد جیسی... سعد کسی سے نفرت کر ہی نہیں سکتا۔" رضوان نے تسلی دی۔

"کرتا ہے... مجھ سے کرتا ہے۔ اس دن سے کرتا آ رہا ہے جب میں نے اس کی مرضی جانتے ہوئے بھی ام ہانی کو... مگر رضوان... میں اس کی ماں ہوں' دشمن نہیں نہ میں تب اس کا برا چاہتی تھی نہ اب۔"

"اب اس بات کا کیا ذکر؟" وہ الجھ گئے۔

"ام ہانی بھی اپنے گھر گئی... سعد کی زندگی میں بھی تانیہ ہے پھر یہ بے وقت کی راگنی کیوں؟"

"یہ بے وقت کی راگنی نہیں ہے۔ یہ وہ خطرے کی گھنٹی ہے جو میں نے اسی وقت بھانپ لی تھی جب سعد ہانی کو یہاں لایا تھا۔ نہ تین سال پہلے میرے اندازے غلط تھے نہ اب... مجھے بتایئے کیا میں نے ام ہانی کو واپس اس کے شوہر کے پاس جانے کا کہہ کر غلط کیا؟ کیا آپ سات سمندر پار سے آئے اس شخص سے آنکھ ملا پاتے کہ اب آپ کا بیٹا' اس کی بیٹی سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتا؟" رضوان پہ حیرت کے پہاڑ

ٹوٹ پڑے۔
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو تانیہ۔ کیا سعد اب بھی؟ مگر۔ مگر ام ہانی تو اپنی خوشی سے واپس گئی ہے۔"
"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اس نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے لیکن سعد اس کا الزام بھی مجھے دے رہا ہے۔ اپنی ماں کو۔"

"تم نے اسے جانے کیسے دیا سعد؟" تانیہ مجھ سے جرح کر رہی تھی۔
"وہ نہیں سمجھتی تانیہ کچھ نہیں سمجھتی اسے لگتا ہے میری خوشیاں اس سے دور رہنے میں ہیں۔ وہ مجھے وعدے میں باندھ گئی ہے کہ میں تم سے ہی شادی کروں۔"
"اور تم یہ وعدہ نبھاؤ گے؟" وہ طنز سے پوچھنے لگی۔
"ہاں۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔
"کیوں کہ میں ہمیشہ سے اس کے وعدوں میں بندھا ہوا ہوں۔"
"مگر مجھے کسی بندھے ہوئے انسان سے شادی نہیں کرنی۔" تانیہ نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ دو ٹوک فیصلہ۔
"وعدہ تم نے کیا سعد۔۔۔ میں نے نہیں۔۔۔ جاؤ۔۔۔ جا کے اسے بتا دو سعد۔۔۔ کہ تانیہ نے خود ایک کمزور شخص سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"
"میں کمزور نہیں ہوں تانیہ۔" میں نے احتجاج کیا۔
"میں صرف بے بس ہوں۔"
"سعد۔۔۔ میں صرف ہانی کی خوشی کے لیے تم سے رشتہ کیسے جوڑ لوں' اس بے بس انسان سے جو اس لڑکی کے لیے کچھ نہ کر سکا جس سے اسے محبت تھی' تو میرے لیے وہ شخص کیا کرے گا۔ مجھ سے تو اسے محبت تک نہیں ہے۔"

اسے کمرے میں لانے کے بعد سالار نے پہلا سوال کیا۔ اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر۔
"میرے ایک سوال کا جواب سچ سچ دینا ام ہانی۔۔۔ تمہارے گھر والوں نے مجھ سے جو طلاق کا مطالبہ کیا تھا کیا تمہاری اجازت اور مشورے سے کیا تھا یا تمہاری لاعلمی میں؟" وہ خوف کے عالم میں اب بیٹھے اسے دیکھتی رہی۔
"میں جانتا ہوں تم اس بارے میں بالکل بے خبر ہو گی۔ تمہیں کچھ نہیں بتایا ہو گا کسی نے۔" اب وہ لہجہ قدرے نرم کیے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اور وہ قدم بہ قدم پیچھے سرک رہی تھی۔ سالار کا نرم لہجہ اسے مزید خوف میں مبتلا کر تا تھا۔
"تم کیسے مجھ سے علیحدہ ہونے کا سوچ سکتی ہوں۔۔۔ کیسے طلاق کی بات کر سکتی ہو۔ جانتا ہوں میں۔۔۔ یہ سب ان لوگوں کی چال تھی بس میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔"
"نہیں۔" شدید خوف اور دہشت کے عالم میں بھی وہ خود کو سچ بولنے سے روک نہ سکی۔ مصلحت میں بھی جھوٹ بولنے پہ آمادہ نہ ہو سکی۔
"کسی نے کوئی چال نہیں چلی۔ میری رضامندی کے بعد ہی انہوں نے آپ سے طلاق۔۔۔" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سالار نے ایک زوردار طمانچہ اسے دے مارا۔
"تم نے؟ تم نے خود۔۔۔؟" وہ آپے سے باہر ہو کے زور سے چیخا۔
"تم نے مجھ سے طلاق لینا چاہی۔۔۔؟ طلاق۔۔۔؟ تم جانتی ہو یہ لفظ میرے کانوں کے لیے زہر ہے۔ میری روح پہ لگا گھاؤ ہے یہ منحوس لفظ۔" اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے قد آدم لیمپ گرا دیا جس کے زوردار چھناکے کی آواز رات کے اس پہر کے سناٹے میں گونج اٹھی۔
"تم ایک ناشکری عورت ہو۔ طلاق چاہیے تمہیں؟ ان عورتوں سے پوچھو جن کو بن مانگے ملتی ہیں طلاقیں۔ ہر روز۔۔۔ ہر رات اور تم خود چاہتی ہو؟ تم جانتی بھی ہو طلاق کیا ہوتی ہے؟" ام ہانی جو اس کے تھپڑ سے بیڈ پہ اوندھی جا گری تھی اور وہیں سسک رہی تھی۔ سالار نے اسے بالوں سے پکڑ کے اٹھایا اور گھسیٹ کے بیڈ سے اتارنے لگا۔
"تم نے کبھی وہ عورتیں دیکھی بھی ہیں؟ جس کے

منہ پہ تھپڑ کی طرح لگتی ہے طلاق؟"
"سالار... دروازہ کھولو... سالار۔" اماں مسلسل بند دروازے پہ دستک دے رہی تھیں۔
"سالار... مت کرو ایسا' دیکھو وہ واپس آگئی ہے تمہارے پاس... تم اسے چاہتے ہونا' وہ تمہارے لیے لوٹی ہے قدر کرو اس کی سالار۔"
"چلی جائیں یہاں سے۔" وہ دہاڑا۔
"ورنہ میں آپ کو خود دھکے دے کر اس گھر سے نکال دوں گا۔"
"تم ایسا نہیں کرسکتے۔" ان کی دستک نہیں رک رہی تھی۔
"کرسکتا ہوں... کاش آپ کے ساتھ بہت پہلے ایسا ہوا ہوتا... آپ کو دھکے دے کر بے عزت کرکے نکالا گیا ہوتا تاکہ میری عزت تو میرے اندر زندہ رہتی... چلی جائیں۔" نجانے اس کی اس بات میں ایسا کیا تھا کہ اماں کے ہاتھ رک گئے۔ ایک خاموشی چھا گئی۔ جس میں صرف ہانی کی سسکیاں تھیں جس کے بال ابھی بھی سالار کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ دروازے کے اس پار اماں کے واپس جانے کا اطمینان ہونے کے بعد سالار نے آہستہ سے اس کے بال اپنی گرفت سے آزاد کیے اور نرمی سے کہنے لگا۔
"میں جانتا ہوں۔ تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔ مجھے ستارہی ہو۔ یہ بھی تمہاری ایک ادا ہے۔ ستانا... مجھ سے ناراض ہونا اس لیے جان بوجھ کے مجھے تڑپانے اور میرا دل جلانے کے لیے ایسا کہہ رہی ہو تم تو مجھ سے الگ ہونے کا سوچ ہی نہیں سکتی۔ تم مانگ ہی نہیں سکتی مجھ سے طلاق۔"
"نہیں... یہ جھوٹ نہیں ہے۔" انجام سے باخبر ہونے کے باوجود وہ حوصلے سے سچ پہ سچ کہتی جارہی تھی۔
"میں نے چاہا تھا کہ آپ سے الگ ہوجاؤں اور میں دوبارہ ایسا چاہوں گی اگر آپ میری ساتھ ایسے ہی پیش آتے رہے۔ میں نے آپ کو ایک موقع دیا ہے اور خود لوٹی ہوں میں واقعی اچھی نیت سے آپ کے ساتھ رشتہ نبھانے واپس آئی ہوں' لیکن یہ رشتہ آپ کو بھی نبھانا ہوگا۔ ورنہ میں پہلے کی طرح خاموشی سے آپ کے ظلم کا نشانہ نہیں بنوں گی سالار۔" نجانے کہاں سے اتنی ہمت لاکے وہ یہ سب کہہ گئی' مگر سالار کی ہمت جواب دیتی جارہی تھی۔
"مگر آپ نے دوبارہ مجھ پہ ہاتھ اٹھایا تو میں..." اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سالار نے اس پہ تھپڑوں کی بوچھاڑ کردی۔
"لو... اٹھایا میں نے تم پہ ہاتھ... بار بار اٹھاؤں گا۔ کیا کرلوگی تم؟ پھر سے مانگو گی طلاق... مانگو... میں نہیں دوں گا۔ مرجاؤں گا' مگر طلاق نہیں دوں گا اور نہ تمہاری کسی دھونس میں آؤں گا۔ تم میرے ساتھ بھی رہوگی اور ویسے ہی جیسے میں چاہوں گا۔"

☼ ☼ ☼

نائلہ اسلم صاحب کی بات سن کے حیران تھی۔
"اچانک جانے کا فیصلہ؟ مگر کیوں؟" رضوان بھی کچھ سمجھ نہیں پارہے تھے۔
"داداجی کے جانے کی وجہ سے ابھی ہم شادی کی تقریب بے شک نہیں کرسکتے' لیکن آپ' ایسے یہ کام ادھورا چھوڑ کے کیسے جاسکتے ہیں جس کے لیے آئے ہیں۔"
"ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں رضوان اور پھر ہم سادگی سے فی الحال نکاح تو کرہی سکتے ہیں۔" نائلہ کی بے تابی عروج پہ تھی۔ اور اسلم صاحب بے بسی سے تانیہ کو دیکھ کے رہ گئے جو انہیں وضاحتیں پیش کرنے کے لیے تنہا چھوڑ کے اب لاتعلق بیٹھی تھی۔ آخر انہوں نے ہچکچا کے کہا۔
"دراصل ایک تو میری مصروفیات اور دوسرا تانیہ بھی..." اتنا کہہ کر وہ پھر سے تانیہ کو دیکھنے لگے۔ اکلوتی لاڈلی بیٹی نے کس مشکل میں ڈال دیا تھا۔
"مجھے احساس ہے آپ کی مصروفیات کا' مگر نائلہ کا کہنا بھی درست ہے ہم ہفتہ کے اندر اندر سادگی سے نکاح کردیتے ہیں۔" رضوان صاحب نے حل نکالنا

چاہا۔

"یہ تو ایک فریضہ ہے اور رسومات محض دل کی خوشی ظاہر کرنے کا ذریعہ۔۔۔ ضروری نہیں یہ کام دھوم دھڑکے سے ہی ہو۔"

"انکل۔۔۔ دراصل میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا ہے۔" تانیہ کو زبان ہلانی ہی پڑی۔

"میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں اور اگلے دو سال میرے پاس شادی کے لیے بالکل بھی وقت نہیں ہے۔" اس کی بات پہ نائلہ اور رضوان ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے جب کہ اسلم صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ ان کے بس میں جتنا تھا وہ تانیہ کو سمجھانے کی کوشش کر چکے تھے اور اب بیٹی کی عجیب و غریب ضد کے سامنے ہتھیار بھی ڈال چکے تھے۔

"تانیہ۔۔۔ بیٹا۔۔۔ یہ اچانک۔۔۔" رضوان ہکا بکا تھے سمجھ نہ آرہا تھا کہ کیا کہیں۔

"اسلم صاحب۔۔۔ آپ ہی کچھ کہیں یہ کیا ہے؟"

"میں نے تانیہ کا ہر معاملہ ہمیشہ اس پہ چھوڑا ہے۔ سعد سے شادی کرنا چاہتی تھی وہ۔۔۔ میں آگیا۔۔۔ اب وہ اپنی اسٹڈیز اور کیریئر پہ توجہ دینا چاہتی ہے' میں اس کی اس خوشی میں بھی خوش ہوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" نائلہ بگڑ گئیں۔

"بیٹھے بٹھائے پڑھائی کا بھوت۔۔۔ کل تک تو مہندی لگوا رہی تھی ہاتھوں میں۔۔۔ وہ بھی خوشی خوشی۔۔۔ سعد کو آنے دو۔۔۔ اس سے پوچھتی ہوں' ضرور دونوں میں کوئی کھٹ پٹ ہوئی ہوگی۔" رضوان کو بھی نائلہ کا قیاس درست لگا۔

"بالکل یہی بات ہوئی ہوگی آج کل کے بچے جذباتی اور جلد باز ہیں۔ فوری فیصلے لے لیتے ہیں ہم بڑوں کو بات سنبھالنی چاہیے بجائے ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے۔"

"پلیز انکل۔۔۔ ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ (سمجھنے کی کوشش کریں)۔۔۔ فی الحال یہی ہم سب کے لیے بہتر ہے اور اس کے علاوہ مجھے ایک اور بھی بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"اب اور کیا رہ گیا ہے کہنے کو؟ وہ بھی بتا دو۔" نائلہ کا موڈ سخت برہم ہو چکا تھا۔

"ڈیڈ کا میرے اور میرا ڈیڈ کے علاوہ اس دنیا میں کوئی اور نہیں ہے جیسے وہ ہمیشہ میری ذمہ داریاں نبھاتے آئے ہیں ایسے ہی آج میں ان کی جانب سے آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔"

"کہو بیٹا۔"

"میں ڈیڈ کا پروپوزل آپ کے سامنے رکھ رہی ہوں رضوان انکل۔۔۔ مہ پارہ پھوپھو کے لیے۔" یہ دوسرا بم تھا جو تانیہ نے ان سب کے سر پہ پھوڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں جانتا تھا نیچے کیا ہو رہا ہے۔ کون سی بحث چل رہی ہے' مگر میں اکیلا۔۔۔ لاتعلق۔۔۔ الگ تھلگ چھت پر کھڑا تھا جو کچھ تانیہ کر رہی تھی میں اسے روک نہیں سکتا تھا اور روکتا بھی کیوں۔۔۔ وہ انجانے میں مجھے اس عہد پہ عمل کرنے سے بچا ہی تو رہی تھی جس عہد میں ہی مجھے نہ چاہتے ہوئے باندھ گئی تھی۔

"تو یہاں ہے؟" علی پھر سے آدھمکا۔

"میں تجھے قبرستان تک ڈھونڈنے چلا گیا۔ آنٹی بتا رہی تھیں تم وہاں بڑے دادا کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے گئے ہو۔"

"پڑھ لی۔۔۔ پھر یہاں آگیا۔" میں نے کان لگا کے کچھ سننے کی کوشش کی مگر بانسری کی آواز کہیں نہیں تھی۔

"ہر قبر کا حق ہے کہ اس پہ فاتحہ پڑھی جائے۔ کچھ قبریں دل کے اندر بھی ہوتی ہیں علی مگر ان پہ پڑی مٹی اور جلتی ہوئی اگر بتیاں کسی کو نظر نہیں آتیں۔"

"سعد۔۔۔ تو۔۔۔" علی کچھ کہنا چاہتا تھا یا سمجھانا' مگر پھر اچھا ہوا کہ اس نے خود ہی ارادہ ترک کر دیا۔

"تجھے پتا ہے نیچے تانیہ نے کیا شوشا چھوڑا ہے؟"

☆ ☆ ☆

"اس میں حیرت والی کیا بات ہے؟ میں چاہتی ہوں کہ ڈیڈ اب کم از کم اپنی باقی کی زندگی اکیلے نہ گزاریں

میری خاطر انہوں نے بہت وقت سزا کی طرح کاٹ لیا اور آج سے نہیں' میں ہمیشہ سے یہ چاہتی تھی اب کہیں جا کے وہ رضا مند ہوئے ہیں۔" اسلم صاحب اپنی فطرت کے برخلاف بیٹی کی بے موقع بات سے بڑے شرمندہ' شرمندہ سے لگ رہے تھے۔

"تانیہ۔۔۔ میرا خیال ہے یہ موقع ایسی باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے ڈیڈ؟ جب میری شادی کی بات ہو سکتی ہے تو آپ کی کیوں نہیں؟"

"تمہاری اور سعد کی شادی کی بات میں اور اس بات میں بہت فرق ہے تانیہ۔" میں اندر داخل ہوا تو امی ناگواری سے کہہ رہی تھیں۔

"تم کم عمر ہو۔ ہماری روایات اور معاشرتی اقدار سے واقف نہیں ہو' لیکن پھر بھی مجھے تم سے اتنی بچکانہ بات کی امید نہیں تھی اور اسلم صاحب۔۔۔ آپ تو خاصے سمجھ دار ہیں آپ بھی؟ کیا کچھ سال ملک سے دور رہنے کے بعد آپ یہاں کی اقدار بھی بھول گئے؟"

"میں معذرت خواہ ہوں' میں نے تانیہ کو سمجھایا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔" ان کی معذرت پہ تانیہ الجھ پڑی۔

"کیوں ڈیڈ؟ آپ کیوں شرمندہ ہو رہے ہیں؟ کوئی غلط بات نہیں کی ہم نے اور آنٹی۔۔۔ کیا ہماری روایات میں گھر بنانا' سیٹل ہونا یا نکاح کرنا شامل نہیں ہے؟"

"ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے؟" امی لاجواب ہونے کے بعد بھی چپ نہیں رہیں اور ابو کو بھی آنکھوں سے اشارہ کیا۔

"تانیہ بیٹا۔۔۔ نائلہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ بات واقعی بہت عجیب ہے۔"

"کیا عجیب ہے اس میں؟" میں نے آگے بڑھ کے تانیہ کا ساتھ دیا۔

"کیا یہ کہ انکل ایک جوان بیٹی کے باپ ہیں؟ یا یہ کہ مہ پارہ پھوپھو کی عمر زیادہ ہو چکی ہے؟ تو کیا زندگی پہ دونوں کا حق نہیں رہا؟"

"تم چپ رہو سعد۔۔۔ میں مزید اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی' لوگ کیا کہیں گے کہ بھتیجے کے ہونے والے سسر کو پھوپھی نے۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ بہت جگ ہنسائی ہوگی۔"

"پھر سے وہی جگ ہنسائی کا خوف۔۔۔ پھر سے لوگوں کی باتوں کا ڈر۔۔۔ ایک بار پھر دنیا کی خاطر جیتے جاگتے انسانوں کی قربانی۔ کب تک چلے گا یہ؟" اب میں اسلم انکل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"آپ پھوپھو سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"سعد۔۔۔" ابو نے مجھے ٹوکنا چاہا۔

"پلیز ابو۔۔۔ مجھے بات کرنے دیں۔ آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ میں اب بڑا ہو گیا ہوں اور مجھے اپنی ذمے داریوں کا احساس ہونا چاہیے۔ پھوپھو بھی میری ذمے داری ہیں۔ بتائیے انکل۔۔۔ آپ خوش رکھ سکیں گے انہیں؟ نبھا سکیں گے یہ تعلق؟"

"آف کورس۔۔۔ یقیناً"۔۔۔" انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں پھوپھو سے پوچھ کے آپ کو جواب دے دوں گا۔ ان کی مرضی اہم ہے۔ ہم سب کی مرضی سے زیادہ۔"

"سعد۔۔۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ تمہیں کچھ احساس بھی ہے؟" امی نے غصے سے گھورا۔

"اور کیا آپ کو احساس ہے کہ اس حویلی کی اونچی دیواروں کے اندر کتنے بین چھپے ہیں؟ کتنی سسکیاں گونجتی ہیں؟ پھوپھو کو پورا حق ہے اپنی زندگی میں رنگ بھرنے کا۔ کوئی ان کو بھی ماں کہہ کر پکارنے والا ہو۔ ان کا بھی کوئی گھر ہو۔"

"سعد ٹھیک کہہ رہا ہے نائلہ۔۔۔ اس نے میرے اندر بھی شعور بے دار کر دیا ہے۔ میں اختیار ہوتے ہوئے بھی اسے استعمال نہ کر سکا۔ ان پرانی روایتوں اور اصولوں کو توڑ سکتا تھا' میں۔۔۔ مگر۔۔۔ خیر۔۔۔ دیر آید درست آید۔۔۔ اس کا سہرا نئی نسل کو ہی جانا تھا۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

فرحین اظفر

دیائے وفا

سوہا اور رابا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔

گھر کی نچلی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔

حدید، انس، عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ، انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس، سوہا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوہا کی تائی کے سامنے کردیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے، مگر بظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوہا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کرلیتی ہیں۔

نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبو سے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوہا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوہا رخصت ہو کر انس کے گھر آجاتی ہے۔

حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔

سوہا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔

حدید، عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔

نائلہ، شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے، جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہوجاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ نائلہ کی شادی کا فیصلہ کرلیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور رابا سے بھی کردیتی ہیں۔

حدید، انس کی خاطر نائلہ سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہوجاتا ہے اور شادی کے بعد پوری سچائی سے نائلہ کو بیوی کا درجہ دینا چاہتا ہے، مگر نائلہ نے حدید کو مجبوری کے تحت اپنی زندگی میں قبول کیا اور اس کو وہ مقام نہ دیا جو اس کا حق تھا حدید

خاموش ہو گیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ نائلہ اس کو قبول کرلے گی' مگر حدید کی شرافت اور خاموشی کو دیکھتے ہوئے نائلہ کے دماغ میں کچھ اور ہی منصوبے بالا ہی بالا تشکیل پانے لگے' جس پر نائلہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی کامیابی سے عمل پیرا تھی کہ وہ انس کی نہ ہو سکی تو سوہا اور انس کو بھی جدا کر دے گی۔

ماہا کی شادی حبیب سے بخیر و خوبی ہو جاتی ہے۔ ماہا حبیب کے ساتھ دبئی چلی جاتی ہے' ماہا حبیب سے شادی کے بعد اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت لڑکی سمجھنے لگتی ہے' مگر اس کو پتا چلتا ہے کہ حبیب ایک بیٹے کا باپ ہے اور وہ فوراً پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیتی ہے۔

سوہا امید سے ہوتی ہے' مگر نائلہ بڑی عمدگی اور کامیابی سے سوہا کو اس خوشی سے محروم کردیتی ہے اور اس حادثے کے بعد انس کو اپنی زیادتی کا احساس ہوتا ہے اور وہ سوچ لیتا ہے کہ اب سوہا کو کوئی غم نہیں دے گا۔ نائلہ اسپتال میں شبیر حسین کو دیکھ کر چکرا جاتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ شبیر حسین نے اس کو نہیں دیکھا' مگر شبیر حسین نائلہ کا پیچھا کرتے کرتے اس کے گھر پہنچ جاتا ہے اور نائلہ نہ چاہتے ہوئے بھی شبیر حسین کے جال میں گھر جاتی ہے۔

حبیب ماہا کو منا لیتا ہے اور پاکستان آجاتا ہے' مگر ماہا پھر غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے اور حبیب کے ساتھ جانے سے منع کردیتی ہے۔ حبیب اکیلا ہی دبئی جانے کے لیے روانہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

عفت کا نکاح معراج کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جس کا حدید کو پتا چلتا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

پندرھویں اور آخری قسط

پندرہ دن کے اندر اندر ہنگامی صورت حال میں عفت کی رخصتی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ اس تاریخ رکھنے کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے سوہا خود ماہا کو لینے بھی آئی اور ڈراپ کرنے بھی۔ ورنہ حبیب اسے اجازت دینے کے موڈ میں نہیں تھا اور اس کے موڈ کو دیکھتے ہوئے ماہا کی بدمزاجی اور چڑچڑاہٹ عروج پر پہنچ چکی تھی۔

سوہا نے فون پر ساری صورت حال سن کر خود اجازت لینے کا مرحلہ طے کیا۔ اسے تسلی دی۔ اور جب وہ شادی کے اوائل دنوں کے بعد' ایک لمبے عرصے بعد اس قدر سج دھج سے تیار ہوئی تھی تو حبیب کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر اسی پر جا ٹھہرتی تھیں۔

وہ دبے دبے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میٹھی میٹھی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر قریب جانے کا ارادہ فی الحال ملتوی کیے رکھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ اس کے ذرا سے التفات پر آنسو بہا کر وہ اپنا حلیہ اور چہرہ دونوں بگاڑ لیتی۔

بہرالحال سوہا آئی۔ حبیب سے شکوے شکایات ہوئے اور انس نے بھی حسب توفیق اسے لتاڑا تب' کہیں جا کر ماہا کا موڈ قدرے بہتر ہوا۔ پھر بھی وہ اس بات پر شاکی تھی کہ نہ تو حبیب اپنی حرکتوں کو لے کر اتنا سنجیدہ ہوا۔ نہ اس دوران انس اور سوہا نے ہی سنجیدگی سے اس سے بات کی۔ الٹا ہنسی مذاق اور چھیڑ خانی میں بات کرکے اسے ساتھ لے کر چلتے بنے۔ ولید اس دوران اور دل جلانے کا سبب بنا۔ کیونکہ وہ بھی ان ہی لوگوں کے درمیان کسی گھر کے فرد کی طرح موجود رہا۔

تقریب بخیر و عافیت اپنے اختتام کو پہنچی۔ تمام لوگوں کی طرف سے خوش اخلاقی کے بھرپور مظاہرے کے بعد بھی بتول اور ان کی بیٹیوں کی جانب سے سرد مہری کا عنصر ہر بات میں واضح رہا۔ اپنے اپنے اور معراج کے بچوں کو وہ گھر پر معراج کے حوالے کرکے آئی تھیں۔ رہے دونوں داماد تو دونوں ہی منہ بند کیے بیٹھے رہے۔ نہ کوئی اعتراض نہ حامی نہ انکار۔

صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ مارے باندھے تقریب میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔
اس شادی اور رخصتی سے پہلے ہی عفت کو کیا کچھ سننا تھا۔ ابھی کیا کچھ تھا جو باقی تھا۔ ہونے کو اور وہ کچھ پہلے ہو جانے والے بہت کچھ سے بڑھ کر تھا۔

☼ ☼ ☼

"صرف پندرہ دن کے شارٹ نوٹس پر کیسے انتظام ہو گا سب۔" انس کے آگے ناشتا رکھتے ہوئے وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔ قریب ہی حدید بیٹھا اپنا ناشتا ختم کر رہا تھا۔ سوہا نے دیکھا اس کی بات پر کوئی رد عمل تو دور کی بات حدید چونکا تک نہیں۔
"اب کرنا ہی کیا ہے تیاری تو ساری مکمل ہے ہی۔" انس کے لب و لہجے میں مردوں والی مخصوص بے فکری بول رہی تھی۔ جبکہ سوہا سر ہلا کر ایک بار پھر حدید کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ اس سے حدید کا اس قدر محو ہو کر ناشتا کرنا برداشت نہیں ہوا جبھی بے ارادہ اسے پکار بیٹھی۔
"حدید بھائی۔" وہ بنا چونکے متوجہ ہوا۔ مطلب وہ اس کی بات سن رہا تھا۔
"وہ....." اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا بات بنائے۔ "آپ نائلہ کا موبائل مانگ رہے تھے بار بار... کوئی کام تھا کیا۔" حدید کے منہ میں گھومتا نوالہ ساکت ہوا۔ اس کے جبڑے بھینچے لیکن چہرے کی سنجیدگی میں فرق نہیں پڑا۔ سوہا کو لگا اس نے کوئی بہت ہی غلط بات غلط موقع پر چھیڑی ہے۔ مگر وہ جواب دینے کے بجائے انس سے کہنے لگا۔
"فرصت ملے تو بات سننا میری۔" اس کا لہجہ ہرگز بھی نظر انداز کیے جانے کے لائق نہ تھا۔
"کیا بات ہے بتا دو ابھی۔" انس بھی فوراً" متوجہ ہوا۔
"نہیں مجھے..." اس نے کھڑے ہو کر سوہا کو دیکھا۔
"اکیلے میں کرنی ہے۔ صرف تم سے۔ چلتا ہوں خدا حافظ۔" سوہا اپنی جگہ شرمندہ سی ہو گئی۔ پھر کوئی فیصلہ کر کے تیزی سے باہر نکلی۔ حدید بائیک کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے آواز دی تو پلٹ کر دیکھا۔
"آپ کو جو بھی ضروری بات کرنی ہے۔ آپ کر سکتے ہیں ابھی۔ میں اوپر چلی جاتی ہوں۔" بے حد سادگی اور محبت بھرے لہجے میں وہ اسے دیکھ کر بولتی ہوئی نزدیک آئی۔ حدید بے ساختہ مسکرا دیا۔
"اتنی بھی ضروری نہیں۔ شام میں کر لوں گا۔" اس نے پھیکے پن سے مسکرا کر سوہا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ سوہا کو اس کی مسکراہٹ بے حد بھلی لگی لیکن... پھر جانے کیا ہوا۔ وہ ایک دم منہ پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی۔
"ارے ارے... کیا ہوا بھئی۔" اس نے جلدی سے اس کا سر پکڑ کر چہرہ اونچا کیا۔ سوہا آنکھیں صاف کرتی سوں سوں کر کے نفی میں سر ہلانے لگی۔
"بہت کچھ ہو جاتا ہے زندگی میں گڑیا! ایسے ہمت تھوڑا ہی ہارتے ہیں۔"
سوہا کو اس کے تھکے ماندے لہجے پر اور ٹوٹ کر رونا آنے لگا۔ مگر اس کی پشت پر انس باہر نکل آیا تھا۔ اور وہ اب اپنا مذاق نہیں اڑوانا چاہتی تھی۔ اس لیے ضبط سے چہرہ صاف کرنے لگی۔
انس نے حدید سے اشارے سے پوچھا۔ حدید مسکرانے لگا۔
"کچھ نہیں یار بچی ذرا جذباتی ہو گئی۔" اب کی بار اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی بشاشت تھی۔
"میری بچی!" انس قریب آیا اور حدید کو برا جتانے والے انداز میں بولا۔ حدید ہلکے سے ہنس دیا جبکہ سوہا کی روتے میں بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ حدید کے جانے کے بعد وہ انس کی طرف پلٹی۔

”میں کوئی بچی وچی نہیں ہوں۔ اچھا۔“ اس کا انداز صاف چڑانے والا تھا۔
”اور ٹیلی بے بی۔“ اب کی بار انس اور شوخ ہوگیا۔ سوہا اسے زبان چڑا کر اندر جانے لگی تب ہی انس کو کچھ یاد آیا۔
”سنو ماہا سے بات ہوئی دوبارہ....“
”رات میں فون کروں گی۔“ اس نے اندر جاتے جاتے آواز لگائی تھی۔

☼ ☼ ☼

فضاؤں میں بہت چپکے اور آہستگی سے خنکی سمٹ آئی تھی۔ صبح کاذب کے وقت اگر بازو کھلے ہوں تو بے ساختہ پیٹ لینے کو دل کرتا اور عشاء میں ٹھنڈے پانی سے وضو کا خیال ایک بار تو ضرور ہی ''آنکسی'' کھا جاتا۔ ایسی ہی ایک خنک رات میں گرم دودھ کا گلاس خالی کر کے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے حبیب نے ایک ایسی بات کہی کہ ماہا حیرت کے مارے بت سی بن گئی۔
”کیا... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“
”ہو کیوں نہیں سکتا۔“
”اب نائلہ نہیں ہے وہاں جو اپی بہن کا ہر کام سنبھال لے۔“ اس کے لہجے میں بے حد سرسری سی یاددہانی تھی۔
”ہاں تو کیا ہوا۔ انس نے بتا دیا ہے مجھے 'سوہا چلی جائے گی رکنے۔“
”جب وہ جائے گی تو میں کیوں نہیں۔“ اس نے تنک کر ڈریسنگ پر دودھ کا گلاس پٹخا۔ حبیب نے ناگواری سے اس کے انداز کو دیکھا اور پھر جواب دیے بنا موبائل میں گم ہوگیا۔
”میں آپ کو بتا رہی ہوں آخری بار....“ حبیب کا یوں نظر انداز کرنا اسے بے حد کھل گیا۔
”میں دو دن پہلے چلی جاؤں گی اور پھر ولیمہ کر کے ہی آؤں گی واپس۔“
”میری بات کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔“
”نہیں... کوئی اہمیت نہیں۔ کیا آپ کے نزدیک ہے اہمیت میری بات کی۔“ اسے بتدریج غصہ چڑھ رہا تھا۔
”ہے تبھی تو بھیج رہا ہوں شادی میں۔“
”ہاں عین وقت پر مہمانوں کی طرح۔ کیا کہیں گے سب خاندان کے لوگ۔“
”نہیں جو کچھ بھی کہنا تھا وہ 'میرے بارے میں سچائی سن کر کہہ چکے۔ اب کوئی کچھ نہیں کہے گا۔“ سرد مہری اور لہجے کی ٹھنڈک' برف کو مات دیتی ہوئی تھی۔ ماہا کا مزاج بری طرح بگڑ گیا۔
”کوئی کچھ کہے یا نہ کہے۔ میں جو کہہ رہی ہوں۔ میں وہی کروں گی۔ سن لیا آپ نے مجھے جانا ہے۔ میں جاؤں گی۔ کوئی میرے اوپر نہ پابندی لگا سکتا ہے۔ نہ روک سکتا ہے مجھے....“ اب کی بار وہ بلا خوف و خطر چلائی تھی۔ تب ہی دستک کی آواز نے بحث میں خلل ڈالا۔
”کیا بات ہے۔ کیا لڑائی جھگڑا ہو رہا ہے آدھی رات کو۔“ آنے والی مزنہ تھیں۔ ماہا نے شدید ناگواری سے انہیں دیکھا۔
”اور تمہیں اپنے شوہر سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ جب دیکھو لڑائی جب دیکھو بدتمیزی اور زبان درازی۔ وقت دیکھو گھر کا ماحول دیکھو مگر نہیں۔ کیا بات ہے حبیب۔“

بمشکل اپنی زبان کو روک کر حسیب کی جانب متوجہ ہوئیں۔
"نہیں۔۔۔ میں بھی ابھی یہی کہہ رہا تھا کہ آہستہ بولو۔"
"ہاں تمہارے ایک بار بولنے کا ضرور اثر ہوگا مہارانی پر۔ بچپن سے ماں کے گھر سے پتا نہیں کیا سیکھا۔"
"آپ کی طرح دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا نہیں سیکھا کم از کم۔" جب برداشت کی حد ہو گئی تو وہ بول ہی پڑی۔ زبان ایک ایسا تالا ہے جو جب تک لگا رہے لگا رہے مگر جب ایک بار کھل جائے تو برے الفاظ بن بلائے مہمان کی طرح وقت بے وقت بے تکلفی سے چلے آتے ہیں۔ وہ یہ شرم ہے۔ جو ایک بار ختم ہوتی ہے تو پھر زندگی میں بار بار انسان کو شرمندگی سے دوچار کرتی ہے۔
"ماہا!" اب کی بار مزنہ نے نہیں حسیب نے درشتی سے اسے پکارا تھا۔
"شرم نہیں آتی تمہیں بڑوں سے بدتمیزی کرتے ہوئے۔ معافی مانگو آپی سے۔" کمرے کے ماحول اور منظر نے اس تیزی سے رنگ بدلا کہ خود مزنہ بھی گڑبڑا سی گئیں مگر صرف چند لمحوں کے لیے بعد میں ان کی گردن اور اکڑ گئی اور ماہا کی حالت ایسی تھی کہ اس کے سفید چہرے کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اب گری کہ تب۔۔۔۔
"معافی مانگو۔ کیا کہہ رہا ہوں۔"
حسیب کی بلند آواز دوبارہ گونجی۔ وہ چونک کر کسی گہرے خیال سے جاگی اور شدید نفرت آمیز نگاہ ان دونوں بہن بھائی پر ڈالتی ہوئی باتھ روم میں بند ہو گئی۔ باتھ روم کا دھاڑ سے ٹکرانے والا دروازہ مزنہ کو اپنے منہ پر طمانچے کی طرح ہی لگتا اگر جو فوراً" حسیب ان سے معذرت نہ کر لیتا۔
"آئی ایم سوری آپی۔ ماہا کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے آج کل۔ اس کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔" حسیب کی آواز واش روم تک آ رہی تھی۔ اور ماہا واش بیسن میں پانی کے ساتھ ڈھیروں آنسو بہا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگر کسی اور حالات میں گھر میں اتنی حادثاتی فوتگی ہوئی ہوتی تو اتنی جلدی کسی خوشی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن۔۔۔۔
"معراج اللہ سمجھے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو۔" عفت کے گنتی کے چند جہیز کے جوڑے سجے سجائے پیکنگ میں رکھے دیکھ کر ان کے دل سے ایک ہوک سی نکل گئی۔ یہی حال باقی گھر والوں کا تھا۔ اتنے بڑے غم کے بعد خوشی کا موقع اتنی جلدی بس زبردستی ہی چلا آیا تھا کہ کوئی بھی ڈھنگ سے اس کا استقبال تک کرنے کو تیار نہ تھا۔
سوہا نے بے دلی سے انس کے ساتھ جا کر اپنا ڈریس لیا۔ اور وقت بچانے اور دل نہ لگنے کی خاطر ماہا اور عفت کا بھی رنگ بدل کر ویسا ہی لے لیا۔ عفت کا سوٹ اس کے جہیز میں رکھ دیا گیا۔ باقی چیزوں کی شاپنگ بھی بس ایسے ہی کی گئی کہ چند گھنٹے ہی لگے۔ اور میک اپ سے لے کر سینڈلز چوڑیاں اور ہیئر کلپ تک آ گئے۔ حالانکہ عفت نے سختی سے کسی بھی چیز کی خریداری کرنے سے منع کر دیا تھا۔ ایسا کرتے سمے اس کی آنکھوں میں اپنی بچھڑی بہن کا غم ہلکورے لے رہا تھا۔ اور دل اس کی جدائی کے سبب بے انتہا کرب انگیز کیفیت میں تھا۔ لیکن رضوانہ نے اسے سمجھا بجھا کر راضی کر لیا۔
"اپنے سسرال والوں کا مزاج دیکھ کر چلو بیٹی۔ پہلے ہی ان کے خیالات تمہارے بارے میں اچھے نہیں۔ اگر تم نے کسی بھی رسم یا بناؤ سنگھار سے انکار کیا تو کہیں وہ اس بات کو بھی مسئلہ نہ بنا لیں۔" ان کی بات ٹھیک ہی تھی۔

عفت ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
ماں باپ کی دہلیز چھوڑنے کا غم 'نئی زندگی نئی خوشیاں اور محبت بھرے ہمسفر کی جس خوشگواریت میں ملفوف ہوتا ہے۔ اس کا ایک ہلکا سا شائبہ بھی اس کے دل میں نہ تھا۔ البتہ اس کی جگہ اگر کسی جذبے نے دل میں ڈیرے ڈال رکھے تھے تو وہ تھا خوف۔ اور صرف خوف۔ رضوانہ اس کی کیفیات سمجھ سکتی تھیں۔ اس لیے اسے دل کھول کر رونے دیا۔ اور تھوڑی دیر اس سے اس کے کپڑوں اور جہیز کی دوسری چیزوں کا پوچھ کر لسٹ بنانے کے بہانے اسے پھسلا بھی لیا۔
سب کو انتظار تھا تو اس دن کا' جس دن عفت اس گھر کی دہلیز کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے پیا کے سنگ رخصت ہو جاتی۔ لیکن سب لوگوں کو جہاں اس دن کا انتظار تھا۔ وہیں دو افراد ایسے بھی تھے۔ جن کی خوشیاں تفکرات کی دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔
ماہا۔ جس کو حسیب نے گھر جا کر رہنے سے منع کر دیا تھا۔
اور حدید۔ جس کے کانوں میں وقت بے وقت ان چاہی آوازیں گونجتیں اور اس کا سارا اطمینان غارت کر دیتیں۔

✲ ✲ ✲

فضا میں مغرب کی اذان کی آوازیں گونجیں تو اس نے چہرے اٹھا کر دونوں ہتھیلیوں سے اس کی نمی کو رگڑ ڈالا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا اور کتنی دیر گزر گئی۔ یہاں خاموشی سے بیٹھ کر آنسو بہاتے ہوئے۔
آنکھیں صاف کرنے کے بعد جونہی دائیں جانب نگاہ اٹھی وہ بری طرح ڈر گئی۔ اور پھر فوراً" ہی چہرے پر ناگواری بھی پھیل گئی۔
"آپ کے گھر میں آج آپ کی کزن کی مایوں ہے۔ آپ جانے کے بجائے یہاں بیٹھی ہیں۔" اس کا انداز آج بھی نرم اور دوستانہ تھا۔
"تم سے مطلب۔" وہ ہمیشہ کی طرح پھاڑ کھانے کو دوڑی۔
"جاؤ اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر ان کا غم غلط کرو۔"
"غم تو میں آپ کا بھی غلط کر سکتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں۔۔۔"
"اونہہ۔ بڑے آئے کہیں سے۔" وہ تیزی سے سر جھٹک کر کھڑی ہوئی اور نیچے جانے کے لیے پر تولے۔ عصر کے وقت چھت پر آئی تھی۔ اور اب مغرب ہو چکی تھی۔
"اگر آپ کو اپنی امی کے گھر جانا ہے تو میں لے چلتا ہوں۔" اسے جاتا دیکھ کر وہ تیزی سے بولا۔ ماہا ٹھہر گئی۔ بات ہی ایسی تھی۔ سیدھی دل کو لگی تھی۔ پھر کچھ خیال آگیا۔
"تم کیسے لے جاؤ گے۔"
"گاڑی سے اور کیسے۔"
"اوفوہ۔" وہ الجھی اور بولی۔ "میرا مطلب ہے۔ حسیب نے منع کر دیا ہے۔ مجھے جانے سے۔ پتا نہیں انہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔"
اس کی آنکھوں میں پھر سے آنسو بھرنے لگے۔ پھر اسے دیکھا تو تنک گئی۔
"اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ تم نے میری زندگی میں یہ ساری نحوست پھیلائی ہے۔" وہ بری طرح اس پر

الٹ پڑی۔ مگر وہ برا مانے بنا مسکراتا رہا۔
"چلیں اگر میری لائی ہوئی مصیبت ہے۔ تو پھر مجھے ہی اس مصیبت کو بھگانا چاہیے نا!" وہ دو قدم آگے آیا۔
اور دھیرے سے بے حد نرمی سے بولا۔
"آپ تیاری کرلیں۔ بابا سے پرمیشن میں لے لوں گا۔" ماہا کا دل پگھلا۔ مگر اگلے ہی لمحے پتھر ہو گیا۔
"رہنے دو۔ وہ نہیں جانے دیں گے۔ احسان الگ ہو جائے گا۔"
"اگر انہوں نے روکا تو آئی پرامس۔ میں دو آؤٹ پرمیشن لے جاؤں گا آپ کو۔"
ماہا اس کی بات پر بے اختیار پلٹی۔ وہ ایک سیڑھی نیچے اتر چکی تھی۔ اور ولید دہلیز سے دو قدم ہی پیچھے تھا۔ اس کے چہرے پر لکھی سچائی کوئی بھی پڑھ سکتا تھا۔ وہ واپس پلٹ گئی۔ اور جب وہ تیز تیز سیڑھیاں اترتی جارہی تھی۔ تو لبوں پر ایک انجانی خوشی سے پھوٹنے والی مسکراہٹ گہری ہوتی جارہی تھی۔

☼ ☼ ☼

گھر پر ایک رونق لگی ہوئی تھی۔ سب ہی نے اس کی ولید کے ساتھ آمد کو ایک معنی خیز تناظر میں دیکھا تھا۔ خاص طور پر سوہا کو ایک عجیب سا اطمینان ہوا۔
"تم اس کے ساتھ کیسے خیریت۔۔۔"
ذرا سی تنہائی کا موقع ملتے ہی اس نے اپنی بے چینی کو زبان دے دی۔
"ہاں ہاں خیریت ہی ہے۔ بڑی منتیں کر رہا تھا۔ میں لے چلتا ہوں۔ کیونکہ حسیب کا تو آج کل دماغ ہی ٹھکانے پر نہیں۔ پتا نہیں کس نے ان کو کیا بھر دیا ہے کہ وہ دن رات میرے یہاں آنے پر پابندیاں ہی لگاتے رہتے ہیں۔ ابھی بھی واپس آنے کے وعدے پر بھیجا ہے۔" ماہا بھی ناک تک بھری ہوئی تھی۔
"تو ابھی کیسے آنے دیا۔" وہ لوگ اوپری حصے میں کھڑی رسم کے لیے گجرے اور ہار وغیرہ پلیٹوں میں سیٹ کررہی تھیں۔
"ولید نے ہی لے کر دی اجازت۔" ماہا خود میں حد سے زیادہ مگن تھی۔ تب ہی سوہا کے لبوں سے پھوٹتی مسکراہٹ دیکھ کر چونکی۔
"لو تو یہ تو تمہارے کام کا نکلا۔"
"رہنے دو بچہ نہیں ہے وہ۔ اور وہ اتنے ہی کام کا ہے۔ تو گود لے لونا۔" یہاں ماہا بدکی۔ سوہا کی ہنسی چھوٹ گئی۔
"میں کیوں لوں۔ اگر انس کا ہوتا تو ضرور لے لیتی۔" اب کی بار دونوں کی بوکھلاہٹ دروازے کے باہر اپنا نام سن کر رکتے ہوئے ولید کے کانوں نے بھی سنی۔ وہ بھی شرارت سے مسکرا دیا۔
"آپ کا کچھ لگتا ہوں میں خالہ جان۔" دل ہی دل میں اس نے سوہا کو مخاطب کیا۔ جبکہ اندر ماہا دھیرے سے سوہا کو ٹوک رہی تھی۔
"توبہ کرلو بے شرم۔" ولید وہیں سے پلٹ گیا۔
چھوٹے سے گھر کے نچلے حصے میں خوب شور برپا تھا۔ کسی لڑکی نے ڈھولک منگوالیا تھا۔ گانوں کی آواز باہر تک جارہی تھی۔ ولید نے زندگی میں پہلی بار ایسی کسی تقریب میں شرکت کی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی لڑکیوں کے ساتھ شامل ہوچکا تھا۔ گانے والے تو کیا گائے تھے۔ بس شور و غل ہاؤ ہو مچا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج کی تقریب میں معراج کے گھر والوں کے ساتھ 'معراج کو خود بھی انوائٹ کیا گیا تھا۔ تاکہ خاندان کے دو ایک قریبی گھرانے ہیں جو نکاح کے وقت اس سے مل نہیں سکے تھے۔ اب فرصت سے مل بھی لیں اور شکوہ بھی دور ہو جائے۔ ان سب لوگوں سے دور' والدہ بیٹے اور بہنوں کے گھر والوں کے علاوہ خاندان کے دوسرے چیدہ چیدہ افراد کے ساتھ کوسٹر میں معراج مستقل مسکرا رہا تھا۔ بتول بظاہر خوش نظر آتی تھیں لیکن ان کا دل ہی جانتا تھا کہ معراج کی ضد اور ہٹ دھرمی نے انہیں کتنا کلسایا تھا۔

یہی حال دونوں بہنوں کا بھی تھا۔

بس نہیں چلتا تھا کہ معراج کے ہاتھ پیر باندھ کر گن پوائنٹ پر یہ نکاح ختم کروا دیتیں۔ ان لوگوں کو اپنا بھائی بالکل ہاتھوں سے نکلا ہوا لگتا تھا۔

غصے اور جلن کے مارے وہ دونوں بھائی کی طرف دیکھ تک نہیں رہی تھیں۔ جو سب سے آگے کی سیٹ پر اپنے بیٹے کو برابر میں بٹھائے چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہا تھا۔

''بابا! ناریل۔'' سگنل پر رکی گاڑی' کب سے چلنے کو تیار کھڑی تھی لیکن ٹریفک جام میں بری طرح پھنس چکی تھی۔

''یا اللہ کیا مصیبت ہے۔ کھڑکی کھولو بھئی۔'' تبسم کی برداشت جواب دے رہی تھی۔ جب ہی گاڑی نے ذرا سا رینگنے کے بعد ایک جھٹکا کھایا' بے دھیانی میں بیٹھے لوگ اپنی اپنی جگہ ہل کر رہ گئے۔ اور ابھی واپس اپنی جگہوں پر سنبھل ہی نہیں پائے تھے کہ دو اجنبی شکل و صورت کے لڑکے دھڑ دھڑ کرتے بس کے اندر گھس آئے۔ ان کے انداز اور ہاتھوں میں دبی پستول نے لمحے بھر میں سب کو معاملہ سمجھا دیا۔

''سیدھے بیٹھو سب۔ خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔'' آواز تھی کہ نقارہ۔ عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ سڑک باہر ٹریفک سے بھری ہوئی تھی۔ گاڑیاں رینگ رہی تھیں۔ ذرا کی ذرا سرکتیں اور پھر رک جاتیں۔ ایسے میں کسی بس میں چیخ و پکار دوسروں کو متوجہ کر سکتی تھی؟ سامنے کھڑے اسلحہ بردار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ سے سامنے سیٹ پر بیٹھا بچہ دبوچ کر بغل میں دبایا۔ اور اس کے سر پر پستول کی نال ٹکائی۔

''جو کچھ بھی جس کے پاس ہے ایک منٹ میں نکال دو ورنہ.....'' اور اس ورنہ کے آگے بس میں موت والی ہی خاموشی تھی۔ علی نے وحشت سے بھری معصوم آنکھیں' معراج پر گاڑ دیں۔ اور ہولے سے پکارا.... ''بابا....'' اس کی آواز میں ایسی کراہٹ تھی کہ سب سے پہلے بتول ہی ہڑبڑا کر جاگیں۔

''اے بچے کو کچھ نہ کہنا بھیا۔ ہم دیتے ہیں' دے رہے ہیں سب۔'' آج بتول کی آواز دوسروں کے ساتھ ساتھ خود انہیں بھی اجنبی لگ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

بھرے پرے گھر میں کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ چلبلی رونقوں میں اب بے چینی کا عنصر دھیرے دھیرے سرایت کر رہا تھا۔ کئی ایک کے چہروں پر جھلکتی بے چینی بھانپ کر بھی سوہا نے دوسری بار نظر انداز کی لیکن کب تک۔ آخر تایا ابا ہی بول اٹھے۔

''ارے بھئی فون کرو ان لوگوں کو آخر اتنی دیر کیوں لگ گئی۔'' ان کی بارعب آواز' کمزوری میں بھی سب سے نمایاں تھی۔

''جی تایا ابا میں ابھی کہتی ہوں انس بھائی سے۔'' کھوئے کھوئے انداز میں مہمانوں اور خوش گپیاں کرتی لڑکیوں

کو دیکھتی ماہا کسی نیند سے جاگ کر چونکی اور باہر نکلی۔ سامنے ہی انس فون کان سے لگائے دوسری طرف شاید کوئی بات سن رہا تھا۔ لیکن ماہا کا اندازہ غلط نکلا۔ انس نے وہیں کھڑے کھڑے دو تین بار کال ملائی اور پھر مایوس ہو کر کاٹ دی۔

"معراج کے فون پر بیل جا رہی ہے۔ مگر کوئی ریسیو نہیں کر رہا۔" اس کا لہجہ سخت تشویش زدہ تھا۔

"ہو سکتا ہے راستے میں ہوں۔" وہ بولتی ہوئی آگے آئی اور امید افزا نظروں سے سوہا کو دیکھا۔

اس سے اسے جانے کیوں سوہا کی رنگت اڑی اڑی سی لگی۔ اس نے قریب جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔" سوہا چونکی۔ پھر نفی میں سر ہلا کر گہری سانس بھر کے بولی۔

"دیر ہوتی جا رہی ہے۔ کب وہ لوگ آئیں گے کب رسم ہو گی کب کھانا لگے گا۔ سب کو بھوک الگ لگ رہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔"

"پھر بھی۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ انس نے ایک بار پھر جھنجلا کر لائن کاٹی تھی۔

"مت بار بار کال کریں۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ پہنچنے ہی والے ہوں۔"

"اگر پہنچنے بھی والے ہیں۔ تو انفارم کرنے میں کیا حرج ہے۔" اب کے اس کا انداز بگڑا ہوا تھا۔

"چلیں چھوڑیں تھوڑی دیر اور دیکھ لیں۔ میں عفت کے پاس جا رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ اس کے پاس کوئی میسج وغیرہ آیا ہو۔" ماہا بولتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

عفت کو اس کی ایک دوست تیار کرنے کے لیے تھوڑی دیر پہلے ہی اوپر لے کر گئی تھی۔ ماہا کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی تیاری آخری مراحل سے بھی نمٹ چکی تھی۔ گہرے سبز کرتے اور چوڑی دار زرد پاجامے کے ساتھ سبز بھاری کامدار زرد دوپٹے کا زرتار آنچل لیتے اس پر آج کوئی انوکھا ہی روپ چڑھا تھا۔ ماہا کی جو اس پر نگاہ پڑی تو وہ پچھلی بات ہی بھول گئی۔

"ماشاء اللہ۔ کتنی حسین لگ رہی ہو تم عفت۔ واہ بھئی۔" اس کی پرستائش نظریں ان بولوں کی محتاج نہیں تھیں۔ اس کے لبوں سے اچانک پھوٹ پڑنے والی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک نے عفت کو احساس دلایا کہ بیوٹیشن جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ آئینہ بھی غلط نہیں تھا۔ وہ آج واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"ہائے اللہ کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے۔ میری جان کو۔" بہت آہستگی سے اس نے عفت کا شرمایا ہوا چہرہ تھوڑی سے اوپر اٹھا کر نگاہوں میں جذب کیا۔ انداز اتنا والہانہ تھا کہ عفت اپنا چہرہ جھکا کر ہنس دی۔

"آج تو معراج بھائی کی خیر نہیں۔ شرط لگا لو اگر آج ہی رخصتی کا نہ کہہ دیا نا! تو میرا نام نہیں۔ اور لگتا ہے آج تمہاری بھی خیر نہیں۔ چھوڑ کر نہیں جانے والے وہ تمہیں۔ بیٹا۔" اس کے انداز میں شرارت تھی۔ پاس کھڑی بیوٹیشن جوان لوگوں کی دوست بھی تھی کھلکھلا کر ہنس دی۔ ماہا نے اس کا ساتھ دیا۔

"کیا ہوا آ گئے وہ لوگ۔" ان لوگوں کے برعکس عفت کے چہرے پر ذرا فکر مندی جھلکی۔

"ابھی نہیں آئے۔ تم یہاں بیٹھو۔ اور ریلیکس رہو۔ زیادہ پسینہ نہ آئے۔ موسم بھی پتا نہیں کب ٹھیک ہو گا۔" ماہا اور بھی جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن عفت کا دل ان الفاظ پر اٹک گیا۔

"ابھی نہیں آئے۔ ابھی تک۔" اس کے اندر ایکا ایکی کچھ ڈوب کر ابھرا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہائے اور با۔ ایے کی رولا پے گیا سی۔" بتول اپنے خاص انداز میں واویلا کر رہی تھیں۔ ان کے کمرہ بھانت بھانت کے لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ سب ہی عورتوں کے ہاتھ کان اور گلے زیور سے' جبکہ مردوں کی جیبیں والٹ سے خالی تھیں۔

بتول کی حالت سب سے دگرگوں تھی۔ وہ باقاعدہ آنسوؤں سے روتی عفت اور تمام گھر والوں کو کوسنے دے رہی تھیں۔ قریب ہی زہرہ اور تبسم بیٹھی ہلکی ہلکی سسکیاں بھر رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے مردوں میں کچھ دیر پہلے وقوع پذیر ہونے والا واقعہ الگ الگ انداز میں زیر بحث تھا۔ کوئی شہر کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر شکوہ کناں تھا۔ تو کوئی چند دن پہلے ہی اسٹریٹ کرائمز میں اپنا موبائل گنوا کر بیٹھا تھا اور آج پھر۔

عورتیں بھی اپنے اپنے انداز میں تاسف سے ہاتھ مل رہی تھیں۔ زیادہ تر نے نقلی زیور پہنا تھا۔ اس لیے بتول کا زخم سب سے گہرا تھا۔ اس نے نہ صرف خود سونے کی چوڑیاں پہنی تھیں بلکہ متوقع سمدھیوں پر رعب جمانے کے لیے زبردستی بیٹیوں کو بھی اصلی زیور پہنایا تھا۔ بقول ان کے بارات اور ولیمے میں تو میچنگ کے نقلی زیور پہننے ہی ہیں۔ اس لیے عفت کے گھر والوں پر اپنی حیثیت (اپنے تئیں) کا رعب ڈالنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ تھا۔

غور طلب بات یہ تھی کہ ان سب کو اپنا اپنا زیور اپنے موبائل گھڑیاں اور پیسے کا غم ستا رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اس معصوم کی جان بچ جانے کا شکر ادا نہیں کر رہا تھا۔ جسے کچھ دیر پہلے ڈاکوؤں نے پستول کی نال پر رکھا ہوا تھا۔ کسی نے جھوٹے منہ بھی سب مادی اشیاء کو اس کی جان کا صدقہ نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی سمجھنے کو تیار تھا۔ سب کے نزدیک اپنا نقصان بڑا تھا اور بتول کا سب سے بڑا۔۔۔ کیوں کہ ان کے ہاتھ سے ان کا اپنا زیور ہی نہیں بلکہ ڈیڑھ تولے کا وہ قیمتی سیٹ بھی چلا گیا تھا۔ جو انہوں نے بے حد بدلی سے عفت کو چڑھانے کے لیے بنوایا تھا۔

"ہائے اللہ۔۔۔ میں کی کراں میں کتھے جاواں۔۔۔ ساری خون پسینے کی کمائی لے گئے۔ منحوس اللہ غارت کرے انہیں۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔" بیڈ کے سرہانے سے ٹیک لگائے ہائے وائے کرتے اسے کچھ خیال آیا اور وہ جوش سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"اور اللہ غارت کرے اس منحوس بخت ماری کو۔۔۔ جس نے میرے بیٹے کی ساری خوشیاں کھالیں۔ ارے بلاؤ اس جورو کے غلام کو اس کو ابھی بھی ہوش آیا کہ نہیں۔۔۔" تبسم اور زہرہ سے کہتے کہتے انہوں نے منہ کھولا اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت صرف کرکے معراج کو آواز دی۔

"معراج۔۔۔ معراج۔۔۔ ادھر آ۔۔۔ کہاں جا کے چھپ کر بیٹھ گیا۔ کم بخت۔۔۔" بتول کی آواز کسی نقارے کی طرح پورے گھر میں گونج گئی۔ معراج نے تھکے تھکے انداز میں کمرے میں قدم رکھا۔ ذرا دیر پہلے ہونے والے واقعے نے اسے سر تا پیر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بندوق کی نوک پر اپنے معصوم اکلوتے بیٹے کی جان دیکھ کر عفت سے محبت اور ساتھ نبھانے کے سارے وعدہ وعید دھڑام سے زمین بوس ہو گئے تھے۔ اس وقت ان لوگوں کے بس سے اترنے کے بعد معراج نے ہی ڈرائیور کو بس گھر کی طرف واپس موڑنے کو کہا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ اس لمحے کے گزر جانے کے بعد وہ نہ چاہتے ہوئے بتول کی باتوں میں حقیقت کی جھلک تلاش کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"ان کے گھر کی مصیبت تب تک ہے جب تک وہ وہاں ہے۔۔۔ جب وہ یہاں آئے گی تو اپنی نحوست ساتھ لائے گی۔ تم لکھ کر رکھ لو۔" اسے کسی دن کی کہی ہوئی ماں کی بات یاد آئی تھی اور وہ فقط اک آہ بھر کر رہ گیا تھا۔

"منہ بند کر کے کیا بیٹھ گیا ہے۔ میں کہتی ہوں ابھی فون کر۔ اور ابھی طلاق دے اس منحوس کو۔" معراج کو یوں جھکے سر کے ساتھ آتا دیکھ کر بتول بالکل آپے سے باہر ہو گئیں۔ حالانکہ لوٹا ماری شہر میں روز کا معمول تھا' مگر بتول کا ایمان تھا کہ ان پر آئی ہوئی ہر مصیبت کی پیچھے اس کی نئی نویلی بہو کا ہاتھ ہے۔ معراج نے سر اٹھا کر بے بس سے انداز میں تبسم کو دیکھا۔

"ہمیں کیا دیکھ رہے ہو۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں۔ اب تو کسی صورت یہ رشتہ آگے نہیں چل سکتا۔ ہمارا نہیں تو اپنے بیٹے کا خیال کر لو۔ جان جاتے جاتے بچی ہے اس کی آج۔" تبسم کی بات' معراج کے متزلزل خیالات میں تابوت کی آخری کیل کی طرح تھی۔ جو دل کو چیرتی ہوئی اندر تک اتر گئی تھی۔

"میں تو کہتی ہوں ہمیں راستے سے واپس آنے کے بجائے اسی وقت جا کر ان کے منہ پر رشتہ توڑنا چاہیے تھا تاکہ اس مصیبت کی منحوسیت کے بارے میں اس کے خاندان والوں کو بھی پتا چلتا۔" اس دم معراج کا موبائل فون ایک بار پھر بجنے لگا۔ انس کی ایک بار پھر کال آرہی تھی۔ جسے وہ کتنی دیر سے نظر انداز کر رہا تھا۔

"کس کا فون ہے۔" تبسم ایک دم چونکی ہو گئی۔

"اگر تیرے سسرال سے ہے تو ابھی اٹھا اور ابھی کے ابھی دو حرف بھیج اس پر۔" بتول کے منہ سے گالیاں بھی ساتھ ساتھ نکل رہی تھیں۔ معراج متذبذب سا ہو گیا۔

"رکو۔ رک جاؤ۔" تبسم ایک دم فیصلہ کر کے اٹھی اور اس کے ہاتھ سے سیل لے کر لائن کاٹ کر سیل آف کر دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ریسیو کرنے کی۔ نہ جواب دینے کی۔ اچھا ہے۔ کرنے دو انتظار۔ جس اذیت اور تکلیف سے ہم گزر رہے ہیں۔ اس کا تھوڑا سا مزہ وہ تو چکھیں۔" اس نے بات مکمل کر کے سیل واپس معراج کی گود میں پھینک دیا اور خود ماں کے پاس بستر پر بیٹھ کر پیر پسار لیے۔

"چل بھئی زہرہ کپڑے بدل اور چائے بنا کر لا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب جو ہونا ہے وہ ہماری مرضی سے ہو گا بس۔" معراج سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھا رہا۔ اس کے اندر ماں بہنوں سے اختلاف کی طاقت نہیں بچی تھی۔

☼ ☼ ☼

معراج کا فون آف ہو جانے کے بعد کسی بری خبر کا الارم سب ہی گھر والوں کے کانوں میں پوری قوت سے بجنے لگا تھا۔ پھر بھی یہ وقت جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کا تھا۔

"ہم سب سے کہہ دیتے ہیں۔ بتول آنٹی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ اس لیے وہ لوگ نہیں آرہے۔" تائی اماں اور چچی جان چہروں پر دنیا جہان کی پریشانی سمیٹے انس کو سن رہی تھیں۔ اس وقت اوپر والے حصے میں سوائے تایا ابو کے سب ہی افراد موجود تھے۔

"اور وہ جو لوگ رسم کرنے کے انتظار میں ہیں کب سے۔" چچی جان نے بمشکل خود کو اس حل کے لیے سنبھالا تھا۔

"آنٹی دیکھیں۔ اس وقت ہمیں نہیں پتا معاملہ کیا ہے۔ جب تک دوسری طرف بات نہیں ہو جاتی ہمیں۔ سب خیریت ہی رکھنی ہے اور دکھانی بھی ہے۔"

"اور ان شاء اللہ سب خیریت ہی ہو گی۔" سوہا کو انس کی بات آگے بڑھاتے ہوئے اپنی آواز خالی ٹین میں بجتے

کنکروں سے مختلف نہیں لگ رہی تھی۔
"اب یہ توکل ہی پتا چلے گا۔ فی الحال عفت کو لے کر چلیں۔ رسم اور کھانے سے فارغ کر کے سب لوگوں کو گھر بھیجیں اس کے بعد دیکھا جائے گا۔" اس نے بے حد عجلت میں بات سمیٹی اور عفت کا سر تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔
پتھر کا بت بنی عفت کے اندر اتنی بھی طاقت نہیں بچی تھی کہ اپنے رخساروں پر لڑھک آنے والا کاجل ہی پونچھ لیتی۔ سوہا اور ماہا خود اندر سے بے حد پریشان اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پاتیں۔ دل ہی دل خیریت کا ورد کرتیں اسے نیچے سب کے درمیان لے آئیں۔
رضوانہ اور تائی اماں تب تک انس کے ساتھ مل کر صورت حال سنبھال چکی تھیں۔ رسم کا آغاز ہوا۔ عفت سر جھکائے مٹی کی صورت کی مانند اپنے ہاتھوں پر لگتا ابٹن اور زبان پر گھلتے ذائقے کو محسوس کرتی رہی۔ آج ابٹن کا امنگوں بھرا زرد رنگ سیاہ اور مٹھائی کا ذائقہ تلخ لگ رہا تھا۔ جانے کیوں.....؟

☼ ☼ ☼

رات کا دوسرا پہر تھا۔ چاروں طرف چھائی خاموشی، تنہائی اور نیم تاریکی میں ایک اداس دل، سر جھکائے چپ چاپ اپنی دھڑکنوں میں زندگی تلاش رہا تھا۔
قریب ہی کہیں کوئی سرسراہٹ جاگی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ بالکل یوں لگا جیسے کوئی خوشبودار آنچل اس کے لیے اپنی نرم ہتھیلیوں میں کوئی عنایت دبائے نزدیک آیا۔
"چائے پی لیں.....

پانی لے لیں.....
ناشتا کرلیں.....
دودھ..... " وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے گہری سانس بھری اور تھک کر سر دوبارہ گھٹنوں میں گرا لیا۔
"کیوں وہ بازگشت میرا پیچھا نہیں چھوڑتی..... آخر کیوں..... میری سماعتیں۔ میری بصارتیں سب بھول کیوں نہیں جاتیں....." اس نے سخت اذیت سے بے بس ہو کر خود سے سوال کیا۔
"یا اللہ..... میری مدد کر..... مدد کر..... یا اللہ۔" وہ ٹوٹ رہا تھا۔ فریاد کر رہا تھا اور اس کی فریاد دور کھلے آسمان سے اوپر اور اوپر سفر کرتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کے دوسرے پہر کی خاموشی میں صرف سرگوشیاں زندہ تھیں۔ اندازے، قیاسے..... اور کبھی کبھی کوئی شکوہ نما کوسنا بھی.....
"بہت ہی بے غیرت لوگ ہیں۔ خدا جانے کیا سوچ کر یہ بیچ حرکت کی ہے انہوں نے۔"
"آخر اس سب کا مطلب کیا ہے بھئی..... اگر انہیں عفت کی رخصتی نہیں کرنی تو اس طرح ہمارا مذاق بنوانے کا مقصد.....؟ سیدھی کلیئر کٹ بات کیوں نہیں کرتے۔" ماہا ولید کے ساتھ واپس جا چکی تھی۔ اب وہاں صرف رضوانہ، سوہا اور انس جاگ رہے تھے۔ تایا ابو چونکہ صورت حال کی سنگینی سے لاعلم تھے۔ اس لیے دوا کے زیر اثر گہری نیند میں جا چکے تھے۔ تائی اماں کو سوہا نے ہی زبردستی نیند کی دوا دی تھی اور عفت.....
اپنے کمرے میں چت لیٹی کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورتی صرف عفت جاگ رہی تھی..... اسے انتظار تھا.....

کسی کے پیغام کا۔۔۔ کسی کی فون کال کا۔۔۔ بڑی شدت سے۔۔۔ بہت یقین کے ساتھ' مگر پتا نہیں کیوں۔ اسے یقین کیوں تھا اس میں شدت کیوں تھی۔ شاید یہ اس کی محبت کی شدت تھی۔ اس کی چاہت کا مان اور یقین تھا جو نکاح جیسے مقدس بندھن میں بندھ جانے کے بعد اس کا دل معراج کی طرف سے بدگمان نہیں ہونا چاہتا تھا۔

دل کی الگ آواز تھی۔ دماغ کی الگ اور اس کے دل کی آواز اس وقت ہر چیز پر بھاری تھی۔ اس کے وجود میں دھیرے دھیرے سرائیت کرتی مایوسی سے بھی بھاری۔۔۔ **دفعتا** "ارتعاش جاگا۔ اس کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی اور جیسے زندگی جاگ گئی۔ معراج کی کال آرہی تھی۔ اس کا یقین ضائع جانے سے بچ گیا تھا۔ اس نے لمحے سے بھی کم وقت میں کال ریسیو کی۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو معراج۔۔۔ میں بات کررہی ہوں عفت۔۔۔ آپ لوگ کیوں نہیں آئے۔۔۔ سب نے کتنا انتظار کیا اور۔۔۔ سارے لوگ جمع تھے۔ ان کو کتنی مشکلوں سے سنبھالا۔۔۔ آپ۔۔۔ کچھ تو بولیں چپ کیوں ہیں۔" اس کے اندر کی گھٹن کو رستہ ملا تو وہ یک دم بے قابو ہو کر بہتی چلی گئی جبکہ دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی۔

"آپ بولیں تو۔۔۔" چند لمحوں بعد اسے خود ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بولے جارہی ہے۔

"آئی ایم سوری عفت! میں۔۔۔ اب۔۔۔ اپنے اور تمہارے رشتے کو مزید نہیں چلا سکتا۔"

"کیا۔۔۔" عفت کا منہ کھل گیا۔ "کیا مطلب۔۔۔" اس کے لبوں سے فقط بے آواز الفاظ سرگوشی کی صورت نکلے۔ جنہیں معراج نے جانے کس طرح سن لیا۔

"آج ہم لوگ آہی رہے تھے تمہاری طرف۔۔۔" اس نے دھیمے لہجے میں سارا قصہ گوش گزار کردیا۔

"میں اب تک اپنی امی اور بہنوں کی ہر بات کو جھٹلاتا آیا ہوں اور میں اب بھی ان کی کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں لیکن۔۔۔" اس کی خاموشی عفت کو اپنی گردن پر رکھی لات جیسی ہی لگی۔ جس کا دباؤ مسلسل بڑھ رہا تھا۔

"لیکن آج جو لمحات علی نے میری آنکھوں کے سامنے موت کے سائے میں گزارے وہ میرے لیے بہت تکلیف دہ تھے۔ میں سب کچھ سہہ سکتا ہوں۔ ہر بات برداشت کرسکتا ہوں لیکن۔۔۔ اپنے بیٹے پر کسی معمولی تکلیف کا سایہ تک نہیں جھیل سکتا۔ کجا یہ کہ میں جانتے بوجھتے اسے کسی مستقل آزمائش کی نظر کردوں۔" وہ اتنا بے چارہ تھا نہیں۔ جتنا اس وقت بن گیا تھا۔ عفت کی آنکھوں سے چہرے پر اترتا کرب لمحہ بھر میں اپنا رنگ بدل گیا۔

"تو یوں کہیں نا! کہ آپ بھی اپنے گھر والوں کی طرح میرے وجود کو اپنے بیٹے کے لیے نحوست کا باعث سمجھتے ہیں۔" وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوئی۔ پچھلے چند گھنٹوں میں جھیلی گئی تمام تر اذیت اس وقت اپنی ذات کے دفاع کی کوشش میں اپنی موت آپ مرگئی۔

"میں ایسا نہیں سمجھتا پلیز۔۔۔ عفت میری بات کو سمجھو۔"

"آپ جو سمجھتے ہیں یا جو نہیں سمجھتے مجھے اس سے سروکار نہیں۔ آپ نے یہ کہنے کے لیے فون کیا کہ آپ مجھے چھوڑنا چاہتے ہیں گو کہ یہ آپ کا نہیں آپ کے گھر والوں کا فیصلہ ہے اور آپ مجبور ہوچکے ہیں' مگر معراج۔۔۔ اپنے اندر ہمت پیدا کیجیے۔ اپنے فیصلوں کی بندوق دوسروں کے کندھے پر رکھ کر چلانے کے بجائے اپنے ہاتھوں میں اٹھانا سیکھیے اور سنیے! میں بھی آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی یہ میرا فیصلہ ہے۔ میرے گھر والوں کا نہیں۔ جس گھر اور گھر والوں کی بربادی کی داستانیں' میرے قدم رکھنے سے پہلے مجھ سے منسوب کردی جائیں۔ ایسے گھر میں' میں قدم نہ ہی رکھوں تو بہتر ہے۔ اس لیے پلیز کل کے انتظار میں میرے گھر والوں کو لمحہ لمحہ موت دینے کے بجائے آپ ایک بار ماردیجیے اور مجھ سے اپنی جان چھڑالیجیے۔" اس کی بات ختم ہوئی چند لمحے دوسری طرف

خاموشی رہی۔
"میں تم سے الگ نہیں ہونا چاہتا عفت.... "معراج کی آواز میں عجیب دم توڑتی بے بسی سی تھی۔
"لیکن آپ مجبور ہیں.... یہی نا.... "عفت کو لگتا تھا یا تو آج وہ ختم ہوجائے گی یا یہ الفاظ.... بے رحم.... بے مروت....
"عفت میں.... میں تمہیں.... "اس نے چٹانوں کی سی سختی سے اس کی بات سنی۔ پھر فون بند کر کے سیدھی اپنے باپ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ تائی اماں اور تایا ابو گہری نیند سو رہے تھے البتہ اس نیند کے پرسکون ہونے کے بارے میں وثوق سے کہا نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے دھیرے سے دروازہ بھیڑا اور سیڑھیاں پھلانگتی اوپر آئی۔ سامنے ہی وہ دونوں رضوانہ سے دھیمی آواز میں کوئی بات کررہے تھے اسے اوپر آتے دیکھ کر تینوں ہی متوجہ ہوئے۔ وہ بے حد خاموشی اور سنجیدگی سے نزدیک آکر کھڑی ہوئی۔ انس، سوہا اور رضوانہ نے اپنے اپنے دل میں اس کی تسلی کے لیے الفاظ ترتیب دیے لیکن اسی وقت عفت کے لب کھلے اور زندگی کی ہر ترتیب الٹ گئی۔
"معراج کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے طلاق دے دی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"کیا.... "اس کی آواز کسی چیخ سے مشابہ تھی۔ کپڑے پریس کرتی مزنہ نے بے اختیار مڑ کر اسے دیکھا۔ پھر تیزی سے ڈبڈباتی اس کی آنکھوں کو۔
"یا اللہ خیر.... "کام ادھورا چھوڑ کر وہ تیزی سے اس کی طرف آئیں۔ جو فون بند کر کے صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے سمجھ میں نہ آتا ہو کہ اب کرے تو کیا کرے۔
"کیا ہوا ماہا!"انہوں نے وقتی ہمدردی جیسے کسی عارضی جذبے سے مغلوب ہو کر اس کا کندھا تھاما۔ ماہا نے اسی طرح خالی، لیکن آنسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ پھر ان کے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔
"پانی لے کر آؤ۔" قریب کھڑی ملازمہ کو انہوں نے جلدی سے منظر سے ہٹایا۔ جب تک ملازمہ پانی لائی ماہا نہ صرف خود کو سنبھال چکی تھی بلکہ مزنہ کو عفت کی طلاق کی خبر بھی سنا چکی تھی۔
"یہ تو بہت برا ہوا بے چاری لڑکی کے ساتھ۔ وہ بھی عین شادی والے دن.... "ان کے انداز میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ ماہا نے پانی کا گلاس لے کر لبوں سے لگالیا۔ مزنہ چونک کر اس سے بولیں۔
"تمہیں وہاں جانا چاہیے۔ پتا نہیں کیسے حالات ہیں۔ تمہاری اپنی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سوہا اکیلی پڑ گئی ہوگی۔" ماہا خود کو سنبھال کر اب سمجھ داری سے سرہلا رہی تھی۔ مزنہ کے کہنے پر خود کو ہر طرح کی صورت حال ہینڈل کرنے کے لیے تیار کرتی ہوئی اٹھی اور کمرے میں آکر حسیب کو ساری بات سنائی۔
"آپ پلیز۔ ولید سے کہیں مجھے وہاں لے چلیے.... "حسیب کے چہرے پر چھائی فکر مندی، ماہا کے لیے بڑی ڈھارس تھی۔ اسے قوی امید تھی کہ خوشی کے موقع کو یوں غم میں بدلتا دیکھ کر وہ اپنی بے تکی راگنی نہیں الاپے گا۔ لیکن....
"لیکن سوال تو یہ ہے کہ تم وہاں جاکر کروگی کیا.... جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا۔ "اس کا انداز ایکا ایکی اتنا بدل گیا اس قدر لاپروا اور بے نیاز کہ ماہا کو لگا اس کے سامنے کوئی نیم پاگل شخص بیٹھا ہے جیسے کسی حادثے کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی غم، خوشی، حیرت، تعجب کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔
بالکل ایسا ہی اس وقت تایا ابا کے سامنے بیٹھی عفت کو لگا۔ جن کے بوڑھے چہرے پر آنسو بنا کسی رکاوٹ کے

یوں بہہ رہے تھے۔۔۔ کہ ان کو بالکل اپنا ہوش نہیں تھا۔ سیدھے ہاتھ کی طرف بیٹھا انس مستقل ان کا ہاتھ سہلا رہا تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں میں ان کا کمزور ہاتھ دبایا ہوا تھا۔ وہ بار بار تھوک نگلنے کی کوشش کرتے اور لفظ محض چند غوں غاں سے زیادہ سفر نہیں کرپاتے۔ عفت کو ان کی حالت سے بے اختیار بہت خوف آیا۔

"ابا۔۔۔ ابا۔۔۔ میں بہت خوش ہوں۔۔۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ ابا۔۔۔ میری بات کا یقین کریں۔" کسی اندرونی جذبے سے خوف کھا کر اب کی بار وہ بولی تو اس کی آواز معمول سے قدرے بلند تھی۔ سپاٹ اور انجانی سی۔

"میں نہ بھی کہتی تب بھی وہ لوگ اب نہیں ماننے والے تھے۔ انہوں نے یہی کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ میری امی اور بہن کل سامان واپس کرنے آئیں گی۔ میں نے خود انہیں انکار کیا۔ ہم۔۔۔ ہم کوئی سامان کے بھوکے تھوڑی نہ تھے۔ انسان کو عزت اور خوشی چاہیے ہوتی ہے اور وہ لوگ یہ دونوں ہی چیزیں دینے کو تیار نہیں تھے۔" اس کا لہجہ شدید بے بسی سے بھر گیا۔ انسان کی زندگی کا ہر ہر فیصلہ کتنے لوگوں' رشتوں اور ان کے جذبات سے جڑا ہوتا ہے۔ آج اندازہ ہو رہا تھا۔

وہ ان کو دکھ سے بچانے کی خاطر خود کو مطمئن اور خوش دکھانے کی خاطر جس طرح کی باتیں کر رہی تھی جھکی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ ٹٹولتا انس اپنا دل چھلنی ہوتا محسوس کر رہا تھا اور یہ بھی کہ وہ کتنی مضبوط تھی۔ دوسرے کمرے میں پھیکے پھیکے نیر بہاتی تائی اماں کے پاس سوہا اور رضوانہ بیٹھی کم و بیش اسی طرح کی باتیں کر رہی تھیں۔

"مجھے خود بتایا ہے عفت بیٹی نے۔۔۔ ماں بہنوں کی باتوں میں آکر ہر بات کا ذمہ دار عفت کو ٹھہرا دیا تھا۔"

"کیا فائدہ تھا ایسے لوگوں میں جانے کا تائی اماں۔۔۔ شکر ہے اللہ نے بڑے وقت پر بچا لیا۔ کیا پتا کل کو کیا کہہ دیتا کہ کوئی ایک دو دن کی بات تھوڑی تھی۔ کب تک یوں الٹے سیدھے الزام اپنے سر لے کر بیٹھتی عفت۔۔۔ وہ لوگ تو اسے زندہ لاش بنا کر رکھ دیتے۔۔۔ بس خدا کا شکر ادا کریں جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔" سوہا نے بے حد محبت سے ان کا چہرہ صاف کیا۔

"پر میری بچی پر تو داغ لگ گیا نا! لوگ کیا کہیں گے۔ اور آج ابھی۔۔۔ مغرب تک سب آنا شروع ہو جائیں گے۔ یہ سب سامان۔۔۔ اتنا کچھ۔۔۔ کیسے۔۔۔" ذہنی بے ربطگی کی وجہ سے وہ کھل کر اپنی بات بھی نہیں کہہ پا رہی تھیں۔

"جب اللہ نے داغ لگانے والا دیا ہے نا' تو اسے مٹانے والا بھی وہی دے گا۔ ان شاءاللہ۔" اس کے لہجے میں اتنا یقین اور اطمینان تھا کہ وہ اور رضوانہ دونوں ہی چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"اور یہ کوئی اتنی انوکھی بات نہیں۔ لڑکیوں کے رشتے' منگنیاں' نکاح ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہر بات میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔ شکر ادا کریں کہ ابھی صرف نکاح ہی ہوا تھا۔" رضوانہ نے انہیں خود سے لگا رکھا تھا۔

"اور آپ ہمارا اعتبار کریں۔ یہ معاملہ بگڑا ہے نا! اس صورت حال کو ہم لوگ سنبھال لیں گے۔ سب کچھ سنبھال لیں گے۔ آپ صرف تایا ابا کو دیکھ لیں جا کر۔۔۔ عفت کو دیکھیں کتنی سمجھ داری سے ان کو حوصلہ دے رہی ہے۔ عفت کے بعد صرف آپ ہی صحیح معنوں میں تایا ابا کی دل جوئی کر سکتی ہیں۔۔۔ اٹھیں اور جا کر انہیں احساس دلائیں کہ جو ہو گیا شاید اسی میں سب کی بہتری تھی۔۔۔ آئیں چلیں۔۔۔"

عین بارات والے دن طلاق کا مژدہ مل جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی' لیکن عفت نے بہت جلدی اس حقیقت کو قبول کیا تھا کہ اب اگر اس ساری صورت حال کو کوئی مزید بگاڑ یا سنوار سکتا ہے' تو وہ ہے اس کا اپنا رد عمل اگر وہ خود ہی جاہل عورتوں کی طرح اپنے اجڑنے کا بین ڈال دیتی تو منظر یقیناً "مختلف ہوتا۔ اب جو منظر تھا یہ بھی مختلف ہی تھا مگر اس کی آنکھوں کو اتنا ناگوار نہیں لگ رہا تھا۔ جتنا معراج اور اس کے گھر والوں کو منت سماجت کرتے اپنے ماں باپ کو دیکھ کر لگتا۔ اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور کٹھن فیصلہ اس نے نہ صرف چند لمحوں میں کیا

تھا بلکہ اب اس فیصلے کو بڑی ہمت سے نبھا بھی رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اماں اور ابا کے علاوہ باقی سب اس کا سنجیدہ چہرہ اور سمٹا ہوا انداز دیکھ کر خود بخود یہ طے کر چکے تھے کہ جو ہو چکا ہے اس پر رو پیٹ کے شور مچانے کے بجائے انہیں آنے والے وقت سے نمٹنے کی تیاری کرنی ہے۔

"مجھے پتا ہے ابا' میرے لیے بہت مشکل وقت ہے۔ آپ کے لیے بلکہ سب کے لیے' لیکن اللہ نے یہ مشکل وقت ہم پر ڈالا ہی اس لیے ہے کہ ہمیں آنے والے مزید مشکل وقت سے بچا سکے...." اماں کو آج دیکھ کر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ان کی آنکھیں نم' چہرہ سوجن کا شکار' لیکن انداز کسی قدر ٹھہرا ہوا تھا۔

"چھوڑیں جی۔ ناقدروں کی خاطر اپنی طبیعت خراب نہ کریں۔ اللہ کا شکر ہماری بیٹی میں کیا کمی ہے۔ اللہ خود ہی کوئی بہتر راہ نکالے گا۔" عفت اماں کو جگہ دینے کے لیے کھڑی ہوئی تو سوہا سے پانی پینے کا کہہ کر کمرے سے نکلی اور دوسرے کمرے میں آکر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"ہماری بیٹی میں کیا کمی ہے۔" الفاظ کی بازگشت اس کے اطراف چکرا کرا سے توڑنے لگی تھی۔ اس کے اندر جمع ہوتے غبار نے سانس کی آمد و رفت مشکل بنا رکھی تھی۔ اب ضروری تھا کہ اس غبار کو نکلنے کے لیے کوئی روزن دے دیا جاتا۔ ورنہ....

☼ ☼ ☼

ولید اس بار اس کے ساتھ گھر کے اندر تک نہیں آیا تھا بلکہ ماہا کے کہے بغیر ہی دروازے سے پلٹ گیا تھا۔ آج بھی اس نے خود ہی ماہا کو گھر لے جانے کی بات حسیب کے سامنے چھیڑ دی تھی اور اب کی بار ماہا نے گاڑی سے اترتے ہوئے پہلی بار ولید سے نرمی سے بات کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ وہ واقعی دل سے اس کی مشکور تھی کہ اس نے حسیب سے خود ہی ماہا کو گھر لے جانے کی بات کر لی۔ ورنہ حسیب جس موڈ میں تھا اور جس قطعیت سے انکار کرنے چلا تھا اس کے بعد ماہا کبھی اپنی انا کو جھکا کر ولید سے درخواست نہ کرتی۔

ولید نے اس کے شکریے کا جواب فقط ایک سچی اور سادہ مسکراہٹ سے دیا تھا۔ گھر کا ماحول اس کی توقع کے بالکل خلاف بے حد نارمل تھا۔ وہ جو دل ہی دل میں روتے دھوتے گھر والوں اور ناس پیٹوں جیسی مکالموں کو سننے کی تیاری کر کے آئی تھی راستے بھر بھرے بھرے دل کو تسلیاں کراتی آئی تھی۔ اس وقت حیرت زدہ رہ گئی جب عفت نے ہی سب سے پہلے اسے دیکھا اور پھر بے حد معمول کے سے انداز میں اطلاع دی۔

"ماہا آگئی ہے۔" گو کہ اس کا انداز قدرے بجھا ہوا اور بے حد سنجیدہ تھا' لیکن اس کے چہرے پر سوگ کی وہ کیفیت رقم نہیں تھی جس کا سوچ سوچ کر ماہا کا دل گھٹنوں سے بیٹھا جا رہا تھا۔

"بس یوں سمجھ لو.... حادثات کا بھی ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور وہ جس قدر وقت پر وقوع پذیر ہوں۔ اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔" چائے کے مگ سے گھونٹ گھونٹ چائے پیتی یہ عفت وہ نہیں تھی۔ جسے وہ سالوں سے جانتی تھی۔ رحم دل' بامروت' نرم رو.... یہ کوئی اور ہی عفت تھی سخت دل' اذیت پسند' حقیقت و آگہی پرست.... ماہا اس کے سامنے ضبط کرتے کرتے بھی جانے کیا سوچ کر سسک پڑی۔

"کیوں رو رہی ہو پاگل.... مجھے دیکھو میں کتنی مطمئن ہوں۔ ان کے انداز بہت دن پہلے ہی بدل گئے تھے۔ ماہا...."

ماہا نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر حیرت سے پوچھا۔

"بہت دن پہلے...."

"ہاں.... میری فون پر بات ہوئی تھی نا! وہ اپنی امی اور بہن کی کسی بات کو غلط نہیں کہتے تھے اور اگر میں غلط کہتی تھی تو مجھ سے الجھ جاتے تھے۔ ابھی تو میری رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی اور انہیں مجھ سے اختلافات ہو گئے تھے۔"

"اور وہ جو انہوں نے نائلہ کی ڈیتھ کے بعد اسٹینڈ لیا تھا۔ اپنی اماں اور بہنوں کے خلاف جاکر۔ آئے تو تھے یہاں شادی کی ڈیٹ فکس کروانے کے لیے۔" اس نے سوں سوں کرتے ناک اور چہرہ صاف کیا۔

"وہ غلبہ تھا کسی وقتی جذبے کا۔۔۔ کیوں کہ ان کے نزدیک ان کی زندگی میں پہلے سے موجود رشتوں کی اہمیت مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔ میری نحوست کے سائے کی وجہ سے ان کے دل میں ان رشتوں کو کھودینے کا ڈر تھا۔ ان کے خیال میں ان کے خاندان پر اور ہمارے یہاں آنے والا سارا برا وقت میری وجہ سے تھا۔ اس لیے جب انہیں مجھ میں اور اپنے خون کے رشتوں میں سے کسی ایک کو چننا پڑا تو انہوں نے حقیقی رشتوں کو چن لیا۔" ماہا اس کی بات کے جواب میں کتنی ہی دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی سطح اب تک نم تھی۔ وہ یقیناً" روئی ہوگی' لیکن اب نہیں رونا چاہتی تھی۔

"اور۔۔۔ اور آج رات کا فنکشن' مہمان' کھانا اور۔۔۔" اس کے لبوں سے اٹک اٹک کر بات نکل رہی تھی۔

"سب کینسل کروا دیا ہے۔ انس نے۔ فی الحال اصل بات کسی کو نہیں بتائی' لیکن شادی ملتوی ہونے کی خبر سب کو پہنچا دی ہے۔" سوہا اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھی۔

"لیکن لوگ اتنی آسانی سے کہاں مانتے ہیں۔ دیکھنا رات میں سب ہی آئیں گے شادی ملتوی ہونے کا افسوس لے کر نہیں بلکہ ٹوہ لینے کے لیے۔۔۔" ماہا کے دل کسی طور قرار نہیں پا رہا تھا۔

"آنے دو۔ جب آئیں گے ہم دیکھ لیں گے۔ لو تم ناشتا کرو۔۔۔ اور یہ بتاؤ۔۔۔ حسیب بھائی کچھ کہہ تو نہیں رہے تھے۔" سوہا کا انداز بے حد سرسری تھا' لیکن ماہا کی تو کسی نے دم پر پیر رکھ دیا۔

"اونہہ۔۔۔ ان کی کیا بات کروں۔ بالکل ہی الٹا دماغ چل رہا ہے آج کل۔" گھر کے ماحول سے اس ناخوش گوار واقعے کا اثر زائل کرنے کے لیے وہ خود ہی جوش و خروش سے حسیب کے عجیب و غریب رویے کی طرف مڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

رات کے گہرے پڑتے سایوں میں وہ بے یقینی سے انس کے الفاظ دل ہی دل میں دہرا رہا تھا۔ جو اس نے صبح ہی صبح کال کر کے اس سے کہے تھے۔

"عفت کی رخصتی نہیں ہو رہی۔ رات کو کسی وقت معراج نے فون پر اسے ڈائیورس دے دی۔" اس کا لب و لہجہ بے حد افسردہ تھا۔ حدید کو کتنی ہی دیر اس وقت بھی یقین نہیں آیا۔ وہ بولا تو اتنی دیر ہو چکی تھی کہ دوسری طرف موجود انس لائن کاٹنے ہی والا تھا۔

"اچھا نہیں ہوا۔۔۔" اس کی آواز بے حد دھیمی اور الفاظ سرسراتے ہوئے تھے۔ انس گہری سانس بھر کے رہ گیا۔ یہ تک نہیں کہہ سکا کہ "یہ تو وقت بتائے گا کہ کس کے لیے اچھا ہوا اور کس کے لیے نہیں۔۔۔"

"خالہ اور خالو جان کی طبیعت ٹھیک ہے۔" پوچھنا تو وہ کچھ اور چاہتا تھا' مگر یہ مصلحتیں۔۔۔

"ٹھیک ہیں سب۔۔۔ اور عفت بھی۔۔۔" حدید کو جواب مل گیا اور بات ختم ہو گئی۔ اب آگے کیا پوچھے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"تمہیں کوئی بات کرنی تھی مجھ سے۔ سوہا نے بتایا تھا۔"

"ہاں وہ۔۔۔" اس کے اعصاب بوجھل سے ہو گئے۔

"کرنی تو ہے۔ تمہیں فرصت ملے تو۔۔۔"

"ٹھیک میں کل آؤں گا۔۔۔ پھر اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔۔۔ ایک ضروری بات مجھے بھی کرنی ہے تم سے۔۔۔"

"مجھ سے... کس بارے میں..."

"تمہاری آگے کی زندگی کے بارے میں... تمہارے اور عفت کے بارے میں۔" حدید خاموش رہ گیا۔ اس نے تو عرصہ ہوا کوس کتنے چھوڑ دیے تھے۔ تو کیا... تقدیر اسے دوبارہ ان ہی راستوں پر لے جانا چاہتی تھی۔ جبکہ دوسری طرف کمرے میں داخل ہوتی سوہا نے انس کی آخری الفاظ سن لیے تھے۔ جب ہی گرم گرم چائے کا مگ لے کر انس کے سامنے آئی تو خوشبودار بھاپ کے عقب میں اس کے چہرے پر خوش گوار یت پھیل چکی تھی اور لب کسی اشارے کو بھانپ کر مسکرا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

سب کی باتیں سن کر' عفت کو مطمئن اور تایا ابا اور تائی اماں کو سنبھلا ہوا دیکھنے کے بعد بھی اس کے دل میں گڑی ایک پھانس مسلسل چبھن پیدا کرتی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ رات جب وہ حسیب کی بانہوں کے حصار میں آئی تو جانے کیوں اشکوں کے چند شفاف موتی پلکوں سے ٹوٹ کر اس کے گریبان میں جذب ہو گئے۔

"عفت کے ساتھ اچھا نہیں ہوا حسیب... قدرت کیوں یہ ناانصافی کرتی ہے لوگوں کے ساتھ۔ جو سب کے ساتھ اچھے ہوتے ہیں۔ ان ہی کے ساتھ برا کیوں ہو جاتا ہے۔"

"یہ ناانصافی قدرت نہیں۔ انسان ہی کرتے ہیں۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ۔" اس نے دلگرفتی سے سر ہلایا۔

"اچھا ادھر دیکھو میری آنکھوں میں..." اس نے محبت سے ماہا کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"تم نے اس سارے واقعے سے' ان ساری باتوں سے کوئی سبق بھی سیکھا یا صرف ٹسوے بہا کر گھر چلی آئیں۔"

"کیا مطلب..." وہ بے وقوفوں کی طرح پوچھنے لگی۔ حسیب نے ماتھے پر ہاتھ مارا پھر اسے اپنے برابر میں بٹھا لیا۔

"گھر والے مشکل میں تھے۔ تم ان سے ملیں۔ انہیں تسلی دی۔ انہیں یقیناً" اچھا لگا ہو گا۔ سب گھر والے مشکل میں ایک ساتھ ایک جگہ' ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لیے موجود تھے نا۔" ماہا نے سر ہلایا۔

"اور اگر فرض کرو۔ تمہاری امی یا تائی اماں اس بات کو سہار نہیں پاتیں۔ ان کی طبیعت خراب ہو جاتی اور میں تمہیں گھر جانے نہیں دیتا۔ تو تم پر کیا گزرتی..." ماہا کا دل سہم کر رہ گیا۔

"اللہ نہ کرے... میں تو مر ہی جاتی۔" وہ ایک بار پھر رونے کو تیار تھی۔

"تو جب تم... اپنے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں اس قدر حساس ہو۔ اتنا محسوس کر سکتی ہو۔ تو ولید کے بارے میں کیوں نہیں..." ماہا ساکت رہ گئی۔ اس کے آنسو' وجود اور سانس سب رک سا گیا۔

"تمہارے پاس بہت سے رشتے ہیں۔ اللہ کا شکر... اس کے پاس صرف ایک تھا... میں' اس کا باپ... اور تم چاہتی تھیں کہ وہ موت اور زندگی کی کشمکش میں پھنسے ہوئے اس ایک رشتے کو بھی چھوڑ دے۔" حسیب کی آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔ پھر بھی ماہا کو نقارے سے کم نہیں لگی۔

"تم چاہتی تھیں کہ میری حالت سے بے نیاز جہاں جیسی کنڈیشن میں بھی ہے۔ جتنا بھی پریشان ہے وہیں رہے بس' یہاں نہ آئے۔ دل پہ ہاتھ رکھ کر کہو۔ کیا یہ بالکل وہی حرکت نہیں تھی۔ جو پچھلے چند دن میں تمہارے ساتھ کرتا رہا۔ کتنی تکلیف محسوس کی تم نے... کتنا دکھ پہنچا تمہیں میرے رویے سے پہنچایا نہیں۔" ماہا نے بجھے دل سے سر ہلایا۔

"تو پھر... جب تم اپنے دل میں اپنے گھر والوں کے لیے درد محسوس کر سکتی ہو تو کسی اور کے دل میں اس کے گھر والوں کا درد محسوس کیوں نہیں کر سکتیں اور اگر واقعی نہیں کر سکتیں تو اس کا مطلب کہ تم نہ صرف خود غرض بلکہ بے حس بھی ہو۔" ماہا نے یک دم خفگی سے اسے دیکھا۔

"میں نہ خود غرض ہوں اور نہ بے حس..." حسیب نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے صرف بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔ ماہا نے سر جھکا لیا۔

"لیکن میں جانتا ہوں۔ میری پیاری بیوی نہ صرف بہت حساس ہے بلکہ ایک بہت خوب صورت محبت بھرا دل رکھنے والی بھی ہے... ہے نا!" حسیب نے اس کا جھکا ہوا سر دیکھ کر اسے بازو کے گھیرے میں سمیٹ لیا۔ ماہا نے اس کے کندھے سے سر ٹکا لیا۔ اور چند لمحوں بعد دھیرے سے بولی۔

"میں جانتی ہوں آپ نے یہ بات کیوں کی... شکریہ!"

"شکریہ... کس بات کے لیے۔" حسیب نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ایک مردہ احساس کو 'بے حد خوب صورت انداز میں میرے اندر جگانے کے لیے۔"

"ہم... م... م..." حسیب نے دھیرے سے اسے سمیٹ لیا۔

"آپ فکر مت کریں۔ میں اسے روک لوں گی۔" نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے اس کے آخری الفاظ خود اسی کو شانت کر گئے۔ حسیب مسکرا رہا تھا۔ ابھی اسے یہ بھی بتانا تھا کہ اس کی پلاننگ میں انس اور سوہا بھی شامل تھے۔ جو فون کر کے اسے گھر آنے کے لیے اکسا تی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا بات کر رہے ہو تم۔" انس کے گمان میں کوسوں دور تک یہ بات نہیں تھی نہ ہو سکتی تھی جو حدید کہہ رہا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اسے کتنے وقت تک تو حدید کا چہرہ دیکھ کر خود کو یقین دلانا پڑا کہ حدید جو بھی بات کر رہا ہے پورے ہوش و حواس میں کر رہا ہے۔

"میں بالکل ٹھیک سو فیصد سچ بات کر رہا ہوں۔ انس... اور میں خود کس طرح تم سے یہ بات کرنے کے لیے خود کو تیار کر پایا ہوں۔ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔" انس نے بے اختیار اس کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ حدید نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ انس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔ تسلی دے تو کن الفاظ میں۔ تائید کرے تو کس بنیاد پر۔ اور تردید کرے تو کس طرح...

"وہ نائلہ کو ایسے گالیاں دے رہا تھا جیسے پتا نہیں کب سے دیتا رہا ہو۔ اور پھر اس نے نائلہ کو دھمکی دی کہ تیری یادداشت واپس لاؤں... " سختی سے میچی ہوئی آنکھوں پر ہاتھ رکھے کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے وہ بے حد دھیمے انداز میں دبے ہوئے لبوں سے بات کر رہا تھا۔ انس کا ساکت وجود کوئی حرکت کرنے سے لاچار ہو گیا۔ حدید کے لیے بھی مزید بولنا شاید ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ یونہی اپنا چہرہ چھپائے خود پر ضبط کرتا رہا۔ پھر دونوں کے درمیان گہری ہوتی خاموشی کو محسوس کر کے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں بے انتہا سرخ اور نم تھیں۔

"کیا کہوں میں... بولو... کیا سمجھوں میں... اس بات سے... میں نے اس کا فون بھی دیکھ لیا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ نہ کوئی کال ہے نہ کوئی میسج ہے۔ نہ وہ کہیں جاتی تھی نہ کسی سے ملتی تھی پھر... وہ... وہ شخص کیوں..." اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ انس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"بس حدید بس۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تمہاری بات سو فیصد سچ ہے مگر میں اس کو بالکل جھوٹ بھی نہیں کہہ رہا۔ ... سمجھ دار مرد ہو اور مجھے تم پر بھروسا ہے، لیکن یہ سوچو کہ جس کے بارے میں کہہ رہے ہو وہ اب اس دنیا میں

نہیں ہے' مگر جب وہ اس دنیا میں تھی۔ تب بھی تمہاری عزت تھی جو ہو گیا اسے بھولنے کی کوشش کرو اور ان سوالوں میں خود کو مت الجھاؤ' جن کے جواب تمہاری الجھنوں کو اور بڑھا دیں اور تمہیں کسی قسم کی شرمندگی سے دوچار کر دیں۔"

"لیکن..... انس یار..... کسی کی جان چلی گئی۔"

"جان چلی گئی جواب واپس نہیں آسکتی تو پھر فائدہ۔ اس لیے جس چیز پر اللہ نے پردہ ڈال دیا اسے بے پردہ مت کرو۔" اس نے بات مکمل کر کے حدید کا چہرہ دیکھا اس کی سرخ آنکھوں میں نمی کی تہ بڑھ رہی تھی اور چہرے پر بے تحاشا کرب انگیز کیفیت..... انس نے اپنے دونوں ہاتھ حدید کے شانوں پر جما دیے۔

"ان دروازوں کا بند رہنا ہی بہتر ہوتا ہے میرے بھائی۔ جن کے کھلنے پر ہمیں اندھیروں کے سوا اور کچھ نہ ملے اور ہم اس اندھیرے میں راستہ ڈھونڈنے کے چکر میں خود کو کسی گڑھے میں گرا بیٹھیں۔" حدید نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔

"چھوڑ دو اللہ پر۔ ہر معاملہ اور نکال لو خود کو اس فیز سے۔ وہ جب تک تمہاری تھی۔ تمہاری وفادار رہی بس یہ یاد رکھو اور زندگی کے سفر میں آگے کی جانب دیکھو۔ ابھی بہت زندگی باقی ہے اور زندگی ایک نعمت ہے۔ کوئی بے کار شے نہیں۔ جسے یوں خود کو بے کار کے واہموں میں الجھا کر ضائع کیا جائے۔"

گو کہ حدید کی اس بات نے اس کا اپنا دل بھی کافی بجھا دیا تھا' مگر اس وقت وہ وہاں اپنے بھائی کا حوصلہ بڑھانے اسے زندگی کی طرف واپس موڑنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اسے خود کو بشاش دکھانا ہی تھا اس لیے زبردستی مسکرا کر اسے اٹھاتے ہوئے بولا۔

"چلو باہر آؤ۔ سوہا چائے بنا رہی ہے۔ مل کر پیتے ہیں اور بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہیں۔" حدید اپنی کیفیت سے نکلا یا نہیں' لیکن انس کی بات سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔

☆ ☆ ☆

چند گھنٹوں کے بعد اس کی فلائٹ تھی۔ بیرونی ملک روانگی کے لیے اور وہ اکیلا ہی کب سے کمرے میں گھسا' پیکنگ میں مصروف تھا۔ سکڑے ہوئے ہونٹ' سلوٹ زدہ پیشانی اور مایوس آنکھوں کے ساتھ وہ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف تھا۔ گزرے ہوئے دن کسی فلم کی مانند اس کے ذہن میں ایک کے بعد ایک جگہ لیتے جا رہے تھے۔ بار بار اس کا دھیان بھٹک جاتا۔ کام رک جاتا اور وہ کسی ایک زاویے پر جہاں کی تہاں رک کر سوچ میں گم ہو جاتا۔ یونہی کھڑے یا بیٹھے بیٹھے کوئی دھیان گھومتا پھرتا۔ اسے حال میں واپس لاتا تو اٹھ کر پھر سے سامان سمیٹنے لگتا۔ ایسے میں دروازے پر ابھرنے والی آواز پر وہ کرنٹ کھا کر پلٹا تھا۔

"ولید....." وہ دہلیز پر کھڑی تھی اور شاید پہلی بار اس کا نام لے کر اتنی نرمی سے اسے پکارا تھا۔ وہ پلٹا ضرور' لیکن بے حد ساکت وجامد تاثرات کے ساتھ۔

"تم جا رہے ہو۔" وہ یونہی بولتے ہوئے اندر آئی۔ ولید کے ساکت وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے دھیرے سے ہنس کر رخ موڑ لیا۔

"جی..... واپس تو جانا ہی تھا۔" ماہا اسے بغور دیکھتی نزدیک آکر کھڑی ہوگئی۔ اسے اپنی بات کرنے میں بے حد مشکل پیش آرہی تھی۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اسے اپنے سے فقط چند سال چھوٹے اور ایک سمجھ دار لڑکے کے سامنے نہ صرف گزشتہ رویے کی معافی مانگنی تھی بلکہ اپنی شرمندگی کا اظہار بھی کرنا تھا اور پھر اسے روکنا بھی تھا۔ وہ ذرا سا کھنکاری پھر بات شروع کی۔

"حسیب چاہتے تھے کہ تم نہ جاؤ۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ میں خود بھی نہیں جانا چاہتا تھا لیکن۔۔۔ کبھی کبھی ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔۔۔" وہ رخ موڑے بیگ میں جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر پلٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک امپورٹڈ چاکلیٹ تھی۔

"یہ لیں۔ میری فیورٹ چاکلیٹ۔۔۔" اس نے ریپر کھول کر اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کس خوشی میں۔۔۔" وہ اس کے دوستانہ انداز سے ذرا ریلیکس ہو کر اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی اور چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا۔

"آپ نے پہلی بار میرا نام پکارا اور وہ بھی اس قدر نرمی سے۔۔۔ اسی خوشی میں سمجھ لیں۔" ماہا ایک دم ہی ہنس دی' لیکن وہ ذرا سا مسکرا دیا۔ چند لمحے خاموشی رہی ولید اب اپنے بیگ کی زپ بند کر رہا تھا۔

"اور اگر میں کہوں کہ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم نہ جاؤ۔۔۔" ماہا نے اسے بالکل اچانک رکتے اور حیرت سے خود کو دیکھتے ہوئے پایا۔ تو دھیرے سے بات مکمل کی۔

"تو پھر۔۔۔ کیا کہو گے تم۔۔۔" وہ چند لمحے یونہی اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تو میں کہوں گا کہ میں نے آپ کو چاکلیٹ کھلانے میں دیر کر دی۔"

☼ ☼ ☼

زندگی کے سینے پر پت جھڑ نے جتنے بھی زخم لگائے تھے۔ گزرتے وقت کی بہار نے اس پر اپنا مرہم رکھ کر مندمل کر دیے تھے۔ اب ہر سو سکون تھا۔ خوشیوں کی فراوانی تھی۔ ایسی ہی موسم بہار کی ایک چمکیلی روشن صبح' جب تازہ اور گرم الائچی ملی دودھ پتی کی خوشبو' ناشتے کی اشتہا کو اور بڑھا رہی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا عکس دیکھتی وہ' چونک گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے نم آلود بالوں پر تھا۔ کلائیوں تک بھری دہکتی ہوئی مہندی اور جسم و جاں سے پھوٹتی ایک معطر سی خوشبو کی ان کہی داستانیں خود میں سمیٹے ہوئے تھی۔ کسی نے دروازے پر دستک دی' ساتھ ہی سوہا کی آواز سنائی دی۔

"عفت۔۔۔ سب لوگ پہنچنے والے ہیں۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر کھڑی سوہا کو اندر سے گلابوں کی مہک کی لپٹ سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ماشاء اللہ! اس وقت تو کل سے زیادہ مہکی مہکی لگ رہی ہیں محترمہ۔۔۔" وہ بری طرح جھینپ گئی۔

"اچھا سنو! جلدی سے حدید بھائی کو بھی جگا دو گیارہ بجنے والے ہیں۔ پھر اگر لوگ آجائیں گے تو اچھا نہیں لگے گا نا۔" وہ سرہلاتی ہوئی دروازہ بند کر کے پلٹی اور بستر پر محو خواب وجود کے نزدیک آئی۔ دھیرے سے شانہ ہلاتے ہوئے پکاری۔

"حدید۔۔۔ حدید۔۔۔ اٹھ جائیں۔۔۔ پلیز بہت دیر ہو گئی ہے۔" اس کا انداز بے حد نرم اور دھیما سا تھا۔ سوئے ہوئے وجود میں کوئی حرکت نہ پا کر وہ جھکی اور دھیرے سے دوبارہ اس کا شانہ ہلانے کی خاطر ہاتھ بڑھایا۔ حدید نے ایک دم اٹھ کر اس کی کلائی پکڑنی چاہی' مگر وہ ہوشیار تھی۔ ایک دم پیچھے ہٹی اور ہنس کر بولی۔

"مجھے پتا تھا۔ آپ جاگ رہے ہیں۔ بنے پڑے ہیں۔" حدید نے اٹھ کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی اور نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بیوی کو اتنا بھی نبض شناس نہیں ہونا چاہیے۔" عفت کی کھلکھلاتی ہنسی کے پھول لمحہ بھر میں اس کا وجود' سماعتیں اور دل سب معطر کر گئے۔

☼ ☼

شہزادی کائنات یونس

کیا پکاؤں رات کے لیے۔ منیبہ نے کچن سے جھانکا۔

"اے کیا پکانا ہے۔ کوئی من سلویٰ تو نازل ہونے سے رہا ماش کی دال بنا لو بھنی ہوئی۔" اماں نے پالک کے پتے چنتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ وہ ابھی بدھ بازار سے آئی تھیں۔ مغرب سے ذرا پہلے کا وقت تھا۔ اور اب وہ کھٹا کھٹ تیزی سے پالک کے پتے چن رہی تھیں۔ اندازہ لگانا آسان تھا۔ کل کے مینو میں پالک تیار ہونا تھا۔ منیبہ جابک دستی سے برتن دھو کر ٹھکانے لگا رہی تھی۔ پاس ہی نبیلہ بھابھی چولہے پر توا رکھے روٹیاں اتار رہی تھیں۔ اندھیرا پھیلنا شروع ہو چکا تھا۔ شکر تھا کہ لائٹ موجود تھی۔ "جلدی سے برتن دھولوں پھر موٹر لگا کر پانی چڑھاؤں گی۔" منیبہ کے فٹافٹ چلتے ہاتھوں کے ساتھ زبان نے بھی حرکت کی۔

"کیا ہوا پانی کم آرہا ہے۔" نبیلہ نے پھلکا اتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں اوپر ٹنکی میں پانی ختم ہو گیا ہے۔ شکر ہے ابا نے زیر زمین ٹینک بھی بنوالیا تھا۔ ورنہ کتنی مصیبت ہوتی پانی کی کتنی کمی ہے۔" منیبہ نے عادتاً "شکر کا کلمہ پڑھا۔

"مما دو دو۔" ڈیڑھ سالہ فہد منہ بسورتا ہوا کچن میں داخل ہوا۔

"جی جانو لے کر آرہی ہو میرے بیٹے کو بھوک لگی ہے۔" بھابھی نے محبت سے کہا تھا اور جلدی جلدی روٹیاں لپیٹنے لگیں۔

"منیبہ بیٹا یہ پالک دھو کر ابال لو۔ اور جلدی سے چٹنی بھی بنا لو لائٹ کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔" اماں کٹی ہوئی پالک کی پرات اٹھائے چلی آئیں۔

"جی اماں آپ صرف پالک خرید کر لائی ہیں۔ کوئی اور سبزی بھی لے آتیں دو دن کی چھٹی ہو جاتی۔"

منیبہ نے چولہا جلا کر پانی بوائل کرنے رکھا۔

"سبزیوں کو تو آگ لگی ہوئی ہے وہ تو تمہارے ابا نے کئی روز سے پالک پکانے کی فرمائش کر رکھی تھی سو لینی پڑی۔" وہ مڑ کر اندر جاتے جاتے بولیں۔ منیبہ اپنے گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس سے ایک بہن اور بھائی بڑے تھے۔ اور دونوں شادی شدہ زندگی میں خوش اور مگن تھے۔ آپا کے تین بچے تھے اور بھیا کا ایک بیٹا تھا گھر بھر کی جان فہد۔ ہر اتوار کو مریم آپا میکے کا چکر لگاتی تھیں' ان کے ساس سسر انتقال کر چکے تھے۔ بقیہ نند دیور شادی شدہ اپنے اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ اس لیے آپا کو مکمل آزادی تھی۔ ان کی اپنی راجدھانی تھی۔ ہر سنڈے کو آلو گوشت' آلو مرغی اور آلو قیمہ کا میلہ ضرور لگتا تھا۔ ان کا گھرانہ بہت غریب تو نہیں ہاں سفید پوش تھا۔ مختلف اقسام کے اٹالین چائنیز اور فرانسیسی کھانوں کے نوش جان کرنے کا تو خواب میں بھی سوچا نہیں جاتا تھا۔

سائٹ ٹاؤن میں تعمیر شدہ پرانے وقتوں کا بڑے سے آنگن والا گھر منیبہ کی سلطنت تھا۔ جس کے کچے آنگن کی مٹی کو وہ برابر پانی کے چھڑکاؤ سے دباتی رہتی تھی' ورنہ ایک جھونکے میں مٹی کی ہلکی سی تہ پورے کمروں میں جم جاتی تھی۔ گھریلو کام کاج صفائی ستھرائی۔ یہی مصروفیات دل لگانے کا سبب بنتیں۔ ننھا فہد گھر کی رونق تھا۔ اس کی معصوم شرارتوں سے ایک ہلچل کا احساس نمایاں رہتا تھا۔

کل ہفتے کو ہی ابا نے مرغی لا کر رکھ دی تھی۔ اور اب وہ مکمل طور پر بھوننے میں مگن تھی۔ کوئی دو تین قسم کی ڈشنز تو تیار تو نہیں کرنی تھیں۔ جو ہڑبونگ کا احساس جاگتا۔ پھلکے بنا کر ہاٹ پاٹ کی زینت بنا چکی تھی۔

"ویسے کیا بات ہے ہر سنڈے کو روایتی پاکستانی کھانے تیار ہوتے ہیں۔ ڈائجسٹوں کی ہیروئن تو چکن چاؤمن، چکن شاسلک تیار کرتی ہے۔ اور میں تو ہر سنڈے کو پوٹاٹو چکن تیار کرتی ہوں۔" وہ اپنی سوچ پر خود ہی ہنس دی۔

"ارے ہاں وہ تو ہیروئن ہوتی ہے جب ہی تو بدیسی کھانے پکاتی ہے میں کوئی ہیروئن کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔" اس نے خود کو تسلی دلائی۔

"کل میں بھی اماں کے ساتھ بازار جاؤں گی، ورنہ اماں سبزیاں مہنگی بہت ہیں کہہ کہ آگے چل دیں گی۔" اس نے ارادہ کیا۔ گیٹ دھڑ دھڑایا۔

"ضرور آپا آئی ہیں۔" وہ قیاس کرتی دروازے تک آئی۔ حسب توقع آپا کو دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔ ندیم بھائی ان کو گیٹ سے ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

"السلام علیکم کیا حال ہیں۔" وہ ان کے گلے لگی۔

"ٹھیک ہوں گڑیا تم سناؤ۔" وہ مسکرائیں۔

"اندر تو آنے دے وہیں باتیں نہ تمام کرلینا۔" اماں نے آواز لگائی۔

"آداب اماں حضور۔" آپا نے سر جھکا کر دست شفقت پھروالیا بچے آزادانہ گھوم رہے تھے۔

"وہ ابھی لگتا ہے گھر پر نہیں ہیں۔" آپا نے گھر پر چھائے جمود سے اندازہ لگایا۔ ورنہ اب تک فہد آکر ان کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا۔

"ہاں کل ہی گئی ہے۔" اماں نے جواب دیا۔

"اور کیا چل رہا ہے۔" وہ آنگن میں بچھی چارپائی

پرداز ہو گئیں۔

"منیہ سالن نہ جلے دھیان رکھنا۔" اماں نے اس کی توجہ کچن کی طرف مبذول کرائی۔

"نہیں اماں ابھی تو شوربا ڈال کر پکنے رکھا ہے۔" اس نے بھی ٹانگیں اوپر کر کے پشت کو تکیے سے لگایا۔

"باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کرنے سے پہلے بہن کو پانی کا پوچھ لو۔" انہوں نے اسے شرمندہ کیا۔

"اوہ سوری آپی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں بیٹھو چھوڑو پانی میں پی کر نکلی تھی' باتیں کرتے ہیں۔" وہ بازوؤں کو گردن کے نیچے رکھتے ہوئے بولیں۔

حسب عادت وہ باتوں میں پوری طرح مشغول ہو گئیں تو اچانک سالن کی تیز خوشبو نے منیہ کو کچن کی طرف سرپٹ دوڑنے پر مجبور کر دیا۔ شکر تھا مرغی لگی نہیں تھی کچھ دیر کی تاخیر اس کے جلنے کا سبب بن جاتی۔

"یار نبیلہ کو بھی جانا ہوتا ہے۔ ورنہ میرا تو دل کرتا ہے۔ اتنی پیاری بھابھی کو اپنے میکے میں ہی رکھوں۔" مریم آپا کچن کے دروازے سے ٹیک لگا کر بولیں۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے۔ جو اتنی پیاری مخلص بھابھی عنایت کر دی۔ ورنہ آج کل کی بھابھیوں' بہوؤں کے تو بہت سے قصے سننے کو مل جاتے ہیں۔" وہ شکر گزاری کے جذبات سے مغلوب ہوئی۔ نبیلہ بہت نیک طبیعت لڑکی تھی۔ جو پکتا کھا لیتی تھی۔ وہ بھی مڈل کلاس طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے کبھی اماں کی تلخ باتوں کا برا نہیں منایا تھا۔ اماں بھی اکثر اوقات کم آمدنی اور زیادہ اخراجات کی وجہ سے تلخ ہو جاتی تھیں۔ ورنہ عموماً وہ بہت نیک اور اچھے دل کی مالک تھیں۔

☆ ☆ ☆

"چل جلدی سے برقع اوڑھ لے پھر گھر جلدی آنا ہے۔" وہ چادر اوڑھتے ہوئے پکارنے لگیں۔ وہ دونوں بازار جانے کے لیے نکل رہی تھیں۔

"اماں مجھے دو رسالے دلا دیجیے گا۔ اس نے فرمائش

تیرے ان موئے رسالوں سے تو میں عاجز آ گئی ہوں۔ جانے کب بڑی ہو گی۔" وہ بڑبڑائیں۔ مگر کیا کرتیں چھوٹی سے وہ محبت بھی کرتی تھیں۔ وہ اس کی بڑی بڑی تو نہیں البتہ چھوٹی چھوٹی خواہشات ضرور پوری کرنے کی کوشش کرتیں۔

"سنیں یہ ریسیپی بک کتنے کی ہے۔" رسالے خریدنے کے بعد بک اسٹال پر ایک پرانی حالت کی ریسیپی بک پر اس کی نظر پڑی۔

"یہ سو روپے کی ہے باجی پرانی ہو گئی ہے اس لیے ورنہ تو اس کی قیمت تین سو روپے کی ہے۔" اس نے دانتوں کی نمائش کی۔

"یہ لیں۔" اس نے مٹھی سے مڑا تڑا نوٹ نکالا۔ جو اس کی بچت تھا۔ چپ چاپ پے منٹ کر کے بک پرس میں رکھ لی۔ دل تھا کہ خوشی سے معمور ہو گیا۔ اس کا کئی دفعہ دل چاہا تھا' جو رسالوں میں مختلف شیف اور چکن کے پکوانوں کے نام پڑھتی ہے۔ ان کو ٹرائی کر کے دیکھے۔

"ارے یہ کہاں سے آئی ہے۔" گھر آ کر اماں نے جو بک دیکھی تو اچنبھے سے پوچھا۔

"یہ وہیں بک اسٹال سے لی ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"ان ترکیبوں کے پیچھے کتنے پیسے پھینک کر آئی ہے۔" وہ ڈپٹ کر بولیں۔

"اماں سو روپے کی لی ہے۔ دیکھیں تین سو کی ہے مگر سو کی ملی ہے کتنے مشہور شیف نے مرتب کی ہے۔" وہ جوش سے کہتی رہی۔ یہ غور کیے بنا کے اماں کا چہرہ مارے طیش کے سرخ ہو رہا ہے۔

"کیوں ستاتی ہے مجھ بڑھیا کو' اللہ کی مار سو روپے میں ایک دن کی ہنڈیا پک جاتی ہے۔ محترمہ ترکیبوں کا لارا لیے چلی آ رہی ہیں' ماں سے مشورہ کیے بغیر' لوگ بھوکے مر رہے ہیں ملک میں سیلاب آیا ہوا ہے۔ ادھر ہم وطن اب چک چک لونڈے اڑائیں گے۔" وہ غصے سے لال پیلی ہو رہی تھیں۔

"چھوڑیے اماں بچی ہے۔ یہی تو شوق پورے

کرنے کی عمر ہوتی ہے جانے دیجیے۔" بھابھی نے اماں کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔
"اس نے فرمائش کی مجھے رسالے دلا دیجیے میں نے دلا دیے نا۔ مجھے کیا خبر یہ مفت کا مال سمجھ کر سو روپے منہ دکھائی دے آئے گی۔" وہ بپھریں۔
"اماں مجھے نہیں پتا تھا آپ اتنا غصہ ہوں گی میں ڈسٹ بن میں ڈال دیتی ہوں، آپ خوش ہو جایئے۔" وہ روہانسی ہوئی۔
"اب اس کو رکھو بادا سے پیسے لے کر پکانا دیکھوں گی صاحبزادی کیا تیر مارتی ہیں۔" اماں نے پیٹھ پھیر کر ناراضی کا اظہار کیا۔
"پیاری اماں آپ دیکھیے گا آپ کی صاحبزادی کیسا مزے کا کھانا بنائیں گی۔ آپ انگلیاں چاٹتی رہیں گی۔" اس نے دلار سے ماں کی گردن میں باہیں ڈالیں۔
"چل پرے ہٹ، مرضی کر کے پچکارنے آئی ہے۔" ان کے منہ بنانے پر۔ نبیلہ بھابھی کی ہنسی نکل گئی۔
"تم ہنس کر اسے اور چڑھاوے دے رہی ہو۔" ان کا رخ نبیلہ بھابھی کی طرف ہوا۔ نبیلہ کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔
"اماں کیا پکانا ہے۔"
"اس میں سے ہی کچھ پکالو۔" وہ انواع اقسام کی سبزیوں کی طرف اشارہ کرتی وضو کرنے چل دیں۔

☼ ☼ ☼

"بھابھی آپ اس سنڈے کو اپنی امی کے گھر جائیں گی۔" اس نے دریافت کیا۔
"نہیں اس دفعہ تو نہیں جاسکوں گی، بھابھی نے اپنے میکے والوں کی دعوت کی ہے اچھا نہیں لگے گا جاؤں گی تو۔" وہ ہاتھ پلو سے پونچھتی ہوئی اس کے برابر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔
"اچھا در اصل میں نے سوچا کہ اس دفعہ آپا آئیں گی تو کچھ خاص پکا لیا جائے۔ اور میں نے ابا سے پوچھ لیا ہے انہوں نے کہا ہاں بیٹا تم لسٹ بنا کر دے دینا میں لے آؤں گا۔" اس نے کامیابی کا ذکر کیا جو ابا کی حمایت سے حاصل ہوئی تھی۔
"چلو یہ تو اچھی بات ہے پھر کیا ٹرائی کرنے کا ارادہ ہے۔" وہ مسکرائیں۔
"وہی تو میں سوچ رہی ہوں اتنی ساری ریسپیز سے کس کا انتخاب کروں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔
"چلو مل کر ڈھونڈتے ہیں۔ وہ اہم ڈش کون سی ہے جو ہماری پیاری منیبہ ٹرائی کرے گی۔" وہ عادتاً" مسکرائیں۔ وہ بھاگ کر ریسپی بک اٹھا لائی۔
"لبنانی کباب۔۔۔ اس میں آدھا کلو قیمے کا ذکر ہے۔ ہمارے ہاں تین پاؤ آتا ہے۔ یہ ٹھیک رہے گی پکانے میں۔" منیبہ کی نگاہیں لبنانی کبابوں کی ریسپی اٹکیں۔ قیمہ، آلو، پیاز، ابلی میکرونی۔۔۔ وہ میکرونی پر تھوڑا اٹکی۔ بڑے ٹماٹر، ابلے مٹر۔
"ارے اب یہ ابلے مٹر کہاں سے لائیں گے۔" منیبہ نے منہ بسورا۔
"چلو چھوڑو کبابوں کی کوئی اور سی ترکیب دیکھتے ہیں۔" بھابھی نے تسلی دی۔
"چکن چاؤ من مرغی، شملہ مرچ، گاجر، ٹماٹر، پیاز، بند گوبھی اف مالک اماں تو کھری کھری سنا دیں گی۔ بوتلیں کی تین عدد سبزیاں۔۔۔ اس سے تو آلو مرغی پکالو۔" بھابھی نے چکن چاؤ من کو مسترد کیا۔ اس طرح کئی پکوان تو قبولیت کی گھڑی کو پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ کسی میں اشیا خورد و نوش کی زیادتی تھی کسی میں جو نام سنے بھی نہیں تھے وہ چیزیں درج تھیں۔ جنہیں ڈھونڈنے کے لیے کسی سپر اسٹور جانا پڑتا۔ اور اوون کا ذکر ان کے ارمانوں سے بڑھی ریسپی پر غموں کے بادل تان دیتا۔ بالآخر نند بھاوج کی نظریں چکن جنجر پر ٹکیں۔ اس میں درج کچھ اشیاء میسر تھیں۔ کچھ منگوائی پڑتیں۔
"ابا سرکے کی ایک بوتل، لیموں اور مرغی کے ساتھ ادرک بھی لے آیئے گا۔" اس نے ابا کو حسب ضرورت سامان بتایا۔

"اچھا بیٹا جو تمہاری مرضی۔" وہ بازار سودا لانے چل دیے۔

"اے لڑکی یہ سرکے کی بوتل کیوں منگوائی ہے۔" اماں نے اسے مخاطب کیا۔

"اماں آج ہم چکن جنجر پکا رہے ہیں اس میں سرکہ ملاؤں گی۔" اس نے جواباً کہا۔

"ہمیں کیا تم جانو تمہارا کام۔" وہ بے زاری سے کہہ کر اٹھ گئیں۔

"ہوں۔" وہ ایک لفظی جواب دے کر کچن میں چلی آئی۔ صبح کا ناشتا کچھ دیر قبل ہی اختتام پذیر ہوا تھا وہ برتن دھونے لگی۔ شکر ہے نمک لال مرچ' ہری مرچ' پسا دھنیا' کارن فلور' لیموں' تیل آلو ٹماٹر پیاز وغیرہ موجود تھے۔ اس نے شکر کا پہلو ڈھونڈا۔

"منیبہ میں آگئی۔" مریم آپا کی چہکتی ہوئی آواز کچن تک آئی۔ وہ باہر نکل آئی۔

"آپا کیا حال ہے۔"

"فرسٹ کلاس تم سناؤ۔" فہد کمرے سے نکل کر آنگن میں آیا۔ آپا نے بڑھ کر اسے گود میں اٹھالیا۔

"نبیلہ کیسی ہو۔" پانی کا گلاس لیتے ہوئے آپا نے خیریت دریافت کی۔

"ٹھیک ہوں آپ سنائیں بچے نظر نہیں آرہے!" اس نے متلاشی نگاہیں دوڑائیں۔

"باپ کے ساتھ آئس کریم لینے گئے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔

"اماں کدھر ہیں۔"

"نہا رہی ہیں میں برتن دھو رہی تھی ابھی آتی ہوں۔" وہ معذرت کرتی واپس ہولی۔ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے دھلے برتن اسٹینڈ پر رکھے۔

"اور بھئی چکن کا جنجر تیار ہو رہا ہے۔" آپا کچن میں داخل ہوئیں۔

"جی آپا ابھی تو تیار ہوگا۔ ابا سودا لانے گئے ہیں۔" وہ یقیناً "نبیلہ کی زبانی سارا واقعہ سن کر آئی تھیں۔

"دعا ہے کہ اچھا بنے ورنہ اماں صحیح سنائیں گی۔" وہ کسی خوف کے تحت بولی۔

"فکر نہ کرو اتنے مشہور شیف کی ریسپی ہے ضرور مزے کی بنے گی۔" نبیلہ نے بھی آکر گفتگو میں شمولیت اختیار کی۔

"لگتا ہے باگڑ بلے آگئے ہیں۔" آپا شور سن کر قیافہ لگاتی باہر نکل گئیں۔

"آنی جلدی سے پیالیاں لے آئیے۔ ہم آئس کریم لائے ہیں۔" آپا کے بیٹے نے جوش بھری آواز میں پکارا۔

"لا رہی ہوں۔" وہ پیالیاں لے کر کمرے میں پہنچ گئیں۔

ندیم بھائی سے علیک سلیک کرکے وہ اماں کے برابر میں بیٹھ گئی بچے پرجوش ہو رہے تھے۔ اماں نے سب کو آئس کریم ڈال کردی۔

"منیبہ یہ لے لو۔" ابا آگئے تھے۔ وہ آنگن میں آگئی ابا کے ہاتھ سے سودا لے کر کچن میں چلی آئی۔ پہلی دفعہ وہ کسی روایتی ڈش کے بجائے چکن کو دوسری شیپ میں تبدیل کر رہی تھی۔ مکمل طور پر توجہ دے کر اس نے سارا کام نبٹایا۔ محنت کے صلے میں چکن کا جنجر کی مہک سے پورا گھر مہکنے لگا۔

"خوشبو تو زبردست آرہی ہے۔" بھابھی نے گہرا سانس بھرا۔

"ہاں بھابھی مگر یہ تو بغیر شوربے کی ڈش ہے کیسے پورا ہوگا۔" اس نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں یہ تو ہے اس میں چکن ڈیڑھ کلو لکھا تھا۔ ہم نے ایک کلو لیا ہے۔ اور۔ وہ سوچنے لگیں۔

"ایسا کرتے ہیں۔ چھ انڈے رکھے ہیں ان کا سالن بنا لیتے ہیں۔ تم ایسا کرو انڈے ابالنے رکھو۔ میں آلو کا سالن بناتی ہوں۔" بھابھی نے حل پیش کیا۔

"یہ کس طرح کا سالن ہے۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ خاص پاکستانی سالن ہے۔ ہمارے گھر میں بنا کرتا تھا۔ ابلے انڈے چھیل کر پلیٹ میں رکھتے ہیں۔ اور سرونگ ڈش میں آلو کا خوب گھی والا سالن ڈال کر پیش کرتے ہیں۔ انڈے ڈال کر مزے سے کھاؤ۔"

انہوں نے آسان لفظوں میں ترکیب نوٹ کرائی۔
سالن واقعی بیس منٹ میں تیار ہوگیا۔ خوب صورت شکل والا پاکستانی سالن۔
"ارے یہ کیا۔" اماں نے حیرت سے آلو کے سالن کو دیکھا۔
"یہ آلو انڈے کا سالن ہے اماں۔" بھابھی نے فوراً" کہا لیکن اماں مزید خیالات کا اظہار نہ کریں۔ اماں خاموش ہوگئیں۔ سب گھر والے سوائے بھیا اور ابا کے آلو انڈوں کا سالن کھا رہے تھے۔ صرف آپا کی فیملی ابا اور بھیا چکن کا جنجر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ منیبہ نے اماں کو چپکے سے چکن کی کمی کا بتا دیا تھا۔ اس وقت تو اماں خاموش رہیں مگر بیٹی داماد کے رخصت ہوتے ہی گویا پھٹ پڑیں۔ اس کو بلایا۔
"مرغی کا سالن ختم ہوگیا یا بچا ہے۔" پوچھا گیا۔
"ختم ہوگیا ہے۔" اس نے سرد ہوتے ہاتھوں کو رگڑا۔
"اے نبیلہ یہ موٹی ریسیپی بک کدھر ہے؟ اسے لے کر آؤ۔" بھابھی نے ریک پر رکھی بک اٹھا کر اماں کو دی۔
"یہ لے اور خود جا کر اسے کچرے کے ڈبے میں ڈال کر آ۔" انہوں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔
"نیک بخت اس میں اللہ کا نام لکھا ہے۔ ایسا کرنا بازار جا کر اسی بک اسٹال والے کو واپس کر کے آجانا۔ خواہ مخواہ چیز برباد نہیں کرو۔" ابا نے مداخلت کی۔
"اچھا چلو ٹھیک ہے۔ مگر آئندہ ہی قسم کے شوق پورے کیے تو جہاں آرا سے نبٹنے والا کوئی نا ہوگا۔" اس پر نظر رکھتے ہوئے انہوں نے دبنگ آواز میں اپنا نام لیا۔ سب خاموشی سے دم سادھے بیٹھے تھے۔ بھیا البتہ گھر پر نہیں تھے وہ اپنے کسی دوست سے ملنے گئے ہوئے تھے۔
"غضب خدا کا گھر میں نہیں دانے اماں چلی بھنانے اتنی مہنگائی ہے۔ یہاں چک چک لونڈے چل رہے جو گھر والوں کے منہ تک بھی نہ پہنچ سکے اور خود بھی نہ چکھ سکی۔ الٹا دوسرے سالن کا خرچا الگ ہوا۔ اتنے پیسوں میں کسی بھوکے کا دو ٹائم چولہا جل جاتا۔" ان کا سانس پھول گیا۔
"دیکھ بیٹا یہ امیروں کے چونچلے ہوتے ہیں۔ ہم جیسے سفید پوش ان ریسیپیز کو صرف پڑھنے کی حد تک دیکھ سکتے ہیں۔ تم خود سمجھدار ہو۔ ہم ایسی ڈشز افورڈ نہیں کرسکتے۔ ہمارا ملک ایک غریب ملک ہے۔ ہمیں ہلکی سے ہلکی غذا لینی ہے اور ان بچے ہوئے پیسوں سے دوسروں کی مدد کرنی ہے۔ ہمیں اجتماعی اتحاد کی ضرورت ہے۔ غیر ملکی کھانے ایک تو زیادہ تر لوگوں کو اچھے نہیں لگتے اور اس میں خرچ بھی بہت آتا ہے۔ اس سے اچھا تو کسی غریب کو کھانا کھلا کر ہم کو ان کی مدد کرنی چاہیے۔ ناکہ ہم اپنی خواہشات کے پیچھے اندھے ہوجائیں۔" ابا کی گمبھیر آواز نے کمرے میں چھائے جمود کو توڑا۔ اماں نے مجازی خدا کو ان کے قول کے باعث پسندیدگی سے دیکھا۔
"جی ابا میں کل ہی بازار جا کر یہ کتاب واپس کر آؤں گی۔ آپ نے مجھے بہت اچھی بات سمجھائی ہے۔ واقعی ہمیں اجتماعی اتحاد کی ضرورت ہے۔" وہ بشاشت سے مسکرائی۔
"اللہ کا شکر ہے ہم بہت سوں سے اچھا کھاتے ہیں۔ اور۔۔۔" اماں نے وقفہ لیا۔
"اور ہماری بیٹی بھی عقل مند ہے۔" اماں کے منہ سے اپنی تعریف سن کر وہ خوشی سے پھول گئی۔
"اماں پھر ہم آج ہی امدادی سامان نکالتے ہیں۔" اس نے دل کی گہرائیوں سے اپنے ضرورت مند ہم وطنوں کا دکھ محسوس کیا۔
"ہاں گڑیا کیوں نہیں۔" وہ خوش دلی سے بولیں۔ ماحول میں چھائی بوجھل دھند چھٹ گئی۔ اس نے وہ ریسیپی بک اٹھائی اور اپنے پرس میں ڈالنے چل دی۔ کیونکہ اسے اپنی خواہشات کو پس پشت ڈال کر اجتماعی اتحاد کی جانب پہلا قدم دھرنا تھا۔

☼ ☼

شعلۂ عزیر

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے ابوبکر! تین باتیں جو سب کی سب بالکل حق ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ جس بندہ پر کوئی ظلم و زیادتی کی جائے اور وہ محض اللہ عزوجل کے لیے اس سے درگزر کرے (اور انتقام نہ لے) تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کی بھرپور مدد فرمائیں گے۔ (دنیا اور آخرت میں اس کو عزت دیں گے)

اور دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص صلہ رحمی کے لیے دوسروں کو دینے کا دروازہ کھولے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کو اور بہت زیادہ دیں گے۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ جو آدمی (ضرورت سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ اپنی دولت بڑھانے کے لیے سوال اور گداگری کا دروازہ کھولے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی دولت کو اور زیادہ کم کردیں گے۔"

غزل...... ملتان

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ خدا کے نزدیک بہترین دوست وہ ہے جو اپنے دوست کا خیر خواہ ہو۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

☆ سچائی کی مشعل جہاں بھی دکھائی دے اس سے فائدہ اٹھاؤ یہ نہ دیکھو کہ وہ کس کے ہاتھ میں ہے۔ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا)

☆ بانٹنے سے خوشی بڑھتی ہے جس طرح زمین میں بویا ہوا بیج فصل بنتا ہے۔ (حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ)

☆ گناہ کا ترک، توبہ کی کلفت سے آسان ہے (حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ)

☆ مصائب سے مت گھبرائیے کیونکہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔ (حضرت لقمان رحمتہ اللہ علیہ)

نگہت...... جہلم

ہیرے اور سونے میں فرق

حضرت شیخ سعدی سے کسی نے دوست اور بھائی کے بارے میں دریافت کیا۔ شیخ سعدی فرمانے لگے۔

"دوست ہیرے کی مانند اور بھائی سونے کی مانند ہے۔"

وہ شخص بہت حیران ہوا اور کہنے لگا۔

"حضرت! بھائی جو حقیقی اور سگا رشتہ ہے اسے آپ کم قیمت چیز سونے سے منسوب کررہے ہیں۔ اس میں کیا حکمت ہے؟"

شیخ سعدی نے فرمایا۔

"سونا اگرچہ کم قیمت ہے لیکن اگر ٹوٹ جائے تو اسے پگھلا کر اصل شکل دی جاسکتی ہے۔ بھائیوں میں اگر کوئی وقتی چپقلش ہو جائے تو وہ دوری ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر دوستی کے رشتے میں کوئی دراڑ آجائے تو اسے دور نہیں کیا جاسکتا۔"

وہ شخص شیخ سعدی کے حکمت سے بھرپور جواب سن کر سحر زدہ ہوگیا۔

امن عامر...... فیصل آباد

سوچ

☆ جو زیادہ سوچتا ہے، وہ زیادہ تجربات کرتا ہے۔

☆ مثبت سوچ انسان کے لیے ترقی کی راہیں کھولتی ہے۔

☆ جو سوچتا نہیں ہے، وہ کوئی قابل ذکر کام نہیں کر

سکتا۔

☆ سوچ انسان کو بغیر خرچے کے جہاں چاہے، جس جگہ چاہے، پہنچا کر مفت میں سیر کرواتی ہے۔

☆ پہلے سوچو پھر بات کرو، کبھی بھی خفت اٹھانا نہیں پڑے گی۔

☆ سوچ کا دائرہ وسیع کرو۔ محدود سوچ نقصان پہنچا سکتی ہے۔

☆ اچھی سوچ انسان کو دوسروں کی نظروں میں بلند کرتی ہے۔

☆ اکثر سوچنے کے بعد کیا جانے والا فیصلہ درست ہوتا ہے۔

☆ اچھی سوچ انسان کے خیالات کو نکھار دیتی ہے۔

☆ زیادہ سوچنے والا فضول باتیں کرنے سے بچ سکتا ہے۔

☆ سوچ پر بیوی کا بھی پہرہ نہیں ہو سکتا۔

☆ اچھی سوچ ایک پھول ہے۔ جس کی مہک دوسروں کو بھی محسوس ہوتی ہے۔

☆ سوچ ایک دریا ہے، جس میں انسان ڈوب جاتا ہے لیکن سانس بند نہیں ہوتی۔

حنا کرن..... پتوکی

دولت

دولت: عینک خرید سکتی ہے، نظر نہیں....

دولت: کتابیں خرید سکتی ہے، علم نہیں....

دولت: گھڑی خرید سکتی ہے، وقت نہیں....

دولت: قلم خرید سکتی ہے، مگر تحریر نہیں....

دولت: دوائیں خرید سکتی ہے، مگر صحت نہیں....

دولت: نرم بستر خرید سکتی ہے، مگر نیند نہیں....

دولت: عیش و عشرت خرید سکتی ہے، مگر سکون نہیں....

مصباح..... سرگودھا

عشق

ساجن کی یادیں بھی کن لمحوں میں آجاتی ہیں

گوری آٹا گوندھ رہی تھی، نمک ملانا بھول گئی

گڑیا شاہ..... کھروڑ پکا

بچے کی تعلیم

بچے کی تعلیم کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ اسے ضدی اور خود غرض نہ بننے دیں۔ اس کی بے جا ضد کو کبھی پورا نہ کریں۔ اس کی خوشنودی مزاج کا ہرگز خیال نہ رکھیں۔ اس میں فرمانبرداری کی عادت پیدا کریں تو سمجھیں کہ آپ نے اسے آفات زمانہ سے بچا لیا۔ (امام غزالی)

کشور منیر..... کراچی

الفاظ

الفاظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر صرف بولنے سے پہلے تک! بولنے کے بعد انسان اپنے لفظوں کا غلام بن جاتا ہے۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ)

حنا قربان..... راجن پور

جدید لغت

☆ حماقت: پہلے پیریڈ میں حاضر ہونا۔

☆ رقم: جس کی ضرورت امتحانوں کے دوران ممتحن کو زیادہ ہوتی ہے۔

☆ ظالم: شعبہ امتحانات۔

☆ غشی: مشکل پرچے کا رد عمل۔

☆ کتاب: ایسی خواب آور دوا ہے جسے کھانا بھی نہیں پڑتا اور نیند آجاتی ہے۔

☆ واپڈا: جو رات کو پڑھائی سے نجات دلاتا ہے۔

☆ جرمانہ: جیب خرچ پورا کرنے کا ذریعہ۔

☆ سزا: جس سے کوئی طالب علم بچ کر نہیں رہ سکتا۔

☆ صبر: جو حکومتی کارناموں کی وجہ پاکستانی عوام کو ہر وقت کرنا پڑتا ہے۔

☆ لیبارٹری: بے کار چیزوں کا گودام۔

☆ نصیحت: جو صرف دوسروں کے لیے ہوتی ہے۔

☆ ڈسپلن: جس کا سرکاری دفاتر سے کوئی تعلق نہیں۔

حمدا واجد..... کراچی

حنا کرن، کی ڈائری میں تحریر

منیر نیازی کی نظم

نیا سال،

نیا سال آیا ہے
ویران صبحوں کی نیلی تہوں سے ابھرتا
خیابان و دشت و جبل کی ٹھٹھرتی خموشی میں، رسیلی
سیٹی بجاتا
دبے پاؤں
یخ آلود شاموں کی خاموشیاں
اس کے قدموں کی آہٹ سمیٹے
گزرگاہوں پر سائبانوں میں نوحہ کناں میں
دراز ہے شب کو دریچوں، درزوں سے
پکڑ کر جھونکوں کی بے مہر ٹھنڈک
برودت زدہ پانیوں پر پرندے
کناروں پر ایستادہ پیڑوں کی نمناک شاخوں کی
جانب اڑے جا رہے ہیں
مکین آنگنوں میں، چھتوں پر
دھڑکتے دلوں میں ہزاروں خیالوں کی شمعیں جلائے
دبے پاؤں آتے ہوئے سال کو دیکھتے ہیں

صبا خان، کی ڈائری میں تحریر

احمد ضیا کی نظم

محبت میں کسی بھی بات کی قسمیں نہیں کھاتے
محبت تو فقط پیمان ہوتا ہے کہ دونوں
زندگی کے روز و شب کے درد کو
مل کر سمیٹیں گے
خوشی کا کوئی بھی لمحہ ہو
وہ مل کر گزاریں گے
کوئی پہچان ہو
وہ کبھی بھی چھوٹا نہیں ہوتا
کہ دونوں میں سے کوئی ایک تو
وعدہ نبھاتا ہے
نفی کرتا ہے اپنی ذات کو
خود کو مٹاتا ہے
محبت میں کسی بھی بات کی قسمیں نہیں کھاتے

گڑیا شاہ، کی ڈائری میں تحریر

خالد شریف کی نظم

میری پلکوں پہ
جب کوئی حسین سایہ لرزتا ہے
میری آنکھوں پہ
جب کوئی دھیرے سے ہاتھ رکھتا ہے
میرے ہونٹوں پہ
جب کوئی مدھر نغمہ مچلتا ہے
کسی جانب سے جب کوئی خوشبو کی لہر آتی ہے
کسی کیاری میں
جب خوش رنگ کوئی پھول کھلتا ہے
کسی رستے سے
سج بن کے کوئی گزرتا ہے
کوئی دیوانگی کی حد تلک جب پیار کرتا ہے
مجھے تم یاد آتے ہو
مجھے تم یاد آتے ہو

سلمیٰ زبیر، کی ڈائری میں تحریر

ناصر زیدی کی غزل

سامنے تو ہو تو کدھر دیکھوں
تو ہی محسوس ہو جدھر دیکھوں

جانے کیوں تجھ سے جی نہیں بھرتا
جس قدر چاہوں، جس قدر دیکھوں

تو ہی کافی ہے عمر بھر کے لیے
اور تجھ سا نہ عمر بھر دیکھوں

جھیل جیسی ہیں وہ کنول آنکھیں
ان میں اک روز ڈوب کر دیکھوں

ایک ہی شخص ہے بہت ناصر
کیوں کوئی اور ہم سفر دیکھوں

کہکشاں انجم، کی ڈائری میں تحریر
حسن عباسی کی نظم

دلوں کی قید سے آزاد محبت

محبت کرنے والے آج
اظہار محبت کر رہے ہیں پر
تمہارے ہاتھ میں جو پھول ہے اس کو
محبت کے صحیفے میں کہیں رکھ دو
کہ اظہار محبت تو دلوں کی قید سے آزاد ہوتی
ہے
محبت میں روایت پھول دینے کی
بہت ہی خوبصورت ہے
مگر تم آج مجھ کو پھول مت دینا
تقاضے میری چاہت کے جدا ہیں کچھ
کہ میرے پیار کی رسمیں زمانے سے جدا ہیں کچھ

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر، کی ڈائری میں تحریر
سعد اللہ شاہ کی غزل

کوئی بات نہ سہاری جائے
زندگی کیسے گزاری جائے

اب تماشا نہیں دیکھا جاتا
نوٹ پھینکو کہ مداری جائے

عشق بازی بھی عجب بازی ہے
جیتی جائے نہ ہاری جائے

جھیل، بادل یا موم خرام
تیری صورت اتاری جائے

میری قسمت تو نہیں زلف تیری
جب سنوارو، یہ سنواری جائے

چیز ہوتی ہے اسی کی جاناں
نام سے جس کے پکاری جائے

سعد آتی ہے مجھے سانس تو یوں
جیسے اک پیڑ سے آری جائے

ثمرہ، اقراء، کی ڈائری میں تحریر
تابش کمال کی یہ نظم

تاکید

اُسے کہنا
اگر آئے، تو ساتھ اپنے
کوئی جگنو، کوئی تارا بھی لے آئے
کہ میرا دل
میرے گھر کی طرح
تاریک رہتا ہے

شگفتہ سلیمان

فوزیہ ثمر بٹ ———— گجرات

ہم تو محبت کے نام سے ہی انجان تھے
اک شخص کی چاہت نے ہمیں پاگل کر دیا

افشاں ———— کراچی

راہِ محبت میں عجیب سا ہوا ہے حال اپنا
نہ زخم نظر آتا ہے نہ درد سہا جاتا ہے

زینب صدیقی ———— کوٹ چھٹہ

محبت کے بعد محبت ممکن ہے فراز
پر ٹوٹ کے چاہنا صرف ایک بار ہوتا ہے

نوشین اقبال نوشی ———— گاؤں بدر مرجان

تسکین محبت کے فقط دو ہی طریقے تھے
یا دل نہ بنا ہوتا، یا تم نہ بنے ہوتے

امبر آصف ———— لاہور

قدم رک سے گئے ہیں آج پھول بکتے دیکھ کر
وہ اکثر مجھ سے کہتا محبت پھول جیسی ہے

آمنہ امتیاز ———— کراچی

کیسی ہوتی ہے محبت
کبھی ملے تو مجھ سے ملا دینا

صائمہ ———— گوجرانوالہ

اس کائنات محبت میں ہم مثل شمس و قمر کے ہیں
اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے
ہم خود کو بیچ دیں پھر بھی ہم تجھ کو پا نہیں سکتے
میں عام سا ہمیشہ ہوں تو خاص سا مسلسل ہے

شافعہ ———— لاہور

محبت میں نہیں ہے شرط ملنے یا بچھڑنے کی
یہ ان خود غرض لفظوں سے بہت آگے کی دنیا ہے

اقصیٰ ناصر ———— کراچی

محبت ایسا منفرد کھیل ہے غالب
جو سیکھ جاتا ہے وہی ہار جاتا ہے

قرأت ———— کراچی

یہ رکھ رکھاؤ محبت سکھا گئی اس کو
وہ روٹھ کر بھی مجھے مسکرا کر ملتا ہے

بریرہ اکرم ———— کراچی

تمہارا ساتھ ہو تو سارے موسم اچھے لگتے ہیں
وگرنہ بے مزا ہیں پھول، خوشبو اور برساتیں

راشدہ ثروت ———— کراچی

اب وہاں یادوں کا بکھرا ہوا ملبہ بھی تو ہے
جس جگہ عشق نے بنیادِ وفا رکھی تھی

صابرہ بنت محمد ———— اسلام آباد

کس کو کہتے ہیں محبت نہیں معلوم ہمیں
اک تمنا سی ہے جو دل سے نکلتی ہی نہیں

آسیہ جاوید ———— علی پور چھٹہ

آج آخری سطروں میں کہیں نام ہے اس کا
احباب کی فہرست میں پہلا تھا جو ایک شخص

مدیحہ ایمان ———— کراچی

آج تو ان کی یاد میں ایسے کھوئے ہیں فراز
جیسے تنہا کسی کو سمندر میں شام ہو جائے

عائشہ ———— گوجرہ

میں تم کو چاہ کر پچھتا رہا ہوں
کوئی اس درد کا مرہم نہیں ہے

ندا، فضہ ———— فیصل آباد

ماضی کی گود میں رکھ آئے خواب اور خواہش
اک روگ بن گیا تھا اس وبال کا شعور
وہ پکارے تو دل لوٹ آتا ہے خوشی سے
پنچھی بھول جاتا ہے ہر بار تیرے جال کا شعور

لائبہ ایمن ———— آزاد کشمیر

گنجائش نکل ہی آتی ہے ایک دل لگی کی
کوئی بھی محبت کسی کی آخری نہیں ہوتی

رانی ـــــــــــ کراچی

نہ ہوا نصیب قرارِ جاں، ہوسِ قرار بھی اب نہیں
ترا انتظار بہت کیا، ترا انتظار بھی اب نہیں
تجھے کیا خبر مہ و سال نے ہمیں کیسے زخم دیے یہاں
تری یادگار تھی اک خلش، تری یادگار بھی اب نہیں

ارم ـــــــــــ کراچی

نہ گلے رہے نہ گماں رہے نہ گزارشیں ہیں نہ گفتگو
وہ نشاطِ وعدۂ وصل کیا ہمیں اعتبار بھی اب نہیں

سائرہ ـــــــــــ کراچی

عشق سمجھے تھے جس کو وہ شاید
تھا بس اک نارسائی کا رشتہ
میرے اور اس کے درمیان نکلا
عمر بھر کی جدائی کا رشتہ

فرزانہ علی ـــــــــــ کراچی

میں اس کو بھول گیا ہوں وہ مجھ کو بھول گیا
تو پھر یہ دل پہ کیوں دستک سی ناگہانی ہوئی
کہاں تک اور بھلا جاں کا ہم زیاں کرتے
بچھڑ گیا ہے تو یہ اس کی مہربانی ہوئی

نسرین ناز ـــــــــــ لاہور

یہ کیسے لوگ ہیں صدیوں کی ویرانی میں رہتے ہیں
انہیں کمروں کی بوسیدہ چھتوں سے ڈر نہیں لگتا
یہ ممکن ہے وہ ان کو موت کی سرحد پہ لے جائیں
پرندوں کو مگر اپنے پروں سے ڈر نہیں لگتا

حمیرہ مہتاب ـــــــــــ سعودی عرب

میں گوشۂ صحرا میں ہوں اور جوئے رواں ہوں
ہوتے ہیں مرے لمس سے سیراب پرندے
یہ ربط کسی فصل کا پابند نہیں ہے
میں دریا ہوں اور ہیں مرے احباب پرندے

عذرا ناصر ـــــــــــ کراچی

میں محبت میں اس مقام پہ ہوں جہاں
میری ذات میں رہتی ہے تیری ذات مسلسل

سیمی ظفر ـــــــــــ کراچی

ہمیں پتا تھا کہ تیری محبت کے جام میں زہر ہے
لیکن تیرے پلانے میں خلوص اتنا تھا کہ ہم ٹھکرا نہ سکے

مہناز ہاشم ـــــــــــ کراچی

درد سے میرا دامن بھر دے یا اللہ
پھر چاہے دیوانہ کر دے یا اللہ
میں نے تجھ سے چاند ستارے کب مانگے
روشن دل، بیدار نظر دے یا اللہ

سعدیہ یاسین ـــــــــــ اسلام آباد

سورج سی اک چیز تو ہم سب دیکھ چکے
سچ مچ کی اب کوئی سحر دے یا اللہ

شافعہ اعوان ـــــــــــ کراچی

نوحہ گرانِ شامِ غم تم نے سنا نہیں مگر
کیسا عجیب درد تھا تیز ہوا کے شور میں
میرے مکان کی چھت پہ تھے طائرِ شب ڈرے ڈرے
جیسے پیامِ مرگ تھا تیز ہوا کے شور میں

آمنہ امتیاز ـــــــــــ کراچی

خیر و شر کی خبروں کو مانتے تو سب ہی ہیں
کس کو ہوش رہتا ہے جبر اور ضرورت میں
دونوں درد دیتی ہیں آہ سرد دیتی ہیں
فرق کچھ نہیں ایسا نفرت و محبت میں

الماس علی ـــــــــــ کراچی

ایک سیدھی بات ہے ملنا نہ ملنا عشق میں
اس پہ سوچو گے تو یہ بھی مسئلہ بن جائے گا
میرے سینے میں ابھی اک جذبۂ بے نام ہے
ضبط کرتے کرتے حرفِ مدعا بن جائے گا

ہما کاشف ـــــــــــ کورنگی

مل گیا تھا سکوں نگاہوں کو
کی تمنا تو اشک بھر آئے
گل ہی اکتا گئے ہیں گلشن سے
باغباں سے کہو نہ گھبرائے

ذکیہ خان ـــــــــــ لاہور

اس جگہ عقل نے دھوکے کھائے
جس جگہ دل ترے فرمان گئے
کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ امنگ
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے

ادیبہ شمشاد، منیبہ شمشاد ـــــــــــ باغ

برباد کرنے کے اور بھی راستے تھے فراز
جانے کیوں انہیں محبت کا ہی خیال آیا

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

بیف اینڈ کرسپی نوڈلز

اشیاء :

گائے کا گوشت	آدھا کلو
ابلے نوڈلز	آدھا پیکٹ
گاجر	دو عدد
شملہ مرچ	دو عدد
بند گوبھی	ایک کپ
پسے ہوئے ٹماٹر	ایک کپ
کارن فلور	آدھا کپ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
ادرک لہسن (باریک کٹے ہوئے)	ایک کھانے کا چمچہ
ووسٹر شائر سوس	ایک کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

دو کھانے کے چمچے تیل گرم کرکے اس میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فرائی کریں۔ اب ان میں ایک کپ پسے ہوئے ٹماٹر شامل کریں۔ ادرک، لہسن، کالی مرچ، گرم مسالا، لال مرچ شامل کر کے ہلکی آنچ پر بیس منٹ پکائیں اس کے بعد گاجر، شملہ مرچ، بند گوبھی ڈال کر تیز آنچ پر دو منٹ پکائیں اور چولہا بند کر دیں۔ اب آدھا پیکٹ نوڈلز کو ابال لیں اور ان ابلے ہوئے نوڈلز کو کارن فلور میں ڈپ کر کے گرم تیل میں فرائی کریں۔ آخر میں پہلے ڈش میں نوڈلز ڈالیں اور گوشت اور سبزیاں اوپر ڈال کر سرو کریں۔

اسپیشل کڑاہی کباب

اشیاء :

قیمہ	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
ادرک لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے

ہری مرچ	تین عدد
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
ڈبل روٹی کے سلائس	دو عدد
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ

گرم مسالا	ایک چائے کا چمچ
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
دودھ	ایک کپ

ترکیب :

ڈبل روٹی دودھ میں بھگودیں۔ باقی چیزیں قیمہ میں مکس کریں۔

مسالا بنانے کے لیے :

ٹماٹر	آدھا کلو (ابال کر میش کرلیں)
آئل	ایک کپ
لیموں کا جوس	دو چائے کے چمچے
پیاز	ایک عدد
ہری مرچ	دو یا تین
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

سب سے پہلے کڑاہی میں آئل ڈالیں۔ جب تیل گرم ہو تو پیاز تل کر براؤن کرلیں۔ پھر اس میں ابلے میش کیے ٹماٹر، زیرہ، چینی، نمک، لیموں کا رس اور ہری مرچ ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر رکھ دیں۔ دودھ میں بھیگی ڈبل روٹی بھی قیمہ میں شامل کردیں اور کباب بنالیں۔ کباب سیخ کباب کی شکل میں بنائیں، تمام کباب بنا کر مسالے میں ڈال دیں۔ اوپر سے ہرا دھنیا ڈال کر ہلکی آنچ پر پندرہ سے بیس منٹ رکھیں، آنچ بہت ہلکی رکھنی ہے۔ جب تیل اور مسالا الگ ہو جائے اور کباب گل جائیں تو تھوڑا سا مسالا اور دھنیا چھڑک کر اتارلیں۔ بہترین کڑاہی کباب تیار ہیں گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

ویجیٹیبل ٹیمپورا

اشیاء :

آلو	ایک پاؤ
گاجر	ایک پاؤ

شملہ مرچ	ایک پاؤ
پیاز	ایک پاؤ

ہٹو بنانے کے لیے :

میدہ	ایک کپ
بیسن	ایک کپ
کارن فلور	آدھا کپ
لال مرچ پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
ہلدی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
لہسن پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
اوسٹر سوس	دو کھانے کے چمچے
بیکنگ سوڈا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

تمام سبزیوں کو سلائسز کی شکل میں کاٹ لیں۔ اس کے بعد میدہ، بیسن، کارن فلور، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، نمک، گرم مسالا پاؤڈر، لہسن، پیسٹ بیکنگ سوڈا اور اوسٹر سوس کو ایک پیالے میں ڈال کر مکس کریں۔ پھر اس میں تھوڑا تھوڑا پانی شامل کرکے بتدریج گاڑھا پیسٹ تیار کرلیں۔ اب ایک کڑاہی میں آئل گرم کریں اور کٹی ہوئی سبزیوں کو آمیزے میں ڈبو کر آئل میں ڈیپ فرائی کریں۔ نکال کر ٹشو پیپر کے اوپر رکھیں اور چٹنی کے ہمراہ گرم گرم سرو کریں۔

کچھ موتی چُنے ہیں

ادارہ

مشرقی لڑکیاں

ہم مشرقی لڑکیاں بھی عجیب ہیں' شاید محبت ہمارے بس کا روگ نہیں' ہمارا خون و ضمیر شاید اس جذبے کے لیے موزوں نہیں۔ ہم محبت کر بھی لیں تو اسے نبھانا مشکل اور اگر نبھالیں تو زندگی گزارنا مشکل۔ محبت میں ہونے والی وہ لمحے بھر کی لغزش' وہ ایک پل کی خودغرضی نہ ہمیں جینے دیتی ہے نہ مرنے دیتی ہے۔ پھر وہ محبت جو ہم نے بہت لڑ کر اور دنیا سے ٹکرلے کر حاصل کی ہوتی ہے' ہمیں اپنا سب سے بڑا گناہ نظر آنے لگتی ہے۔ ایسا گناہ جس پر ہم اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے شرمندہ ہوتے ہیں۔ ہم محبت کے بغیر رہ سکتے ہیں' لیکن خود سے وابستہ رشتوں کے بغیر زندگی گزار ہی نہیں سکتے۔

(وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر... فرحت اشتیاق)
شاہدہ عامر... کراچی

زندگی کی حقیقت

زندگی سب کے لیے ایک ہی سوغات نہیں لاتی' مگر زندگی ہر ایک کا امتحان ضرور لیتی ہے' مگر ناکامی یہ نہیں کہتی کہ جینا چھوڑ دیں۔ زندگی کو پوری طرح جینا ہی اصل زندگی ہے۔

(زندگی اک کہانی... عائشہ ناز علی)
فوزیہ تمریٹ' ام ہانیہ عمران... گجرات

عقیدت

یہ عقیدت' محبت سے کمال اوپر کی چیز ہوتی ہے۔ محبت میں جذبات کا عنصر زیادہ ہوتا ہے اور عقیدت صرف اور صرف حقیقت ہوتی ہے۔ سنا ہوگا "محبت اندھی ہوتی ہے" جب کہ عقیدت ایک دیدہ بینا ہوتی ہے' محبت' شکوے شکایتیں' سچ جھوٹ اور دو بے وقوف' ڈرامہ گیر' جذبات پسند افراد کے درمیان شاید ایک ریت کا پل ہوتی ہے۔ جس کے آس پاس شک' بدگمانی اور بے اعتمادی کے جھکڑ' آندھیاں مسلسل زور آزمائیاں کرتے رہتے ہیں عقیدت میں حسد اور شکوہ نہیں ہوتا۔

(کاجل کوٹھا... محمد یحییٰ)
سلمیٰ زبیر۔ لاہور

وقت کی کمی

امریکی قوم سب کچھ کر سکتی ہے۔ نہیں کر سکتی تو وہ آرام نہیں کر سکتی۔ امریکی اپنے گھر بھی یوں جاتے ہیں جیسے دفتر جارہے ہوں یا ٹورسٹ ہوں۔ وہ ہر سال ہزاروں ناول خریدتے ہیں' مگر ایک دو صفحے سے زیادہ پڑھنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ ہنسنے کے لیے وہ کامیڈی شو کی ٹکٹیں لیتے ہیں اور کامیڈین کو ہنستے ہوئے دیکھتے ہیں کیونکہ ان کے پاس خود ہنسنے کے لیے وقت نہیں ہے۔

(بٹ تمیزیاں... ڈاکٹر یونس بٹ)
ثوبیہ شاہین سلطان

انسان

"انسان بڑی دلچسپ مخلوق ہے پروین۔ یہ جانور کو مصیبت میں دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتا' لیکن انسان کو مصیبت میں مبتلا کر کے خوش ہوتا۔ یہ پتھر کے بتوں تلے ریشم اور بانات کی چادریں بچھا کر ان کی پوجا کرتا ہے' لیکن انسان کے دلوں کو اپنے ناخنوں سے کھروچ کر رستا ہوا خون چاٹتا ہے۔ انسان اپنی کار کے آگے گھٹنے ٹیک کر اس کا ماتھا پونچھتا اور اس کے پہلو کو صاف کرتا ہے اور میلے کچیلے آدمی کو دھکے دے کر اس لیے پرے گرا دیتا ہے کہ وہ ہاتھ لگا کر اس کی مشین کو دھندلا نہ کردے... انسان پتھروں سے' مشینوں سے' جانوروں سے پیار کر سکتا ہے' انسانوں سے نہیں...."

(شہر آرزو۔ اشفاق حسین)
فائزہ بھٹی۔ پتوکی

حسن و صحت

ادارہ

خوب صورت چہرہ

ہر عورت کی اولین خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت خوب صورت نظر آئے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کی جلد ہمیشہ ہی ایسی رہے کہ جس پر نہ کوئی داغ ہو نہ ہی دانہ اور نہ ہی جھریاں، لیکن در حقیقت بہت کم خواتین کا یہ خواب پورا ہو پاتا ہے۔ البتہ کچھ تدابیر و احتیاطوں کے ذریعے ہم بہت حد تک اپنی یہ خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ آج کل بازار میں ہر طرح کی اور ہر جلد کے لیے مصنوعات موجود ہیں جن کے استعمال سے آپ کی رنگت نکھر بھی سکتی ہے اور آپ کی جلد کو تحفظ بھی مل سکتا ہے۔ انہی مصنوعات میں پاؤڈر اور فاؤنڈیشنز بھی شامل ہیں اور جلد کی نمی کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔

میک اپ کرنے سے پہلے اپنے چہرے کو اچھی طرح صاف کر لیجیے

میک اپ لگانے سے پہلے اپنے چہرے کو اچھی طرح صاف کر لیجیے تاکہ چہرے پر کوئی مٹی وغیرہ نہ رہے۔ اس کے لیے ٹونر اور موائسچرائزر کا استعمال بہتر ہے۔ لیکن اگر آپ کی جلد پہلے ہی نرم و ملائم ہے تو صرف کنسیلر ہی سے اپنے چہرے کو صاف کر لیجیے۔ اس کے بعد لوشن اپنے چہرے پر لگائیے۔ لوشن کے بارے میں یہ احتیاط ضرور کیجیے کہ وہی لوشن اپنے چہرے پر استعمال کیجیے کہ جو آپ کی جلد کے لیے موزوں ہو۔ بازار میں ہر طرح کے لوشن موجود ہیں۔ یعنی خشک، چکنی و نازک جلد کے لیے الگ الگ قسم کے لوشن دستیاب ہوتے ہیں۔ اپنی جلد کو مد نظر رکھتے ہوئے لوشن کا انتخاب کیجیے۔ لوشن کے استعمال سے آپ کا چہرہ بھی خوب صورت لگتا ہے اور ساتھ ہی آپ کا میک اپ بھی بہت دیر تک رہتا ہے۔ اب تو ویسے بھی بازار میں ایسے لوشن بھی دستیاب ہیں کہ جو آپ کے چہرے کو سورج کی روشنی کے مضر اثرات سے بچاتے ہوئے آپ کے چہرے کو نرم و ملائم بنا دیتے ہیں۔ لوشن کے استعمال سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کا میک اپ کم سے کم پھیلتا ہے۔ آپ کی جلد چاہے چکنی ہو یا خشک لوشن کا استعمال آپ کے میک اپ کو چار چاند لگا دے گا۔

کنسیلر کو بیس کے طور پر استعمال کیجیے

لوشن سے چہرے کو صاف کرنے کے بعد کنسیلر سے چہرے کو صاف کر لیجیے۔ اکثر خواتین یہ سوچ کر کنسیلر کا استعمال نہیں کرتیں کہ یہ تو بیکار اور غیر ضروری چیز ہے۔ لیکن اس کا فائدہ اس کو استعمال کرنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔ ماہرین کے مطابق کنسیلر کا استعمال نہ صرف جلد کو چمک دار اور صاف بناتا ہے بلکہ چہرے پر موجود داغ دھبوں کو بھی چھپا دیتا ہے۔ بہتر ہے کہ مائع کنسیلر کا استعمال کیا جائے کیونکہ اسے لگانا بھی آسان ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فائدہ ہے کہ آنکھ جیسے نازک عضو پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔

کنسیلر کا انتخاب کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھیے کہ وہی رنگ خریدیں کہ جو آپ کی جلد کی رنگت سے ہلکا ہو۔ اس سے نہ صرف آپ کے چہرے پر قدرتی نکھار آئے گا بلکہ چہرے پر موجود داغ دھبوں کا بھی پتا نہیں چلتا۔ آپ دیکھیں گی کہ کنسیلر کے استعمال سے تھوڑی ہی دنوں میں آپ کی رنگت نکھر جائے گی۔

کنسیلر کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی ہتھیلی پر تھوڑا سا کنسیلر موئسچرائزر کے ساتھ ملائیے اور ایک گاڑھا سا پیسٹ بنا لیجیے۔ اب اس پیسٹ کو اپنے چہرے پر لگائیے۔ ایک بات یاد رکھیے کہ اگر آپ کی آنکھ کے نیچے کوئی زخم ہو یا کوئی داغ ہے تو اس پر کنسیلر انگلی کی مدد سے لگائیے اور اس کو آہستہ آہستہ اس وقت رگڑیے کہ جب تک وہ پوری طرح پھسل نہ جائے۔ یہ نہ ہو کہ کنسیلر کو آپ صحیح طرح سے نہ رگڑیں اور کنسیلر آپ کے چہرے پر یوں ہی چپکا رہے۔ اگر انگلی کی مدد سے کنسیلر لگانا آپ کے لیے مشکل ہے تو آپ اسفنج کی مدد سے بھی کنسیلر لگا سکتی ہیں۔ یہ دھیان رکھیں کہ آنکھوں کے نیچے اسفنج کی نوک کی مدد سے کنسیلر لگائیں۔ اس طرح پورے چہرے پر اچھی طرح کنسیلر لگا لیجیے اور چہرے کو صاف کر لیجیے۔

فیس پاؤڈر کا استعمال بھی اچھا رہتا ہے

جب چہرہ پوری طرح صاف ہو جائے تو پھر فیس پاؤڈر لگا کر میک اپ شروع کر سکتی ہیں۔ دن بدن ترقی کے ساتھ ساتھ میک اپ کی دنیا میں بھی نئی چیزیں آ رہی ہیں۔ انہی میں سے ایک فیس پاؤڈر بھی ہے۔ فیس پاؤڈر کو فاؤنڈیشن سے پہلے لگایا جائے تو میک اپ بھی اچھی طرح لگتا ہے اور ساتھ ہی فاؤنڈیشن کا بھی اچھا لک آتا ہے۔ آج کل تو فیس پاؤڈر بھی ایسے موجود ہیں کہ جو چہرے کو حسین بنانے کے ساتھ ساتھ چہرے کو سورج کی روشنی کے مضر اثرات سے بھی بچاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ **مائیکرو انکیپسولیشن** (Micro Incapsulation) کی بدولت ممکن ہوا ہے۔

مائیکرو انکیپسولیشن (Micro Incapsulation) کو اس طرح سمجھ لیں کہ جیسے آپ کے چہرے پر بہت سارے گہرے حلقے موجود ہیں اور جب آپ فیس پاؤڈر اپنے چہرے پر لگائیں گی تو فیس پاؤڈر میں موجود اجزا ان حلقوں میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ اجزا حلقوں میں شامل ہو کر ان پر اثر انداز ہوں گے اور چہرہ صاف ہو جائے گا۔ اس طرح چہرے کو موائسچرائزر بھی کر دے گا اور چہرہ خوب صورت نظر آئے گا۔ کچھ پاؤڈرز تو اس قدر اچھے ہوتے ہیں کہ جو جلد کو لمبے عرصے تک فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں۔

اسی لیے فاؤنڈیشن سے پہلے فیس پاؤڈر لگایا جاتا ہے اس طرح آپ کا میک اپ آپ کے چہرے کو قدرتی نکھار بھی دیتا ہے اور ساتھ ہی میٹ فنشنگ (Mate Finishing) بھی دیتا ہے۔ ایک اہم فائدہ فیس پاؤڈر کا یہ ہے کہ اس سے میک اپ گھنٹوں تک برقرار رہتا ہے۔

جہاں تک فیس پاؤڈر لگانے کا تعلق ہے تو اس کے لیے برش کا استعمال بہتر رہتا ہے۔ ایک بار اپنے چہرے پر فیس پاؤڈر لگانے کے بعد دوبارہ برش کو چہرے پر پھیریے تاکہ زائد پاؤڈر چہرے سے ہٹ جائے۔

☆ ☆

روبینہ شریف

جواب

ایک مقامی کرکٹ ٹیم نے اپنا بدترین سیزن کھیلا۔ وہ جتنے میچز کھیلی تمام کے تمام ہار گئی کاؤنٹی کی انتظامیہ نے ان سے جان چھڑانے کی ٹھان لی۔
میچ کے دن ایک تماشائی ٹکٹوں والی کھڑکی کے پاس پہنچا اور بولا۔ "پلیز! مجھے دے دیجئے۔"
کلرک نے فوراً کہا۔ "جناب لے جائیں لیکن یہ بتائیں کہ آپ بولر خریدیں گے یا بیٹسمین؟"

گل لالہ۔۔۔پشاور

جگہ

ایک صاحب شادی میں بڑی رغبت سے کھانا کھا رہے تھے۔ ایک شناسا نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا۔
"جناب! پانی کے لیے بھی گنجائش رکھئے گا۔"
وہ صاحب ذرا توقف سے بولے۔ "بھائی! بس کتنی ہی بھری ہوئی کیوں نہ ہو کنڈیکٹر اپنی جگہ خود ہی بنا لیتا ہے۔"

افسوس

ایک کسان نے اپنے بھتیجے کو مرغیوں سے بھرا ہوا ٹوکرا بھیجا' ٹوکرا مکان میں لے جاتے ہوئے بھتیجے کا پاؤں پھسلا ٹوکرا گر کر ٹوٹ گیا۔ اور تمام مرغیاں بھاگ گئیں' دوسرے روز بھتیجے نے کسان کو خط میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔
"میں نے تو پڑوسیوں کے گھر کے اندر تک مرغیوں کا پیچھا کیا لیکن افسوس کہ صرف گیارہ مرغیاں ہاتھ آسکیں۔"
ایک ہفتے بعد کسان کا جواب آیا' اس نے لکھا تھا۔
"لیکن میں نے تو تمہیں صرف چھ مرغیاں بھیجی تھیں۔"

فرزانہ طارق۔۔۔لاہور

کون گرا

بحری جہاز پوری رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ اچانک ایک نئے ملاح نے شور مچا دیا۔ "ایک آدمی سمندر میں گر گیا ہے۔"
چند منٹ میں یہ اطلاع کیپٹن تک پہنچی تو اس نے جہاز کا رخ موڑنے کا حکم دیا۔ جہاز کئی میل پیچھے آگیا تو ملاح ہکلاتے ہوئے بولا۔ "سر! دراصل کوئی آدمی سمندر میں نہیں گرا۔۔۔"
کیپٹن ملاح پر خوب گرجا برسا۔ جہاز کا رخ ایک بار پھر موڑ گیا۔ جہاز تیز رفتاری سے منزل کی جانب روانہ ہو گیا تو ملاح نے گویا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔
"سر! میں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ سمندر میں آدمی نہیں' عورت گری ہے۔"

انشراح۔۔۔کراچی

تلاش

زخمی سپاہی بہت پریشان تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا جینا مشکل کر دیا تھا۔ اسپتال اسے عقوبت خانہ محسوس ہونے لگا تھا۔ بالا خر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور ایک دن اس نے ڈاکٹر کا بازو تھام لیا اور التجا آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ "ڈاکٹر صاحب' بس' اب مجھ پر رحم کریں۔ مجھ سے تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ آپ روزانہ آتے ہیں اور میرے زخم کو کریدتے ہیں۔ اس سے مجھے جو اذیت ہوتی ہے۔ اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔"
ڈاکٹر نے گہرا سانس لیا اور بولا۔ "مجبوری ہے دوست' مجھے ہر حال میں رائفل کی گولی تلاش کرنی ہے۔"

"وہ گولی تو میری جیب میں ہے۔"

فوزیہ ثمرین بٹ۔۔۔ گجرات

لنچ

ایک جگہ ایک ہندو' ایک سکھ اور ایک سردار مزدوری کرتے تھے' ایک روز انہوں نے اپنے لنچ بکس کھولے تو ہندو بولا۔ "اگر کل پھر میری بیوی نے لنچ میں آلو مٹر پکائے تو میں خودکشی کرلوں گا۔"

سکھ بولا۔ "اگر کل پھر میری بیوی نے لنچ میں انڈے پکائے تو میں خودکشی کرلوں گا۔"

سردار جی بولے۔ "اگر کل پھر میرے لنچ میں دال نکلی تو میں خودکشی کرلوں گا۔"

اگلے روز تینوں نے اپنے اپنے لنچ بکس کھولے تو پھر وہی سب کچھ تھا۔ تینوں نے سمندر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔

آخری رسومات کے وقت ہندو کی بیوی بولی۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ انہیں آلو مٹر سے اتنی نفرت ہے تو میں آلو مٹر نہ پکاتی۔"

سکھ کی بیوی نے کہا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ انہیں انڈے سے اتنی نفرت ہے تو میں انڈا نہ پکاتی۔"

سردار جی کی بیوی بولی۔ "مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ وہ تو اپنا لنچ خود بنایا کرتے تھے۔"

اریبہ۔۔۔ گوجرہ۔

اب کس کی باری ہے

ایک قصاب کا انتقال ہوگیا۔ اس کی بیوہ میت کے سرہانے کھڑی ہو کر رو" رو کر لوگوں سے کہنے لگی۔ "ہائے تیرا ٹوکا کون لے گا؟۔ تیری چھری کون لے گا؟۔ تیری دکان کون لے گا؟ تیرے جانور کون لے گا؟"

اس کی ہر بات کے جواب میں ایک ہی آدمی کھڑا ہو جاتا اور کہتا۔ "میں لوں گا۔ میں لوں گا۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے مگر ہائے تیرا قرض کون ادا کرے گا؟" بیوہ نے پھر پوچھا۔

یہ سن کر وہی آدمی پھر کھڑا ہوا اور باقی لوگوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "بولا بھائیو! اب کس کی باری ہے؟"

کرن شمشاد۔۔۔ اسلام پورہ

ایک دن

استاد امتحان میں فیل ہونے پر شاگرد سے۔

استاد! "تمہارے فیل ہونے کی وجوہات ذرا تفصیل سے بتاؤ۔ آخر تم ہمیشہ فیل ہی کیوں ہوتے ہو۔"

شاگرد لمبی سانس لے کر۔ "سر ایک سال میں 365 دن ہوتے ہیں۔ ان میں روزانہ آٹھ گھنٹے سونے کے لیے یعنی سال میں 122 دن سونے کے لیے یہ ہوئے دن 365-122=243 ۔ عید' بقر عید کی چھٹیاں اور گرمیوں کی چھٹیاں تقریباً" 61 دن' یہ ہوئے دن 243-61=182 ۔ اب رہے اتوار وہ ہوتے ہیں کل 52 یعنی دن 183-52=130 تہواروں کے 15 دن اور سردیوں اور بہار کی چھٹیاں تقریباً" 40 دن یعنی کل 55 دن۔ اب رہے دن 130-55=75 ۔

کھانے پینے کے 3 گھنٹے روزانہ۔ یہ ہوئے 46 دن' یعنی دن 75-46=29 دوستوں سے ملنے ملانے کا روزانہ ایک گھنٹہ یعنی یہ ہوئے 15 دن اس طرح دن 29-15=14 بیماری وغیرہ کے لیے اندازاً" 10 دن۔ یہ ہوئے دن 14-10=4 کم سے کم ٹی وی دیکھنے کے 3 دن۔ یہ ہوئے دن 4-3=1

سر! سال میں ایک دن بچا وہ دن ہوا میری سالگرہ کا کیا وہ بھی نہ مناؤں۔ اب آپ خود فیصلہ کریں۔"

رضوانہ ملک۔۔۔ جلال پور

اس ماہ کا خط
سلمیٰ زبیر۔۔۔ لاہور

جنوری کا شمارہ 15 کو ملا جو کہ بہت لیٹ تھا۔ بہت انتظار کرنا پڑتا ہے کرن کے لیے! جیسے ہی ملا دل خوش ہو گیا۔ ماڈل تو بہت خوب صورت لگ رہی تھی' خاص اس کا جوڑا اس پر بہت سوٹ کر رہا تھا اور سونے پر سہاگہ میرا فیورٹ کلر زیب تن کیا ہوا سرورق تو برا ہو ہی نہیں سکتا!

اب آتے کرن کی طرف جو اپنی پوری خوب صورتی کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں۔ سب سے پہلے حمد و نعت سے مستفید ہوئے۔ سارہ خان سے ملاقات اچھی رہی "میری بھی سنیے" میں سلمیٰ خان میری فیورٹ ہیں۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا آواز کی دنیا میں انعم قاضی بھی بس ٹھیک ہی تھی!

"آسیہ مرزا" نے تو پہلی قسط میں ہی کمال کر دیا کافی جان دار اسٹوری ہے پڑھ کر مزا آیا سب سے اچھا کردار تو حوریہ اور حازم کا لگا! کہیں فضا کا افیئر بابر سے تو نہیں چل رہا خیر دیکھا جائے گا "راپنزل" میں مجھے نینا اور سلیم کا کردار ذرا نہیں بھاتا اور پلیز شیریں کو کچھ نہ ہو سمیع اور شیریں کے والدین ان سے راضی ہو جائیں۔ "ردائے وفا" میں نائلہ مر گئی یہ بالکل اچھا نہیں ہوا اب تو اس نے اپنے آپ کو خاصا بدل دیا تھا مانا کہ برائی انسان کا پیچھا موت تک کرتی ہے مگر توبہ بھی تو کسی چیز کا نام ہے اب پلیز حدید کے دل میں جو نائلہ کی عزت ہے وہ بنی رہے' اور معراج بھی عفت کو طلاق نہ دے پلیز اس کا اینڈ ٹھیک کیجیے گا۔ نایاب نے بھی کمال کر دیا میری صرف ایک گزارش ہے کہ ماہ رو اپنے آپ کو اتنا مت گرائے آخر ہے تو ایک عورت! پلیز فریحہ کی شادی عاشر سے ہو جائے اور عون عباس کی ماہ رو سے۔ اور ماہم کو بھی اچھی دوست بننا چاہیے ناکہ اسے الٹے سیدھے مشورے دینے چاہئیں خیر دیکھتے ہیں کہ نایاب جیلانی نے کیا سوچ رکھا ہے۔

دعا ہے کہ فائزہ جی جلدی سے صحت یاب ہو جائیں اور پھر کرن کے لیے لکھیں۔

"رنگ آگہی" اور "تحفہ" نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی "رنگ آگہی" میں بڑے ابا کا کردار اور ہلال کا بہت فنی تھا پڑھ کے مزا آیا!! درامت العزیز نے جیسے خوب صورتی سے شروع کیا اس سے زیادہ شاندار اس کا اینڈ کیا۔ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف۔ اس بار شفق افتخار اور ندا حسنین نے بازی مار لی۔ باقی افسانے بھی ٹھیک تھے۔ مجھے ہر رائٹر سے بس ایک شکوہ ہے کہ جہاں پیار ہوتا ہے وہاں اعتبار بھی ہونا چاہیے "بس تم ہی ہو" میں ماہم کیسے بدگمان ہو گئی تھی خضر سے۔۔۔! تم یاد بہت آئے "میں زلیخا سانول سے۔ پلیز محبت کا دوسرا نام اعتبار ہے پلیز کوئی بھی کچھ بھی ہو جائے ایک محبوب کو محبوبہ سے اور ایک محبوبہ کو محبوب سے بدگمان مت کیجیے گا۔

ج: سلمیٰ! ہماری کوشش تو ہوتی ہے کہ کرن جلد از جلد آپ کو مل جایا کریں مگر پھر بھی آپ کو انتظار کرنا پڑتا ہے اس کے لیے معذرت۔ تمام رائٹرز تک آپ کا شکوہ پہنچ گیا ہو گا کرن پسند کرنے کا شکریہ۔

توسیہ شاہین۔۔۔ ملتان

سب سے پہلے تو میں کہنا چاہوں گی کہ میں کرن کی پرانی قاری ہوں اب جو کرن کا معیار تیزی سے بڑھا ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ اس کے لیے داد قبول فرمائے۔ سال نو نمبر کا ٹائٹل مناسب تھا۔ سب سے پہلے تو سروے دیکھا۔ اپنا نام نہ دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ بہرحال سروے پسند آیا۔ اس کے بعد سلسلے وار ناول کی فہرست میں آسیہ مرزا کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی ماضی میں انہوں نے بہت اچھی کہانیاں تحریر کی ہیں۔ باقی دونوں سلسلے وار ناول بھی اچھے جا رہے ہیں سارے افسانے ہی لاجواب تھے مگر مجھے سب سے زیادہ ندا حسنین کا "بہروپیا راجہ" پسند آیا۔ ہلکا پھلکا سا میں نے ایک بات محسوس کی ہے کہ ندا نئی ہونے کے باوجود بہت اچھا لکھتی ہیں۔ امید ہے کہ انہیں آگے بھی کرن میں پڑھنا نصیب ہو گا۔ شبینہ گل' شفق

افتخار اور ماہم علی کے افسانے ٹھیک تھے۔ ناولٹ میں امت العزیز بازی لے گئیں۔ مکمل ناول میں اپنی پسندیدہ رائٹرز صدف آصف اور نایاب جیلانی کا نام خوشی دے گیا۔

سب سے پہلے بات ہو جائے "اسیر وفا" کی بہت اچھے انداز میں تحریر کیا۔ جس کی حساس کہانی نے دل کو چھو لیا۔ نایاب جیلانی کی کیا بات ہے ان کو "زبردست" بولیے گا۔ باقی سلسلے بہت اچھے لگے۔ باقی باتیں آئندہ کے لیے اٹھا کر رکھ دیتے ہیں۔

ج : پیاری ثوبیہ! آپ کی داد قبول کرتے ہیں۔ آپ نے سروے کے جوابات بھیجے تھے؟ مگر ہم کو موصول نہیں ہوئے ورنہ آپ کا نام بھی ضرور شامل کیا جاتا۔ نایاب جیلانی تک آپ کی مبارک باد پہنچا دی جائے گی۔ کرن کو پسند کرنے کا شکریہ آئندہ بھی آپ خط لکھتی رہیے گا۔

صبا خان..... بہاولپور

سب سے پہلے تو اتنا اچھا پرچہ پیش کرنے پر مبارک ہو ۔ محنت دکھائی دیتی ہے' کہانیوں کا سلیکشن کافی بہتر ہوا ہے۔ سال نو نمبر کا ٹائٹل کافی فریش لگا۔ اس کے بعد سلسلے وار ناولوں پر نگاہ ڈالی۔ سارے اچھے جا رہے ہیں۔ آسیہ مرزا کو بہت عرصے بعد کرن میں دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کے بعد سروے دیکھا پسند آیا۔ اس ماہ کے سارے افسانے ہی پڑھ ڈالے اچھے لگے۔ مگر مجھے ندا حسنین اور شبینہ گل کے افسانے بہت اچھے لگے۔ اس کے بعد دونوں ناولٹ کی باری۔ امت العزیز کافی اچھا لکھتی ہیں۔ نایاب جیلانی کا مکمل ناول اچھا ہے۔ صدف آصف نے بھی ایک عمدہ ناول لکھا۔ ویل ڈن باقی تمام سلسلے بھی بہت اچھے لگے۔ مگر شاعری سب پر سبقت لے گئی۔

ج : پیاری بہن صبا! آپ کو سال نو کا پرچہ پسند آیا آپ کی پسندیدگی کا شکریہ۔

نائلہ یاسمین... لاہور

میں نے کرن میں ایک مرتبہ پہلے بھی خط لکھا تھا غالباً آپ کو موصول نہیں ہوا۔ میں آپ کا ڈائجسٹ دو سال سے پڑھ رہی ہوں۔ ایک دن اتفاق سے کرن کے مطالعے کا موقع ملا ۔ کرن کی سب تحریریں لاجواب ہیں جن کی تعریف کے لیے مجھے لفظ نہیں ملتے۔ ڈائجسٹ پڑھتے پڑھتے مجھے لکھنے کا شوق ہوا۔ البتہ میں کبھی کبھار اشعار اور غزل وغیرہ بھی لکھتی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی تحریریں آپ کے ڈائجسٹ میں بھیج سکتی ہوں براہ مہربانی میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔

ج : نائلہ! آپ نے کرن میں خط لکھا بہت خوشی ہوئی آپ اپنی تحریریں ضرور بھیج سکتی ہیں قابل اشاعت ہونے کی صورت میں ضرور شائع کی جائیں گی۔ کرن پسند کرنے کا بے حد شکریہ امید ہے آئندہ بھی آپ خط لکھتی رہیں گی۔

فوزیہ ثمریٹ۔ ام ہانیہ عمران..... گجرات

دو ماہ بعد حاضر خدمت ہوں غیر حاضری کی وجہ 12 نومبر کو میرے ابو جی فوت ہو گئے۔ آپ سے بہنوں گزارش ہے میرے ابو جی کے لیے دعائے مغفرت ضرور کیجیے گا۔ رب عظیم ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

جانے والے ایسی جگہ چلے جاتے ہیں جہاں ہمارے آنسو انہیں واپس نہیں لا سکتے۔ ایسا دکھ جس کا ازالہ ناممکن ہے۔

سال نو کا کرن 12 جنوری کو ہی مل گیا۔ ہاتھ میں پکڑتے ہی ابو جی کی یاد آ گئی۔ ہر مہینے ابو جی اور میری تکرار ہوتی تھی۔ جب تک ابو رسالہ لا کر نہیں دیتے تھے۔ میں پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔

سال نو کا ٹائٹل حسب روایت ہی لگا۔ میک اپ' ہیئر اسٹائل بہت پیارا تھا۔ شرٹ کا ڈیزائن خاص پسند نہیں آیا۔

کرن کے ساتھ مفت کتاب "ستارے کیا کہتے ہیں" اوہو کیا کہنا ہے۔ اب ستاروں نے ہمارے ستارے تو اسٹل ہو گئے ہیں ایک ہی جگہ جامد پھر ان کے متعلق جان کر ایویں ہی سر ہی کھپایا تھا ناں۔

حمد باری تعالیٰ نعت رسول مقبول سے مستفید ہوئے۔ "سکھیوں کچھ تم ہی کہو" سب نے اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ خاص کر شاء شہزاد اور حرا قریشی چھائی ہوئی نظر آئی۔

خوب صورت مسکراہٹ والی سارہ خان بہت اچھی لگی۔ ویل آف فملیز کی لڑکیاں بھی شوبز میں آ رہی ہیں اچھا شگون ہیں۔

"میری بھی سنیے" سلمیٰ خان کی باتیں کچھ ادھوری اور چھپی چھپی سی لگی۔ تھوڑا تفصیل سے بتائیں نا اپنے بارے میں۔

"آواز کی دنیا سے" آنکھ میچ کر آگے نکل گئے۔ خاص دلچسپ نہیں لگا مجھے یہ سلسلہ۔

کرن کا نیا ناول "من مورکھ" ابھی تو ابتدا ہے یقیناً" قابل توجہ رہے گا۔ آسیہ جی سپرہٹ مصنفہ ہیں۔ خاص الخاص تو ہوگا۔ مگر ابتدا میں ہی اک گزارش ہے کہ پلیز تحریر زیادہ طویل مت کیجیے گا مکمل ناول "دل ٹوٹ کے ہارا تھا" دوسری قسط پڑھی اف اتنا سخت دل ہیرو ماہ رو چلو مان لیا کہ امیر گھرانے کی ہیں اب اتنی بھی گئی گزری نہیں ہوتی یہ امیرزادیاں کے ایڈوینچر کے نام پر اپنے آپ کو ڈی گریڈ کرواتی پھریں "تم یاد بہت آئے" مکمل ناول بہت اچھا لگا۔ تحریر کچھ خاص نہ تھی۔ وہی روایتی اسٹوری مگر گاؤں کی کیا منظر کشی کی ہے۔ بہت عرصے بعد گاؤں کے مطابق تحریر پڑھ کر مزا آیا' بہت سا دکھ تھوڑا سہنے کے بعد آخر زلیخا سانول کو مل ہی گئی۔

مکمل ناول "اسیر وفا" تھوڑا قابل قبول ہی تھا۔ ہیرو ہیروئن ہیرو سے زیادہ مجھے بھابھی جی کا کردار اچھا لگا۔ طائلہ کتنی خوش نصیب تھی جو اتنی اچھی بھابھی اسے ملیں....

ناولٹ "رنگ آگہی" تھوڑا اچھا تھوڑا بور سا لگا۔ اصل میں فرح بخاری نے مزاح کا تڑکا لگانے کی کوشش کی تھی۔ مگر مجال ہے جو مجھے بلال کی کسی بھی بونگی بات پہ ہنسی آئی ہو۔

بلال کے بڑے ابا قسمت کے دھنی نکلے بچھڑی محبت حاصل کرلی ننھی پری خوش قسمت رہی جو اپنے دادا ابو کی شادی میں شامل ہوگئی۔

مستقل ناول "راپنزل" اس بار قسط پڑھی صوفیہ کی سادگی پہ ہنسی آئی۔ کتنا اندھا اعتماد کرنے لگی ہے کاشف پر اور کاشف جیسے مردان کو بس کھلونا چاہیے ہوتا ہے۔ وقت گزارنے کے لیے چاہے حبیبہ ہو یار خشی۔

"ردائے وفا" آئے ہائے یہ کیا کیا آپ نے فرحین جی نائلہ بے چاری فیل ہوگئی۔ تو کیا تبسم کو ایسے ہی چھوڑ دیں گی آپ۔ یہ تو کوئی بات ناں ہوئی عفت بے چاری کی ناؤ پار لگا ہی دیں۔ حدید بچارے کا کیا کرنا ہے اور حبیب کسی خوشی میں ماہا کے ساتھ اوکھا ہو رہا ہے ماہا کا حبیب کے بیٹے کے ساتھ اتنا سخت رویہ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اگر حبیب کا دل جیتنا چاہتی تو اس کے بیٹے کے لیے کچھ تو گنجائش نکالنی پڑنا تھا اس سے اچھے طریقے سے بات کرلیتی۔ چلیے ہی جانا تھا۔

افسانے ایک سے بڑھ کر ایک لگے۔ "گریبان" کافی سبق آموز تھا۔ ہر گھر کی داستان بیان کرتا ہوا۔ اصل میں گریبان میں جھانکنے کا بہت کم رواج رہ گیا ہے۔ اور اسی لیے پھر ایسی کہانیاں جنم لے رہی ہیں۔ "بہترین تحفہ" ماہم علی کی چھوٹی سی کاوش اچھی تھی۔ میری فیورٹ سعدیہ عزیز صاحبہ دکھوں کو خوب صورت طریقے سے بیان کرنے والی رائٹر "اماں جی" تحریر سمجھ سے بالاتر تھی۔ مستقل سلسلے اچھے لگے۔

ج : پیاری فوزیہ ثمر! آپ کی کمی محسوس ہوئی تھی اور دل سے بے ساختہ یہ دعا نکلتی کہ آپ خیریت سے ہوں۔ آپ کے والد صاحب کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور بلند درجات عطا فرمائے۔ مگر خوشی ہوئی اس بات کی کہ آپ اس غم سے نکل آئیں اور کرن پر تبصرہ کیا اور بھرپور کیا شکریہ۔

سعدیہ اقبال..... کراچی

سب سے پہلے اپنے پیارے کرن کی تعریف میں عرض کروں گی کہ کیا کہنے۔ کرن تو میری زندگی میں سایہ دار درخت ہے' ٹھنڈی میٹھی ہوا ہے' میرے سانس لینے کا ذریعہ ہے۔ کرن کی ہر کہانی زبردست اور قابل تعریف ہے اس کے ہر صفحے پر نصیحت اور اعلا زندگی کے گر ہیں۔ مجھے لگتا ہے میں تو کرن کی سب سے بڑی فین ہوں۔ کرن سے ہی مجھے لکھنے کا شوق چڑھا ہے۔ اور اتنے عرصے بعد آخر ہمت کرکے میں نے ایک تحریر لکھ ہی لی۔ مجھے امید ہے میری یہ کہانی کرن کے سنہرے صفحات پر ضرور جگمگائے گی۔ پہلی دفعہ کرن کے لیے لکھا ہے خدا کرے آپ سب کو پسند آئے کوئی غلطی کوتاہی ہو تو معافی۔ ایسے ہی ہماری زندگیوں میں بہار لاتا رہے۔

ج : سعدیہ! کرن کو اس قدر پسند کرنے کا بے حد شکریہ کرن سے آپ کی اتنی محبت اچھی لگی۔ آپ کی کہانی قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔

اسماء خان..... کے جی ایم

ناسازی طبیعت کی بنا پر خط نہ لکھ پائی وجہ آپریشن اور اس کے بعد طویل بیماری پر آج خط لکھنے سے خود کو نہ روک سکی اس ماہ کا ٹائٹل اچھا نہیں لگا پر تحریریں ساری زبردست تھیں ناول "راپنزل" کی تو بات ہی الگ ہے اور

"ردائے وفا" بھی زبردست ہے مطلب کرن کی جان ہیں یہ دونوں اور باقی بھی اچھی تھیں آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی پلیز خط ضرور شائع کیجئے گا۔

ج : پیاری بہن اسماء! آپ نے طبیعت کی ناسازی کے باوجود خط لکھا بے حد شکریہ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ (آمین)

ثناء شہزاد...... کراچی

سال نو کا شمارہ حسب معمول 10 تاریخ کو ملا ماڈل کا ڈریس اچھا لگ رہا تھا اداریہ اور حمد و نعت پڑھ کر سکھیوں سے ملے سب کے جوابات اچھے تھے۔ سارہ خان اور سلمیٰ حسن سے ملنا اچھا لگا۔ "میری بھی سنیے" میں انعم قاضی کی سنی "شادی مبارک" میں صبا آصف نے اپنی بیٹی بنزہ کی شادی کا احوال بڑے خوب صورت انداز میں لکھا پڑھ کر ایسا لگا ہم بھی موجود ہیں اس شادی میں ماشاء اللہ کپل بہت پیارا لگ رہا تھا اللہ نظر بد سے بچائے (آمین) افسانے اس بار سب اچھے تھے لیکن جو نمبر ون رہا وہ "بہترین تحفہ" ماہم علی کا تھا جو قرآن پاک سے اچھا اور قیمتی تحفہ تو روئے زمین پر کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ گریبان میں جو کچھ بیان کیا وہ تقریباً "ہر گھر کی کہانی ہے" "بس تم ہی ہو" شفق افتخار نے بھی اچھا لکھا خضر کو حریم ہی ملنی چاہیے تھی "اماں" کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔ "من مورکھ کی بات" آسیہ مرزا کے ناول کی پہلی قسط پڑھی ابھی کچھ تبصرہ نہیں کر سکتی ویسے حازم کی ہیروئین حوریہ ہوگی اتنا مجھے اندازہ ہے دو تین اقساط پڑھنے کے بعد پتا چلے گا کہ مومنہ کے ساتھ کیا ٹریجڈی ہوئی اور کہانی میں کیا کیا راز پوشیدہ ہیں" ردائے وفا" میں نائلہ سدھر تو گئی تھی اسے کہانی سے کیوں ہٹا دیا شبیر کو ہٹانا چاہیے تھا۔ عفت کی جوڑی تو معراج سے بن گئی اب حدید کا کیا ہوگا نائلہ کی موت کا سین بہت درد ناک تھا حسیب ماہا کے ساتھ بالکل ٹھیک کر رہا ہے اب دیکھتے ہیں فرحین صاحبہ آخری قسط میں کیا کرتی ہیں بس اینڈ اچھا ہونا چاہیے" راپنزل "میں تنزیلہ ریاض نے سمیع پر بہت ظلم کیا شہرین کو برین ٹیومر ہے۔ سمیع تو پاگل ہو گیا سن کر وہ تو دیوانوں کی طرح چاہتا ہے شہرین کو نینا نے رانیہ کو جو سمجھایا وہ اچھا لگا کہ ہر لڑکی راپنزل ہوتی ہے" رنگ آگہی "فرح بخاری نے بھی اچھا لکھا ہنسی مزاح سے بھرپور ناولٹ مزا دے گیا۔ بڑے ابا کو ان کی پہلی محبت کا بچھڑا پیار اتنے سال بعد مل ہی گیا ویسے بھی ایک سچے اور مخلص ساتھی کی ضرورت تو انسان کو ہر دور میں پڑتی ہے مگر بڑھاپے میں سفر کا ساتھ ہونا ضروری ہے "تحفہ" میں ایان کو سب نے مل کر خوب سبق سکھایا مجھے تو لگا تھا کہ داؤد ایمن کا ہیرو ہوگا "اسیر وفا" صدف آصف کے قلم کی تحریر ہو اور اچھی نہ ہو تو یہ تو جناب ہو نہیں سکتا فہام کو طائلہ سے محبت اتنا ٹائم گزرنے کے بعد ہوئی جبکہ اسے تو نکاح کے بعد ہی محبت ہو جانی چاہیے تھی کیونکہ نکاح کے بولوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ دو اجنبی انسان ایک دوسرے سے خود محبت کرنے لگتے ایک دوسرے کے لیے اہم ہو جاتے ہیں۔ "تم یاد بہت آئے" بھی اچھا تھا سانول کو اس کا پیار بالآخر دس سال بعد مل ہی گیا۔ ثمینہ کوثر کو شادی کی بہت بہت مبارکباد قبول ہو ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں پروردگار آپ کی جھولی خوشیوں سے بھر دے (آمین) فائزہ بھٹی کا بہت بہت شکریہ مجھے دعا دینے کے لیے باقی سب بہنوں کے تبصرے اچھے لگے بلکہ پورا کرن بیسٹ تھا ارے سب سے اہم بات تو بھول ہی گئی کہ اس بار فائزہ افتخار کے شاید کی کمی بہت زیادہ محسوس ہوئی۔ پلیز خط کو اس محفل میں ضرور شامل کیجئے گا۔ تاکہ میں کرن کو کبھی نہ چھوڑوں اس کا اور میرا ساتھ ہمیشہ یونہی برقرار رہے۔

ج : ثنا تبصرہ کرنے بلکہ اتنا اچھا تبصرہ کرنے کا بے حد شکریہ۔ ان شاءاللہ۔ آپ کا اور کرن کا ساتھ ہمیشہ رہے گا۔

انیقہ انا...... چکوال

مجھے خود کو یقین دلانا مشکل ہے کہ میں کرن سے کم و بیش ایک سال دور رہی کہاں ایک شمارہ پڑھنے کے بعد دوسرے کا شدت سے انتظار رہتا تھا ورنہ کرن کو بھولنا.... کرن نے ہی تو "انیقہ انا" کو پہچان دی ہے.. ہو سکتا ہے آپ نے مجھے بھولی بسری کہانی کی طرح فراموش کر دیا ہو شاید' آخر کار! مزاج کی ساری تلخی کرکری کرتے ہوئے میں نے پھر سے پرانی جون میں لوٹنے کی تیاری کی۔ رات دن کا فرق بھلا کر (پہلے کی طرح) ایک ہی رات میں سارا رسالہ پڑھا کرن ہی نہیں پڑھا' خود سے ملی ایک لحاظ سے میرے لیے کرن (جنوری کا) اب پڑھنا اچھا رہا کہ دو نئے سلسلے وار ناول آغاز سے ہی پڑھنے کو ملے۔ راپنزل کی گزشتہ تمام اقساط پڑھ چکی ہوں۔ "شاید" پڑھنا باقی ہے۔ اب تبصرے کی طرف آتی ہوں۔

''من مورکھ'' سچ کہتی ہیں آسیہ مرزا کہ دل کی بات نہیں ماننی چاہیے۔ نری خواری یہ وہی آسیہ ہیں نا! ''دل اک شہر جنوں'' والی۔ میں نے ان کا ایک وہی ناول پڑھا تھا' اور ان کے مداحوں میں شامل ہو گئی تھی۔ پہلی قسط ہے ابھی تو کردار بھی واضح نہیں کہانی پر تبصرہ تو بعد میں ہی ہو سکے گا۔ لیکن امید واثق ہے کہ شاندار تحریر ہو گی۔

تنزیلہ ریاض کا نام بھلا کب کسی تعریف کا محتاج ہے؟ ہر ہر دو تبصرہ پر راپنزل کا گمان ہوتا ہے۔ نبینا' اس ناول کا سب سے جاندار کردار ہے۔ لیکن اپنے ابا سے اس کی خفگی ہمیں راز کھلنے تک ورطہ حیرت میں ڈالے رکھے گی۔

نایاب جیلانی کا نام پڑھتے ہی ذہن میں ایک شدت پسند عاشق و معشوق کا تصور آتا ہے۔ ان کی تحریریں مجھے اپنی اسی شدت پسندی کے باعث پسند ہیں کہ محبت ہو یا نفرت' آخری حدوں کو چھوتی ہوئی ہو۔ (اپنا اپنا نظریہ) مذکورہ ناول میں یہ دیکھنا ہے کہ ماہ رو کی بیکراں سمندری پرجوش طوفانی محبت کے سامنے' عون عباس استقلال کی چٹان بنا کھڑا رہے گا؟ کیونکہ چٹانیں ہی بپھرے سمندر کی شدت سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہیں' سمندر کو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو نفرت و محبت سے بھی موتی اندر جذب کرلیتا ہے۔ نایاب' یقیناً'' دیگر تمام تحاریر کی طرح آپ اس ناول کو بھی حد درجہ خوب صورتی سے نبھائیں گی۔

ماضی اور حال کے آئینے میں جھانکتی' خود کلامی کا سا انداز لیے' بشریٰ گوندل کی کہانی کچھ زیادہ متاثر کن نہ لگی البتہ' انداز تحریر اچھا تھا۔

''اسیر وفا'' میں پھر وہی نکتہ کہ عورت مشرق کی ہو یا مغرب کی' محبت کے نام پر پاگل ہو ہی جاتی ہے۔ اس محبت کے آگے؟ کوئی عورت بھلے کتنی ہی باشعور اور سمجھ دار کیوں نہ ہو' بخوشی نا سمجھ بن جاتی ہے اور یہ بیوی بن کر مرد کا دل بھی جیت لیتی ہے۔ لیکن عجیب ہے کہ لزا کی محبت کا دم بھرنے والے فہام نے اتنی جلدی قدم پیچھے ہٹا لیے۔ کیا کہیں کہ طائلہ کی دعائیں رنگ لائیں یا لزا کی محبت میں کمی تھی؟ بہرحال جو بھی تھا' تحریر اچھی تھی۔

''رنگ آگہی'' میں ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ بہت عمدگی سے ایک بڑا مسئلہ بیان کردیا کہ مرد و عورت کا بچوں کی شادی کے بعد خود شادی کرنا برا نہیں' جبکہ مذہب میں بھی کوئی روک نہیں۔ ''تحفہ'' بھی اچھا تحفہ رہا۔ ہنستی مسکراتی تحریر۔ شکر ان کو عقل آگئی اور مزید شکر کہ داؤد'

پاکستان ثانیہ کے لیے آیا تھا۔ ایمن پر فریفتہ نہ ہوا۔

افسانوں میں سعدیہ عزیز اور شبینہ گل' بازی لے گئیں۔ شفق افتخار نے بھی خوب لکھا' لیکن حریم کا ماہا کی باتوں میں آنا' (اف یہ محبت بھی)۔ ان دنوں ''حریم'' نام کچھ زیادہ ہی فیشن میں ہے۔ ہر دوسری کہانی میں ہے (ہاہاہا.... معذرت)

مستقل سلسلوں میں ''موتی چنے ہیں'' نیا سلسلہ اچھا اضافہ ہے۔ آپ خطوط کے جواب دیتی ہیں' یہ سب سے اچھا ہے۔ اشعار و غزلیں بھی خوب رہیں۔ بہت سی پرانی قارئین ''فوزیہ ثمر' امبر گل' نوال' سونیا اور بہت سے نام بھول گئے۔ جن کے نام لکھے ان کو بالخصوص یاد کیا۔ اللہ کرے سب بخیر و عافیت ہوں۔

آسیہ نے صحیح کہا کہ کتاب یا رسالہ تو ہاتھ میں لے کر پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ روشنی یا اندھیرے سے بے نیاز ہو کر اور یہ فکر مجھے بھی لاحق ہے کہ 17 کو کرن ملا' 19 کو خط پوسٹ کروں گی' مل تو جائے گا نا!!! اب مجھے بھی بتایئے گا کہ عرصہ دراز بعد میرا خط ملا تو کیسا لگا.....؟

ج : انیقہ! آپ کا خط ملا بے حد خوشی ہوئی آپ آئندہ اتنا لمبا غائب ہو کر کرن کے ساتھ زیادتی مت کیجیے گا آپ نے اتنی تفصیل سے اتنا عمدہ تبصرہ کیا دل خوش ہو گیا۔

فضہ نور..... روہڑی

میں پہلی بار کسی ڈائجسٹ میں لکھ رہی ہوں۔ پہلے تو یہی ڈر رہا کہ خط شائع نہ ہوا تو..... پھر میں نے ہمت کی اور خط لکھنے بیٹھ گئی۔ میرا یہ خط لکھنے کی وجہ بنا' تنزیلہ ریاض کا سلسلہ وار ناول ''راپنزل'' جو بہت دلچسپ ناول ہے۔ اس سے پہلے میں نے فرحانہ ناز ملک جی کا ناول ''شام آرزو'' پڑھتی تھی جو بہت دلچسپ اور تجسس بھرا ناول تھا اور میرا فیورٹ بھی تھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں آمین!

کرن کے سبھی سلسلے لاجواب ہے خاص کر کچھ ''موتی چنے ہیں'' اور ''کرن کرن خوشبو'' پڑھ کر تو ایسا لگتا ہے جیسے ہماری زندگی میں بھی خوشبو پھیل گئی ہے۔ میری گزارش ہے کہ اگر میرا خط دیر سے موصول ہو تو اسے اگلے ماہ ضرور شائع کیجیے گا پلیز۔ مجھے امید ہے کہ میرے خط کو ''نامے میرے نام'' میں ضرور شائع کیا جائے گا۔

ج : فضہ! یقیناً'' آپ کو خوشی ہوئی ہو گی کہ آپ کا خط

"ناہے میرے نام" میں شامل کر لیا گیا ہے۔ شکریہ "راپنزل" کو پسند کرنے کا۔ ہمیں امید ہے آئندہ بھی آپ خط لکھیں گی اور تمام کہانیوں پر اپنی رائے کا اظہار کریں گی۔

ثنا خان۔۔۔۔ نا معلوم

جنوری کا کرن اس بار دیر سے ملا۔ کرن کے تمام ہی سلسلے مجھے بہت پسند ہیں۔ "کیسار دیا چاند" ابن انشا ایسا نام دنیائے ادب کے افق پر ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ "شادی مبارک ہو" میں ہنزہ ہمراہ علی کا احوال پڑھ کر اچھا لگا۔ سلسلے وار ناولز میں سے "ردائے وفا" میں نائلہ کے انجام پر دکھ ہوا لیکن شاید جو نادانیاں وہ کرتی رہی ہے اس کا انجام یہی ہونا تھا۔

"راپنزل" تنزیلہ ریاض کا نام ہی کافی ہے پر تفصیلی تبصرہ ناول مکمل ہونے کے بعد کروں گی۔ ابھی بس اتنا کہوں گی ہمیشہ کی طرح شان دار۔ صدف آصف ایک بہت اچھا اضافہ ہیں۔ "اسیروفا" بہت اچھا لگا۔ بلو خالہ جیسے حاسد اور کم ظرف کردار ہمارے معاشرے میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ طاہلہ کے صبر نے بہت متاثر کیا اس کے صبر کے نتیجے میں اس کا شوہر اس کے پاس پلٹا تو مکمل اس کا تھا۔ ویل ڈن صدف آصف "دم یاد مت آئے" میں بشریٰ گوندل کی منظر نگاری کمال تھی۔ ناول پڑھ کر اپنا بچپن یاد آ گیا۔ افسانوں میں سب سے زیادہ شبینہ گل کے "گریبان" نے متاثر کیا۔ واقعی یہ گھر گھر کی کہانی ہے۔

ج: پیاری ثنا کرن کو پڑھنے کا بے حد شکریہ

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔۔ کھوڑ رکا

جیسے سورج کی کرنیں دنیا کو روشنی دیتی ہیں بالکل ویسے ہی "کرن" رسالہ ہمیں روشنی دیتا ہے ہمارے من کو روشن کر دیتا ہے۔ کرن ایک خوشبو کی مانند ہے جس کی خوشبو ہر سمت بکھر جاتی ہے اور یہ خوشبو ہر کوئی محسوس کرتا ہے۔ اس کی خوشبو ایسی تیز رفتار ہے کہ پڑھنے والوں کو باد صبا کی طرح لگتی ہے کرن 14 کو میرے آنگن میں آیا بے ساختہ ٹائٹل کو دیکھ کر "زبردست" کا خطاب میں دے چکی ہوں سب سے پہلے سروے پڑھا سب نے اپنے انداز اور پسند کے مطابق رائے دی' اچھا لگا پڑھ کر حرا قریشی یار وہ تجوری بتاؤ جہاں سے تمہیں لفظ ملتے ہیں' بہت خوب 'انشا جی "کیسار دیا چاند" اتنی زبردست عظیم شخصیت کے لیے میرے جیسے کو لکھنا مشکل کام' ہاں جی بہترین انسان لکھاری' شاعر' کالم نویس وغیرہ کی مغفرت کی دل سے دعا کی رب جہاں ان شاء اللہ ان کے آخرت میں درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

سارہ خان اور سلمیٰ خان سے ملاقات' دونوں کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ "شادی مبارک" صرف پکچر دیکھی برائیڈل حقیقت میں بہت پیاری دکھ رہی ہیں۔

آسیہ مرزا "من مورکھ کی بات نہ مانو" آسیہ جی ابھی ناول مکمل بھی نہیں پڑھا مگر میں ابھی سے کہہ رہی ہوں یہ آپ کی گزشتہ تحریروں سے اعلا بہت اعلا ہوگا۔

"راپنزل" اور "ردائے وفا" دونوں ناول آگے بڑھ رہے ہیں۔ تنزیلہ ریاض اپنے لفظوں کے ذریعے ہم پر جادو کر جاتی ہیں۔ اس دفعہ ناول اداس رہا کیونکہ "اولیگوڈینڈروگلیوما" شہرین کو ٹیومر گریڈ 2 کا کینسر مرض کی شدت کا جان کر دل ہمارا بھی بوجھل ہو گیا۔۔۔۔ رائٹر اب اس کے ساتھ کیا کرنے والی ہیں تجسس "بہترین تحفہ" ماہم علی واقعی دنیا و جہاں کے سارے علوم و معلومات کا ذخیرہ انسانیت کے لیے راہ ہدایت "قرآن پاک" ہی ہے لیکن تحفے کے ساتھ ساتھ اس کو سمجھ کر پڑھنے اور زندگی پر اپلائی کرنے کی ہم سب کو ضرورت ہے۔ ماہم علی اور پری ناکس "دل ٹوٹ کے ہارا تھا" نایاب جیلانی دو مختلف فیملیز' ماحول' سوچ اپر اور مڈل کلاس کو لے کر آگے بڑھ رہی ہیں محبت کے نام پر جیت کس کی ہوتی ہے۔ آپ رائٹر نے صحیح لکھا جذبات کا اظہار انسان کو بے وقعت کر دیتا ہے" اگلی قسط کا انتظار ہے۔

اب آتے ہیں مستقل سلسلوں کی طرف تمام سلسلے بہت خوب تھے۔

"ستارے کیا کہتے ہیں" واقعی ستارے سچ کہتے ہیں۔ ستاروں پر مبنی معلومات پہلے تھوڑا اتنی تفصیل پتا تھی بس اتنا کہ 12 برج ہیں۔ نام اور بس' میری نالج میں اضافہ ہوا' ستاروں کو پڑھا مشہور سیلیبریٹی کے اسٹارز کا پتا لگا ڈیفرنٹ فیلڈ سے تعلق رکھنے والے مشہور شخصیات کے اسٹارز جان کر اچھا لگا۔

ارے ہاں 4 جنوری میری برتھ ڈے بھی تھی میں تو ہر دفعہ جوش و خروش سے سیلیبریٹ کرنے کی عادی ہوں۔

ج: سیدہ نسبت زہرا! آپ نے خط لکھا بہت اچھا لگا آپ ہر ماہ خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا کریں۔ ہماری طرف سے بھی آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔